سفرنامہ

غیر ملکی اسفار

جلد اوّل

مولانا وحید الدین خاں

SAFARNAMA: GHAIR MULKI ASFAR
By Maulana Wahiduddin Khan
First published 1992

Published by the Islamic Centre
C-29, Nizamuddin West, New Delhi-110013. Tel.: 611128, 697333
Distributed by AL-RISALA Book Centre
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Printed by Nice Printing Press, Delhi

فہرست

بسم الله الرحمن الرحيم

آغاز کلام

سفرنامہ لکھنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ ہومر (آٹھویں صدی قبل مسیح) کے فرضی سفرنامہ اوڈیسی (Odyssey) سے لے کر اب تک پچھلے ڈھائی ہزار سال کے اندر بے شمار سفرنامے ہر زبان میں لکھے جا چکے ہیں۔ تاہم ایک مورخِ ادب کے الفاظ میں، یہ بات بڑی عجیب ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب کہ سفر بہت بڑھ چکا ہے، سفری ادب کا معیار پہلے کے مقابلہ گر گیا ہے:

The literature of travel has declined in quality in the age when travel has become most common — the present. (10/1085)

عرب سیاحوں میں ابن بطوطہ (۱۳۶۸-۱۳۰۴) اور مغربی سیاحوں میں مارکو پولو (۱۳۲۴-۱۲۵۴) نے اس معاملہ میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ان کی فراہم کردہ جغرافی، سماجی اور ثقافتی معلومات سے صدیوں تک لوگ استفادہ کرتے رہے۔

ابن بطوطہ غالباً قرونِ وسطیٰ کا سب سے بڑا سیاح تھا۔ اس نے ۳۰ سال کی مدت میں تقریباً ۷۵۰۰۰ ہزار میل کا سفر کیا اور قدیم دنیا کے اکثر حصوں کو دیکھا۔ اس کی کتاب (رحلۃ) بے حد دل چسپ ہے اور اس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔

سفرنامہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والے اس کو دوسری چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ دل چسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ وہ گویا ایک حقیقی ناول ہے جو اکثر اوقات عام ناول سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ گوئٹے نے ۸۸-۱۷۸۶ میں جرمنی سے اٹلی کا سفر کیا تھا۔ اس سفر پر اس نے جو کتاب لکھی ہے، وہ اس کی ناولوں سے بھی زیادہ پڑھی گئی۔ راقم الحروف کے سفرنامے الرسالہ میں اس کے آخری صفحات میں شائع ہوتے ہیں۔ مگر اکثر قارئین کا کہنا ہے کہ جب انھیں الرسالہ ملتا ہے تو وہ سفرنامہ کو سب سے پہلے پڑھتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں سفر کی سہولتوں نے سفر کی ایک نئی قسم کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ہے بین اقوامی کانفرنسوں کے لیے سفر کرنا۔ راقم الحروف کے سفر سب کے سب اسی نوعیت کے ہیں۔ میں نے ہر سفر کسی کانفرنس کی دعوت ہی پر کیا ہے۔ تاہم میں جہاں بھی گیا، اپنے ذوق کے مطابق ہر قسم کی باتیں جاننے کی کوشش

کرتا رہا۔ اس طرح میرا سفرنامہ صرف کانفرنسوں کی روداد نہیں ہے، بلکہ وہ مختلف قسم کی معلومات کا مجموعہ بن گیا ہے۔ تاہم مجھے انھیں معلومات سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں سبق ہو۔ معلومات برائے معلومات کا مجھے کوئی ذوق نہیں۔

راقم الحروف کے سفرنامے ابتداءً الجمعیۃ ویکلی میں اور اس کے بعد ماہنامہ الرسالہ میں چھپتے رہے ہیں۔ کتاب کی صورت میں ان کی اشاعت کے لیے ان کو حسب ذیل چند حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی تقسیم کے مطابق ان شاء اللہ وہ شائع کیے جائیں گے:

۱۔ میوات کا سفر
۲۔ سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
۳۔ سفرنامہ (ملکی اسفار)
۴۔ سفرنامہ (بقیہ اسفار مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی)

اس مجموعے میں جو سفرنامے شامل ہیں، ان کی مدت تقریباً پندرہ سال کے دائرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ مختلف اور متنوع قسم کے مشاہدات پر مشتمل ہے۔ تاہم ایک چیز ان سب میں مشترک ہے۔ وہ ایک ایسی روح کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہر چیز کو اپنی نفسیاتی غذا بنانا چاہے۔ جو ہر چیز کو سبق اور نصیحت میں تبدیل کرنے کے لیے بے چین ہو۔

وحیدالدین

ایک سفر

۱۹ جنوری ۷۶ ۱۹ کو نئی دہلی کے لیبی سفارت خانہ کے پریس ایڈوائزر میرے دفتر میں آئے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ حکومت لیبیا نے آپ کو ندوۃ الحوار الاسلامی المسیحی (۱۔ ۵ فروری ۷۶ ۱۹) میں شرکت کے لیے مدعو کیا ہے۔ ۲۲ جنوری کو لیبی سفیر ڈاکٹر رجب الزروق سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی ویزا اور ضروری کاغذات دے دیئے۔ دیگر رسمی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ۳۰ جنوری کو ایرانڈیا کے بوئنگ ۷۴۷ سے روانگی ہوئی۔ کویت اور روم ہوتے ہوئے یکم فروری کو ہم طرابلس کے ہوائی اڈہ پر اترے۔

اس قسم کا سفر میرے لیے ہمیشہ وحشت کا باعث ہوتا ہے۔ ہم دہلی کے ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوئے اور "صنعتی پنجروں" کی زندگی شروع ہوگئی۔ ہوائی اڈہ سے ہوائی جہاز میں، ہوائی جہاز سے کار میں، کار سے ہوٹل میں، ہوٹل سے آڈیٹوریم میں۔ غرض صنعتی تمدن کے پیدا کردہ خوبصورت پنجروں کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھا اور ہم ایک سے دوسرے میں منتقل ہورہے تھے۔

مشینوں کے معجزے، سائنسی کاریگری کے جلوے اور ٹکنکل ترقیوں کے کمالات کے درمیان خود انسان ایک غیر اہم وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر ترقی یہی ہے تو یہ ترقی انسان کو انتہائی مہنگی قیمت پر ملی ہے۔ کھلی دھوپ، تازہ ہوا اور قدرت کی فضا سے محروم ہوکر ہم ایک مصنوعی زندگی میں بند ہوگیے ہیں۔ یہ زندگی بظاہر کتنی ہی حسین اور چمک دار نظر آتی ہو وہ ہماری فطرت کے مطابق نہیں۔ انسان جب قدرتی ماحول میں ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ سے بھی قریب ہوتا ہے اور خدا سے بھی۔ جب کہ صنعتی تمدن کے ماحول میں وہ دونوں چیزوں سے دور ہوجاتا ہے۔

روم میں دوسرا جہاز لینے کے لیے ۳۶ گھنٹے رکنا پڑا۔ یہ وقت شہر کے ایک ہوٹل میں گزرا ہم ایرپورٹ کی عمارت میں تھے کہ تیز برف باری شروع ہوگئی۔ بڑے بڑے شیشوں کے باہر سارا میدان سفید نظر آنے لگا۔ ایرپورٹ کی ایرکنڈیشنڈ عمارت کے اندر بالکل سکون تھا۔ مگر جیسے ہی ہم باہر نکلے، نہایت ٹھنڈی ہوا اور کپکپی طاری کر دینے والی سردی نے ہمارا بے رحم استقبال کیا۔ عمارت کے اندر اور اس کے باہر کا فرق دیکھ کر قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں ایک دیوار ہوگی، اس کے ایک طرف جنت کی نعمتیں ہوں گی اور اس کے دوسری طرف دوزخ کا عذاب (الحدید ۱۳)

طرابلس کے سیمنار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس موقع پر دنیا کے دو سب سے بڑے مذاہب اس لیے جمع

ہوئے کہ وہ باہم اتفاق کی بنیادیں تلاش کریں اور ایک مسیحی کے الفاظ میں " ماضی کو غرفۃ المحفوظات میں ڈال دیں "۔ اگرچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس قسم کی کسی کوشش سے فائدہ وہی گروہ اٹھا سکتا ہے جو اس سے پہلے اپنی کوئی مثبت جدوجہد منظم کر چکا ہو اور اس کو باقاعدہ چلا رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ویٹکن نے اس موقع پر حکومت لیبیا سے یہ اجازت حاصل کر لی کہ وہ بن غازی میں اپنا ایک چرچ قائم کرے۔ جب کہ مسلمان اس سمینار سے اس قسم کا کوئی ٹھوس فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

سمینار کا خاص مقصد دونوں مذاہب کے درمیان متفقہ بنیاد تلاش کرنا تھا۔ سب سے زیادہ طویل گفتگو جس مسئلہ پر ہوئی وہ یہ کہ مذہب کا تصور کیا ہے۔ مسلم جانب کا زور اس پر تھا کہ مذہب ایک مکمل قانون ہے۔ زندگی کے تمام معاملات اس کے دائرہ میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس مسیحی جانب کا کہنا تھا کہ مذہب ایک روحانی چیز ہے، وہ بطور ایک قوت محرکہ کے انسان کی سرگرمیوں میں شامل رہتا ہے۔ مگر قوانین وضوابط کی شکل میں وہ اپنا کوئی مخصوص ڈھانچہ نہیں رکھتا کچھ لوگوں نے یہ بحث چھیڑ کر مجلس میں کافی گرمی پیدا کر دی کہ عیسائی حضرات فلسطین اور اس قسم کے دوسرے معاملات میں کھل کر مسلمانوں کی حمایت کیوں نہیں کرتے۔

میں نے اپنی تقریر میں اس پر زور دیا کہ " اس قسم کے تمام مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل سوال اسلام کے مذہبی استناد کو تسلیم کرنے کا ہے جس کا عیسائی حضرات اب تک انکار کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسے عیسائی کثیر تعداد میں موجود ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ان کا یہ ماننا انفرادی طور پر ہے۔ کلیسا نے اب تک اس کو نہیں مانا ہے "۔

افریقہ کے ایک پادری نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ میں حضرت محمد کو سچا رسول مانتا ہوں۔ مگر ویٹکن کے نمائندہ نے یہ کہہ کر اس کی تردید کر دی کہ یہ ان کی انفرادی رائے ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ ویٹکن نے ایک کمیٹی خاص اس مقصد کے لیے مقرر کی ہے جو اس بات کا جائزہ دے رہی ہے کہ کیا ہم حضرت محمد کی نبوت کو بطور واقعہ تسلیم کر سکتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ بنیادی نکتہ جہاں سے مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ " فارقلیط " کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ یوحنا کی انجیل صاف طور پر بتاتی ہے کہ حضرت مسیح نے اس دنیا سے جاتے ہوئے اپنے شاگردوں سے کہا کہ میرے بعد خدا ایک تسلی دہندہ (یا ستودہ صفات) بھیجے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ وہ کل سچائی کو ظاہر کرے گا، وہ دنیا کا سردار ہوگا، وہ ان باتوں کو بھی بتائے گا جو میں نے

نہیں بتائیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری پیشین گوئیاں حضرت مسیح کے بعد کی شخصیتوں میں جس کے اوپر صادق آتی ہیں، وہ صریح طور پر پیغمبر اسلام کی ذات ہے۔ مگر مسیحیوں نے "تسلی دہندہ" کو روح القدس قرار دے کر سارے مفہوم کو الٹ دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ تسلی دہندہ روح القدس کی شکل میں حضرت مسیح پر ایمان لانے والے کے اوپر آتا ہے اور اس کے ذریعہ ان سچائیوں کو ظاہر کرتا ہے جو حضرت مسیح نے نہیں بتائیں۔ اس تعبیر کے ذریعہ انھوں نے ان تمام اضافوں کو حق بجانب قرار دینے کا جواز ڈھونڈ لیا جو حضرت مسیح کے بعد ان کے ماننے والوں نے حضرت مسیح کے مذہب میں کیں۔ اس نے کلیسا کو حضرت مسیح کا دائمی اور مستند نمائندہ بنا دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو اس آخری اور ابدی سچائی سے محروم کر لیا جو پیغمبر اسلام کے ذریعہ ظاہر کی گئی ہے۔ "فارقلیط" کی صحیح تعبیر کی جائے تو اس سے نبوت محمدی کا اثبات ہوتا ہے اور اس کی غلط تعبیر کی جائے تو اس سے کلیسا کا مذہب برآمد ہو جاتا ہے۔

تاہم مسیحی جانب نے اس نقطہ نظر سے بچنے کی کوشش کی اس کی کوشش یہ رہی کہ اس اختلافی بحث کو نظر انداز کر کے اتفاق کی مشترک بنیادیں تلاش کی جائیں۔

مسیحی جانب کے بعض ذہین لوگوں نے یہ کوشش کی کہ مسیحیت کے جو عقائد اسلام کی نظر میں قابل اختلاف ہیں، ان کی ایسی خوبصورت تاویل کی جائے کہ وہ قابل قبول نظر آنے لگیں۔ مثلاً مسیح کے ابن اللہ ہونے کا معاملہ۔ ایک مسیحی نمائندہ ڈاکٹر شولیکل نے کہا کہ مسیح کے ابن اللہ ہونے کا مطلب دراصل بشریت کے اعلیٰ معیار کو ممثل کرنا ہے۔ انسان ایک بشر کی حیثیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اپنے اعلیٰ کردار کے ذریعہ اس کو خدا جیسا بننا ہے۔ مسیح کا خدا کا بیٹا ہونا اعلیٰ ترین انسانی بلندی کی تمثیل ہے۔ مگر یہاں فوراً یہ سوال تھا کہ مسیح کا ابن اللہ ہونا اگر تمثیلی معنوں میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان خدا کا بیٹا بن سکتا ہے۔ اس تعبیر کے بعد کفارہ کے عقیدہ کے لیے کوئی بنیاد نہیں رہتی جس پر موجودہ مسیحیت کی ساری عمارت قائم ہے۔ ایک ملاقات میں میں نے ڈاکٹر شولیکل کے سامنے یہ سوال رکھا تو انھوں نے کہا کہ میرا نقطہ نظر بلاشبہ ویٹکن کے سرکاری عقیدہ کے خلاف ہے مگر ہمارے یہاں فکری آزادی ہے۔

وہ واحد مسئلہ جس پر دونوں فریقوں کا سب سے زیادہ اتفاق ہو سکا وہ الخراف الشباب فی جانبین کا مسئلہ تھا۔ یہ مسلم اور عیسائی دونوں معاشروں کا مشترک مسئلہ ہے کہ نوجوان طبقہ مذہبی

روایات سے کٹ کر الحاد کی طرف چلا جا رہا ہے۔ متفقہ طور پر یہ رائے سامنے آئی کہ اس مسئلہ کے مقابلہ کے لیے دونوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ مگر اس معاملہ میں کوئی ٹھوس پروگرام وضع نہ کیا جا سکا۔ ایک صاحب نے "بدء الحوار مع الملحدین" کی تجویز پیش کی۔ یعنی جس طرح مسلمان اور عیسائی یہاں بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں، اسی طرح ملحدین سے بھی گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ مگر یہ کوئی تجویز نہیں۔ اس قسم کی باتیں صرف یہ ثابت کرتی ہیں کہ مسئلہ کے احساس کے باوجود اس معاملہ میں ابھی تک زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچا نہیں جا سکا ہے۔

راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ ۹۹ فی صد لوگ وقت اور موضوع کے حدود میں رہ کر بولنا نہیں جانتے۔ طرابلس کا سیمینار بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ بیشتر تقریریں اور مقالے غیر ضروری طور پر طویل اور موضوع سے ہٹے ہوئے تھے۔ ایک شخص کھڑا ہو کر یہ کہتا: انی لا احب الاطالة علیکم اور جب اس اظہار کے باوجود اس کی تقریر لمبی ہو جاتی تو آخر میں معذرت کرتا کہ: ایھا الاخوة اشکرکم علیٰ صبرکم۔ ایک شخص اصل موضوع سے ہٹ کر کسی دوسرے موضوع پر لمبی تقریر کر ڈالتا اور پھر یہ کہہ کر حاضرین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا: فما اظن انی قد ابتعدت من الموضوع کوئی شخص مقررہ وقت میں اپنی تقریر ختم کر دیتا تو یہ اتنی نادر چیز ہوتی کہ صدر جلسہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ الفاظ بھی ادا کرتا: اشکر خاصة علیٰ تقیدہ بالوقت المحدد۔

ندوة الحوار الاسلامی المسیحی میں یورپ کے ایک پادری سے میں نے بائبل کے عربی ترجمہ کی خواہش ظاہر کی۔ اگلے دن انھوں نے نہایت عمدہ چھپائی اور نہایت عمدہ جلد کے ساتھ عربی انجیل کا ایک نسخہ مجھے ہدیةً پیش کیا۔ بعد کو مکمل بائبل عربی میں مجھے ڈاک سے مل گئی۔ مسیحی مبشرین اپنی مقدس کتاب ہر زبان میں سارے عالم میں پھیلا رہے ہیں۔ کاش اسی طرح ہم قرآن کو ہر زبان میں ساری دنیا میں پھیلا سکیں۔

فروری کی ۳ تاریخ تھی اور شام ۶ بجے کا وقت۔ طرابلس کے مسرح التحریر میں ۶۰ سے زیادہ ملکوں کے تقریباً پانچ سو مسلمان اور عیسائی جمع تھے۔ اچانک کارروائی رک گئی۔ لوگ گیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔ فوٹوگرافر بھاری بھاری کیمرے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے مسلسل شاٹ لینے لگے۔ معلوم ہوا کہ لیبیا کے صدر کرنل معمر قذافی آئے ہیں۔ وہ بالکل اچانک آئے تھے۔ لوگوں نے کوشش کی کہ ان کو ڈائس پر لے جائیں۔ مگر وہ عام لوگوں کے ساتھ ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیے اور نہایت خاموشی کے ساتھ کارروائی سننے لگے۔

دُبلا پتلا سا ایک آدمی، کھلا سر، کالے رنگ کا معمولی کوٹ پتلون جس پر ٹائی بندھی ہوئی نہیں تھی۔ ہر قسم کے نشان سے خالی ایک معمولی آدمی کی طرح اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

کارروائی بدستور جاری رہی۔ درمیانی وقفہ کے بعد دوسری نشست میں لوگوں نے صدر قذافی سے اصرار کیا تو وہ ڈائس پر گیے۔ وہاں بھی کسی امتیازی نشست پر نہیں بیٹھے بلکہ ایک عام کرسی پر بیٹھ گیے۔ درمیان میں تین بار انھوں نے لوگوں کی فرمائش پر تقریر کی۔ تینوں تقریریں سادہ الفاظ کے ساتھ، کسی تمہید کے بغیر شروع ہوئیں اور بالکل اچانک ختم ہو گئیں۔ مسیحی جانب نے مذہب کا روحانی تصور پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ مذہب کو حکومت وغیرہ کے معاملات میں داخل نہیں کرنا چاہیے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ قوت محرکہ (motive force) کے طور پر تمام سرگرمیوں میں کام کرے۔ صدر قذافی نے اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ ویٹکن میں تو عیسائیوں کی حکومت قائم ہے۔ پھر وہ کیسے ہے۔

مجھے کرنل قذافی کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کرنل قذافی کے ثورہ (انقلاب) نے لیبیا کو نقصان زیادہ پہونچایا ہے اور فائدہ کم۔ اسلام کے بارہ میں بھی ان کی بہت سی تعبیرات بالکل احمقانہ ہیں۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے آدمی کے اندر کچھ خاص صفتیں ہونا ضروری ہیں۔ آپ صحیح کام کرنا چاہتے ہوں یا غلط کام، ہر حال میں آپ کے اندر ان صفتوں کی موجودگی ضروری ہے۔ ان کے بغیر اس دنیا میں آدمی نہ کوئی صحیح کام کر سکتا ہے اور نہ کوئی غلط کام۔

"ثورہ" سے پہلے لیبیا میں بادشاہت تھی اور ثورہ کے بعد ڈکٹیٹر شپ۔ شہر کی دیواروں پر اس طرح کے جملے لکھے ہوئے نظر آئے:

نحن نضرب بالحديد اذا مست الثورة

ہوٹل کے ایک بڑے ہال میں کتابوں کی تقسیم کا انتظام تھا۔ مگر یہ کتابیں زیادہ تر پروپیگنڈے سے تعلق رکھتی تھیں جن میں بڑھ چڑھ کر ثورہ کی تعریف کی گئی تھی۔ قرآن کے انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ کے کچھ نسخے تھے جو فوراً ہی ختم ہو گیے۔ اور اس کے بعد وہاں پروپیگنڈا لٹریچر کے سوا کچھ اور موجود نہ تھا۔

میں اندر داخل ہو کر منتظم سے ملا اور ان سے یہ کہنے کی کوشش کی کہ اس کانفرنس کے موقع پر عیسائی حضرات بڑی تعداد میں آئے ہوئے ہیں اور وہ قرآن کا ترجمہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ

قرآن کے انگریزی اور فرانسیسی ترجمے بڑی تعداد میں یہاں رکھتے تو کتنا فائدہ ہوتا ۔ میں ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر سکا تھا کہ پیچھے سے ایک عرب نوجوان نے مجھے اپنی طرف کھینچا اور الگ لے جاکر کہا :

" اے شیخ ، آپ اس وقت لیبیا میں ہیں ۔ آپ ہندستان میں نہیں ہے "

یہ صرف لیبیا کی بات نہیں ۔ اکثر مسلم ملکوں کا یہی حال ہے ۔ مسلمانوں کے اندر شکر کا جذبہ نہیں ۔ اگر ان کے اندر شکر کا جذبہ ہوتا تو وہ جانتے کہ آج ہندستان میں اس سے کہیں زیادہ کام کے مواقع ہیں جتنا کسی مسلم ملک میں پائے جاتے ہیں ۔

لیبیا کا رقبہ ۶ لاکھ ۵ ، ۷ ہزار مربع میل سے زیادہ ہے ۔ مگر اس وسیع رقبہ کے باوجود اس کی کل آبادی تقریباً ۲۰ لاکھ ہے ، موجودہ صدی کے آغاز میں اٹلی کے لیڈروں میں یہ ذہن ابھرا کہ وہ اپنے اقتدار کو وسیع کریں اور شمالی افریقی ایمپائر بنائیں ۔ چنانچہ ۱۹۱۱ میں انھوں نے سمندر پار کر کے لیبیا پر حملہ کیا اور اس پر اپنا قبضہ کر لیا ۔ میں نے طرابلس میں وہ وسیع مکان دیکھا جس میں اٹلی کا گورنر رہتا تھا اور جو اب میوزیم بنا دیا گیا ہے ، لیبیا نے دسمبر ۱۹۵۱ میں بیرونی قبضہ سے آزادی حاصل کی ۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۹ میں فوجی انقلاب ہوا اور سابق شاہ ادریس جلاوطن کر دیئے گئے ۔

مذکورہ میوزیم میں " مجاہدین آزادی " کی یادگاریں رکھی ہوئی ہیں ۔ ان کو دیکھتے ہوئے میری نظر ایک کتبہ پر پڑی ۔ اس پر وہ نعرہ لکھا ہوا تھا جو اٹلی کی محکومی (۴۳-۱۹۱۱) کے زمانہ میں مجاہدین آزادی نے اختیار کیا تھا وہ نعرہ یہ تھا :

موتوا اليوم اعزاء قبل ان تموتوا غداً أذلاء

(آج عزت کے ساتھ مر جاؤ قبل اس کے کہ کل تمہیں ذلت کے ساتھ مرنا پڑے) نوآبادیاتی دور میں تمام محکوم مسلم ممالک میں یہی بات کسی ایک یا دوسرے لفظ میں دہرائی گئی ۔ تاہم نوآبادیاتی محکومی ختم ہونے کے بعد بھی مسلمانوں کو باعزت زندگی حاصل نہ ہو سکی ۔

ان مجاہدین آزادی کی غلطی یہ تھی کہ وہ عزت اور ذلت کو صرف سیاسی اصطلاحوں میں سوچتے رہے ۔ حالاں کہ اس دنیا میں عزت اس کو ملتی ہے جس کو فکری غلبہ حاصل ہو ۔ اور بے عزت وہ ہے جو فکری اعتبار سے مغلوب ہو جائے ۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے بے حساب کوششیں کیں ۔ مگر فکری غلبہ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کچھ نہیں کیا ۔

لقاء مع «وحيد الدين خان» مؤلف «الاسلام يتحدى»

محمد سليمان الراشد

متى نستوعب تقاليد العصر من أجل الدعوة للإسلام؟

وحيد الدين خان مفكر اسلامي .. مؤسس مدرسة اسلامية جديدة في الفكر الاسلامي المعاصر .. وهو رئيس تحرير « الجمعية الاسبوعية » أكبر المجلات الاسلامية في الهند وأوسعها انتشارا ، ومؤلف « الاسلام يتحدى » الذي يعد نهجا مستقلا في تقديم الاسلام بأسلوب العصر وعلى ضوء العلم ونتائجه الباهرة . وهو مؤسس مدرسة اسلامية جديدة قوامها الدعوة الى الدين الاسلامي كما هو دون الخروج به الى ما تعكسه الظروف النفسية للمسلمين في العصر الحديث . وقوامها أيضا فهم العصر كما هو دون الخروج به الى ما تعكسه نفسيات المسلمين نتيجة للانبهار من جهة ونتيجة للجهل أيضا .

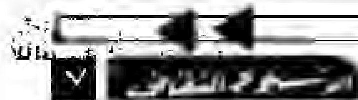
فهي - أي هذه المدرسة - تؤمن بوجوب مواجهة التحديات التي يواجهها المسلمون بنفس المصطلحات والوسائل التي يستخدمها الاعداء .. ونبذ الاتجاه الى تحويل الاسلام من دعوة الى حزب سياسي ، أو من فكر روحي الى فكر سياسي او فكر ايديولوجي مركزا على النواحي العلمية في العصر باعتبارها المدخل الجديد لتقبل الاسلام ، باعتباره الحقائق الوحيدة في هذا العالم في مجال العقيدة .

والمفكر الهندي هو الاخر صاحب مشروع المركز الاسلامي وقد عرض هذا المشروع في كتيب صغير بعد ان قام بدراسة عميقة لظاهرتين في التاريخ الحديث .. وهما اليابان واليهود في الولايات المتحدة الامريكية .

ولقد جاءت قرارات مؤتمر الدعوة الاسلامية الذي انعقد في طرابلس الغرب في ديسمبر عام ١٩٧٠ مماثلة بصورة مدهشة لهذا البرنامج ، وكذلك يوجد توافق كبير بين هذه المقترحات وبين قرارات المؤتمر الاسلامي الذي عقده المركز العام لجمعيات الشبان المسلمين في ابريل عام ١٩٧١ م .

ولقد كان لقاؤنا بهذا المفكر الهندي المسلم ابان انعقاد الحوار الاسلامي المسيحي في طرابلس، والذي حضره بصفته مراقبا . ونحن مع تقديرنا له لفتح قلبه لنا .. نتمنى ان يفتح القراء قلوبهم له فهو صاحب رغبة في ان يفهم فهما سليما بعيدا عن التصورات المسبقة التي تعوق ادراك الانسان عن الحكم الصحيح .

● هناك عدة مسائل نرغب في طرحها او دها تأملنا في مؤلفاتكم وبالذات « حكمة الدين » - اي اننا نريد ان نعرف على ماذا تبنون رأيكم في المركز الاسلامي .. كمشروع هام يجب ان يقوم به المسلمون وفق تصوركم الشامل الذي عرضتموه في منشور خاص .



لیبیا کے لیے میرا ویزا ابتداءً صرف دو ہفتہ کے لیے تھا۔ مگر وہاں کچھ لوگوں نے مزید قیام کے لیے اصرار کیا۔ انھوں نے ویزا کی مدت میں توسیع کرائی۔ چنانچہ میں تقریباً دو مہینے (فروری۔ مارچ ۱۹۷۶) وہاں مقیم رہا۔ یہ قیام زیادہ تر طرابلس میں رہا۔ اگرچہ بعض تاریخی مقامات کو دیکھنے کے لیے دوسرے مقامات پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ مثلاً رومی دور کے کھنڈرات، اٹلی کے دور کی یادگاریں وغیرہ

اس دو ماہہ قیام میں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا، دو عرب نوجوان محمد سلیمان القائد اور علی الجعیدی روزانہ قلم کاغذ لے کر آتے اور گھنٹوں ان سے تبادلۂ خیال جاری رہتا۔ دوران گفتگو وہ نوٹ بھی لیتے رہے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں محمد سلیمان القائد کے اندر زبردست ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ اس سے پہلے ان کے اندر "سیاسی اسلام" والا ذہن تھا، اب ان کے اندر دعوت کا ذہن پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کیگالی (روانڈا) کے اسلامی مرکز سے وابستہ ہوئے اور خالص انذار آخرت کے انداز میں دعوتی کام شروع کیا۔ ان کی کوششوں سے اس ملک کے تقریباً ۲۵ ہزار آدمی اسلام میں داخل ہو گئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

طرابلس کے دو ماہہ قیام میں تقریباً ایک درجن مواقع پر خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ تقریریں زیادہ تر توحید اور آخرت کے موضوع پر تھیں اور تربیتی انداز کی تھیں۔ مثلاً ۲۶ مارچ ۱۹۸۶ کی ایک تقریر میں میں نے کہا کہ یہاں طرابلس میں ایک متحف (میوزیم) ہے جو آپ میں سے اکثر لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ یہ میوزیم پہلے معمولی حالت میں تھا مگر اٹلی والوں نے اس کو ترقی دے کر نہایت اعلیٰ معیار کا بنا دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس میوزیم میں ایک بھس بھری ہوئی بکری رکھی ہے۔ اس کی گردن کے اوپر دو سر ہیں۔ اگر ایک شخص میوزیم کو دیکھ کر آئے اور اس سے پوچھا جائے کہ تم نے میوزیم میں سب سے زیادہ عجیب چیز کیا دیکھی، تو شاید وہ جواب دے گا کہ "دو سر والی بکری"۔ مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں نے دنیا میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز دیکھی وہ دو سر والے انسان تھے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک سر والا بنایا ہے۔ مگر وہ اپنی تخلیق کو بگاڑتا ہے اور دو سر والا انسان بن کر رہتا ہے۔

انسان اپنے معاملہ میں ایک انداز سے سوچتا ہے اور دوسرے کے معاملہ میں دوسرے انداز سے۔ وہ اپنے مسائل کو ایک ڈھنگ سے حل کرتا ہے اور قوم کے مسائل کے بارہ میں دوسرے ڈھنگ کی تجویزیں پیش کرتا ہے۔ دنیا کے معاملہ میں اس کا ذہن دوسرا ہوتا ہے اور آخرت کے معاملہ میں دوسرا۔ جس شخص سے مفاد وابستہ ہو اس سے وہ دوسرے طریقہ سے ملتا ہے اور جس سے مفاد وابستہ نہ ہو اس سے دوسرے

طریقہ ہے ۔ اس قسم کے تمام انسان دوسرے والے انسان ہیں اور خدا کے تخلیقی نظام میں وہ بلاشبہ سب سے زیادہ عجیب چیز ہیں ۔

جاتے ہوئے روم سے طرابلس کے لیے جہاز بدلنا تھا۔ مگر یہاں کنکٹنگ فلائٹ نہیں تھی اس لیے ہوائی کمپنی نے روم کے ایک ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام کیا ۔ اس طرح ہم ۳۶ گھنٹے اس قدیم شہر میں رہے جس سے یورپ کی تاریخ کی بہت سی قدیم یادیں وابستہ ہیں ۔

روم کی یادوں میں سے ایک یاد وہ جرمن مستشرق ہے جس سے وہاں میری ملاقات ہوئی :

Dr. Hans Georg Asmuseen, Propst,
Beselerstrabe 28-2240 Heide, W. Germany.

ایک موقع پر میں نے دیکھا کہ موصوف عربی انجیل کا مطالعہ کر رہے ہیں ۔ اس سے میں نے سمجھا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں ۔ ان سے دیر تک مختلف مذہبی موضوعات پر گفتگو ہوئی ۔ وہ جرمن لہجے میں کسی قدر اٹک اٹک کر عربی بولتے رہے ۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے کہا کہ مجھے عربی بائبل حاصل کرنے کا شوق ہے ۔ میرے پاس بائبل کا انگریزی ترجمہ موجود ہے ، مگر بائبل کا عربی ترجمہ میرے پاس موجود نہیں ۔

میرا مقصد صرف ادارہ کا پتہ پوچھنا تھا تاکہ اس کو خط لکھ کر وہاں سے عربی بائبل منگائی جاسکے ۔ مگر انھوں نے ادارہ کا پتہ بتانے کے بجائے خود میرا پتہ دریافت کیا ۔ اور اپنی ڈائری میں میرا پتہ نوٹ کرتے ہوئے کہا : میں آپ کو عربی بائبل بھجواؤں گا ۔

سفر کے ایک سال بعد کا واقعہ ہے کہ فروری ۱۹۷۷ میں مجھے ڈاک سے ایک پیکٹ ملا ۔ کھولا تو اس کے اندر پرانے اور نئے عہد نامہ پر مشتمل " الکتاب المقدس " کا ایک نیا نسخہ موجود تھا ۔ فولڈنگ جلد کے ساتھ باریک کاغذ پر چھپا ہوا یہ خوبصورت نسخہ ۱۶۸۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ پرنٹ لائن کے مطابق بائبل کا یہ عربی نسخہ کوریا میں ۱۹۷۶ میں چھپا ہے ۔ غالباً مستشرق موصوف کے ادارہ میں عربی نسخے ختم ہوگئے تھے ۔ تاہم انھوں نے میری فرمائش یاد رکھی اور جب عربی بائبل کوریا سے چھپ کر آئی تو انھوں نے حسب وعدہ فوراً اس کی روانگی کا انتظام کیا ۔

مسیحی حضرات دنیا کی تمام زبانوں میں اپنی مقدس کتاب کے ترجمے شائع کر کے لوگوں کو فراہم کر رہے ہیں ۔ مگر مسلمان ابھی تک قرآن کے معاملہ میں ایسا نہ کر سکے ۔ جرمن مستشرق کی طرف سے میں نے عربی بائبل کا نسخہ وصول کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبان حال سے کہہ رہا ہو : دیکھو تم اسلام کا

پیغام پھیلانے میں ناکام رہے اور ہم نے مسیحیت کا پیغام سارے عالم میں پہونچا دیا۔

۶ فروری کو صدر قذافی (صدر جمہوریہ لیبیا) سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ تعارف کے فوراً ہی بعد انھوں نے کہا: میں آپ کی کتاب الاسلام یتحدیٰ پڑھ چکا ہوں (لقد قرأت کتابك الاسلام یتحدی) عربی میں یہ کتاب اب تک دس سے زیادہ بار چھپ چکی ہے اور پورے عالم عرب میں پھیلی ہے۔ انھوں نے کتاب کو ایک عظیم کتاب بتایا۔ ملاقات کے دوران صدر قذافی نے اپنے ایک ساتھی سے راقم الحروف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: هو مفكر ومؤلف كبير ونحن نقدره الجہاد (طرابلس) ۸ فروری ۱۹۷۶ -

صدر قذافی ایک سادہ آدمی نظر آئے۔ بظاہر ان کو دیکھ کر کسی قسم کی عظمت کا تصور نہیں ہوتا "یہی وہ آدمی ہے جو لیبیا کا حکمراں ہے جس کے ہاتھ میں ملک کے خزائن ہیں" میں نے سوچا "اس معمولی آدمی میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے اس کو اس مقام تک پہونچایا" اور میرے دل نے جواب دیا "خطرہ (risk) مول لینے کی صلاحیت"۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ کو جب قاریونس کے معسکر (بیرک) سے اس معمولی افسر اور اس کے ساتھیوں نے بن غازی کی طرف مارچ کیا تو ہر لمحہ ان کے لیے موت کا لمحہ تھا۔ سابق شاہ ادریس اگرچہ اس وقت ترکی میں تھے مگر ان کی سیکورٹی فورس جو ہوائی جہازوں تک سے مسلح تھی، کوئی بھی کارروائی کرنے کی مکمل قدرت رکھتی تھی مگر انھوں نے جان پر کھیل کر ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرلیا اور اچانک اعلان کردیا:

قامت قواتك المسلحة بالاطاحة بالنظام آپ کی مسلح فوجوں نے رجعت پسند، متخلف اور

لقاءات سريعة

* من مفكري الاسلام المشاركين في اعمال الحوار الفكر الاسلامي وحيد الدين خان رئيس تحرير مجلة (الجمعية الاسبوعية) التي تصدر في دلهي بالهند وصاحب الكتاب الشهير (الاسلام يتحدى).

حول دراساته الاسلامية الجديدة قال (للجهاد) انه قد انتهى من اعداد دراسة شاملة تصدر في كتاب يحمل عنوان (الاسلام) يبرز فيه الحقائق الاساسية للاسلام كما يصدر له في الباكستان كتاب (اله واحد وانسان واحد ونظام واحد).

الجهاد الخميس ٥ من صفر ١٣٩٦ ص ١٥

لیبیا کے دوران قیام میں وہاں کے اخبارات کے نمائندوں نے صاحب مضمون سے ملاقاتیں کیں اور اس کی رپورٹیں شائع کیں۔ روزنامہ الفجر الجدید (طرابلس) کے ہفتہ وار اڈیشن الاسبوع الثقافی (۲۶ مارچ ۱۹۷۶) میں جو تفصیلی انٹرویو شائع ہوا تھا اس کے ابتدائی حصہ کا چربہ مقابل کے صفحہ پر درج ہے۔ روزنامہ الجہاد (۵ فروری ۱۹۷۶) کے صفحہ ملاقات کا پہلا پیراگراف یہ تھا

الرجعي المتخلف المتعفن وهكذا من الآن تعتبر ليبيا جمهورية حرة ذات سيادة تحت اسم الجمهورية العربية الليبية (رئیسی ابنی)

بدعنوان حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔ آج سے لیبیا آزاد اور با اختیار ہوگا اور اس کا نام ہوگا۔ "جمہوریہ عربیہ لیبیہ"

اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لیے خطرہ مول لینے کی صلاحیت لازمی طور پر ضروری ہے۔ خواہ آپ ڈاکو ہوں یا حق کے مجاہد۔

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ سابق شاہ ادریس کے دور کے مقابلہ میں کرنل قذافی کا دور زیادہ آزاد ہے اور بدعنوانیوں سے پاک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبیا کا انقلاب دوسرے مسلم ملکوں کے انقلاب کی طرح محض ایک برائی سے دوسری برائی کی طرف چھلانگ تھی۔ اس اعتبار سے لیبیا کے بدنام قذافی اور مصر اور پاکستان کے خوش نام اسلامی مفکرین دونوں عملاً مجھے ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں۔

اس سمینار کا سب سے زیادہ موثر حصہ اس کا خاتمہ تھا۔ دونوں طرف کے نمائندوں نے نہایت مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا۔ مسلم نمائندہ نے کہا: اذا مشيتم الينا ميلاً مشينا اليكم ميلين، واذا اتيتم الينا مصافحين هرولنا اليكم معانقين۔ مسلم نمائندہ نے رواداری کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا: نحن بما عندنا وانتم بما عندكم ولكل راى۔ مسیحی نمائندوں کا رویہ بھی نہایت دوستانہ تھا۔ ایک مسلم نمائندہ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ فلاں مسیحی نمائندہ سے ملا تو گفتگو کے دوران اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے بعد مسلم نمائندہ نے یہ آیت پڑھی: ولتجدنّ اقربهُمْ مودة للذين آمنوا ۔۔۔۔ (مائدہ ۸۳-۸۲) تاہم یہ منظر بھی دیکھنے میں آیا کہ تقریروں کے ساتھ تالیوں کی دھوم تھی۔ مگر جب ایک مسلم نمائندہ نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ عیسیٰ کلمۃ اللہ تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر تھے۔ اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف خدا کے پیغمبر ہیں۔" تو مسلمانوں نے دیر تک تالی بجائی مگر مسیحی نشستوں پر خاموشی طاری رہی۔

۶ فروری کی شام کو سمینار کا خاتمہ انجیل اور قرآن کی تلاوت پر ہوا۔ دونوں تلاوتیں ایک عیسائی عالم نے کیں۔ پہلے اس نے انجیل (متی باب ۲۵) عربی میں پڑھی۔ پڑھنے والا پادری نہایت خوش الحان تھا۔ اور خالص عربی لہجہ میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اسی پادری نے قرآن (البقرہ، آخری آیات اور سورہ علق کی کچھ آیات) پڑھیں۔ دونوں تلاوتیں اس نے تجوید اور قرأت کے تمام قواعد کے ساتھ کیں۔ قرآن کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ساتھ شروع کیا اور آخر میں صدق اللہ العظیم کہا۔

اصل انجیل بلاشبہ ایک خدائی کتاب تھی ۔ مگر اس کا موجودہ عربی ترجمہ ظاہر ہے کہ انسان کے قلم سے ہے ۔ اس کے برعکس قرآن کی زبان الہامی زبان ہے ۔ جب دونوں کتابوں کے حصے ایک ساتھ پڑھے گیے تو یہ گویا خاموش اعلان تھا کہ یہ انسانی کلام ہے اور وہ خدائی کلام ۔ انجیل کی قرأت میں ساری کوشش کے باوجود کوئی شکوہ پیدا نہ ہو سکا ۔ اس کے برعکس قرآن حیرت انگیز طور پر ایک عظیم کلام کی مانند ہال کے اندر گونج رہا تھا ۔ اس کی مجرد سماعت ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہ ایک بلند تر خدائی کلام ہے نہ کہ کوئی انسانی کلام ۔

کانفرنس کی کارروائی ختم ہونے کے بعد تمام لوگ ایک بڑے ہال میں چائے پینے کے لیے جمع ہوئے ۔ میں جس میز پر بیٹھا اس کے دوسری جانب اتفاقاً ایک نوجوان پادری تھے جو ویٹیکن کے وفد کے ساتھ آئے تھے ۔

کانفرنس کے آخری پروگرام کا اثر ابھی ہم سب کے ذہنوں پر تھا جب کہ انجیل کی آواز پر قرآن کی آواز اس طرح چھا گئی تھی جیسے قرآن نے اس کو نگل لیا ہو ۔ اسی پس منظر میں ہم دونوں کی گفتگو شروع ہوئی ۔ میں نے پادری صاحب سے کہا : کیا آپ قرآن کو خدائی کتاب مانتے ہیں ۔ یہ پادری اگرچہ وہ بزرگ تھے جو ابھی کانفرنس کے ہال میں اس کی تردید کر چکے تھے ۔ قرأت کے تاثر کے تحت ان کی زبان سے نکلا ہاں ۔ مگر معاً بعد انھیں محسوس ہوا کہ میں نے اپنے عقیدہ کے خلاف ایک بات کہہ دی ۔ چنانچہ اگلے لمحہ انھوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا : مگر وہ صرف قدیم عربوں کے لیے تھا ۔

ریاض کا سفر

(از ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں)

سعودی عرب کے دار السلطنت الریاض میں اکتوبر ۱۹۷۶ء کے آخری ہفتہ میں اسلامی قانون کے بارے میں ایک اہم بین اقوامی کانفرنس (مؤتمر الفقہ الاسلامی) منعقد ہوئی جس میں ساری دنیا سے تقریباً ۱۵۰ علماء و مفکرین اسلام نے شرکت کی۔ آٹھ دن کی فکر انگیز ملاقاتوں اور مناقشات کے بعد اسلامی فقہ کانفرنس ۳۱ اکتوبر کو ختم ہوئی۔ کانفرنس کی اہم قرار دادیں حسب ذیل ہیں:

اسلامی ملکوں میں شریعت اسلامیہ کو فوری طور پر نافذ کرنے کا مطالبہ۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کا قیام جو کہ اسلامی قوانین کی جدید تدوین کے علاوہ عصر حاضر کے پیدا کردہ مسائل کا حل تلاش کرے گی اور اس میں تمام عالم اسلامی کے ممتاز علماء و مفکرین شامل ہوں گے۔ یہ اکیڈمی کانفرنس کی دعوت دینے والی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ (الریاض) میں قائم کی جائے گی۔

مسلم ممالک میں سود کا فوری طور سے خاتمہ، اور بینک کاری اور دوسرے اقتصادی امور کو اسلامی قانون کے مطابق ڈھالنا۔

جامعۃ الامام محمد بن سعود میں اقتصادی ریسرچ کا مرکز قائم کرنا۔

مناہج تعلیم میں اسلامی علوم و ثقافت کو کماحقہ داخل کرنا۔

ایک مستقل مرکز کا قیام جو اسلام کے خلاف استشراقی، الحادی اور صلیبی فکری حملوں پر نظر رکھے اور ان کا توڑ کرے۔

اسلامی انسائیکلوپیڈیا تیار کرنا۔

عالمی صحافتی ادارہ کا قیام جو کہ پرچوں اور روزناموں کے ذریعہ اسلامی قضایا کو ابھارے اور عمدہ اسلامی کتابوں کا ترجمہ کرے۔

اسلامی تعلیمی ریسرچ کے لئے جامعۃ الامام محمد بن سعود اور دوسری اسلامی یونیورسٹیوں میں مستقل مراکز کا قیام جو کہ عمدہ کتابیں تیار کرے تاکہ اسلامی مدارس میں تدریسی کتابوں کا خلا پورا

ہوسکے۔

کانفرنس پہلی ذی القعدہ (۲۴ اکتوبر ۱۹۷۶) کو شروع ہوئی تھی۔ پہلے اجلاس کا افتتاح سعودی ولی عہد الامیر فہد بن عبد العزیز نے کیا۔ انھوں نے کانفرنس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان کا ملک اس کانفرنس کی قراردادوں کو نافذ کرنے کے لئے تیار ہے۔ دوسرے دن کانفرنس کے اعضاکو (جو کہ ۲۶ ملکوں سے آئے تھے) چار کمیٹیوں میں تقسیم کردیا گیا۔ پہلی کمیٹی نے کانفرنس کے ایجنڈا کے مندرجہ ذیل مسائل پر غور کیا:

اسلامی شریعت کی تطبیق ہر زمان ومکان کے لئے واجب ہے۔

شریعت کے بارے میں پیدا کئے ہوئے شبہات۔

مسئلہ جہاد۔

دوسری کمیٹی

اسلام میں نظام قضاء (عدالت)

حدود شرعیہ کی تطبیق کا سوسائٹی کے امن واستقرار پر اثر

مساء الاثنين ۲/۱۱/۱۳۹۶ھ

● كلمة سماحة الشيخ عبد العزيز بن باز

محاضرتان عنوانها : « وجوب تطبيق الشريعة الإسلامية في كل زمان ومكان » لكل من الاستاذ : الدكتور عبدالسلام الترمانيني ، والاستاذ وحيدالدين خان .

مساء الثلاثاء ۳ / ۱۱ / ۱۳۹٦ ھ

● كلمة لسماحة الشيخ عبدالله بن حميد ٠

● محاضرة للاستاذ جمال المرصفاوي « نظام القضاء في الإسلام »

مساء الخميس ٥ / ۱۱ / ۱۳۹٦ ھ

● محاضرتين بعنوان « الغزو الفكري والتيارات المعادية للاسلام » لكل من الدكتور « عبد الستار السعيد » والدكتور المهدي بن عبود .

تیسری کمیٹی

سوسائٹی کے لئے اسلام کا اقتصادی نظام

اسلامی بینک نظریہ و تطبیق میں۔

چوتھی کمیٹی

ذرائع ابلاغ اور ان کا اسلامی قدروں کے پھیلانے اور محفوظ رکھنے میں اثر۔

اسلامی تعلیم کا سوسائٹی پر اثر۔

فکری اور اسلام دشمن حملے۔

اگلے چار دنوں تک کمیٹیوں نے صبح کے جلسوں میں الگ الگ اپنے موضوعات پر بحث کی اور اپنی قراردادوں کو قرارداد تیار کرنے والی کمیٹی کے حوالے کر دیا اور عمرہ و زیارت مسجد نبوی کے راغبین نے فوجی جہازوں کے ذریعہ یہ سعادت حاصل کی۔ شام کے جلسوں کو عام اجتماعات کے لئے رکھا گیا تھا جس میں تمام اعضاء اور سعودی یونیورسٹیوں کے طلبا و اساتذہ اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے لوگ شریک ہوتے تھے۔ موصول ہونے والے مقالات میں سے پانچ مقالات کو اس موقع پر پڑھنے کے لئے منتخب کیا گیا۔

پہلے دن کے اجلاس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کا مقالہ تھا جو کہ بعض مصروفیات کی وجہ سے کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم انھوں نے اپنا مقالہ بھیج دیا تھا۔ ان کی نیابت میں راقم الحروف نے یہ مقالہ پڑھا۔ یہ مقالہ، جس کا عنوان وجوب تطبیق الشریعۃ الاسلامیہ فی کل زمان و مکان تھا کانفرنس میں پیش ہونے والا سب سے عمدہ مقالہ تسلیم کیا گیا۔ مقالہ ختم ہونے کے بعد لوگ اس کی مطبوعہ کاپیاں حاصل کرنے کے لئے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی دیر میں سارا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والے اعضاء نے بکثرت مجھ سے ملاقات کی اور مقالے کو سراہتے ہوئے مولانا موصوف کو اپنی عقیدت و سلام پہنچانے کی مجھ سے درخواست کی۔ عزوز الرباعی (ڈائرکٹر جنرل الدار التونسیۃ للنشر جو کہ تونس کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے) نے کہا کہ یہ مقالہ اس پورے سال کا سب سے عمدہ مقالہ تھا (ھذا اعظم بحث لھذہ السنۃ) ترکی کے نمائندے محمد امین سراج نے کہا کہ "خدا کی قسم تم نے اس مقالہ سے ہمارے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائی" (واللہ انک فد اثلجت

صدور نابهذا البحث) دوسرے لوگ جنھوں نے مقالہ کو سراہا اور سلام پہنچانے کو کہا ان میں سے کچھ نام یہ ہیں:

احمد الحمانی (الجزائر کی وزارت امور دینیہ میں المجلس الاسلامی الاعلیٰ کے ڈائرکٹر) محمد صلاح الدین المستاوی (ایڈیٹر جوہر الاسلام۔ تونس) ڈاکٹر محسن عبد الحمید (پروفیسر بغداد یونیورسٹی)۔ مصر کے ڈاکٹر احمد شلبی۔ انور الجندی۔ رجب البنا (الاہرام) ڈاکٹر عبد الصبور شاہین۔ ڈاکٹر عبد اللہ شحاتہ، ڈاکٹر علی محمد جریشہ، ڈاکٹر محمد احمد عاشور (ایڈیٹر الاعتصام)۔ کویت کے ڈاکٹر جمال الدین عطیہ (ایڈیٹر المسلم المعاصر) زین الدین الرکابی (ایڈیٹر المجتمع) عبد الرحمٰن الولایتی (ایڈیٹر البلاغ)۔ عبد اللہ العقیل (ڈائرکٹر امور اسلامیہ وزارت اوقاف)۔ سعودیہ کے شیخ محمد محمود الصواف (رابطہ عالم اسلامی) شیخ ابوبکر الجزائری (استاد مدینہ اسلامی یونیورسٹی) احمد محمد جمال (عضو مجلس الشوریٰ) مراکش سے عبد الرحیم بن سلامہ (صدر جمعیۃ التضامن الاسلامی) ڈاکٹر عبد المنعم البدراوی (پروفیسر معہد الادارۃ الوطنی) ترکی سے پروفیسر اسماعیل حقی اور ڈاکٹر مصطفیٰ بیلکا۔ امریکا سے عمر فاروق عبد اللہ (شکاگو یونیورسٹی)۔ جامعۃ الامام محمد بن سعود اور مدینہ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ وطلبا نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ ہم شیخ وحید الدین خاں کی کتابوں کے ذریعہ اپنے ملکوں میں الحادی اور کمیونسٹ خطرات کا مقابلہ کر رہے ہیں اور ایسی ہی کتابیں موجودہ دنیا میں اسلام کو پیش کرسکتی ہیں۔

سعودی ذرائع ابلاغ (اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن) نے خصوصیت سے مقالہ کا ذکر کیا۔ اور قاہرہ کے روزنامہ الاہرام نے اپنی ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۶ کی اشاعت میں مقالہ کا واضح خلاصہ پیش کیا۔ انشاء اللہ آئندہ اس مقالہ کا اردو ترجمہ الرسالہ میں شائع کیا جائے گا۔ عربی زبان میں کئی جرائد اس کو شائع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابچہ کی شکل میں وہ قاہرہ سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ کانفرنس میں ہندستان سے بلائے جانے والے نمائندے یہ تھے۔

۱ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

۲ مولانا سید اسعد مدنی

۳ مولانا سعید الرحمٰن ندوی

۴ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

۵ مولانا وحید الدین خاں

ان میں اول الذکر اور دونوں آخر الذکر شریک نہ ہو سکے جس کا کانفرنس کے اعضا، کو شدید افسوس رہا۔ کانفرنس کے ساتھ ساتھ جامعۃ الامام محمد بن سعود نے اسلامی کتابوں کی نمائش کا بھی انتظام کیا تھا جس میں ۱۶ ملکوں کے ناشرین نے شرکت کی۔

کانفرنس اپنی جگہ بہت اہم تھی اور عمدہ اور طویل تیاریوں کی وجہ سے مکمل طور سے منظم و پرسکون تھی۔ سعودی عرب کے ممتاز اسلامی ہفت روزہ " الدعوۃ " نے اس کانفرنس کو لقاء قمۃ علی المستوی الفکری (اسلامی فکر کی چوٹی کانفرنس) سے تعبیر کیا۔

کانفرنس کے آخر میں ہم لوگوں نے اصرار کر کے یہ قرارداد بھی پاس کی کہ جامعۃ الامام محمد بن سعود میں کانفرنس کا مستقل آفس کھولا جائے جس کی ذمہ داری قراردادوں کو نافذ کرنا اور کرانا ہو۔ جامعہ کے ذمہ داروں سے مجھے یہ احساس ملا کہ وہ لوگ عزم صادق سے اس امانت کو نبھانے والے ہیں۔

ایک سفر

لندن میں ایک علمی ادارہ ہے جس کا نام ہے مسلم انسٹی ٹیوٹ۔ اس ادارہ کے تحت لندن میں حج کے موضوع پر ایک بین اقوامی سمینار (۴ تا ۷ اگست ۱۹۸۲) ہوا۔ اس سمینار میں شرکت کے لئے مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں لندن کا سفر ہوا۔ اگرچہ مجھے ایک مہینہ کا ویزا ملا تھا اور وہاں بہت سے دوستوں نیز اسلامی اداروں کی طرف سے تقاضا ہوا کہ میں زیادہ مدت تک قیام کروں۔ مگر بعض ضرورتوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ میں واپس آنا پڑا۔

اگست ۱۹۸۲ء کی پہلی تاریخ تھی۔ برٹش ایرویز کا ہوائی جہاز مجھ کو لے کر دہلی سے بارہ ہزار کیلومیٹر دور لندن کی طرف جا رہا تھا۔ زمین کی اونچ نیچ سے بے نیاز ہو کر وہ ایک ہزار کیلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا "یہ خدا کا کیسا عجیب احسان ہے کہ اس نے انسان کے قابو میں ایسی سواری دے دی جس کو رواں کرنے کے لئے دریاؤں پر پل بنانے کی ضرورت نہیں۔ جس کی راہ میں پہاڑ اور سمندر حائل نہیں ہوتے۔ آبادیوں کی ناہمواریاں جس کا راستہ نہیں روکتیں۔ وہ زمین کا سہارا لئے بغیر ہوا کے دوش پر اِدھر سے اُدھر اڑتا ہے اور تمام سواریوں سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آدمی کو اس کی منزل پر پہنچا دیتا ہے۔

تاہم عام ذوق کے خلاف میرے لئے ہوائی جہاز کوئی پسندیدہ سواری نہیں۔ جب بھی میں ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اڑن جیل میں بند ہو گیا ہوں۔ میری طبیعت میں آزادی پسندی بہت زیادہ ہے۔ ایسی کوئی زندگی مجھے عذاب معلوم ہوتی ہے جس میں میرے اوپر خارجی پابندیاں لگی ہوئی ہوں۔ خواہ اس پابندی کا مقام کوئی شاندار محل ہی کیوں نہ ہو۔ ہوائی جہاز کی اس ایک خصوصیت کے سوا کہ وہ تیزی سے سفر طے کرا دیتا ہے، باقی ہر چیز میرے ذوق کے خلاف ہے۔ آپ کار میں چل رہے ہوں تو اس کو کسی بھی جگہ روک کر باہر آ سکتے ہیں۔ ٹرین میں یہ نفسیاتی اطمینان ہوتا ہے کہ ضرورت ہو تو زنجیر کھینچ کر ٹرین کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر ہوائی جہاز کے اندر داخل ہونے کے بعد بس "زنجیر" میں بندھ جانا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی اعلان کر دے کہ منزل آ گئی، اب آپ باہر نکلنے کے لئے آزاد ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر خوبی جھوٹی ہے، کیونکہ ہر خوبی کے ساتھ کوئی خرابی لگی ہوئی ہے۔ یہاں کا ہوائی سفر بھی جھوٹا ہے اور یہاں کا زمینی عیش بھی جھوٹا۔ لوگ جھوٹی تسکین کے حصول کے لئے اپنی ساری طاقت ضائع کر رہے ہیں۔ اور جب زندگی اپنے انجام کو پہنچتی ہے اور سچی تسکین کا وقت آتا ہے تو معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے اندر وہ طاقت اور صلاحیت ہی نہیں کہ وہ سچی خوشی سے لطف اندوز ہوسکیں۔

ہمارا پہلا ٹھہراؤ دبئی تھا۔ یہاں ایک گھنٹہ کا موقع تھا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ واحد تاثر جو ذہن نے قبول کیا وہ یہ کہ آج کی دنیا تہذیب کی دنیا ہے۔ دبئی بظاہر ایک مسلم ملک ہے۔ مگر یہاں، دوسری ہر جگہ کی طرح، تمام چیزیں مغربی انداز میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ تعمیر، لباس، سواری، فرنیچر، آرائش، غرض کوئی چیز ایسی نہیں جس پر مغربی چھاپ کا نشان نظر نہ آتا ہو۔ ایسی حالت میں احیاء اسلام کی جدوجہد کا آغاز تہذیب کے میدان میں انقلاب کی جدوجہد سے ہوگا نہ کہ سیاست کے میدان میں انقلاب کی دوڑ لگانے سے۔ سیاست زندگی کا آخری نقطہ ہے اور آخری نقطہ پر آپ اپنے سفر کا پہلا قدم نہیں رکھ سکتے۔

ہمارا دوسرا ٹھہراؤ کویت تھا۔ یہاں جہاز تقریباً ایک گھنٹہ رکا۔ دبئی سے کویت کی پرواز تمام کی تمام سمندر (خلیج عرب) کے اوپر سے ہوتی ہے۔ ہمارا جہاز ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ نیچے سمندر کی سطح پر جگہ جگہ سمندری جہاز چل رہے تھے۔ بظاہر دونوں بالکل دو قسم کی سواریاں ہیں۔ مگر حقیقۃً دونوں ایک ہیں۔ دونوں کے دونوں تیر رہے ہیں۔ ایک ہوا کی سطح پر تیر رہا ہے اور دوسرا پانی کی سطح پر۔

ہوائی جہاز میں مسافروں کی رہنمائی کے لئے جگہ جگہ اندراجات ہیں۔ یہ اندراجات انگریزی کے ساتھ عربی میں بھی نظر آئے۔ مثلاً انگریزی زبان میں لکھا ہوا ہے No Smoking تو عربی زبان میں اس کے ساتھ ممنوع التدخین بھی درج ہے۔ انگریزی میں (Please lock Door) درج ہے تو عربی میں الرجاء قفل الباب ہے۔ انگریزی میں Waste Disposal ہے تو عربی میں رمی الفضلات۔ اسی طرح کویت میں مسافروں کے درمیان روزانہ اخبارات تقسیم ہوئے تو انگریزی گارجین کے ساتھ السیاسۃ (کویت کا عربی اخبار) بھی تقسیم کیا گیا۔ یہ گویا عرب دنیا کی اس اہمیت کا اعتراف تھا جو تیل کی دولت کے نتیجہ میں اسے حاصل ہوئی ہے۔

دہلی سے کویت تک جہاز کی بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ کویت میں کثیر تعداد میں عرب مرد اور عرب عورتیں جہاز میں سوار ہوئیں اور تمام سیٹیں بھر گئیں۔ یہ سارے لوگ لندن جا رہے تھے۔ میرے قریب کی سیٹ پر ایک غیر مسلم تھے جو لندن کے باشندہ ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا "عرب مرد اور عورتیں اتنی بڑی تعداد میں کس لئے لندن جاتے ہیں" ان کا مختصر جواب یہ تھا: خرید و فروخت اور تفریح کے لیے۔

عرب ملکوں کو جدید دنیا میں جو اہمیت حاصل ہوئی ہے وہ تیل کی قدرتی دولت کی وجہ سے ہے

نہ کہ کسی ذاتی صلاحیت کی وجہ سے۔ تیل کی دریافت بالکل "جدید" دریافت نہیں ہے۔ تیل کے چشمے قدیم زمانہ میں بھی زمین کی سطح پر جگہ جگہ بہہ پڑے تھے اور انسان ابتدائی طور پر معدنی تیل سے واقف تھا۔ مگر قدیم زمانہ میں کار اور ہوائی جہاز اور دوسری مشینی چیزیں وجود میں نہ آئی تھیں جو تیل کے ایندھن سے متحرک ہوتی ہیں۔ تیل کی اہمیت اسی وقت ہے جب کہ مشینی صنعت کا دور وجود میں آچکا ہو۔ مشینی صنعت کے بغیر تیل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں کس طرح ایک چیز کی اہمیت دوسری چیز کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

ہوائی جہاز میں مسافروں کے لئے گانے اور موسیقی کا انتظام ہوتا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ لاوڈ اسپیکر پر ریکارڈ بجا کر سب کا سکون برباد کیا جا رہا ہو۔ بلکہ یہ کام ایک خاموش انتظام کے تحت ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی طرف سے کان میں لگانے کا ایک خاص آلہ دیا جاتا ہے جس کو ہیڈسیٹ (headset) کہتے ہیں۔ اس کا ایک حصہ ڈاکٹروں کے اسٹتھ اسکوپ کی طرح کان میں لگا کر دوسرا حصہ کرسی کے ہتھے میں بنے ہوئے خانہ میں جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد فوراً ہی گانے اور موسیقی کی آواز کان میں آنا شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ ہوتا ہے کہ جو شخص سننا چاہتا ہے وہی سنتا ہے اور جو نہیں سننا چاہتا اس کے کان اس طرح اس سے محفوظ رہتے ہیں گویا یہاں گانے اور موسیقی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ ایک ایر ہوسٹس کو مجھے ایک ہوائی ہدایت کی طرف متوجہ کرنا تھا جس کی، اس کے خیال کے مطابق، میں "خلاف ورزی" کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو اس کا پہلا جملہ یہ تھا : Excuse me please یعنی یہ کہنے کے لئے مجھے معاف کیجئے ۔۔۔۔

یہ دو مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدید تہذیب نے کس قسم کے آداب کو دنیا میں رواج دیا ہے۔ یہ آداب دو متعین اصولوں پر قائم ہیں : اپنی ذات کی تکمیل، مگر اس طرح کہ دوسرے کی ذات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

دہلی سے لندن کا سفر ۱۳ گھنٹے کا تھا۔ دہلی سے ہم صبح ۶ بجے روانہ ہوئے تھے۔ گویا جب ہم لندن پہنچے تو ہندستانی وقت کے لحاظ سے شام کے ۷ بج چکے تھے۔ دہلی سے میں فجر کی نماز پڑھ کر روانہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے لندن میں پہنچتے ہی مجھ پر مغرب کا وقت آجانا چاہئے تھا۔ مگر میں لندن میں پہنچا تو غروب آفتاب میں ابھی تقریباً پانچ گھنٹے باقی تھے۔ لندن کا وقت، ہندستان کے لحاظ سے تقریباً پانچ گھنٹے پیچھے ہے۔ چنانچہ لندن پہنچ کر میں نے اطمینان کے ساتھ عصر کی نماز ادا کی۔ اور پہلی اگست کو وہاں مغرب کی نماز اس وقت پڑھی جبکہ دہلی والوں کی گھڑی میں رات کا ایک بج رہا تھا۔

کامن ویلتھ کے باشندوں کے لئے باہمی سفر میں پیشگی ویزالینا ضروری نہیں۔ ان کا ویزا (انٹری سرٹیفکٹ) مقام پر پہنچ کر ہوائی اڈہ پر بن جاتا ہے۔ ہوائی جہاز سے باہر آنے کے بعد سب سے پہلے میں متعلقہ کاونٹر پر پہنچا۔ وہاں ایک انگریز نوجوان تھا۔ اس نے میرا پاسپورٹ اور لندن کے میزبان کی طرف سے میرے نام دعوت نامہ دیکھا۔ اس کے بعد پوچھا کیا انگریزی میں بول سکتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کچھ مختصر سوال کئے اور چند منٹ میں ضروری اندراجات کر کے پاسپورٹ اور کاغذات میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "شکریہ"

اس کے بعد دوسرا کام یہ تھا کہ اپنا وہ سامان لگیج سے حاصل کروں جس کو میں نے دہلی میں برٹش ایرویز کے حوالے کیا تھا۔ بین اقوامی ہوائی اڈوں پر یہ قاعدہ ہے کہ سامان ہوائی جہاز سے اتار کر ایک پٹی (Conveyor Belt) پر رکھ دیا جاتا ہے جو گھوم گھوم کر لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہے۔ مسافر کھڑے رہتے ہیں۔ اور اپنا اپنا سامان پہچان کر اس سے اتار لیتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں سامان ہوتا ہے۔ ہوائی اڈہ کا کوئی آدمی وہاں نگرانی کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا سامان لے کر روانہ ہو جائے۔ ہر آدمی صرف اپنا سامان اتارتا ہے اور اس کو ایک خاص طرح کی گاڑی پر رکھ کر باہر آجاتا ہے۔ میں نے بھی اپنا سامان لے لیا اور باہر نکل آیا۔

اس دیانت داری کا راز بے نیازی ہے۔ یہ تمام مسافر خوش حال ہوتے ہیں۔ ان کو کسی دوسرے کا بکس یا کسی کا بیگ چرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ویسا ہی یا اس سے اچھا ان کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی اخلاقی خرابیاں غربت اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور غربت اور جہالت کو دور کر کے انھیں بآسانی ختم کیا جا سکتا ہے۔

جدید طرز کی عمارتوں والے شہر کو دیکھ کر کوئی شخص لندن اترے تو وہاں کی سڑکوں پر چلتے ہوئے اس کا فوری احساس یہ ہوگا کہ وہ ایک ایسے شہر میں چل رہا ہے جو جدید تمدنی معیار سے پیچھے ہے۔ یہاں کے مکانات عام طور پر قدیم انداز کے ہوتے ہیں۔ جدید عمارتوں کی دنیا میں لندن قدیم عمارتوں کا شہر ہے۔

لندن کی سڑکوں کے دونوں طرف قدیم طرز کے مکانات کا منظر عام ہے۔ مگر خود سڑکوں کا حال یہ ہے کہ ان پر ہر وقت انتہائی جدید طرز کی کاروں کا سیلاب بہتا رہتا ہے۔ آدمی یہاں سفر کرتے ہوئے ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ دو طرفہ کھڑے ہوئے قدیم ماحول میں ایک جدید سفر کر رہا ہے یا دوسرے درجہ کے ایک شہر میں اول درجہ کی سواری پر رواں دواں ہے۔ دوسری طرف عرب شہروں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ماڈرن عمارتوں اور شاندار کاروں کے ساتھ یہ منظر پیش کرتے ہیں جیسے کہ انھوں نے "جدید" کو لینے کے شوق میں اپنی

"قدامت" کو سراسر خیرباد کہہ دیا ہے۔ جب کہ لندن کا تمدنی ماحول اپنی خاموش زبان میں یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس نے جدید کو ضرور لیا ہے۔ مگر اس نے جدید کو اس طرح لیا ہے کہ اس کی قدامت اس سے چھوٹنے نہ پائے۔

۳ اگست کو مندوبین کا قافلہ لندن کو دیکھنے کے لئے پورے شہر میں گھمایا گیا، ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ یہاں کی کئی چیزیں اس سے کم "عظیم" ہیں جتنا کہ پڑھ کر یا سن کر ہم نے سمجھ لیا تھا، مشہور بگ بین ٹاور بظاہر دیکھنے میں صرف چھوٹا بین ٹاور معلوم ہوا۔ بکنگھم پیلیس نئی دہلی کے راشٹرپتی بھون کے مقابلہ میں معمولی نظر آیا۔ اسی طرح یہاں کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت نئی دہلی کے پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت کے مقابلہ میں غیر اہم دکھائی دی۔ البتہ ہائیڈ پارک کافی بڑا تھا، اس سے بھی بہت بڑا جو تصوراتی طور پر ہم نے سمجھ رکھا تھا۔

انگریز اپنے ماضی کی روایات کا بے حد احترام کرتے ہیں اور ان کو باقی رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ان کا یہ مزاج ان کی قومی زندگی کا بہت بڑا اثاثہ ہے۔ قوموں کے اندر کردار پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے درمیان کوئی مشترکہ عقیدہ ہو جس کی غیر مشروط وفاداری ہر ایک کا جزو ایمان بنی ہوئی ہو۔ زندہ اسلامی معاشرہ میں خدا کا عقیدہ یہی فعل انجام دیتا ہے۔ انگریز اپنے ماضی کی روایات کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا ماضی خود اپنے تسلسل کے نتیجہ میں ان کے درمیان موجود ہے۔ اگر وہ کوئی نیا اجتماعی عقیدہ بنائیں اور ماضی کی روایات کو توڑ کر نئے عقیدہ کو اس کی جگہ رائج کرنا چاہیں تو قدیم کا تقدس تو ضرور ٹوٹ جائے گا مگر جدید کا تقدس قائم ہونا سخت مشتبہ رہے گا۔ اس کا زندہ نمونہ ہندستان اور پاکستان کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں یہ اندیشہ اپنی بدترین صورت میں واقعہ بن چکا ہے۔ کسی مفکر نے صحیح کہا ہے کہ زندگی میں ایک چھوٹی سی روایت بھی لمبی تاریخ کے بعد قائم ہوتی ہے:

It requires a lot of history to make a little tradition.

لندن میں پانچ لاکھ سکھ ہیں۔ ان کے تقریباً دو سو گوردوارے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد بھی لندن میں تقریباً پانچ لاکھ اور پورے برطانیہ میں تقریباً ۲۵ لاکھ ہے۔ ان میں سے ۵ ہزار نومسلم ہیں۔ لندن میں تقریباً سو مسجدیں ہیں اور پورے برطانیہ میں تقریباً چھ سو۔ یہ سب لوگ یہاں کی اصطلاح میں ایشیائی کہے جاتے ہیں۔ یہ بظاہر مختلف مذہب کے لوگ ہیں۔ مگر ان کے مسائل مشترک ہیں: اپنے تشخص (identity) کو کس طرح برقرار رکھا جائے۔ ان کے درمیان کمیونٹی سنٹر اور مذہبی سنٹر کی مقبولیت کی ایک خاص نفسیاتی وجہ یہی ہے۔

باہر سے جو مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے ہیں ان میں جو حساس ہیں ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کا مسئلہ ہے۔ یہ بچے یا تو مقامی بچوں کی طرح بالکل آزاد ہو رہے ہیں۔

اور اگر ان کے گھر کا دباؤ ان پر شدید ہو تو ان کے اندر دوہری شخصیت پرورش پا رہی ہے۔ ایک وہ جو ان کے ماں باپ ان کے اندر اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری وہ جو اسکول اور ٹیلی وژن اور ماحول کے اثر سے ان کے اندر پیدا ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کا واحد فائدہ جن لوگوں کے حصہ میں آیا ہے وہ مذہبی پیشوا اور قائدین ہیں۔ اس کی وجہ سے ان لوگوں کو ایک نیا شاندار مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ لندن میں اور اس طرح کے دوسرے ملکوں میں بیرونی باشندے جو اپنے پردیسی ماحول میں "اجنبیت" کے مسئلہ سے دوچار ہیں، وہ مایوسانہ تدبیر کے طور پر اپنے وطن سے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بلاتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے اپنے کچھ مذہبی جلسے یا قومی تقریبات منا کر یہ تسکین حاصل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے تشخص کو قائم رکھنے کا کافی انتظام کر لیا ہے۔ اس طرح کی وقتی اور نمائشی چیزوں سے اصل مسئلہ تو حل نہیں ہوتا البتہ ان کے پیشواؤں کو اس چیز کا موقع مل جاتا ہے جس کو ایک شخص نے بجا طور پر جھوٹی امیدوں کی تجارت (False Hopes Business) کہا ہے۔

انگلستان میں اور دوسرے مغربی ممالک میں بعض مسائل نہایت عجیب ہیں۔ مثلاً یہاں کتا آدمی کے مقابلہ میں زیادہ قابل لحاظ ہے۔ بے کار کتوں کے لئے کتا گھر (Dogs'Home) بنے ہوئے ہیں جیسے ہندستان میں ناکارہ گایوں کے لئے گوشالے بنائے جاتے ہیں۔ تاہم یہاں کے کتا گھر اتنے اعلیٰ اور صاف ستھرے ہوتے ہیں کہ ہندستان کے گوشالوں سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔

یہاں کے مالک مکان ایسے شخص کو اپنا مکان کرایہ پر دینے میں متردد ہوتے ہیں جن کے ساتھ کئی بچے ہوں اس کے مقابلہ میں وہ ایسے جوڑے کو کرایہ کا مکان دینے پر راضی ہو جاتے ہیں جن کے درمیان تیسرا صرف ایک کتا ہو۔ ان کا خیال ہے کہ کتا انسان کے بچوں سے زیادہ مہذب ہوتا ہے۔ بچے مکان کو خراب کرتے ہیں جب کہ کتے کے متعلق اطمینان ہے کہ وہ اس طرح رہے گا کہ مکان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے۔

لندن میں سو سے کچھ اوپر مسجدیں ہیں۔ یہ مسجدیں زیادہ تر رہائشی مکانات کے کمروں میں قائم کی گئی ہیں۔ البتہ پارک روڈ پر ایک باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی ہے جو کافی وسیع اور شاندار ہے اور اس کے ساتھ کلچرل سنٹر بھی قائم ہے۔ یہاں میں نے ۳ اگست کو عصر کی نماز پڑھی۔

مرکزی لندن کے ایک ہوٹل میں ہمارے لئے قیام کا انتظام تھا، اس میں ایک بڑا کمرہ نماز کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ یہاں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی تھی، مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کے مسلک بھی الگ الگ تھے۔ کوئی ایک ہاتھ کان پر رکھ کر اذان دیتا تھا اور کوئی دونوں ہاتھ۔ کوئی ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھتا تھا کوئی ہاتھ باندھ کر۔ کوئی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرتا تھا اور کوئی بغیر دعا کے نماز

ختم کر دیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان اختلافی مسائل پر یہاں نہ کوئی بحث ہوتی تھی اور نہ اختلاف۔ ہر ایک دوسرے کے مسلک پر اعتراض کیے بغیر اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھتا اور پھر باہم اس طرح ملتا جیسے ان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ "مغربی علمار" ان "مشرقی علمار" سے بہتر ہیں جو انھیں امور پر باہم لڑتے رہتے ہیں حتیٰ کہ دینی مسجدیں اور مدرسے الگ الگ بنا لیتے ہیں۔ یہ در اصل میدان اختلاف میں فرق کا سوال ہے نہ کہ خود اختلاف کا۔ مشرقی علما جب کسی مختلف مسلک والے آدمی پر تنقید کرتے ہیں تو وہ کفر و فسق کی اصطلاحوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مغربی تعلیم یافتہ لوگ اس معاملہ میں اپنے مغربی اساتذہ کی نقل کرتے ہیں، وہ اپنی اختلافی شدت کو حسین الفاظ اور خوبصورت اصطلاحات میں چھپا لیتے ہیں۔

ایک نوجوان جو ملیشیا سے آئے تھے۔ جوش و خروش کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ ہم ملیشیا میں ایران کی اسلامی حکومت کے حق میں عوامی رائے کو موبلائز کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بعض اسلامی جماعتیں جن کو مخالف اسلام حکومتوں سے مدد ملتی ہے وہ ہم کو اس سے روکتی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کے اپنے ملک میں خود بہت سے اہم دینی مسائل ہیں، پھر آپ ان میں اپنی طاقت صرف کیجئے۔ آپ کو باہر کے مسائل میں اتنا زیادہ اپنے کو شامل کرنے کی کیا ضرورت۔ ان کا جواب یہ تھا: دنیا کی واحد اسلامی حکومت پر طاغوتی طاقتیں حملہ کر رہی ہیں پھر ہم خاموش کس طرح رہ سکتے ہیں۔

اس واقعہ کا ذکر میں نے ڈاکٹر اشفاق احمد صاحب (آسٹریلیا) سے کیا۔ انھوں نے بہت عمدہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ اصل مسئلہ آدمی کی نفسیات (Psyche) کا ہے۔ اور نفسیات صرف دو قسم کی ہوتی ہے یا دنیوی یا اخروی۔ آدمی کی نفسیات اگر دنیوی طرز کی ہے تو وہ انھیں مسائل کو اہمیت دے گا جن میں کوئی دنیوی یا سیاسی پہلو ہو۔ وہ ان مسائل کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتا جو اپنے اندر اخروی پہلو رکھتے ہیں۔ آپ کو سب سے پہلے لوگوں کی نفسیات بدلنی چاہیے۔ اس کے بعد ہی وہ صحیح اسلامی طرز کو اختیار کر سکتے ہیں۔

۷ اگست کو ہم نے جمعہ کی نماز پارک روڈ پر لندن کی جامع مسجد میں پڑھی۔ کافی بڑی مسجد ہے۔ نمازیوں کی کثرت سے اس کے تمام گوشے بھرے ہوئے تھے۔ منبر کی طویل عربی تقریر دہلی کی جامع مسجد کی اردو تقریروں سے کچھ مختلف نظر نہیں آئی۔ اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں مسلمانوں پر ہندستانی ظلم کے خلاف واویلا ہوتا ہے اور وہاں فلسطینیوں پر یہودی ظلم کے خلاف واویلا کیا جا رہا تھا۔

نماز ادا کر کے ہم لوگ باہر نکلے تو ایرانیوں کی ایک جماعت سڑک کے کنارے مسجد کے گیٹ کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ایک صاحب مجتہد والے لباس میں تھے اور بقیہ مغربی لباس میں۔ یہ لوگ مسلسل نعرے لگا رہے

INTERNATIONAL HAJJ SEMINAR AND

HAJJ EXHIBITION

LONDON 4–7 AUGUST 1982

11am–7pm

لبيك اللهم لبيك



A UNIQUE OPPORTUNITY

for Muslim children during school holidays
to see films of Makkah, Medina and the Hajj as well as
slides depicting the world of Islam.

You and your children can also see
an exhibition of photographs, sketches and books on Islam.

Admission 50p Children 20p

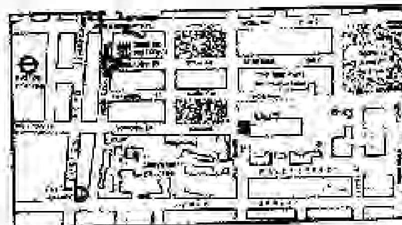
SATURDAY, AUGUST 7, 1982 WILL BE A PUBLIC DAY AT THE SEMINAR 2.30 – 6.30pm.

Speakers in English, Arabic and Urdu will include:

Maulana Waheeduddin Khan, *a scholar from Delhi, India.*
Mohammad Salahuddin, *Editor, Jasarat, Karachi, Pakistan.*
Altaf Hassan Qureshi, *Editor, Urdu Digest, Lahore, Pakistan.*
Hujjat-al-Islam Mohammed Husain Fadallallah, *a leading scholar from Lebanon.*
Professor Syed Salman Nadvi
Al-Haj Sheikh Toure, *a scholar of eminence from Senegal.*
Fatima Heeren, *a German Muslim author and journalist.*

at the
INSTITUTE OF EDUCATION
Bedford Way, London WC1

Tube: *Russell Square, Euston Square & Euston*





Arranged by
THE MUSLIM INSTITUTE
6 Endsleigh Street London WC1H 0DS

تھے۔بہت سے لوگوں کے بیک وقت بولنے کی وجہ سے اتنا شور ہو رہا تھا کہ ان کے الفاظ سمجھنے میں مجھے دیر لگی۔ان کے نعرے یہ تھے:

اللہ اکبر خمینی رہبر۔مرگ بر منافق۔مرگ بر امریکہ۔حزب فقط حزب اللہ رہبر فقط روح اللہ۔لا شرقیہ لا غربیہ جمہوریہ اسلامیہ

یہ لوگ اچھل رہے تھے، ہاتھ پھینک رہے تھے اور چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے۔دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔مگر جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے، مجھے ان کے چہروں پر دینی سنجیدگی نظر نہ آئی۔میں نے سوچا: آج اگر صحابہ کرام ہوتے تو کیا وہ اسی طرح عمل کرتے۔

میرا مقالہ (حج کی دعوتی اہمیت) ۶ اگست ۱۹۸۲ کو صبح کی نشست میں تھا۔میں اپنا مقالہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تیار کر کے لے گیا تھا۔مگر وہاں ایک قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اردو جانتے اور سمجھتے تھے۔نیز تقریر کے ساتھ فوری ترجمہ کا عمدہ انتظام تھا۔اس لئے میں نے اپنا مقالہ اردو میں پڑھا۔البتہ مقالہ شروع کرنے سے پہلے چند جملے انگریزی میں کہے جن کا خلاصہ یہ تھا:

I am going to present my paper in Urdu. As the Arabic and English versions may be heard on your headsets, I hope you will not mind it.

مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) کی فرمائش پر میں نے دو مضامین تیار کئے تھے۔ایک، حج کے فلسفے کے بارے میں۔اور دوسرا حج کے مسائل پر۔یہ دونوں مقالے (حج کی دعوتی اہمیت، حج کا طریقہ) دو الگ الگ پمفلٹ کی صورت میں انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کر کے تقسیم کئے گئے۔اس کے علاوہ سمینار کے آخری دن ۷ اگست کو میری ایک تقریر ہوئی۔اس تقریر میں حج کے اخلاقی پہلو کی وضاحت کی گئی۔اس تقریر کا انگریزی ترجمہ بھی سائیکلو اسٹائل کر کے تقسیم کیا گیا۔کناڈا کے پندرہ روزہ اخبار (کریسنٹ انٹرنیشنل) نے لندن کے حج سمینار پر جو رپورٹ شائع کی ہے اس کا ایک حصہ علیحدہ صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

۸ اگست ۱۹۸۲ کی صبح کو ۱۰ بجے میں لندن سے واپس روانہ ہوا۔تقریباً ۱۳ گھنٹے کی پرواز کے بعد مجھے رات کو دہلی پہنچ جانا چاہئے تھا۔مگر وقت میں فرق کی وجہ سے یہ ہوا کہ جب میں دہلی پہنچا تو یہاں کی مقامی گھڑیوں میں صبح کے چار بج رہے تھے۔لندن جاتے ہوئے میں نے تقریباً پانچ گھنٹے "حاصل" کئے تھے۔لندن سے واپسی میں میں نے پانچ گھنٹے کھو دئے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر پانے کے لئے آدمی کو کچھ کھونا پڑتا ہے۔اس دنیا میں کھوئے بغیر کسی کے لئے کچھ پانا ممکن نہیں۔

ایک سفر

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ (لیبیا) کی دوسری عالمی کانفرنس ۱۴۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۲ کو طرابلس میں ہوئی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں طرابلس کا سفر ہوا۔ ۱۳ اگست کو میں طرابلس پہنچا اور ۳۰ اگست تک وہاں قیام رہا۔

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے تخیل اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں جو تعارفی کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے، اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

پہلی دعوتی کانفرنس جو طرابلس میں ۱۳ شوال ۱۳۹۰ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہوئی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تاکہ وہ خدا کی طرف اور اس کے سچے دین اسلام کی طرف دعوت دینے کے معاملات کو سنبھالے اور دین اسلام کو آباد دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچائے۔ یہ ایک فرض ہے جو مسلمانوں کے کندھوں پر ان کے بھائیوں کے حق میں ڈالا گیا ہے۔ یہ اسلامی دعوت کی ادائگی ہے جس کی امت اسلامیہ مکلف ہے جو کہ خیر امت ہے اور لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تاکہ وہ انسان کی خدمت کرے جو حیرت کے اندھیروں میں گم ہے اور اسلام کا محتاج ہے۔ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسانیت کو حیرانگی اور گمراہی سے نکالے اور اس کو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرے اور اس کی مشکلات کو حل کرے اور اس کو اس سعادت سے ہم کنار کرے جس کو دنیا کے تمام نظام فراہم کرنے سے عاجز رہے ہیں (عربی سے ترجمہ)

جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے موجودہ ذمہ دار (امین) دکتور محمد احمد الشریف ہیں۔ اس ادارہ کے مقاصد میں سے خاص مقاصد یہ ہیں ـــــ داعی اور استاد تیار کرنا، اسلامی دعوت کے اداروں کو تعاون دینا، قرآن اور دوسری اسلامی کتابیں شائع کرنا۔ جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ نے افریقہ، ایشیا، یورپ، امریکہ، اور آسٹریلیا میں تقریباً ساڑھے تین سو داعی اور اساتذہ بھیجے ہیں۔ ان لوگوں نے مختلف ملکوں میں، ہزاروں آدمیوں کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ جمعیۃ الدعوۃ نے مختلف ممالک میں مسجدیں اور اسلامی مراکز قائم کئے ہیں اور ایک سو سے زیادہ اسلامی اداروں کو گراں قدر امداد فراہم کی ہے، بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں چھاپ کر ساری دنیا میں تقسیم کی گئی ہیں۔ وغیرہ

جمعیۃ الدعوۃ کے تحت ۱۹۷۴ میں ایک تربیتی کالج قائم کیا گیا جس کا نام کلیۃ الدعوۃ الاسلامیہ ہے۔

یہ ادارہ طرابلس میں قائم ہے اور اپنی وسعت کے اعتبار سے ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اس ادارہ کا مقصد یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو اسلام کے ماضی اور حال سے واقف کرایا جائے۔ اسلام کی فکری عظمت اور اس کی عملی افادیت ان کے ذہن پر بٹھائی جائے۔ ایسے داعی تیار کئے جائیں جو دنیا کے مختلف حصوں میں اسلام کی دعوت کا کام کریں۔ اس کلیہ میں تعلیم کی مدت چار سال ہے اور اس میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کے درجہ تک کی ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ اس کا نصاب کلیہ کے مطبوعہ پمفلٹ کے مطابق حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے :

التفسیر وعلوم القرآن، الحدیث وعلوم السنہ، الفقہ الاسلامی، تاریخ التشریع الاسلامی، التاریخ الاسلامی، الاستشراق والتبشیر، حاضر العالم الاسلامی، علم النفس العام، علم الاجتماع، الادیان ومقارنتہا، الفرق الاسلامیہ، التیارات الفکریہ المعاصرہ، التصوف وتاریخہ، علم الاخلاق، الحضارۃ الاسلامیہ، الفلسفۃ الاسلامیہ، علم النفس الاجتماعی، اللغات الاوروبیہ، اللغات الشرقیہ

ہندستان اور طرابلس کے درمیان چھ ہزار کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ہندستان میں "طرابلس" کا لفظ غالباً سب سے پہلے ۱۹۱۱ میں عام ہوا جب کہ اٹلی کی ۴۰ سالہ حکومت نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے لیبی عوام پر مظالم کئے۔ اس وقت ہندستان کے اخبارات نے مضامین لکھے اور شاعروں نے نظمیں کہیں۔ اسی زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور نظم کہی تھی اس کے دو اشعار یہ تھے :

گر ہیں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں　　جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

میں طرابلس ایسے موقع پر پہنچا جب کہ لبنان میں فلسطینی مسلمانوں کے اوپر اسرائیل کے وحشیانہ مظالم (۱۹۸۲) جاری تھے۔ اس کے بعد جس طرح ذلت کے ساتھ فلسطینیوں کو لبنان چھوڑنا پڑا، اس کی چیخ پکار سے تمام عرب اخبارات بھرے ہوئے نظر آئے۔ اگر مذکورہ تقابل کو دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ملت اسلامیہ نے ۱۹۱۱ سے لے کر ۱۹۸۲ تک آگے کی طرف سفر طے نہیں کیا۔ ملت اسلامیہ ستر سال پہلے جس طرح ظالموں کے مقابلہ میں بے بس تھی۔ اسی طرح وہ ستر سال بعد بھی ظالموں کے مقابلہ میں بے بس ہے ـــــ جس ملت کے لئے دور اول میں غلبہ مقدر کیا گیا تھا، کیا بعد کے دور میں اس کے لیے صرف مظلومیت اور مغلوبیت مقدر کر دی گئی ہے۔

دہلی سے لیبیا کے لئے ابھی تک براہ راست ہوائی سروس نہیں ہے۔ ہم نے دہلی سے ایتھنز تک ڈچ ہوائی کمپنی (KLM) کے ذریعہ سفر کیا اور ایتھنز سے طرابلس کے لئے اولمپک ایرویز کے ذریعہ ۔

۱۳ اگست کو ایک دن ایتھنز (یونان) میں قیام رہا۔ یونان کی زمین پر یہ مختصر قیام بڑا عبرت انگیز تھا۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں دور قدیم کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ پیدا ہوئے۔ اسپین کے بعد یہ دوسرا مقام ہے جہاں سے اسلام نے "مغرب" کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ مگر آج انھیں راستوں سے "مغرب" اسلامی دنیا میں داخل ہو رہا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے نفوذ کے لئے قدیم روایتی راستوں کی ضرورت نہیں۔ وہ بے شمار نئے راستوں سے اس طرح عالم اسلام میں گھس رہا ہے کہ اس پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وھم من کل حدب ینسلون

۱۳ اگست کو جب کہ ہم طرابلس سے بہت دور ایک غیر ملک (یونان) میں تھے۔ ہوائی اڈہ کی ایک خاتون آئیں اور ہمارا تعارف حاصل کرنے کے بعد ہم کو خوش آمدید کہا۔ ان کو حکومت لیبیا کی طرف سے ٹیلکس پر ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ہم سے ملیں اور ہماری مدد کریں۔ چنانچہ وہ ہم کو عام ہوائی مسافروں کی صف سے نکال کر ایک خصوصی مہمان خانہ میں لے گئیں۔ یہاں کھانے اور دوسری ضروریات کا اعلیٰ انتظام تھا۔ جب اگلے جہاز کا وقت آیا تو خاتون دوبارہ آئیں اور عام مسافروں سے الگ ایک خصوصی گاڑی پر سوار کر کے ہم کو طرابلس جانے والے جہاز تک پہنچایا۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے آخرت کا معاملہ یاد آگیا۔ جنت میں کسی آدمی کا داخلہ اگرچہ حشر میں حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ مگر حدیث میں بتایا گیا ہے کہ آدمی کا اخروی انجام اس کی موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس پر کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ جب آدمی کے ابدی انجام کا فیصلہ قیامت کے بعد ہوگا تو قیامت سے پہلے کسی آدمی کے لئے اس کا تجربہ کیسے ممکن ہے۔ مذکورہ واقعہ تمثیلی انداز میں اس کا ایک جواب ہے۔ ہماری میزبانی کا اصل مقام اگرچہ براعظم افریقہ کے ایک ملک (لیبیا) میں تھا۔ مگر چونکہ یہ سرکاری میزبانی تھی اس لئے اس کا آغاز بہت پہلے براعظم یورپ کے ایک ملک (یونان) سے شروع ہوگیا جب کہ ابھی ہم میزبان ملک کی سرحد میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے۔

طرابلس میں ایک روز میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں تھا کہ دروازہ باہر سے مقفل ہوگیا۔ یہ کمرے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ نہ باہر کی آواز اندر آئے اور نہ اندر کی آواز باہر جائے۔ ایسی حالت میں دروازہ کو دوبارہ کھلوانے کے لئے مجھے کافی شور و غل کرنا ہوتا۔ مگر مجھے سادہ طور پر صرف یہ کرنا پڑا کہ میں نے انٹرکام پر نمبر 17 کو ڈائل کیا۔ اُدھر سے ہلو کی آواز آئی تو میں نے بتایا کہ میں کمرہ نمبر 48 ۱۱ میں ہوں اور میرا کمرہ باہر سے مقفل ہوگیا ہے۔ چنانچہ ایک منٹ میں ہوٹل کا آدمی آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ ان کے پاس ماسٹر کی ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک ہی کنجی سے پوری منزل کے تمام دروازے کھول سکتے

ہیں ـــــــ جہاں لوگوں کے پاس صرف اپنے اپنے تالے کی کنجیاں ہوں وہاں لوگ اکثر یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ کوئی ایسی شاہ کلید بھی ہوسکتی ہے جس کے ذریعہ ان کے اپنے تالے سمیت تمام تالوں کو کھولا جاسکے۔

ہندستان میں "بائیں چلو" کا اصول ہے اور لیبیا میں "دائیں چلو" کا اصول۔ نئی دہلی کا کوئی آدمی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ طرابلس کی سڑک پر "بائیں چلو" کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔ اسی طرح طرابلس کا ایک آدمی کبھی ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ نئی دہلی کی سڑک پر "دائیں چلو" کے اصول پر عمل کرے اور اپنی گاڑی لے کر دائیں رخ پر دوڑنے لگے۔ سڑکوں کے بارے میں ہر آدمی اس قانون کو جانتا ہے مگر زندگی کے معاملہ میں ہر آدمی اس اصول کو بھول جاتا ہے۔ یہاں ہر آدمی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے کسی "خارجی قانون" کی پابندی کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ذوق کے مطابق خواہ دائیں طرف اپنی زندگی کی گاڑی دوڑائے یا بائیں طرف۔

کانفرنس کا افتتاح ۱۴ اگست کی شام کو ہوا۔ اس کے بعد پانچ روز تک باقاعدہ کارروائی جاری رہی۔ ہر روز کا اجلاس کسی خاص آدمی کی صدارت میں ہوا۔ ایک دن (۱۵ اگست) کی نشست کے لئے راقم الحروف کو صدر جلسہ (یہاں کی اصطلاح میں امین جلسہ) بنایا گیا۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر انگریزی میں کی اور اس میں چند باتیں کہیں۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس وقت دنیا بھر کے مسلمان یہاں ایک چھت کے نیچے جمع ہیں۔ ان کو جس چیز نے یکجا کیا ہے وہ اسلامی دعوت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت ایک ایسا عنوان ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتحاد ہوسکتا ہے۔ پھر کیوں ہم ان عنوانات پر زور آزمائی کریں جن میں مسلمان ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اس کے بجائے ہم کو دعوت کے مقصد کو لے کر آگے بڑھنا چاہئے جو اتحاد و اتفاق پیدا کرتا ہے اور اتحاد و اتفاق بلاشبہ سب سے بڑی قوت ہے۔

کانفرنس کی کارروائی چھ دن جاری رہی۔ پروگرام کی تفصیل مطبوعہ نقشہ کے مطابق حسب ذیل تھی:

۱۴ اگست	الافتتاح
۱۵ اگست	الدعوۃ الاسلامیہ فی عالمنا المعاصر
۱۶ اگست	الدعوۃ الاسلامیہ ومشکلات المسلمین
۱۷ اگست	قضیۃ الحریہ فی العالم الاسلامی
۱۸ اگست	الاسلام وتحدیات العصر
۱۹ اگست	بیان المؤتمر والتوصیات الختامیہ

Brothers and Sisters in Islam

I am very thankful to you for according me the honour of presiding over this international assembly of Muslim scholars and preachers. May God help us to carry out His will.

First, I congratulate Dr M.A.Sharief, and the members of the Jamiat Al-Dawah Al-Islamia for affording us the opportunity of having Muslims from all over the world under one roof, discussing matters of Islamic *da'wah.*

The most obvious lesson of this universal gathering of Muslims is that Islamic *Da'wah* is the most certain base of unity among Muslims. *Da'wah* is the only issue about which there is no controversy among different sects of Muslims; moreover, this is the only field of work where we can enjoy the cooperation of the Muslim rulers of our day. This great conference of Islamic Call is an incontrovertible proof of this.

Let us avail of this opportunity and open a new page of our history, one of unity, of joint effort, and of result-oriented struggle. May Allah bless you and bestow upon you the wisdom which leads to ultimate success and salvation.

Finally, I would request all the learned speakers to observe the time limit(for speech) and in this too, set an example of Islamic discipline.

Now I request Shaikh Dr Mostafa Al-Hamshary to carry on the proceedings.

Presidential address delivered by Maulana Wahiduddin Khan at the Second Islamic Conference, Tripoli, 15th August 1982.

آخری دن کی کارروائی میں اتفاق رائے سے اسلامی دعوت کا کام انجام دینے کے لئے مختلف ملکوں سے ایک عالمی کونسل (مجلس عالمی للدعوۃ الاسلامیہ) بنائی گئی جو اس مؤتمر عام کے لئے مجلس تنفیذی کے طور پر کام کرے گی۔ اس کونسل میں راقم الحروف کا نام شامل کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس عالمی کونسل کا ہر سال کم ازکم ایک اجلاس طرابلس میں ہوا کرے گا۔ اس کے ممبران کی مجموعی تعداد ۳۶ ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو میرا مقالہ تھا۔ میرے مقالہ کے ساتھ عجیب قصہ پیش آیا۔ طرابلس کے سفر سے پہلے مجھے لندن کا سفر کرنا پڑا۔ وہاں سے واپسی کے فوراً بعد طرابلس کے لئے روانگی تھی۔ اس ہنگامی صورت حال کی وجہ سے طرابلس کی کانفرنس کے لئے کوئی مستقل مقالہ تیار کرنے کا موقع نہ تھا۔ لندن کے سفر پر جاتے ہوئے میں نے برادرم مولانا محسن عثمانی ندوی ایم اے کو اپنی مطبوعہ کتاب الاسلام یتحدی دی اور ان سے کہا کہ اس سے معلومات لے کر ایک مقالہ تیار کر دیں۔ انھوں نے مقالہ تیار کیا اور وہ ہندستان کے لیبی سفارت خانہ کی معرفت طرابلس پہنچ کر وہاں سائیکلو اسٹائل بھی ہو گیا۔

میں اسی مقالہ کو لے کر طرابلس پہنچا اور ذہن میں یہ تھا کہ اسی کو وہاں کی کانفرنس میں پڑھنا ہے۔ اس درمیان میں ایسا ہوا کہ میں نے ایک امریکی نومسلم کو ایک دن پہلے یہ مقالہ پڑھنے کے لئے دیا جو عربی زبان اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ یہ تو آپ کی کتاب الاسلام یتحدی کا خلاصہ ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو آدمی جو مقالہ پڑھتے وقت ہال میں موجود ہوں گے ان میں سے بیشتر الاسلام یتحدی کو پڑھ چکے ہیں۔ وہ یقینی طور پر محسوس کریں گے کہ وہی پچھلی بات ان کے سامنے دہرا دی گئی ہے۔

یہ خبر میرے لئے بڑی سخت تھی۔ کیونکہ اگلے ہی دن مقالہ پڑھا جانے والا تھا اور درمیان میں صرف ایک رات کا موقع تھا۔ بہر حال میں نے اللہ کے بھروسہ پر ایک نیا فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ میں ایک نیا مقالہ تیار کروں گا۔ میں نے ذمہ داروں سے نیا مقالہ پڑھے جانے کی اجازت لی۔ اس کے بعد ایک مصری نوجوان کو معاونت کے لئے تیار کیا۔ یہ تھے :

محمد سعید مراد۔ ۱۲ شارع سعید۔ متفرع من شارع طومان بای۔ حلیۃ الزیتون۔ القاہرہ

طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم دونوں فندق باب البحر (طرابلس) کی گیارھویں منزل پر کمرہ نمبر ۱۱۴۸ میں عشاء کی نماز پڑھ کر بیٹھے۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مقالہ کا مضمون میں اپنی ہندستانی عربی میں کہتا اور کبھی کبھی انگریزی میں اس کی تشریح کرتا۔ اس کے بعد محمد سعید مراد مصری اس کو اپنی فصیح عربی میں لکھتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ یہاں تک کہ جب فجر کی اذان ہوئی تو ہمارا مقالہ تیار ہو چکا تھا۔ اگلے دن دوپہر بعد کی نشست میں اس کو پڑھنا تھا۔ اس وقت تک سائیکلو اسٹائل ہو کر اس کی کاپیاں بھی تیار ہو گئیں۔

آدھ گھنٹہ کے اس مقالہ کا عنوان تھا "القرآن فی مواجہۃ التحدیات العصریۃ"۔ مقالہ پیش کرنے کے بعد جو ملاقاتیں ہوئیں ان سے اندازہ ہوا کہ لوگوں نے اس کو غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ کسی نے کہا: واللہ اسلوب فرید۔ کسی نے کہا: کان ممتازا جدا۔ کسی نے کہا: لقد اعجبنی کثیرا۔ وغیرہ۔ یہ عربی مقالہ اولاً موتمر کی طرف سے سائیکلو اسٹائل کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد وزیر اطلاعات عبدالرحمٰن شلقم کی خصوصی ہدایت کے تحت فوری طور پر اس کو پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ موتمر میں پڑھے جانے والے مقالات میں راقم الحروف کا مقالہ واحد مقالہ تھا جس کو اس طرح پمفلٹ کی صورت میں چھاپا گیا۔

آدھ گھنٹہ کے مقالہ میں میں نے یہ دکھایا کہ جدید تحدیات دراصل جدید امکانیات ہیں۔ اگر ان کو قرآن کی رہنمائی میں استعمال کیا جائے تو وہ ہمارے لئے نیا مستقبل پیدا کرنے کا زینہ بن سکتے ہیں۔ آخری پیراگراف یہ تھا:

"رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں بظاہر اسلام کو العدو القوی سے معاملہ پیش آیا۔ مگر اس العدو القوی کے اندر حقیقۃً المومن القوی کے امکانات چھپے ہوئے تھے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں اگرچہ ہم کو سخت ترین حالات کا سامنا ہے مگر یہ حالات اسلام کے لئے زینے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو لے کر اٹھ جائیں تو تاریخ دوبارہ ثابت کرے گی کہ یہ ساتویں صدی ہجری کی مانند گویا ایک تاتاری تلوار تھی جو صرف اس لئے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر خدا کے دین کی خدمت وحمایت کے لئے وقف ہو جائے۔"

ایک صاحب امریکہ سے آئے تھے۔ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں یکساں روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ کھانے کی میز پر ان کا ساتھ ہو گیا۔ بات چیت کے دوران انھوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا "وحیدالدین" انھوں نے کہا "وحیدالدین خان"، میں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد وہ بڑے زور کے ساتھ لپٹ گئے۔ وہ میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ اسی طرح کا واقعہ اکثر لوگوں کے ساتھ پیش آیا۔ عربی کتابیں، خاص طور پر الاسلام یتحدیٰ، بار بار چھپ کر تقریباً پوری مسلم دنیا میں پھیلی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اس کو پڑھ چکا ہے۔ یہاں اگرچہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ ہیں، تقریباً سارے ہی لوگ الاسلام یتحدی کو پڑھے ہوئے نظر آئے۔ ایسے لوگ بھی ملے جنھوں نے کہا کہ الاسلام یتحدیٰ ابھی میں نے پڑھی نہیں ہے مگر اس کا نام کافی سنا ہے اور پڑھنے کا اشتیاق ہے۔

مزید معلوم ہوا کہ الاسلام یتحدی (مذہب اور جدید چیلنج) کا ترجمہ عربی کے علاوہ اور کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مثلاً یوگوسلاویہ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک ماہوار رسالہ (Edukata Islame) نکالتے ہیں۔ یہ رسالہ یوگوسلاویہ کی البانوی زبان میں ہے۔ انھوں نے اس یوگوسلاوی زبان میں الاسلام یتحدی

کاترجمہ کیا ہے۔ فی الحال اس کو انھوں نے اپنے رسالہ کے نمبر کے طور پر شائع کیا ہے اور آئندہ کتابی صورت میں چھاپنے والے ہیں۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Mar Sherif Ahmad, director medrese Alauddin
P.F. 89. Pristina, Yogoslavia.

اس طرح ہماری معلومات کے مطابق یہ کتاب اردو کے علاوہ عربی، ترکی، فرانسیسی اور یوگوسلاوی زبانوں میں شائع ہو چکی ہے۔

الاسلام یتحدی عرب دنیا میں اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس سے باخبر ہے اور اس سے غیر معمولی طور پر متاثر ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے، اس کا جواب یہ ہوتا تھا : عدۃ مرات (کئی بار)

ہماری معلومات کے مطابق، الاسلام یتحدی اب تک پانچ عرب ملکوں کی جامعات میں باقاعدہ طور پر داخل نصاب ہو چکی ہے ——— قاہرہ، طرابلس، قطر، خرطوم اور تیونس۔ یہاں آنے والوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ کئی عرب یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اساتذہ مستقل طور پر اس سے استفادہ کرتے ہیں اور اس کے مضامین کو اپنے لکچروں میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر جہاں تک راقم الحروف کا علم ہے، ہندستان اور پاکستان کی کسی بھی درس گاہ کے نصاب میں اب تک وہ داخل نہ کی جاسکی۔ ہمارے قائدین اور ہمارے مدارس کے ذمہ دار یہ اعلان تو بار بار کرتے رہتے ہیں کہ "معقولات اور علم کلام پر جدید انداز میں کتاب لکھنے کی ضرورت ہے"۔ مگر جب ایسی کتاب لکھ کر شائع کر دی جائے تو ان کے اندر یہ جذبہ نہیں ابھرتا کہ اس کو اپنائیں اور عملاً اس کو استعمال کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہر آدمی صرف کہنے کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے، کرنے کا کریڈٹ لینے کا شوق کسی کے اندر نہیں۔

طرابلس میں الاسلام یتحدی سے متعلق ایک عجیب کہانی معلوم ہوئی۔ طرابلس میں محمد سلیمان القائد اور علی مختار الجعیدی ہمارے دعوتی مشن سے بہت متاثر ہیں۔ ۱۹۷۷ میں وہ ڈاکٹر عبداللہ الصونی (رئیس قسم اللغۃ العربیۃ، کلیۃ التربیۃ، جامعہ طرابلس) سے ملے اور ان سے کہا کہ اسلامی مرکز کے لئے آپ تعاون دیجئے۔ وہ مذکورہ لیبی نوجوانوں کے قریبی ملاقاتی تھے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم میں تو ایک غریب آدمی ہوں (واللہ انا مفلس)

عبداللہ الصونی کے پاس واقعتہً مال نہ تھا۔ تاہم وہ ایک شریف آدمی تھے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹے تو ان کے دل نے انھیں ملامت کی کہ تمھارا دوست تم سے ایک نیک کام میں مدد لینے کے لئے آیا اور

تم اس کی کچھ مدد نہ کر سکے۔ یہ احساس ان پر اس قدر غالب آیا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہ سکے۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ان کے احتساب خویش نے ان کے سامنے ایک نیا وسیع تر دروازہ کھول دیا۔ وہ "الاسلام یتحدیٰ" کو پڑھے ہوئے تھے اور اس کی اہمیت کے معترف تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگرچہ میرے پاس مال نہیں ہے اور مال کے ذریعہ میں اس دینی مشن کی مدد نہیں کر سکتا۔ مگر میں ایک تعلیمی ادارہ کا صدر ہوں اور میں ایسا کر سکتا ہوں کہ الاسلام یتحدیٰ کو اپنے یہاں تعلیمی نصاب میں داخل کر دوں۔

اگلی صبح کو وہ خود مذکورہ لیبی نوجوان کے گھر پہنچے اور اس سے کہا کہ میں نے تمھارے مشن کی مدد کے لئے ایک اور راستہ پالیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میں نے تمھارے مشن کے تحت شائع شدہ کتاب (الاسلام یتحدیٰ) کو یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کر دیا ہے۔ اسی وقت انھوں نے کتاب کے پانچ ہزار نسخوں کا آرڈر لکھ کر محمد سلیمان القائد کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کی فراہمی کا فوراً انتظام کریں۔ چنانچہ کتاب بہت جلد قاہرہ سے منگائی گئی۔

اس کے بعد اگلے چند سالوں میں مزید کتابیں منگائی گئیں۔ اندازہ ہے کہ اس کے بعد مجموعی طور پر تقریباً پچاس ہزار کتابیں لیبیا میں پہنچیں۔ اس کی قیمت مصری سکہ میں ۵۰ قرش تھی جو لیبیا میں بمشکل ۵۰ پیسہ کے بقدر ہے۔ چنانچہ طلبا اور غیر طلبا نے کثرت سے خریدا۔ لیبیا اگرچہ رقبہ کے اعتبار سے بڑا ملک ہے، مگر اس کی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ چند سالوں کے اندر ایسا ہوا کہ الاسلام یتحدیٰ لیبیا کے تقریباً ہر پڑھے لکھے آدمی تک پہنچ گئی۔

لیبیا نیز دوسرے ملکوں کے کئی صحافی حضرات نے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات میں دو سوال بہت مشترک ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ آپ نے الاسلام یتحدیٰ کے بعد اور کیا کیا تحریری کام کئے ہیں۔ میں نے بتایا کہ اس کے بعد کافی تحریری کام ہو چکا ہے مگر عربی میں ان کے ترجمہ اور اشاعت کا کام ابھی باقی ہے۔ دوسرا سوال جو تقریباً ہر اخبار یا رسالہ والے نے کیا وہ یہ کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو مشکلات و مسائل درپیش ہیں ان کا آپ کے نزدیک کیا حل ہے۔ میں نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔ وہ یہ کہ تمام مسائل کا ایک ہی یقینی حل دعوت الی اللہ ہے۔ دوسرا کوئی حل نہ اب تک کامیاب ہوا ہے اور نہ آئندہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

۲۲ اگست کو طرابلس کے ٹیلی وژن پر میرا ایک انٹرویو نشر کیا گیا۔ اس طرح کا انٹرویو عام طور پر ۱۵ منٹ کا ہوتا ہے مگر میرا انٹرویو خاص طور پر ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات زیادہ تر دو چیزوں سے متعلق تھے۔ ایک یہ کہ آپ کے مرکز اسلامی کے تحت کیا کیا کام ہو رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جدید تحدیات کے مقابلہ میں آپ کے نزدیک اسلام کا موقف کیا ہونا چاہیئے۔

چودہ منزلہ فندق باب البحر کی بالکنی پر کھڑے ہوکر طرابلس کے شہر پر نظر ڈالیں تو وہ خشک عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل معلوم ہوتا ہے۔ نئی دہلی جیسے سبزہ اور درخت کا یہاں کوئی تصور نہیں۔ ہوٹل میں چاروں طرف کثرت سے ہرے بھرے درخت اور پودے نظر آئے۔ ہم سمجھے کہ یہ ہمارے ملک کی طرح واقعی درخت اور پودے ہیں۔ مگر قریب جاکر گہرائی کے ساتھ مشاہدہ کیا تو وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے۔ مگر ڈنٹھل اور پتی اور پھول، ہر چیز میں اتنی کامل مشابہت تھی کہ دور سے کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ پلاسٹک کے بنے ہوئے ہیں ——— صحرائی ملکوں میں سبزہ کی کمی نے پلاسٹک انڈسٹری کے لئے تجارت کا ایک نیا میدان کھول دیا ہے۔

ہندستان کے تقریباً پچاس ہزار افراد لیبیا میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ جو طرابلس میں رہتے ہیں ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں، پردیس میں اپنے ہم وطنوں سے ملنا ہمیشہ بہت خوشی کا باعث ہوتا ہے، جن سے میری ملاقاتیں ہوئیں وہ سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ چند شام گزری جو بہت دن تک یاد رہے گی۔ ان کے ایک اجتماع میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے دعوتی پہلو پر اپنے خیالات پیش کئے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو مختلف تحفے دئے گئے۔ ان میں سب سے زیادہ کارآمد چیز ایک جانماز تھا۔ اس جانماز میں ایک خاص قسم کا قطب نما چپکایا ہوا تھا جس کا نام کاشف الاتجاہات (Direction Finder) رکھا گیا ہے۔ یہ قطب نما دنیا کے کسی بھی مقام پر قبلہ کا رخ بتاتا ہے۔ اس میں گھڑی کی طرح چالیس اعداد چاروں طرف گولائی میں لکھے ہوئے ہیں اور سامنے ایک مینار بنا ہوا ہے۔ ہر عدد دنیا کے کسی خاص شہر کو بتاتا ہے۔ آپ جہاں کہیں ہوں، گائڈ بک میں اس مقام کا عدد دیکھیں اور پھر جانماز کو بچھاکر گھمائیں۔ قطب نما کی سوئی جب مطلوبہ نمبر پر ٹھہر جائے تو اس وقت مینار کا رخ جس جانب ہوگا وہی اس مقام پر قبلہ کا رخ ہوگا۔

طرابلس کی کانفرنس میں دنیا کے تمام حصوں کے لوگ ساڑھے چار سو کی تعداد میں آئے۔ مختلف ممالک سے تقریباً ۱۵۰ تنظیموں اور اداروں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ دعوت دین اور احیاء اسلام کے عنوانات پر اس طرح کے اجتماعات مختلف مسلم ملکوں میں کثرت سے کئے جا رہے ہیں۔ سعودی عرب خاص طور پر اس معاملہ میں کافی آگے ہے۔ وہ ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی خدمت کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔ موجودہ مسلم حکمراں اگرچہ سیاسی اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو برداشت نہیں کرتے۔ مگر دعوتی اسلام کی کوششوں کو وہ ہر طرح کا تعاون دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ملے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے نہ یہ کہ ہم اپنی جدوجہد کو اس میدان سے شروع کرنا چاہیں جو ابھی ہم کو حاصل نہیں ہوا۔

۲۹ راگست کو راقم الحروف کے اعزاز میں فندق باب المدینہ میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس عشائیہ میں وزراء اور سفراء شریک تھے، طرابلس میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارجن اسرانی نے بھی شرکت کی۔ اس قسم کی تقریب شرکا ء موتمر میں راقم الحروف کے سوا اور کسی کے لئے منعقد نہیں کی گئی۔ دوسرے معززین کے علاوہ ڈاکٹر طاہر محمد الشویھدی (الامین العام للهیئة المشترکه لتاسیس المراکز الثقافیه الاسلامیه) بھی اس موقع پر موجود تھے۔

طرابلس کا سوق الجمع (سپر بازار) دیکھا۔ اس طرح کے یہاں چار بازار ہیں، نئی دہلی کے سپر بازار کے مقابلہ میں یہاں کے سوق الجمع کی عمارت کافی زیادہ شاندار تھی۔ کئی منزلہ عمارت میں خودکار سیڑھیوں کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ حساب کتاب کرنے کے لئے جدید طرز کی درآمد شدہ مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم خریداری اور سامان کے اعتبار سے وہ نئی دہلی کے سپر بازار سے کم نظر آیا، اس فرق کے ساتھ کہ دہلی میں تمام سامان ملکی ہوتا ہے اور یہاں تمام سامان باہر سے درآمد کیا ہوا۔

طرابلس کا متحف (میوزیم) کافی بڑا ہے۔ مگر وہ ترکوں کے ایک قدیم قلعہ میں قائم کیا گیا ہے اس لئے عمارتی اعتبار سے اس میں وہ خوبیاں نہیں ہیں جو اس عمارت میں ہوتی ہیں جو خاص طور پر میوزیم کے مقصد سے بنائی گئی ہو۔ مثال کے طور پر لکھنؤ کا میوزیم مقابلتہً کافی چھوٹا ہونے کے باوجود عمارتی اعتبار سے طرابلس کے میوزیم سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

ایک ہندستانی عالم کے ساتھ عرب دنیا میں بعض اوقات یہ صورت حال پیش آتی ہے کہ وہ بظاہر عربی بولتا ہے مگر عرب اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عربی لفظ کو اس کے اردو مفہوم میں استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ عربی زبان کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں رائج ہیں۔ اس لحاظ سے اردو دانی کو عربی دانی کے لئے کارآمد ہونا چاہئے۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی کے اکثر الفاظ کے معنی اردو میں آکر بدل گئے ہیں۔

مثلاً اردو میں جس چیز کو ہم انقلاب کہتے ہیں، اس کے لئے عربی میں ثورہ کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں ثورہ کے معنی ریوولیوشن کے ہیں اس کے مقابلہ میں انقلاب کا لفظ اس مفہوم کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو انگریزی میں (coup) کہتے ہیں۔ ہندستان کے ایک مصنف نے اپنی کتاب کا نام الاقدار الاسلامیہ رکھا ہے۔ اس سے ان کی مراد اسلامک ویلوز ہے۔ مگر ویلو (value) کے لئے عربی میں قیمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے نہ کہ قدر کا۔ اگرچہ قیمت اور قدر دونوں ہی عربی الفاظ ہیں۔ تاہم عربی میں اس کو القیم الاسلامیہ کہیں گے نہ کہ الاقدار الاسلامیہ۔ وہ چیز جس کو اردو میں استحصال کہا جاتا ہے اس کے لئے عربی میں استغلال کا

لفظ استعمال ہوتا ہے، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دوسری مشکل تلفظ کی ہے۔ مثلاً موجودہ عرب اکثر ق کا تلفظ گ سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ اقول لک (میں آپ سے کہتا ہوں) کو اگل لک بولیں گے۔ اسی طرح مثلاً وہ الاستقلال (آزادی) کو اس طرح بولتے ہیں کہ وہ الاستغلال سنائی دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ ہندستان کا ایک آدمی کسی لفظ کے معنی جانتے ہوئے عربوں کی گفتگو کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ کبھی لفظ کے دہرے مفہوم کی وجہ سے اور کبھی تلفظ کے فرق کی وجہ سے۔ اردو داں مسلمانوں کی انفرادیت پسندی کی یہ عجیب قیمت ہے جو ان کو خود مسلم دنیا میں دینی پڑتی ہے۔

۲۷ اگست کو لیبیا میں ہندستان کے سفیر مسٹر ارحمن اسرانی سے ملاقات ہوئی۔ نہایت ذہین اور با اخلاق آدمی ہیں۔ بہت شریفانہ طور پر ملے اور اس کے بعد مزید تفصیلی ملاقات کی غرض سے ۲۹ اگست کو باصرار اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کی۔ کھانے کی میز پر سفیر صاحب کے ساتھ جناب عبدالخالق دہلوی بھی تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک دل چسپ اور مفید گفتگو رہی۔ سفیر صاحب نے اسلامیات کے مطالعہ کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں نے چند پمفلٹ ان کی خدمت میں پیش کیے۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک تعلیم یافتہ عرب سے ہوئی۔ وہ ایک ملک میں اچھے عہدہ پر ہیں۔ ان کو میں جانتا تھا۔ مگر مجھ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ ہمارے مشن سے کس حد تک قریب ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میری عربی کتابیں انھوں نے بار بار پڑھی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اردو کتابوں اور الرسالہ کے بہت سے مضامین کو ہندستانی یا پاکستانی عربی دانوں کے ذریعہ ترجمہ کرا کر سمجھا ہے۔ اب وہ ہمارے مشن کو پوری طرح پا گئے ہیں اور صدق صدا اس سے متفق ہیں۔

مذکورہ عرب بزرگ نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں لوگوں کا معاملہ آپ کے ساتھ کیا ہے۔ میں نے کچھ تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک طبقہ ہمارا سخت مخالف ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر تل گیا ہے کہ ہماری جڑ اکھاڑ کر اس مشن کا خاتمہ کر دے۔ یہ لوگ ہمارے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کر رہے ہیں۔ ہماری معاشیات کو برباد کرنے کی تدبیریں کرتے ہیں۔ ہم کو اتنا زیادہ پریشان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنگ آکر اس مشن کو چھوڑ دیں۔

یہ سن کر عرب بزرگ بولے ——— آپ کا یہ اسلامی مشن بالآخر ایک تاریخ بننے والا ہے۔ پھر آئندہ بننے والی تاریخ میں یہ لوگ اپنا نام آخر کس خانہ میں لکھوانا چاہتے ہیں۔

ایک سفر

وسط افریقہ میں ایک ملک ہے جس کا نام روانڈا ہے۔ اس کے دار السلطنت کا نام کیگالی (Kigali) ہے۔ یہاں پہاڑوں کے خوبصورت ماحول میں کھلی فضا کے اندر ایک اسلامی مرکز قائم ہے۔ ۱۹۸۱ میں مجھے یہاں لکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔ میرے اور میرے ساتھی کے لیے دو ہوائی ٹکٹ بھی آچکے تھے۔ مگر آخر وقت میں بعض وجوہ سے سفر ملتوی کر دینا پڑا۔ اس موقع کے لئے جو لکچر ترتیب دئے گئے تھے ان کا اردو ایڈیشن "احیار اسلام" کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

اگست ۱۹۸۲ میں عالمی مؤتمر میں شرکت کے لئے طرابلس گیا تو وہاں سے دوبارہ کیگالی کے سفر کا انتظام ہوگیا۔ طرابلس کی الهیئۃ المشترکۃ نے یہ انتظام کیا کہ میں طرابلس سے واپسی میں کیگالی اور ابوظبی اور کویت وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے دہلی واپس جاؤں۔ اس پروگرام کے تحت میں ۳۱ اگست ۱۹۸۲ کو کیگالی پہنچا اور ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ تک وہاں مقیم رہا۔

لیبیا اور متحدہ عرب امارات کے باہمی تعاون سے ۱۹۷۵ میں ایک اسلامی ادارہ قائم ہوا جس کا صدر دفتر طرابلس میں ہے اور جس کا نام ہے:

الهيئة المشتركة لتاسيس المراكز الثقافية الاسلامية

اس ادارہ کے موجودہ ذمہ دار دکتور طاہر محمد الشویھدی ہیں۔ اس ادارہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں اسلامی مراکز قائم کئے جائیں جن میں مسجد، مدرسہ، ہال، اسپتال، لائبریری اور دعوتی ادارے ہوں۔ یہ مراکز ایک طرف مقامی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے ہیں اور دوسری طرف مقامی غیر مسلم آبادی میں اسلام کی تبلیغ کا کام انجام دیتے ہیں۔ ہیئت کی طرف سے اس قسم کے مراکز گابون، ٹوجو، مالی، بورونڈی، یوگنڈا، زامبیا، انڈونیشیا وغیرہ میں قائم کئے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک مرکز وہ ہے جو روانڈا کے دار السلطنت کیگالی میں قائم ہے۔ اس مرکز کے تحت تقریباً ایک درجن شعبے کام کر رہے ہیں۔

طرابلس سے ہم ۳۰ اگست کو فرانسیسی ہوائی کمپنی کے ذریعہ روانہ ہوئے۔ راستہ میں جہاز ایک گھنٹہ کے لئے مالٹا میں اترا۔ اس طرح موقع ملا کہ ہم جہاز سے باہر آکر مالٹا کو دیکھیں جو آج کل سیاحوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مالٹا کی زمین پر قدم رکھتے ہوئے عجیب احساس ہوا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آزادی ہند کی مسلح تحریک کے نتیجہ میں ہندستان کے مسلم قائدین کو جلا وطن کیا گیا۔ میں نے سوچا: ہمارے لیڈر موجودہ صدی کے آغاز میں ایک ناکام سیاسی تحریک کی خاطر اس جزیرہ میں آئے اور ناکام سیاسی تحریک کی خاطر اس سے واپس چلے گئے۔ اس کے

برعکس اگر وہ اللہ کے دین کے داعی بن کر "مالٹ" آتے تو شاید آج اس علاقہ کی تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ ایسی حالت میں ان کا آنا بھی کامیابی کا آنا ہوتا اور جانا بھی کامیابی کا جانا۔

پیرس سے ہم کو جہاز بدلنا تھا۔ اس کی وجہ سے چند گھنٹے پیرس میں گزرے۔ دہلی کی پُرہجوم آبادی کے مقابلہ میں پیرس ایک سونا شہر معلوم ہوتا ہے۔ تاہم وہ یورپ کا قدیم ترین ترقی یافتہ شہر ہے۔ ہم کو افریقہ کے ایک ملک سے افریقہ کے دوسرے ملک میں جانا تھا۔ مگر اس کے لئے ہم کو یورپ کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اس وقت ہمارا پیرس اترنا اس بات کی علامت تھا کہ آج کسی مسلمان کو "لیبیا" سے "روانڈا" جانا ہو تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ وہ اپنے لئے کوئی "پیرس" تلاش کرے۔ کیگالی سے ہم نے دہلی ٹیلیفون کیا تو اس کا رابطہ بھی پیرس سے قائم ہوا۔

یہ ہماری آج کی صورت حال ہے۔ مگر کسی زمانہ میں پیرس اس بات کی علامت تھا کہ اسلام کے علم برداروں کی پیش قدمی جو مکہ سے شروع ہوئی وہ خشکی اور تری کو پار کرتی ہوئی یورپ کے مرکزی شہر پیرس تک پہنچ چکی ہے۔ آج بھی پیرس کی بعض قدیم عمارتوں میں عربی کتبات موجود ہیں جو گزرے ہوئے عہد کی یاد دلاتے ہیں۔

۳۱ اگست کو ہم کیگالی (روانڈا) پہنچے۔ روانڈا وسط افریقہ میں خط استوا پر واقع ہے۔ اس کے ایک طرف یوگنڈا، دوسری طرف تنزانیہ اور تیسری طرف زائر ہے۔ اس کا رقبہ ۲۶ ہزار مربع کیلومیٹر اور آبادی دو ملین (۲۰ لاکھ) ہے۔ اس کا دارالسلطنت کیگالی ہے۔ پورا ملک سرسبز پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مٹی نہایت زرخیز ہے۔ مختلف فصلیں آبپاشی کے بغیر پیدا ہوتی ہیں۔

میرا قیام اصلاً کیگالی میں رہا۔ تاہم مجھے ایک طرف یوگنڈا تک جانے کا موقع ملا جہاں سرحد کے دونوں طرف کثرت سے چائے کے ہرے بھرے فارم پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہم بحیرہ مہازی (Muhazi) تک گئے جو تقریباً سو میل لمبا ہے اور روانڈا اور زائر کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شہر کے علاوہ یہاں کی دیہاتی زندگی کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

عیدی امین (سابق صدر یوگنڈا) کی تصویر ہمارے یہاں بہت خراب ہے۔ مگر یوگنڈا کے لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ ذاتی طور پر بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ اسلام دوست تھا اور اس نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ اس کے زمانہ میں یوگنڈا میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس کی وجہ سے کلیسا اس کو بے حد ناپسند کرتا تھا۔ غیر ملکیوں کو یوگنڈا سے نکالنے میں عیدی امین نے جو سخت انداز اختیار کیا اس کی وجہ سے اس کے مخالفین کو موقع مل گیا کہ اس کو دنیا کے سامنے وحشی انسان کے روپ میں پیش کریں، حتیٰ کہ اس کو ملک سے نکال باہر کریں ——— اس سے اندازہ ہوتا ہے

کو صحافت کے میدان میں مسلمانوں کی پس ماندگی موجودہ زمانہ میں کتنے وسیع نتائج تک پہنچ رہی ہے۔ روانڈا اور یوگنڈا کی سرحد پر میں نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے نوٹوں کی گڈیاں ہاتھ میں لئے ہوئے گھوم رہے ہیں وہ آنے جانے والوں کے لئے نوٹوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ان بچوں کے لئے اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ کوئی ان کے نوٹ چھین کر بھاگ جائے گا۔

روانڈا ابھی صنعتی انقلاب سے دور ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت سادہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ابتدائی فطرت پر قائم ہیں۔ چنانچہ اسلام ان کے درمیان تیزی سے پھیل رہا ہے۔

روانڈا میں کلیسا کافی طاقت ور ہے اور وہ اسلامی تبلیغ کا مخالف ہے۔ مگر یہاں کا موجودہ صدر جنرل ہابیاریمانہ (Habia Remana) نہایت ہوشیار اور منصف مزاج ہے۔ اس نے کھلے طور پر اعلان کیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر مذہب کو آزادی ہے کہ وہ سیاسی معاملات میں دخل دئے بغیر اپنا مذہبی کام کرے۔ کیگالی کے موجودہ اسلامی مرکز کے لئے حکومت نے کافی وسیع زمین مفت دی ہے۔ اور اس پر چھ ملین ڈالر کے خرچ سے ایک بڑا اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے۔ مرکز تعمیر ہونے کے بعد صدر روانڈا نے اس کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ روانڈا میں ہم اس طرح کے اور بھی اسلامی مراکز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے مراکز ہماری شان میں اضافہ کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ملک کے اندر آزادی فکر کا نشان ہیں۔

کیگالی کے اسلامی مرکز کا خاموش تبلیغی کام تقریباً پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے دو درجن داعی پیدل یا کاروں یا بائیسکلوں کے ذریعہ لوگوں تک پہنچتے ہیں اور ان کو خدا کے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ میں نے اپنے زمانہ قیام (۳۱ اگست تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲) میں دیکھا کہ تقریباً روزانہ مختلف اطراف سے لوگ یہ خبریں لے کر آ رہے ہیں کہ فلاں مقام پر اتنے آدمی اسلام میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ تعداد اکائیوں میں نہیں بلکہ اکثر دہائیوں میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ کبھی سیکڑوں میں۔ آئے دن نومسلموں کی جماعتیں مرکز میں آتی ہیں تاکہ یہاں کچھ دن رہ کر تعلیم و تربیت حاصل کریں۔ اسی کے ساتھ ہر ایک باصرار اپنا ختنہ کراتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان نومسلموں میں تقریباً ۹۹ فی صد نوجوان ہیں۔

کام کی بڑھتی ہوئی رفتار کے لحاظ سے مرکز کے وسائل بہت کم ہیں۔ تاہم نہ صرف مرکز میں بلکہ مختلف مقامات پر نومسلموں کی دینی تعلیم کے لئے مدارس قائم ہیں جن میں مرکز کے مقرر کردہ معلمین ان کو اسلام کی تعلیم دیتے ہیں۔ مقامی زبان (کینیا روانڈا) میں چھوٹی چھوٹی کتابیں سادہ دینی تعلیمات کے بارے میں شائع کی گئی ہیں۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۲ کو کیگالی کے اسلامی مرکز میں میرا لکچر تھا۔ شہر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اور کئی ملکوں کے سفرا وسیع لکچر ہال (قاعۃ المحاضرات) میں موجود تھے۔ اجتماع میں تقریباً نصف تعداد مسلمانوں کی تھی اور تقریباً نصف تعداد غیر مسلموں کی۔

یہاں مرکز کا اسٹاف کافی وسیع ہے۔ مگر ان میں کوئی اردو جاننے والا نہیں۔ روانڈا کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ چنانچہ شرکا کی اکثریت فرانسیسی زبان جاننے والوں پر مشتمل تھی۔ میں نے اپنا لکچر اس طرح تیار کیا کہ اولاً میں نے اپنی ہندستانی عربی میں لکچر کو املا کرایا۔ اس کے بعد مرکز کے ڈائرکٹر جناب محمد سلیمان القائد، جو میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں، انھوں نے میری عربی کو عربوں کی زبان میں لکھا۔ اس کے بعد اس عربی لکچر سے جناب سالم جابی (غینیا) نے اس کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا۔

لکچر کی صورت یہ ہوئی کہ اولاً میں نے عربی زبان میں ابتدائی کلمات کہے جس کا فوری طور پر سالم جابی نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد جناب ادریس بلنجی (روانڈا) نے میرا لکچر فرانسیسی میں پڑھ کر سنایا۔ لکچر کے بعد سایکلو اسٹائل پر تیار کی ہوئی اس کی عربی اور فرانسیسی کاپیاں لوگوں کے درمیان تقسیم کی گئیں۔ جلد ہی انشاء اللہ کیگالی کے اسلامی مرکز کی طرف سے دونوں زبانوں میں اس لکچر کو کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ طرابلس کا مقالہ (القرآن فی مواجہۃ التحدیات العصریہ) اور کیگالی کا لکچر (دور الاسلام فی التاریخ العالمی) دونوں اصلاً عربی زبان میں لکھے گئے۔ اس لئے فی الحال ان کا اردو نسخہ الرسالہ میں اشاعت کے لئے ہمارے پاس موجود نہیں۔

اسلامی مرکز (کیگالی) کا دعوتی کام اب تک زیادہ تر عوام میں ہو رہا ہے۔ مرکز کے ڈائرکٹر نے کہا: آپ کا یہ لکچر انشاء اللہ مرکز کے لئے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ اولاً ہم اس لکچر کو فرانسیسی اور عربی اور مقامی زبان (کینیا روانڈا) میں شائع کریں گے اور اس کے بعد آپ کی دوسری چھوٹی کتابیں بھی فرانسیسی میں اور عربی میں شائع کریں گے۔ اس طرح انشاء اللہ یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ (مثقفین) میں بھی ہمارا دعوتی کام شروع ہو جائے گا۔

اس سفر میں ایک اخوانی قائد سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک عرب ملک سے تعلق رکھتے تھے اور میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے میرے اس نقطۂ نظر سے اتفاق کیا کہ اسلامی تحریک کا نشانہ دعوت ہے نہ کہ سیاست۔ ان کے نزدیک الاخوان المسلمون نے سیاسی طریق کار اختیار کر کے غلطی کی ہے۔ تاہم ان کا اصرار تھا کہ ان کو الاخوان المسلمون میں بدستور شامل رہنا چاہئے تاکہ وہ اندر سے اس کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

میں نے کہا کہ اخوانیوں کا سیاسی طریق کار کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہ تھا۔ وہ ان کے فکر میں اول روز سے شامل تھا، ان کی اٹھان ہی سیاست پر ہوئی تھی۔ اور کسی تحریک کی اٹھان جس فکر پر ہوتی ہے وہ آخر تک اسی پر قائم رہتی ہے، آپ درمیان سے اسے بدل نہیں سکتے۔ تاہم انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ بالآخر میں نے انھیں ایک تحریر لکھ کر دی اور کہا کہ اس کو پڑھ کر اپنے پاس محفوظ کر لیجئے اور دو سال بعد اس کو دوبارہ کھول کر پڑھئے گا اور پھر دو سالہ تجربات کا جائزہ لے کر مجھے بتائیے گا کہ آپ کا خیال درست تھا یا میرا خیال۔ یہ تحریر میری ہندستانی عربی میں حسب ذیل تھی:

كل حركة انسانية، مهما كانت اسلامية او غير اسلامية فهي تجري في مجراها التي قدّر لها منذ البدء - لا يمكن لاحد ان يغيّر مجراها من الوسط - حتى لو حاول مؤسس تلك الحركة هذا فلا ريب انه سيفشل - اذا كان رجل مع حركة ثم ظهر له ان فيها غلطا، فلا سبيل له الا ان يعتزل تلك الحركة ويبدأ من جديد - واذا هو قام على تصحيحها وجعل يجتهد ان يتجه بتلك الحركة غير اتجاهها فليس له في النهاية الا الفشل - انما ينبغي عليه ان لا يضيع عمره الثمين الذي بقي عنده - و يستعمل نفسه في العمل الصحيح والجهد المثمر - هذا ما عندي والعلم عند الله العلي الخبير -

وحيد الدين خان ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲

اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ کا بیشتر حصہ سفر میں گزرا - اس دوران میں مجھے دنیا کے تین براعظموں میں جانے کا موقع ملا - ایشیا، افریقہ، یورپ - ایشیا میں سعودی عرب، دبئی اور کویت - افریقہ میں لیبیا، روانڈا، یوگنڈا، کینیا اور ایتھوپیا - یورپ میں انگلینڈ، فرانس، مالٹا، یونان اور اٹلی - طرابلس کی موتمر میں ساری دنیا کے لوگ جمع تھے - آسٹریلیا اور امریکہ سمیت تقریباً ہر ملک کی نمائندگی وہاں موجود تھی - ان لوگوں سے کثرت سے ملاقاتیں ہوئیں - اس طرح گویا ان مہینوں میں بالواسطہ یا براہ راست طور پر میں نے ساری دنیا کو دیکھ لیا — ان سفروں میں طرح طرح کے مختلف تجربات اور مشاہدات سامنے آئے - یہ تجربات اور مشاہدات انشاء اللہ الرسالہ میں آتے رہیں گے -

حج کا سفر

اگست ۱۹۸۲ میں میں بعض ملکوں کے سفر پر نکلا۔ اس سفر میں "حج" کا پروگرام شامل نہ تھا۔ حتی کہ میرے ذہن میں اس کا تصور بھی نہ تھا۔ روانڈا (افریقہ) پہنچا تو وہاں سے اچانک سفر حج کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اس معاملہ میں میرے ساتھ بالکل وہ صورت پیش آئی جو کسی شاعر نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

حج کا یہ سفر اسلامک سنٹر (کیگالی) کے ڈائرکٹر جناب محمد سلیمان القائد کے ساتھ ہوا۔ وہ چونکہ اس سے پہلے دو بار حج کر چکے تھے اس لئے پورے سفر میں ان کی رہنمائی بہت مفید ثابت ہوئی کیگالی سے ہم ایتھیوپین ایر لائنز کے ذریعہ ۱۵ ستمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو روانہ ہوئے۔ ہماری پہلی منزل اینٹبی (Entebbe) تھی۔ یہاں جہاز ایک گھنٹہ ٹھہرا اور ہم کو موقع ملا کہ ہم یوگنڈا کے اس شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکیں۔ اینٹبی ایک چھوٹا ہوائی اڈہ ہے۔ مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی شادابی، نیز سمندر کے ساحل نے اس کو کافی خوبصورت بنا دیا ہے۔ اسی مقام پر ۱۹۷۸ میں ہائی جیکنگ کا مشہور واقعہ پیش آیا تھا جب کہ فلسطینیوں نے ایک اسرائیلی جہاز کو بجبر اینٹبی کے ہوائی اڈہ پر اتار لیا تھا۔ چند روز تک غیر یقینی صورت حال رہی۔ اس کے بعد اچانک اسرائیلی ہوائی جہاز اینٹبی کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ انہوں نے حیرت انگیز مہارت کے ساتھ فلسطینیوں کو مغلوب کیا اور پھر اپنے تمام آدمیوں کو لے کر اسرائیل پہنچ گئے۔

ہماری دوسری منزل عدیس ابابا تھی۔ یہاں سے ہمیں ہوائی جہاز بدلنا تھا۔ اس سلسلے میں یہاں ایک روز قیام رہا۔ عدیس ابابا، ایتھیوپیا کا دارالسلطنت ہے۔ ایتھیوپیا (حبشہ) وہ ملک ہے جہاں صحابہ کرام نے پہلی ہجرت کی تھی۔ اسی خاک سے بلال حبشی پیدا ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہاں کا حکمراں نجاشی تھا۔ وہ نہایت عادل حکمراں تھا اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تاہم یہاں کی اکثر آبادی بدستور اپنے عیسائی مذہب پر قائم رہی۔ ایتھیوپیا کے ایک سرحدی علاقہ (اریٹیریا) میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ مگر ان مسلمانوں کو اس کے سوا اور کوئی کام معلوم نہیں کہ یہاں کی عیسائی حکومت سے بے معنی سیاسی لڑائی

لڑتے رہیں۔ وہ یہاں کے عیسائیوں کو دین خدا کا مدعو نہ بنا سکے۔ البتہ اپنی ناکام سیاست کے ذریعہ انہوں نے یہاں کے عیسائیوں کو اپنا قومی حریف ضرور بنا لیا ہے۔

۱۵ ستمبر کو ہم جدہ پہنچے۔ یہاں کے ہوائی اڈہ پر بڑا سخت مرحلہ پیش آیا۔ ہم چیکنگ کے مقام پر پہنچے تو میدان حشر کا منظر تھا۔ بے رحم چہرے کھڑے ہوئے لوگوں کے سامان کی بری طرح تفتیش کر رہے تھے۔ جس چیز کو چاہتے توڑ دیتے، جس چیز کو چاہتے اٹھا کر اپنے پیچھے رکھے ہوئے بڑے بڑے ٹب میں ڈال دیتے۔ بالآخر میری باری آئی۔ میرے پاس کپڑے اور قلم اور مسواک جیسی چند چیزیں تھیں۔ البتہ کاغذات کا کافی ذخیرہ تھا۔ یہ مختلف مضامین اور تاثرات تھے جو میں پچھلے ایک مہینہ کے سفر میں لکھتا رہا تھا۔ چیکنگ پوسٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے بے رحمی کے ساتھ تمام کاغذات کو لپیٹ کر فاتحانہ انداز سے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ میری ہر اپیل اس کے لئے قطعاً غیر موثر ثابت ہو رہی تھی۔ غیر مطبوعہ مضامین کی اس طرح بربادی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اپنی اس بے بسی کو دیکھ کر میں انہیار عصبی کے مرحلہ کو پہنچنے والا تھا کہ اچانک ایک معجزہ پیش آیا۔ ہوائی اڈہ کے اسٹاف کا ایک عرب نوجوان وہاں آگیا۔ اس نے میرے بکس پر میرا نام اور پتہ دیکھا اور بولا: هل انت وحيد الدين خان، صاحب الاسلام يتحدى. میں نے کہا، نعم۔ اس کے بعد اس نے فوراً مذکورہ آدمی سے کہا: ان کو میں جانتا ہوں۔ یہ بہت خاص آدمی ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد آدمی نے میرے تمام کاغذات میرے حوالے کر دئے اور میری جان میں جان آئی۔

یہ صورت حال دراصل اس تخریبی سیاست کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے جس میں بہت سی نام نہاد اسلامی جماعتیں اور اسلامی حکومتیں شریک ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہم قوموں اور مسلم حکمرانوں کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں سرگرم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکمراں طبقہ باہر سے آنے والوں کے بارے میں انتہائی حد تک شکی ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص باہر سے آرہا ہے وہ کسی سازشی منصوبہ کا جزء ہے۔ اس کے پاس اگر کوئی بیگ ہے تو وہ اس لئے ہے کہ اس میں وہ ہتھیار چھپا کر لائے۔ اس کے پاس اگر کچھ کاغذات ہیں تو وہ یقیناً کوئی باغیانہ لٹریچر ہے جو ان کے ملک میں باہر سے درآمد کیا جارہا ہے۔ اسلام کے نام پر جاری ہونے والی اس تخریبی سیاست نے اسلام یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ تو نہیں پہنچایا البتہ ان کو نئے نئے عذاب میں یقیناً مبتلا کر دیا ہے۔

مکہ میں مجھے ایک اسپتال میں جانا پڑا۔ قاعدہ کے مطابق میں نے پہلے ایک کاغذ لکھوایا جس میں میرا نام اور "الہند" لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے دوسری منزل پر ایک کمرہ میں داخل کیا گیا جہاں ایک عرب ڈاکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ میں وہی وحیدالدین خان ہوں جس نے الاسلام یتحدی لکھی ہے تو وہ بیتاب ہو گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ اس نے اپنے اسٹاف کے آدمیوں کو بلا کر کہا ھذا شیخ کبیر ولہ کتاب عظیم۔ فارغ ہو کر میں اس کے کمرہ سے نکلا تو خلاف معمول وہ باہر تک مجھے پہنچانے آیا۔

مکہ میں ہم جس مطوف (احمد حسین خوان، شارع ابراہیم الخلیل) کے یہاں ٹھہرے تھے، ان کا مکان باب الھجرہ کی جانب حرم سے بہت قریب تھا۔ اس کی وجہ سے بہت سا وقت حرم میں گذارنے کا اتفاق ہوا۔ کعبہ کے پردہ تک پہنچ کر دعائیں مانگنے کی توفیق بھی ملی۔

مذکورہ مکان میں پہلی منزل پر ہم سے ملے ہوئے کمرہ میں تیونس کی وزارت تعلیم کے (مفتش اوّل) مقیم تھے۔ ہمارے کمرہ کا نمبر ۱ تھا، ان کے کمرہ کا نمبر ۲۔ ۱۸ ستمبر کو ایک ملاقات میں انہیں معلوم ہوا کہ میں "وحیدالدین خان" ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا، کیا آپ نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے۔ وہ فوراً بولے ـــــ نعم، بل ھو احسن ما قرأت (ہاں، بلکہ وہ سب سے اچھی کتاب ہے جو میں نے پڑھی) انہوں نے بتایا کہ تیونس کے تمام مدارس ثانویہ میں آپ کی کتاب کو بطور ٹکسٹ بک کے داخل کر دیا گیا ہے۔ اور وہ ہمارے یہاں فلسفہ اور اسلامیات کے موضوع کے تحت باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے کمرہ سے اپنے صاحبزادہ کو بلایا اور کہا کہ ان سے ملو۔ یہ وقت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ (اکبر علماء العصر
تیونس کے جریدہ الہدایہ کے لئے انہوں نے میرا انٹرویو بھی لیا۔

حج میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جو طبیعت پر بے حد شاق معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر آدمی اگر اپنے آپ کو اللہ کی طرف متوجہ کر لے تو وہی چیز اس کے لئے رزق ربانی کا سبب بن جائے گی جو عام حالات میں صرف رزق نفسانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثلاً آپ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہے ہیں اور انسانوں کا ہجوم آپ کے سامنے اس طرح کھڑا ہو گیا کہ آپ نہ صحیح طور پر رکوع کر سکیں اور نہ صحیح طور پر سجدہ۔ ایسے موقع پر اگر آپ سامنے والے انسان کو دیکھیں تو صرف غصہ اور نفرت پیدا ہوگا۔ اس کے برعکس

اگر آپ یہ کہہ اٹھیں کہ خدایا میری اس ٹوٹی پھوٹی نماز کو قبول کرلے۔ کیونکہ میری بظاہر صحیح نماز بھی اتنی ہی ٹوٹی پھوٹی نماز ہے جتنی کہ میری یہ نماز، تو آپ کا ذہن بالکل دوسری طرف پھر جائے گا اور آپ کو خدا کا رزق ملنے لگے گا۔ اسی طرح رمی اور دوسرے مواقع پر انسان کا بے پناہ ہجوم، منیٰ اور عرفات میں گرمی کی شدت، پانی لینے کے لئے ایک کا دوسرے پر ٹوٹنا وغیرہ۔ ان مواقع پر اگر آپ صرف سامنے کے انسان کو دیکھیں تو آپ کے اندر صرف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ سوچنے لگیں کہ دنیا کی معمولی مصیبت کا یہ حال ہے تو آخرت کی بڑی مصیبت میں میرا کیا حال ہوگا تو اچانک آپ محسوس کریں گے کہ جو چیز بظاہر مصیبت نظر آرہی تھی اس نے خدا کی رحمت بن کر آپ کے اوپر سایہ کرلیا ہے۔

ہم ۶ ستمبر کو جدہ سے مکہ پہنچے تو ہمارے ساتھی محمد سلیمان القائد نے اپنے سامان کو چیک کرتے ہوئے پایا کہ وہ اپنا کیس (حقیبہ) جدہ کے ہوائی اڈہ پر چھوڑ آئے ہیں۔ اس میں ان کے بیس ہزار ریال تھے۔ یہ حادثہ بڑا سخت تھا۔ اس کے بعد میں مکہ میں ٹھہرا اور وہ امید و بیم کی کیفیت لے کر دوبارہ جدہ کے لئے روانہ ہوئے کہ شاید بیگ دوبارہ مل جائے۔ مجھے سخت تشویش تھی۔ میں نماز کے لئے کھڑا ہوا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: اللھم اجعلہ لنا درسًا ولا تجعلہ لنا خسارۃً (یعنی خدایا: بیگ ضائع نہ ہو اور وہ دوبارہ مل کر ہمارے لئے سبق کا ذریعہ بن جائے۔ دن بھر اسی قسم کی دعا دل سے نکلتی رہی۔ محمد سلیمان القائد صاحب مغرب بعد جدہ سے لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شرطہ کے دفتر میں بیگ مل گیا۔ اس کی پوری رقم اور دوسرے کاغذات بدستور اس میں موجود تھے۔

جدہ کے ہوائی اڈہ پر میری بھی دو چیزیں گم ہوئیں ——— گھڑی اور قلم۔ مگر وہ دوبارہ نہ مل سکیں۔ ممکن ہے اس میں اس کا بھی دخل ہو کہ میں نے زیادہ تلاش نہیں کیا۔

حج کے بہت سے پہلو ہیں مگر اس کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ حج حق تعالیٰ سے ملاقات ہے۔ آدمی جب سفر کرکے مقامات حج تک پہنچتا ہے تو اس پر خاص طرح کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں پہنچ گیا ہے۔ وہ اپنے خدا کو چھو رہا ہے وہ اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ وہ اس کی طرف دوڑ رہا ہے۔ وہ اس کی خاطر سفر کر رہا ہے۔ وہ اس کے حضور قربانی پیش کر رہا ہے۔

وہ اس کے دشمن کو کنکریاں مار رہا ہے ۔ وہ اس سے مانگ رہا ہے جو کچھ وہ مانگنا چاہتا ہے ۔ وہ اس سے پا رہا ہے جو کچھ اسے پانا چاہئے ۔

عرفات کا میدان اس سلسلہ میں بڑا عجیب منظر پیش کرتا ہے ۔ خدا کے بندے قافلہ در قافلہ چاروں طرف سے چلے آرہے ہیں ۔ سب کے جسم پر ایک ہی سادہ لباس ہے ۔ ہر ایک اپنی امتیازی صفت کو کھو چکا ہے ۔ سب کی زبان پر ایک ہی لفظ جاری ہے ۔ لبیك اللهم لبيك ، لبيك اللهم لبيك ۔ یہ منظر دیکھ کر قرآن کی وہ آیت یاد آنے لگتی ہے ۔ ونفخ فی الصور فاذا ھم من الاجداث الی ربھم ینسلون ۔ حقیقت یہ ہے کہ عرفات کا اجتماع حشر کے اجتماع کی ایک دنیوی تصویر ہے ۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے الحج عرفة (عرفات کے میدان میں قیام ہی حج ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج کا اہم ترین فائدہ کیا ہے ۔ وہ یہ کہ آدمی میدان حشر میں خدا کے سامنے اپنی حاضری کو یاد کرے ۔ جو کچھ کل عملاً بیتنے والا ہے اس کو آج ہی ذہنی طور پر اپنے اوپر طاری کر لے ۔

کعبہ خدائے واحد کا گھر ہے ۔ جس کو دو پیغمبروں (حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ) نے مل کر بنایا ۔ ان پیغمبروں کی خدا پرستی اور خدا کے لئے ان کی قربانی کے حیرت انگیز واقعات اس مسجد سے وابستہ ہیں ۔ پھر پیغمبر اسلام اور آپ کے پاک اصحاب کی زندگیاں اور ان کی تمام خدا پرستانہ سرگرمیاں اس کی فضاؤں میں بسی ہوئی ہیں ۔

خدا پرستی اور خدا کے لئے قربانی کی اس طویل تاریخ کو آدمی کتابوں میں پڑھتا ہے ۔ وہ اس کے حافظہ کے خانہ کا جزبنی ہوئی ہوتی ہیں ۔ اس کے بعد جب وہ کعبہ کے سامنے پہنچتا ہے تو حافظہ کی تمام یادیں اچانک جاگ اٹھتی ہیں ۔ وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ کے سامنے کھڑا ہوا پاتا ہے ۔ خدا سے خوف اور محبت کی تاریخ ، خدا کے لئے قربان ہو جانے کی تاریخ ، خدا کو اپنا سب کچھ بنانے کی تاریخ ، خدا کو قادر مطلق کی حیثیت سے پا لینے کی تاریخ ، خدا کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دینے کی تاریخ ۔

اس قسم کی ایک عظیم ربانی تاریخ اس کے سامنے کعبہ کی صورت میں مجسم ہو جاتی ہے ۔ وہ حجری حروف میں لکھی ہوئی اس کو نظر آنے لگتی ہے ۔ یہ تجربہ اس کے دماغ کو ہلاتا ہے اور اس کے سینہ کو پگھلا دیتا ہے ۔

یہ میری محرومی تھی کہ میں نے ابھی تک حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا ۔ اس سال میں

ایک اور سفر کے لئے نکلا۔ مگر خدا نے عجیب و غریب طور پر ایشیا اور یورپ اور افریقہ کا سفر کراتے ہوئے مجھ کو حجاز پہنچا دیا تاکہ میں حج کی سعادت حاصل کرسکوں۔ حج کرنے والا اگرچہ میں تھا، مگر حج کرانے والا صرف خدا تھا۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہ تھا۔

حرم میں پہنچ کر جب کعبہ پر نظر پڑی تو یہ ایک ایسا منظر تھا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کعبہ کو دیکھنا اور کعبہ کے پڑوس میں اپنے آپ کو پانا اتنا لذیذ ربانی تجربہ ہے جس کے اظہار سے میرا قلم عاجز ہے۔ اس غیر متوقع نعمت کو پاکر دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے کہا: خدایا، میں نے ابھی تک اپنی زندگی میں حج کا پروگرام نہیں بنایا تھا۔ گویا کہ میں حج کئے بغیر مرنے پر راضی تھا۔ تیرا کیسا عجیب احسان ہے کہ تو نے مجھ کو اس محرومی سے بچا لیا۔

کعبہ زمین پر خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ وہاں بھٹکی ہوئی انسانی روحوں کو خدا کا آغوش دیا جاتا ہے۔ وہاں پتھرائے ہوئے سینوں میں عبدیت کے چشمے جاری کئے جاتے ہیں۔ وہاں بے نور آنکھوں کو خدا کی تجلیات دکھائی جاتی ہیں۔ تاہم سب کچھ اس کے لئے ہے جو اس کی استعداد لے کر وہاں جائے۔ بے استعداد لوگوں کے لئے حج بس ایک قسم کی سیاحت ہے۔ وہ وہاں جاتے ہیں تاکہ جیسے گئے تھے ویسے ہی دوبارہ واپس چلے آئیں۔

وہاں میں نے جو خدائی مناظر دیکھے جس طرح وہ ناقابل بیان ہیں اسی طرح وہ انسانی مناظر بھی ناقابل بیان ہیں جو وہاں مجھے دیکھنے کو ملے۔ میں نے دیکھا کہ لوگ یا تو دنیا کی باتیں کرنے میں مشغول ہیں یا دنیا کا سامان خریدنے میں۔ کچھ لوگ دوسروں کو دھکا دے کر اپنی پرجوش مذہبیت کا ثبوت دے رہے تھے حالانکہ اس قسم کی چیزیں حرم میں جائز نہیں۔ جہاں ہر طرف خدا کے جلوے بکھرے ہوئے تھے تاکہ آدمی ان میں محو ہو جائے وہاں لوگ انسانی جلووں میں گم تھے۔ جہاں خدا کے فرشتے اترے ہوئے تھے تاکہ لوگ ان سے باتیں کریں وہاں لوگ انسانوں سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ جہاں ہر طرف آخرت کا سامان بک رہا تھا وہاں لوگوں کو دنیا کا سامان خریدنے کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ جس جگہ کا یہ حق تھا کہ خدا کا ڈر انہیں پیچھے کر دے وہاں لوگ دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھ جانے میں تیزی دکھا رہے تھے۔

مسجد حرام نہایت وسیع ہے اور ویسی ہی ہے جیسا کہ اس کو ہونا چاہئے۔ مگر حاجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے، اس وسعت کے باوجود، اس کو تنگ کر دیا ہے۔ تاہم ایک چیز

مجھے شدت سے محسوس ہوئی۔ اور وہ مسجد حرام کے باہر کا ماحول ہے۔ مسجد حرام کے باہر کھلی ہوئی جگہ نہیں۔ مسجد حرام کو بستی سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ صرف ایک سڑک ہے۔ نہایت ضروری تھا کہ مسجد حرام کے چاروں طرف نہایت وسیع کھلا ہوا میدان ہوتا۔ مگر موجودہ حالت یہ ہے کہ مسجد حرام کو چاروں طرف سے ہوٹلوں کی اونچی عمارتوں کے جنگل نے گھیر رکھا ہے۔ سعودی حکومت نے اگرچہ اطراف کے بہت سے مکانات کو خرید کر حرم کی توسیع کی ہے مگر یہ کام ابھی اور کرنا باقی ہے۔

حاجیوں کو میں نے دیکھا کہ ارکان حج ادا کرتے ہوئے وہ بس رٹی ہوئی دعائیں دہراتے ہیں یا کتاب ہاتھ میں لے کر اس سے پڑھتے رہتے ہیں۔ حج کی فقہی ادائیگی اگرچہ اس سے ہوجاتی ہے مگر حج کے دوران ذکر و دعا سے جو چیز مطلوب ہے اس کا حق اس طرح ادا نہیں ہوتا۔ حج کے دوران آدمی پر وہ کیفیت گزرنی چاہئے جو حضرت ابراہیم اور ان کے خاندان پر گزری تھی۔ مثلاً جب آدمی سعی کرتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلنے چاہئیں کہ خدایا تونے اس سعی کے بعد ھاجرہ کے لئے برکت کا ابدی چشمہ جاری کر دیا تھا، میری سعی کو بھی تو ایسی سعی بنا دے جس کے بعد میرے لئے خیر کے ایسے چشمے جاری ہوجائیں جو دنیا سے آخرت تک مجھے برکت دیتے رہیں۔

السید سابق نے اپنی مشہور کتاب فقہ السنہ میں بجاطور پر لکھا ہے:

ویستحب لہ ان یکثر من الذکر والدعاء ویتخیر منھما ماینشرح لہ صدرہ دون ان یتقید بشئ اویردد مایقولہ المطوفون فلیس فی ذلك ذکر محدود الزمنا الشارع بہ. ومایقولہ الناس من اذکار وادعیۃ فی الشوط الاول والثانی وھکذا فلیس لہ اصل ولم یحفظ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شئ من ذلك فلطائف ان یدعوا نفسہ ولاخوانہ بماشاء من خیری الدنیا والاخرۃ (المجلد الاول، صفحہ ۶۹۴)

طواف کرنے والے کو چاہئے کہ طواف کے وقت خوب ذکر اور دعا کرے اور ان میں سے جن پر اسے شرح صدر ہو ان کو اختیار کرلے بغیر اسکے کہ اپنے کو کسی سے مقید کرلے یا معلمین کے کہے کو دہراتا رہے۔ کیونکہ طواف میں کوئی متعین ذکر نہیں ہے جسکا شارع نے ہم کو پابند کیا ہو۔ اور عوام جو اذکار اور دعائیں شوط اول، شوط ثانی وغیرہ میں پڑھتے ہیں ان کی کوئی اصل نہیں۔ اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ثابت نہیں۔ طواف کرنے والے کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بھائیوں کیلئے جس طرح چاہے دنیا اور آخرت کی بہتری مانگے۔

حج کے مسائل جو قرآن و حدیث میں ہیں وہ اتنے کم ہیں کہ چند صفحات میں لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر فقہاء نے، دوسری عبادات کی طرح حج کے بے شمار مسائل وضع کر رکھے ہیں جن کا احاطہ عام آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ اس "اضافہ" کے حق میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ حجاج کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔ مگر اس استدلال میں کوئی وزن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض فقہی مسائل پڑھ کر کوئی شخص نہ نماز پڑھ سکتا اور نہ حج کر سکتا۔ یہ کام ایسا ہے جو دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے مفصل احکام بتانے کے بجائے یہ فرمایا۔ صلوا کما رأیتمونی اصلی (جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو اسی طرح تم بھی نماز پڑھو)

یہی اصل طریقہ ہے۔ رسول اللہ کو دیکھ کر صحابہ نے نماز پڑھی۔ صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے۔ تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے۔ اس طرح یہ سلسلہ آج تک چلا جا رہا ہے۔ اگر لوگوں کے پاس صرف فقہ کے نام نہاد تفصیلی مسائل ہوتے تو لوگ کبھی صحیح طور پر نماز نہ پڑھ سکتے۔ امام ابوحنیفہ اس فن کے سب سے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ مگر وکیع کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے ان سے کہا کہ میں نے مناسک کی ادائیگی میں پانچ غلطیاں کیں۔ پھر ایک حجام نے مجھے بتایا:
(قال وکیع : قال لی ابوحنیفہ، اخطأت فی خمسۃ ابواب من المناسك فعلّمنيها حجام، ذکرہ المحب الطبری بالتفصیل)

حاجیوں میں تقریباً ۹۵ فی صد تعداد زیادہ عمر والوں کی نظر آئی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو بے حد بوڑھے ہو چکے تھے۔ حتی کہ ایسے بھی تھے جنہیں بار بار کف آتا تھا اور وہ تھوکنے پر مجبور تھے۔ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ پلاسٹک کا تھیلا لئے ہوئے ہیں اور اس کے اندر تھوک رہے ہیں۔ یہ منظر بھی نظر آیا کہ کاغذ میں تھوک کر کاغذ کو حرم میں ڈال دیا۔ اس قسم کے تمام لوگوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنا حج بدل کرائیں۔ حج بدل جو موجودہ زمانہ میں مُردوں کے لئے عام ہو گیا ہے وہ شریعت میں اصلاً ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

عن الفضل بن عباس ان امرأۃ من خثعم قالت یا رسول اللہ ان فریضۃ اللہ علی عبادہ فی الحج۔ ادرکت ابی شیخاً کبیراً

فضل بن عباس کہتے ہیں کہ بنوخثعم کی ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ حج بندوں کے اوپر خدا کا فریضہ ہے

لایستطیع ان یثبت علی الراحلة افاحج عنه۔ قال نعم۔ وذلك فی حجة الوداع (رواہ الجماعۃ)

میرا ایک بوڑھا باپ ہے، وہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتا۔ کیا میں اس کی طرف سے حج کروں۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔

حج بدل کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی مرگیا ہو اور یہ وصیت کی ہو کہ میری طرف سے حج ادا کر دینا۔ یہ صورت استنباطی طور پر نکلتی ہے

امام مالک کے نزدیک مُردہ کی طرف سے حج بدل اسی وقت ہے جب کہ موت سے پہلے اس نے وصیت کی ہو۔ قال مالك: انما یحج عنه اذا اوصی، اما اذا لم یوص فلا یحج عنه۔ لان الحج عبادة تغلب فیه جانب البدنیة فلا یقبل النیابة، فقه السنة، المجلد الاول صفحہ ۶۳۷)

حج ہر صاحب استطاعت پر عمر میں ایک بار فرض ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حج مبرور کا بدلہ صرف جنت ہے (الحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة، (بخاری ومسلم) حضرت عمرو بن العاص کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

لما جعل الله الاسلام فی قلبی اتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت ابسط یدك فلأبایعك۔ قال فبسط فقبضت یدی فقال مالك یا عمرو۔ قلت اشترط۔ قال تشترط ماذا۔ قلت ان یغفرلی۔ قال اما علمت ان الاسلام یهدم ما قبله وان الهجرة تهدم ما قبلها وان الحج یهدم ما قبله (رواہ مسلم)

جب اللہ نے اسلام میرے دل میں ڈالا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ اپنا ہاتھ پھیلا یئے تاکہ میں بیعت کروں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے ہاتھ پھیلایا۔ مگر میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ آپ نے کہا اے عمرو ایسا کیوں۔ میں نے کہا کہ میری ایک شرط ہے۔ آپ نے فرمایا، تمہاری کیا شرط ہے۔ میں نے کہا یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اور ہجرت پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

حج مبرور کو اکثر لوگ حج مقبول کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا حج جس کے ساتھ گناہ شامل نہ ہو (الحج الذی لایخالطه اثم)

حسن بصری تابعی نے کہا ہے کہ حج مبرور وہ ہے جس سے آدمی اس طرح لوٹے کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہو اور آخرت کا شوق اس کے اندر پیدا ہو جائے (ان یرجع زاهداً فی الدنیا راغبا فی الآخرة) حقیقت یہ ہے کہ حج کو اگر صحیح شعور اور جذبہ کے ساتھ کیا جائے تو نہ صرف دوران حج آدمی گناہوں سے بچا رہے گا بلکہ اس طرح لوٹے گا کہ ہر برائی سے اس کا دل متنفر ہو اور ہر بھلائی کی طرف اس کے اندر رغبت پیدا ہو چکی ہو۔

میں جب بھی حرم میں گیا تو حجر اسود کے پاس بھیڑ دیکھی اس لئے میں نے حجر اسود تک جانے کی کوشش نہیں کی۔ طواف بھی اشارہ کے ذریعہ کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حجر اسود کی صورت میں اسلام کے اندر بھی ایک بت موجود ہے۔ مگر یہ بات سراسر واقعہ کے خلاف ہے۔

بت (صنم) کس چیز کا نام ہے۔ یہ دراصل خدا کے شرکا مقرر کرنے کا نام ہے۔ کچھ انسانی یا غیر انسانی ہستیوں کو خدا کا شریک فرض کر لیا جاتا ہے اور ان کی صورت بنا کر انہیں پوجا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی "خدائے واحد" کا کوئی بت موجود نہیں۔ جو قومیں ایک خدائے برتر کے ساتھ بہت سے دوسرے خداؤں کو مانتی ہیں ان کے یہاں صرف دوسرے خداؤں کے بت پائے جاتے ہیں، خدائے برتر کا کوئی بت ان کے یہاں نہیں پایا جاتا کیونکہ بت پرستی لازماً "شرکت" کو چاہتی ہے، شرکت کے بغیر بت پرستی کا کوئی وجود نہیں۔

اسلام میں شرکت کا کوئی تصور نہیں۔ اسی لئے حجر اسود کے ساتھ بھی بت کا کوئی تصور نہیں۔ حجر اسود صرف ایک علامتی پتھر ہے۔ مومن اس پتھر کو چھو کر یا اس کی طرف اشارہ کر کے علامتی طور پر گویا خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ یہ ایک قسم کی براہ راست بیعت ہے، جب کہ دوسری بیعت بالواسطہ بیعت ہوتی ہے۔ حجر اسود خدائے واحد سے عہد کی علامت (symbol) ہے۔ جب کہ بت خدائے واحد کے سوا دوسرے شریکوں کی شکل (image) ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حجر اسود کو بت سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے شراب کو خمر کے ہم معنی سمجھ لینا۔ اس سلسلے میں یہاں میں ایک لطیفہ بیان کروں گا۔ ایک بار دہلی میں ایک صاحب نے مجھ سے کہا: "عرب تو کھلم کھلا شراب پیتے ہیں۔ حتی کہ میں نے حرم کی سیڑھیوں پر لوگوں کو شراب پیتے ہوئے دیکھا" اس عجیب وغریب قسم کی غلط فہمی کا راز میری سمجھ میں اس وقت آیا

جب کہ میں نے حج کیا۔ اصل یہ ہے کہ عربوں میں بند ڈبہ کی مشروبات پینے کا بہت رواج ہے۔ سڑکوں پر جگہ جگہ لڑکے بالٹیوں میں بند ڈبہ کی مشروبات بھرے ہوئے فروخت کرتے رہتے ہیں اور لوگ انہیں لے لے کر پیتے رہتے ہیں۔

ان ڈبوں میں ایسے ڈبے بھی ہوتے ہیں جن پر موٹے حرفوں میں "شراب" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ شراب کا لفظ موجودہ عربی میں مشروب (drink) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ان ڈبوں میں پھلوں کے رس طبی طور پر تیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ بعض ڈبوں میں ایک سے زیادہ چیزوں کے رس ہوتے ہیں ان پر لکھا ہوا ہوتا ہے شراب فواکہ مشکلہ (mixed nectar)۔ جس چیز کو ہندستان میں شراب کہا جاتا ہے اس کو عربی میں خمر کہتے ہیں۔

۱۴۰۲ھ کا حج ستمبر ۱۹۸۲ میں پڑا۔ اس موقع پر تمام دنیا کے مسلمان تقریباً ۲۵ لاکھ کی تعداد میں حرمین کے علاقہ میں جمع ہوئے۔ خوش قسمتی سے میں بھی حج کے اس عالمی اجتماع میں شریک تھا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ عجیب چیز جو میں نے دیکھی وہ یہ کہ ان مسلمانوں کے چہروں یا ان کی سرگرمیوں پر اس تازہ حادثہ کا کوئی اثر نہ تھا جو عین انہیں دنوں میں فلسطینیوں کے ساتھ لبنان میں پیش آیا۔ تمام دنیا کے مسلم اخبارات و جرائد ان دنوں اسرائیلی مظالم کی داستانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر حج کیلئے جمع ہونے والے مسلمانوں پر بظاہر اس کا کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا تھا۔ وہ بدستور ہنس رہے تھے۔ ان کے چہرے بدستور غفلت اور بے حسی کا نشان بنے ہوئے تھے۔ مکہ اور مدینہ کے بازاروں میں خرید و فروخت کی چہل پہل بدستور اسی طرح جاری تھی جیسے ہر سال ان دنوں میں یہاں جاری رہتی ہے۔

یہ حج ایسے وقت میں پڑا جو بلا شبہہ مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کا سب سے زیادہ نازک وقت تھا۔ ایک ایسی قوم جس کو ہم مردود اور مغضوب سمجھتے ہیں اس نے ایک ایسے مسئلہ میں مسلمانوں کو بدترین شکست دی جس کے معاملہ میں تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف ہم آواز ہیں۔ یہودیوں نے زبردستی فلسطین پر قبضہ کیا۔ اپنے علاقہ کو کئی گنا حد تک بڑھا لیا۔ فلسطینیوں کو نہ صرف ان کے وطن سے بلکہ اطراف کے تمام علاقوں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ ان کی آخری سرحدی قیام گاہ لبنان تھی، یہاں بھی اس نے مسلسل بمباری کے ذریعہ فلسطینیوں کو اس قدر تباہ و برباد کیا کہ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ لبنان میں اپنے ہتھیاروں کو چھوڑ کر دور کے علاقوں میں چلے جائیں۔ چند سال پہلے تک دنیا کا کوئی مسلمان اسرائیل کا وجود

تسلیم کرنے پر راضی نہ تھا۔ انور سادات نے ۱۹۷۸ میں کیمپ ڈیوڈ کے معاہدہ کے تحت اسرائیل کے وجود کو تسلیم کیا تو تمام دنیا کے مسلمانوں نے انور سادات کو غدار کہا، حتی کہ اسے قتل کر ڈالا۔ مگر آج فلسطینی مجاہدوں سمیت تمام مسلمان ذہنی طور پر اس کے لئے راضی ہو چکے ہیں کہ وہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لیں۔

ایسی ذلت آمیز شکست مسلمانوں کو اپنی طویل تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئی۔ مگر حج کے عالمی اجتماع میں اس کا کوئی قابل مشاہدہ اثر پانا ناممکن تھا۔ میرے علم کے مطابق صرف یہ واقعہ ہوا کہ کچھ ایرانیوں نے منٰی کی سڑکوں پر "مرگ بر اسرائیل" کے نعرے لگائے۔ مگر جن لوگوں کو مسلم ممالک کی سیاست کا اندازہ ہے انہیں یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی کہ یہ نعرہ حقیقتہً سعودی حکومت کے خلاف تھا نہ کہ اسرائیلی حکومت کے خلاف۔ یہ مجاہدین اسلام اگر واقعتہً اسرائیل کی ہلاکت چاہتے ہیں تو کیوں نہ انہوں نے اپنی فوجیں لبنان یا اسرائیل کے اندر داخل کر دیں۔ کیوں ایسا ہے کہ وہ مسلم ملک میں داخل ہو کر اسرائیل کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں۔

اس الم ناک صورت حال کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف مسٹر صادق نیہوم نے اپنی ایک گفتگو میں اشارہ کیا۔ صادق نیہوم عربی سمیت چھ زبانوں کے ماہر ہیں اور اس وقت جنیوا میں مقیم ہیں۔ انہوں نے کہا: اسرائیل ہم کو نہیں مارتا، ہم تو پہلے ہی سے مرے ہوئے لوگ ہیں (اسرائیل لم تقتلنا، نحن موتی من قبل)

ہماری قیام گاہ حرم سے بہت قریب شارع ابراہیم الخلیل پر تھی۔ چنانچہ کھانے اور سونے کے علاوہ میرا بیشتر وقت حرم میں گزرتا تھا۔ میرا معمول تھا کہ باب الهجرہ کے پاس زمزم کے پانی سے وضو کرتا اس کے بعد سیر ہو کر زمزم پیتا اور پھر حرم میں داخل ہو جاتا۔ اکثر اوپر کے حصہ میں، کیونکہ اوپر کے حصہ میں زیادہ سکون رہتا تھا۔ وہاں نماز پڑھتا، تلاوت کرتا، کعبہ کو دیکھتا۔ روزانہ گھنٹوں اس طرح گزر جاتے کہ وقت کا کچھ اندازہ نہ ہوتا۔ خواہ کتنی ہی زیادہ دیر ہو چکی ہو، جب لوٹتا تو معلوم ہوتا کہ ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں چونکہ افریقہ کی طرف سے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر یہاں آیا تھا۔ اور عربوں کے ساتھ ٹھہرا تھا، اس لئے ہندستانی حاجیوں سے میری واقفیت نہ ہو سکی۔ البتہ میرے لڑکے

ثانی اثنین نے ٹیلی فون پر بتایا تھا کہ نورالدین آزاد صاحب (بمبئی) حج کے لئے جارہے ہیں۔اس لئے ان سے ملنے کی خواہش تھی۔ میں نے کئی دن اِدھر اُدھر دیکھا۔مگر وہ نظر نہ پڑے۔ اور ان کی قیام گاہ کا مجھے علم نہ تھا۔ آخر میں مایوس ہوگیا۔ اور بطور خود سمجھ لیا کہ اب ان سے مکہ میں ملاقات نہ ہوسکے گی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ ۳۰ ستمبر کی شام کو میں حرم میں لیٹا ہوا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھا کہ میں حرم میں داخل ہوا ہوں تو سامنے نورالدین آزاد صاحب کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بعینہٖ اسی صورت میں اگلے دن (یکم اکتوبر کو) پیش آیا۔ میں حرم میں داخل ہوکر ابھی صحن میں کھڑا تھا کہ اچانک نورالدین آزاد صاحب نظر پڑ گئے۔ ان کے ساتھ بمبئی کے کچھ اور حجاج سے ملاقات ہوئی۔

۴ اکتوبر ۱۹۸۲ کی شام ہم نے طواف وداع کیا، اور رات کو مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔ کعبہ کا آخری طواف کرکے جب میں حرم سے نکلا تو میری عجیب کیفیت تھی۔ بار بار مڑکر حرم کو دیکھتا تھا۔ قدم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے اور دل پیچھے کی طرف کھنچا چلا جارہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے وطن اصلی سے نکل کر اپنے دارالھجرت کی طرف جارہا ہوں۔ اس طرح کی کیفیات کے ساتھ ہم مسجد حرام سے رخصت ہوکر ۴ اکتوبر کی شب کو مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔

مکہ میں حراء وغیرہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مدینہ میں مسجد نبوی کے علاوہ بدر، جبل احد، مسجد قبا، جبل جن، وادیٔ عقیق، جنت البقیع وغیرہ مقامات دیکھے۔ مدینہ کی الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ یونیورسٹی) بھی دیکھی۔ وہاں کے اعلیٰ ذمہ داروں (رئیس اور امین عام وغیرہ) سے ملاقات ہوئی۔ یہ سب لوگ الاسلام یتحدی کو پڑھے ہوئے تھے۔ ۹ اکتوبر ۱۹۸۲ کو مدینہ یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے ایک تقریر ہوئی۔ زیادہ تر ہندستانی اور کچھ عرب طلبہ اجتماع میں شریک تھے۔ تقریر کا موضوع یہ تھا کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد دعوت الی اللہ ہے نہ کہ اس قسم کی سیاسی اور قومی سرگرمیاں جو آج تمام مسلم ملکوں میں پائی جارہی ہیں۔

حرم نبوی میں داخلہ بڑا اثرانگیز تھا۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایک پوری تاریخ آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ میری زبان سے یہ دعا نکلی کہ خدایا، میں تیرے رسول پر صلوۃ وسلام بھیجتا ہوں۔ مجھ کو اپنے رسول کی امت میں شامل کرلے۔ مجھ کو ان لوگوں میں لکھ لے جن

کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گے۔ اور جن کی شفاعت کو قبول کرکے آپ انہیں جہنم سے بچالیں گے اور جنت میں داخل کریں گے ــــــــ کیسا عجیب ہے وہ دن جو آچکا ہے اور کیسا عجیب ہے وہ دن جو آنے والا ہے۔

۵ اکتوبر ۱۹۸۲ کو ہم مدینہ پہنچے۔ راستہ میں بدر اور دوسرے مقامات ملے۔ مگر آج کا "بدر" بس نام کا بدر ہے۔ اس کو دیکھ کر حافظہ کے خانہ میں ضرور یہ تصور جاگتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلام اور غیر اسلام کی پہلی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ مگر موجودہ بدر کا ظاہری ماحول اس کی تصویر پیش کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تاہم بعض شہداء بدر کی قبریں اب بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

مدینہ میں ہمارا قیام مسجد نبوی کے بالکل قریب فندق احد میں تھا۔ اذان اور تکبیر تک کی آواز ہمارے کمرہ میں پہنچتی تھی۔ کئی دن تک مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی توفیق نصیب ہوئی۔ مگر نمازیوں کا ہجوم اس قدر ہوتا ہے کہ بمشکل کسی کو سکون اور توجہ کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مکہ کے قیام کے ابتدائی دنوں میں میرے ساتھ یہی صورت پیش آئی تھی۔ اس کے بعد میں مسجد حرام کی اوپر کی منزل پر نماز پڑھنے لگا۔ وہاں مجھے کافی سکون رہتا تھا۔ مسجد نبوی کو معلوم نہیں کس مصلحت کی بنا پر دو منزلہ نہیں بنایا گیا کہ میرے جیسا کوئی آدمی وہاں پناہ لے سکے۔

مسجد نبوی غیر معمولی طور پر وسیع اور شاندار ہے۔ مگر زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے، تمام وسعتوں کے باوجود اس کو ناکافی بنا دیا ہے۔ تاہم میرے جیسے آدمی کے لئے یہ منظر کوئی خوشگوار منظر نہ تھا کہ مسجد نبوی کے اطراف کو دکانوں اور ہوٹلوں نے گھیر رکھا ہے۔ صرف ایک طرف کا حصہ دکانوں اور ہوٹلوں سے خالی ہے جس کے اوپر خیمہ نما تعمیرات نمازیوں کے لئے کھڑی ہوئی ہیں۔ کاش مسجد کے چاروں طرف کھلا ہوا میدان ہوتا تو مسجد کی عظمت زیادہ نمایاں ہوتی۔

آج کے مدینہ میں قدیم زمانہ کے مدینہ کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا۔ آج کا مدینہ بس جدید طرز کی عمارتوں کا ایک شہر ہے۔ تاہم وہ جدید طرز کی شہری منصوبہ بندی کی خصوصیات سے خالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نو تعمیر عمارتوں کا ایک جنگل ہے جو عدم تخطیط کی زمین پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی عدم تخطیط یا سوء تخطیط کا یہ نتیجہ ہے کہ مسجد نبوی

کے چاروں طرف اس کے شایان شان زمین خالی چھوڑی نہ جا سکی۔

یہی حال مکہ کا ہے اور یہی حال مدینہ کا، مکہ اور مدینہ دونوں اسلامی تاریخ کے اہم ترین مقامات ہیں۔ سو سال پہلے یہاں کثرت سے تاریخی آثار موجود تھے۔ مگر اصلاحی مجاہدین نے ان تمام آثار کو بدعت کے مقامات قرار دے کر مٹا دیا۔ ہمارے مصلحین کو واقعہ کا صرف ایک پہلو معلوم تھا۔ یہ کہ یہاں بعض جاہل قسم کے لوگ بدعتی افعال کرتے ہیں۔ انہیں اس کی خبر نہ ہو سکی کہ یہ اسلامی تاریخ کے زندہ نشانات ہیں۔ اور ان کو مٹا کر وہ اسلامی تاریخ کو اس کے ایک قیمتی جزء سے محروم کر رہے ہیں جس کی تلافی کبھی ممکن نہ ہوگی ـــــ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں علمی ذوق کی کمی نے اسلام کو کیسے کیسے نقصانات پہنچائے ہیں۔

۳ ستمبر ۱۹۸۲ کو حج کے مناسک کی تکمیل ہوئی۔ اور ہم دوبارہ مکہ واپس آئے۔ مطابع دا الثقافہ (مکہ) کی طرف سے ہر سال حاجیوں کے اعداد و شمار شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے اعلان کے مطابق اس سال (۱۴۰۲ھ) سعودی عرب کو چھوڑ کر دوسرے تمام ممالک سے آنے والے حاجیوں کی کل تعداد ۸۵۳۵۵۵ تھی۔ زیادہ تعداد والے چند ملکوں کے نام یہ ہیں:

۰۱	مصر	۹۸۴۰۸
۰۲	ایران	۸۹۵۰۳
۰۳	نائیجیریا	۸۱۱۲۸
۰۴	پاکستان	۷۲۸۴۴
۰۵	انڈونیشیا	۵۷۴۷۸
۰۶	ترکی	۵۳۷۸۸
۰۷	الجزائر	۴۰۴۰۰
۰۸	شام	۲۷۸۹۰
۰۹	ہندستان	۲۶۲۲۹

سعودی حکومت کے بے شمار انتظامات نے موجودہ زمانہ میں حج کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ تاہم ایک چیز ایسی ہے جس کا اس کے پاس شاید کوئی حل نہیں۔ اور

وہ حاجیوں کا ہجوم ہے۔ خاص طور پر شیطان کو پتھر مارنے کے موقع پر لوگ جس طرح ایک دوسرے کے اوپر ٹوٹتے ہیں وہ انتہائی حد تک افسوس ناک ہے۔ بے شمار انسان بیک وقت شیطان کو مارنے کے لئے اس طرح ہجوم کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامتی شیطان کو کنکری مارنے کا انہیں اتنا جوش ہے کہ اس کی خاطر وہ حقیقی انسان کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ خدا کے ایک حکم کی تعمیل کے شوق میں خدا کے دوسرے حکم کو نظر انداز کرنے کی اس سے مارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ اب تک میں نے اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھی تھی۔ کئی آدمی ایسے نظر پڑے جن کے ہاتھ یا پاؤں میں پلاسٹر بندھا ہوا تھا۔ ایک منظر یہ بھی دیکھنے کو ملا کہ رمی کے وقت ایک حاجی گر پڑا اور حاجیوں کے قدموں کے نیچے کچل کر ختم ہو گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ اس طرح کے واقعات ہر سال ہوتے رہتے ہیں۔ کیسا عجیب ہے وہ حج جس میں انسانی دشمن کی ایک علامت کو مارنے کے جوش میں خود انسان کو مار ڈالا جائے۔

حج ایک قسم کا تجدید ایمان ہے۔ حج سے پہلے کا ایمان گویا ایک موقت ایمان ہے۔ اس کے بعد مومن جب مکہ پہنچتا ہے اور لبیک لبیک کہہ کر بیت اللہ کا طواف کرتا ہے تو گویا وہ اپنے ایمان کی تجدید کرتا ہے۔ وہ براہ راست خدا سے "بیعت" ہوتا ہے۔

حج کے بعد گناہوں کی معافی عین اس قانون کے تحت ہے جو قبولیت اسلام سے متعلق ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آدمی کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ بندے کے ساتھ یہ معاملہ ایمان اول کے بعد شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایمان ثانی کے بعد گویا اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایمان اول اگر بالواسطہ ایمان تھا تو ایمان ثانی براہ راست ایمان ہے۔ معذوری کی حالت میں ایمان اول ہی خدا کی رحمت سے آدمی کے گناہوں کی معافی کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ مگر صاحب استطاعت کے لئے ایمان ثانی کے بعد اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص استطاعت رکھتا ہو اور پھر بھی حج ادا کئے بغیر مر جائے تو خدا کو اس کی پروا نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرا یا نصرانی ہو کر مرا (من ملك زاداً و راحلةً تبلغه حج بيت الله الحرام و لم يحج فلا عليه ان يموت يهوديا او نصرانيا، رواه الترمذي والبيهقي)

حقیقت یہ ہے کہ حج تمام عبادتوں کا سردار ہے۔ کعبہ کا جو درجہ دوسری مسجدوں کے درمیان ہے وہی درجہ حج کا دوسری عبادتوں کے درمیان۔

ایک سفر

۱۹ دسمبر ۱۹۸۲ کی صبح کو میں ایر انڈیا کے جہاز کے ذریعہ دہلی سے طرابلس کے لئے روانہ ہوا۔ پالم ایرپورٹ پر ہم لوگ پہنچے تو سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری (مختار محمد الامشری) الوداع کہنے کے لئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ موصوف پورے معنوں میں ایک عرب نوجوان ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان سے دینی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ وہ ہندستان آنے سے پہلے میری عربی کتابیں پڑھ چکے تھے، اس لئے گفتگو کا بڑا حصہ انھیں کتابوں سے متعلق رہا۔

ساتھیوں سے رخصت ہو کر اندر داخل ہوا تو کچھ ہندستانی مسافر ملکی سیاست کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے جوش کے ساتھ کہا: "چرن سنگھ، جگجیون رام، مرارجی ڈیسائی، کوئی بھی سیاست نہیں جانتا سیاست اندرا گاندھی جانتی ہے، وہ تو کھا جائے گی پاکستان کو" اسی قسم کی باتیں ناموں کی تبدیلی کے ساتھ آپ کو سرحد کے دوسری طرف بھی سننے کو ملیں گی۔ دونوں ملکوں میں دوسرے کی تخریب کا نام سیاست ہے۔ اپنی تعمیر کا نام سیاست ہے، اس کو دونوں میں سے کسی نے ابھی تک نہیں جانا۔

ہمارے جہاز کے بیشتر مسافر یورپ جا رہے تھے۔ ان کی اکثریت غالباً ان ہندستانیوں پر مشتمل تھی جو یورپ میں مقیم ہیں اور ایشیائی کھیل دیکھنے کے لئے ہندستان آئے تھے۔ ان کے چہرے بےفکری کی علامت بنے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بار بار قہقہے لگاتے تھے۔ میرے دل نے کہا: انسان کی بےخبری بھی کس قدر عجیب ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں حالانکہ بہت جلد وہ روئیں گے۔ لوگ بول رہے ہیں حالانکہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ ختم ہو جائیں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں حالانکہ بالآخر خندق کے سوا کوئی چیز نہیں جو لوگوں کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے مگر یہی وہ حقیقت ہے جس کا نہ کوئی جاننے والا ہے اور نہ کوئی اس کو بتانے والا۔

دہلی سے اڑان کے بعد جہاز تقریباً نو گھنٹے تک چلتا رہا، یہاں تک وہ ساڑھے سات ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے روم (اٹلی) پہنچا۔ اس درمیان میں جہاز کا اناؤنسر بار بار اعلان کرتا رہا ______ "اب ہم شام کے اوپر سے اڑ رہے ہیں۔ اب ہم یونان پہنچیں گے۔ اب ہم

اٹلی کی فضا میں داخل ہوگئے" زمینی سواری کے لئے بار بار راستے کی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں اتنا طویل سفر مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہیں۔ مگر خدا نے فضا کی صورت میں انسان کو ایسی کھلی سڑک دے دی ہے جہاں تمام رکاوٹوں سے بلند ہوکر انسان برابر اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے۔ اس واضح نشانی کے باوجود بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "زمینی" رکاوٹوں میں الجھے رہتے ہیں۔ ان میں یہ حوصلہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ "فضا" میں بلند ہوکر اپنی زندگی کے سفر کے لئے بلا رکاوٹ میدان حاصل کرلیں۔

ہوائی جہاز میں مطالعہ کے لئے رسالے دئے جاتے ہیں جن کو اصطلاح میں اندرون پرواز رسالہ (Inflight Magazine) کہا جاتا ہے۔ ایئر انڈیا میں اس قسم کا دو ماہی انگریزی میگزین مسافروں کو فراہم کیا جاتا ہے جس کا نام نمسکار ہے۔ اس کے شمارہ دسمبر ۸۲ جنوری ۸۳ میں فلم "گاندھی" پر ایک مضمون تھا۔ اس کے ساتھ بن کنگسلے (Ben Kingsley) کی کئی تصویریں مہاتما گاندھی کے روپ میں تھیں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے مذکورہ فلم میں گاندھی کا کردار ادا کیا ہے۔

یہ خوبصورت میگزین ہانگ کانگ میں ٹامسن پریس نے چھاپا ہے۔ جس جہاز (Boing 747) میں ہم اڑ رہے ہیں وہ امریکہ کا بنا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے باپو کی فلم بنانے کے لئے موزوں ترین ایکٹر اور ڈائرکٹر بھی مغرب میں ملے ہیں ——— کیسی عجیب ہے ہندستان کی ترقی اور کیسی عجیب ہے اس کی پس ماندگی۔

ایئر انڈیا کے اس میگزین میں مسٹر آہوجہ کا ایک انٹرویو بھی شامل ہے جو انھوں نے فلم "گاندھی" کے فلم ساز (Sir Richard Attenborough) سے لیا تھا۔ سر رچرڈ اٹن برونے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ کہانی بتاتے ہوئے اس کی ساری بات نہیں کہی جا سکتی۔ فلم گاندھی میں مہاتما کی زندگی کے ابتدائی ۳۰ سال نہیں ہوں گے اور یقیناً فلم میں کچھ ڈرامائی واقعات بھی ہوں گے:

> While telling a story you cannot relate everything. The first 30 years of the Mahatma's life will not be there, and the film must have some dramatic form.

فلم ساز تاریخ میں جو تصرف کرتا ہے وہی اکثر مورخ اور مفکر بھی کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فلم ساز بتا کر کرتا ہے اور مورخ اور مفکر بغیر بتائے ہوئے۔

انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ اس پر

گاندھی جی نے مشہور ڈانڈی مارچ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ دو ہزار آدمیوں کو لے کر ساحل پر جائیں اور نمک بنا کر سرکاری حکم کی خلاف ورزی کریں۔ اس موقع ایک انگریز افسر نے کہا تھا:

Let him make his salt; Mr. Gandhi will have to find a great deal more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو مغلوب کرسکیں۔

اسی طرح گاندھی جی نے جب چرخا چلایا تو ان کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر یہ گاندھی کی بہت گہری تدبیر تھی۔ سیاست کی ایک قسم یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں کوئی اتنا بڑا واقعہ کیا جائے کہ حریف غیر ضروری طور پر چوکنا ہو جائے اور اپنی بھرپور طاقت کو استعمال کرکے تحریک کو کچل ڈالے۔ دوسری سیاست یہ ہے کہ بظاہر بے ضرر اقدام سے آغاز کیا جائے جو حریف کو اتنا معمولی دکھائی دے کہ وہ اس کو نظر انداز کر دے۔ اس طرح تحریک کو اپنا کام کرنے کا موقع مل جائے۔ وہ دھیرے دھیرے نفوذ کرتی رہے، یہاں تک کہ حریف کو اس کی ناقابل تسخیر طاقت کا اندازہ اس وقت ہو جب کہ معاملہ اس کے قابو سے باہر جا چکا ہو۔ ہندستان میں اولاً مسلم لیڈروں نے پہلی قسم کی سیاست چلائی اور وہ ناکام رہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے دوسرے قسم کی سیاست چلائی اور وہ کامیاب رہے۔ مہاتما گاندھی کا "چٹکی بھر نمک"، بالآخر اتنا بڑا پہاڑ بن گیا جس کا بوجھ سنبھالنا برطانی سلطنت کو ناممکن دکھائی دینے لگا اور اس نے ہندستان کو آزاد کر دیا۔

دہلی سے طرابلس کے لئے میں ۱۹ دسمبر کی صبح کو چلا تھا اور اسی دن شام کو میں طرابلس پہنچ گیا۔ اس تقریباً ۹ ہزار کلومیٹر کے سفر کا آمد ورفت کا کرایہ ۱۳۶۵۸ روپیہ ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لئے اتنی رقم درکار نہیں ہوتی تھی۔ مگر دوسری اس سے بڑی چیز جو درکار ہوتی تھی وہ وقت تھا۔ آج ایک شخص دہلی سے روانہ ہو کر ۱۲ گھنٹے کے اندر طرابلس پہنچ جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسے سفر کے لئے ۱۲ مہینے بھی یقینی نہیں تھے۔ مزید یہ کہ جانے والا اپنے متعلقین کو اس درمیان میں کوئی خبر نہیں بھیج سکتا تھا۔ اس کے متعلقین کو اس کی خبر صرف اس وقت ہوتی تھی جب کہ وہ برسوں کے بعد اپنا سفر پورا کرکے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے۔ جب کہ موجودہ زمانے کی امکانیات کا یہ حال ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۳ کو جب واپسی کے لئے میرا رزرویشن ہوا تو اسی دن ٹلکس کے ذریعہ بھیجی ہوئی یہ خبر دہلی میں میرے دفتر کو پہنچ گئی کہ ۵ جنوری کی صبح

کو میں دہلی پہنچنے والا ہوں۔

ہوائی جہاز کیا ہے، قدرت کی نقل۔ ہوائی جہاز در اصل قدرتی چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ قدرت نے ایک چڑیا کے ہوائی سفر کے لئے جو اصول مقرر کئے ہیں اسی کو انسان کے ہوائی سفر میں استعمال کرنے کا نام ہوائی جہاز ہے۔ انسان کا یہ تضاد بھی کیسا عجیب ہے کہ وہ اپنی دنیا کے سفر کے لئے قدرت کی نقل کرنے پر بخوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ مگر آخرت کے سفر کے لئے وہ قدرت کی نقل کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ مادی معاملات میں وہ جس معبود کا پرستار ہے۔ اسی معبود کی پرستاری روحانی اور اخلاقی معاملات میں اس کو منظور نہیں۔

طرابلس میں ہمارا قیام ہوٹل الکبیر (کمرہ نمبر ۴۰۸) میں تھا۔ جب میں اس کمرہ میں داخل ہوا تو یہ کمرہ مجھے بالکل اجنبی معلوم ہوا تھا۔ مگر دو ہفتے بعد ۴ جنوری ۱۹۸۳ کو جب میں اس کمرہ سے رخصت ہو کر نکلا تو مجھے ایسا لگا جیسے میں اور کمرہ دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو چکے ہیں۔ یہی انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ وہ نئی چیز سے بھڑکتا ہے اور جس چیز سے زیادہ عرصہ تک وابستہ رہے اس کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ سچائی کو پانے کے لئے آدمی کا یہ مزاج اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ قدیم چیز کو محض انس کی بنا پر پکڑے رہتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی بے حقیقت ہو۔ وہ نئی چیز کو صرف عدم انس کی بنا پر اختیار نہیں کر پاتا، خواہ وہ کتنی ہی بڑی سچائی ہو۔ حتیٰ کہ دلائل جب اس کے ذہن کو مفتوح کر لیتے ہیں اس وقت بھی وہ اقدام کرنے سے ہچکتا ہے۔ آدمی اکثر حالات میں اپنے مانوس گھروندوں کو حقیقی سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت وہ ہے جو دلیل سے ثابت ہو نہ کہ وہ جس سے مانوسیت کی بنا پر آدمی متعلق ہو جائے۔

۲۲ دسمبر ۱۹۸۲ کی شام کو المجلس العالمی للدعوۃ الاسلامیۃ کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ تلاوت قرآن کے بعد ضروری کارروائی ہوئی۔ ۲۳ دسمبر کو مجلس کے قواعد وضوابط مقرر کئے گئے۔ پورا دن اس میں صرف ہو گیا۔ ۲۴ دسمبر کو دعوتی مسائل پر گفتگو شروع ہوئی۔

ایک عرب نوجوان (السائح علی حسین) نے موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مسائل کے بارہ میں تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا: مشکلات الدعوۃ الاسلامیۃ فی العالم المعاصر۔ آخر میں انھوں نے کہا: آپ کی یہ مجلس اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر اس قابل ہے کہ وہ متعین کرے کہ ہم کہاں سے شروع کریں (ان مجلسکم ہذا لہو المؤہل لعلمہ وخبرتہ لان یحدد لنا من این نبدأ)

اس سلسلے میں مختلف ممبروں نے اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔ میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ آج

سب سے پہلا اور بنیادی کام جدید تقاضوں کے لحاظ سے اسلامی لٹریچر کی تیاری اور اس کی اشاعت ہے۔ مجلس عالمی کے اس اجتماع میں تین زبانیں رائج تھیں ——— عربی، انگریزی، فرانسیسی۔ میں نے اپنے خیالات انگریزی زبان میں پیش کئے۔ مقابل کے صفحہ پر میری تقریر کا خلاصہ نقل کیا جارہا ہے۔

بعض ممبروں کا خیال تھا کہ موجودہ مسلمان دنیا بھر میں کروروں کی تعداد میں دشمنان اسلام کے ظلم کا نشانہ بن رہے ہیں۔ پہلے ہم کو انھیں بچانے کی فکر کرنا چاہیۓ نہ یہ کہ ہم مسلمانوں کی تعداد بڑھانے میں لگ جائیں۔ میں نے کہا کہ دعوت اسلام کا مسئلہ مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ شہادت کی ذمہ داری ادا کرنے کا مسئلہ ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر میں تشریف لائے تو بنی اسرائیل پر وہاں کی قومی حکومت سخت مظالم کررہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے ایک طرف بنی اسرائیل کو بچانے کی فکر کی، اسی کے ساتھ عین اسی وقت انھوں نے فرعون اور اس کی قوم کو حق کا پیغام دیا۔ سب سے اہم بات جو جاننے کی ہے وہ یہ کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ ان پر خاص طور پر ان کے علماء پر یہ لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچائیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر یہ ذمہ داری ان سے ساقط نہیں ہو سکتی۔

تاہم بحثوں اور گفتگوؤں میں لوگوں کا رخ دعوت سے زیادہ دفاع کی طرف رہا۔ آجکل پوری مسلم دنیا میں یہ حال ہے کہ "دشمنان اسلام"، کے پیدا کردہ مسائل سے لوگوں کے ذہن اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ وہ دعوت کے پہلو پر زیادہ سوچ نہیں پاتے۔ حریف کو مدعو کی نظر سے دیکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ایک بار اس موضوع پر گفتگو تھی کہ جہاد سے مراد اصلاً جہاد دعوت ہے نہ کہ قتال۔ اس پر ایک صاحب (مبارک قسم اللہ زاید سوڈانی) بولتے ہوئے کافی جذباتی ہو گئے۔ ان کے نزدیک اس قسم کی باتیں قتال سے فرار کا فلسفیانہ بہانہ تھیں۔ تقریر کے دوران ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا: این سیفنا الذی اخفیناہ این روح قتالنا الذی اھملناہ۔ یہ جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار رو پڑے اور آگے اپنی تقریر جاری نہ رکھ سکے۔

بعض لوگوں نے شدت کے ساتھ اس پہلو کی طرف زور دیا کہ ہم لوگ بات کرنے میں بہت آگے ہیں۔ مگر عمل کرنے میں اتنا ہی پیچھے ہیں۔ ایک صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا: کلنا جید فی النظریۃ وکلنا عاجز فی التطبیق میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ابھی خود "نظریہ" ہی واضح طور پر سامنے نہ آسکا۔ اگر فی الواقع صحیح اور قابل عمل نظریہ لوگوں کے سامنے آجائے تو عمل

Mr. Chairman and the members of the World Council,

It is really a great pleasure to be with you Muslim brethren from all over the world to discuss matters of Islamic Dawa. Islamic Dawa is, without doubt, the most important issue upon which we can get together. I congratulate Brother Dr. M.A. Sharif and the other authorities of Jamiat Al-Dawa on having provided us with this rare opportunity.

This international Islamic gathering symbolizes two great Islamic causes: firstly, united effort and secondly, orientation in the right direction. We can only achieve success by united effort, and Dawa is the only direction in which we should organize our struggle if it is to result in fruitful ends.

I pray God to be with you and bestow His help upon you, so that Islam may regain its former glory.

Now some words on the point of discussion. Brother Said Ali Hussain has rightly pointed out that the basic question is: from where to begin? The answer is: we should begin from literature. Producing literature is the principal task of Islamic Dawa.

At this time, the field of Dawa is open all over the world. But Dawa literature, in the real sense, exists nowhere. The most urgent need of our time is to prepare Islamic literature and to publish it in all the important languages. As our Japanese brother has pointed out, the lack of Islamic literature is the most acute problem of Islamic Dawa at present.

This is the same same method as was followed by the Islamic movement in the early period of its history. It is a well-known fact that the first revelation of the Quran was the verse, "Recite! Your Lord is the Most Bountiful One, who by the pen taught man what he did not know." (Quran, 96:3-4) This means that the teaching of God started through the pen, or in other words, through literature, which is the product of the pen.

One might say that there is so much islamic literature. That is true, but it is still not sufficient. Either it is not prepared in contemporary style, or it is not meant as an introduction to Islam, but only as a defence of Islam.

Firstly, we need good and correct translations of Quran and Hadith in all the languages of the world, just as the Christians' Holy Book is found in all the prevailing languages of the world.

Then we need a set of books in which Islam is presented simply and scientifically.

Also we need some journals and periodicals in which Dawa issues all over the world are discussed regularly, and news concerning Islamic Dawa published.

So, the basic task ahead is to produce Dawa literature in every language. Islamic Dawa started from here in the beginning, and it should start from here again.

Thank you.

کرنے والوں کی کمی نہ ہوگی۔

موجودہ ۳۶ رکنی عالمی کونسل میں دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک علی آبی (Ali Abe) جو جاپان سے آئے ہیں۔ وہ نومسلم ہیں۔ پہلے وہ سرکاری افسر تھے اب خود اپنا ایک قانونی ادارہ چلا رہے ہیں۔

علی آبی نے بتایا کہ ایک صاحب کسی عرب ملک کی طرف سے مبعوث ہوکر جاپان میں تبلیغ کے لئے آئے۔ تین سال تک وہ تبلیغ کرتے رہے۔ مگر کسی نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک روز ایسا ہوا کہ انھوں نے کچھ جاپانیوں کے سامنے تقریر کی اور اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی۔ حدیث یہ تھی۔

عن ابی هريرة، قال جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يارسول الله من احق الناس بحسن صحابتی قال امك - قال ثم من قال امك - قال ثم من قال امك - قال ثم من قال ابوك (متفق عليه) اس سادہ گفتگو کا اتنا اثر ہوا کہ اسی مجلس میں دس جاپانی مسلمان ہوگئے۔ انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم بنیادی طور پر مادری محبت (Mother-loving) والی قوم ہے اس لئے یہ حدیث اس کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ مزید انھوں نے بتایا کہ جاپانی قوم حقیقت پسند اور سنجیدہ مزاج قوم ہے۔ اس کو عملی باتیں اور مختصر باتیں زیادہ پسند آتی ہیں۔ اس لئے جاپان میں تبلیغ کرنے کے لئے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بہت زیادہ موزوں ہیں۔ مگر جاپانی زبان میں احادیث کا ترجمہ موجود نہیں۔ صرف ایک کتاب چھاپی گئی ہے مگر اس میں نکاح وطلاق کے مسائل تک ساری چیزیں درج ہیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ موجودہ مرحلہ میں اگر اخلاقی اور روحانی حدیثوں کا ایک مجموعہ صرف سادہ ترجمہ کے ساتھ جاپانی زبان میں چھاپا جائے تو وہ جاپانیوں پر تبلیغ کے لئے بہت موثر ہوگا۔

میں نے ان سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جاپانی قوم دنیا کی سب سے زیادہ ذہین قوم ہے۔ انھوں نے کہا ایسا نہیں۔ البتہ جاپانی قوم بے حد محنتی قوم ہے۔ ایک جاپانی کارکن دفتر یا کارخانہ میں کام کر رہا ہے۔ اس کا مقررہ وقت ختم ہوجاتا ہے مگر کام ختم نہیں ہوتا تو وہ کام چھوڑ کر گھر جانا پسند نہیں کرے گا۔ وہ مزید دو گھنٹے محنت کرکے اپنا کام پورا کرے گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سے پہلے جب میں سرکاری ملازم تھا تو اکثر ایسا ہوا کہ میں نے ہفتہ میں اپنی دو دن کی چھٹی استعمال نہیں کی اور چھٹی کے دونوں دن دفتر جاکر اپنا کام مکمل کیا۔

علی آبی نے کہا ——— جاپانی لوگ بالقوہ مسلمان ہیں:

مگر ہمارے یہاں جو باہر کے مسلمان آرہے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے ہیں۔ مثلاً جاپانی کھانا کھاتے ہوئے بائیں ہاتھ کو استعمال کرتا ہے، اس پر یہ لوگ سخت اعتراض کرتے ہیں وغیرہ یہ چیزیں جاپانیوں کے عمومی اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ جاپانی بنیادی طور پر سادہ، حقیقت پسند اور الفاظ سے زیادہ معانی پر دھیان دینے والا ہوتا ہے۔ اس لئے فطری اسلام اس کو بہت زیادہ اپیل کرتا ہے۔ مگر امام اور واعظین جس اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں وہ جاپانیوں کے لئے قابل قبول نہ ہوسکے گا۔

۲۶ دسمبر ۱۹۸۲ کو ندوۃ السیرۃ النبویہ کے نام سے ایک اجتماع یہاں کی ایک بڑی مسجد میں ہوا جو جمعیۃ الدعوۃ کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس اجتماع میں سیرت کے مختلف پہلوؤں کے بارہ میں مقالات پڑھے گئے اور ان پر سوال وجواب ہوا۔ یہ سیرت کے عام جلسوں کے برعکس ایک خالص علمی اجتماع تھا۔ اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس میں شریک تھے۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لوگوں نے زیادہ محنت کرکے مقالات نہیں لکھے۔ متعلقہ موضوع سے متعلق جس کے دماغ میں جو کچھ تھا اس کو اس نے لکھ لیا اور یہاں آکر پڑھ دیا۔ سیرت کے موضوع پر بے شمار کتابیں اور مقالات لکھے جاچکے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سیرت پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ مگر سیرت کے بقیہ پہلو اسی وقت کھولے جاسکتے ہیں جب کہ اس کے لئے کافی محنت کی جائے۔

یہاں دنیا بھر سے مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ تقریباً ہر جگہ کے لوگوں نے بتایا کہ غیر مسلموں میں دین کی اشاعت کے کافی امکانات ہیں۔ امریکہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ امریکہ کے لوگ بے حد غیر جانبدارانہ انداز سے چیزوں کو دیکھتے ہیں اور جب کسی چیز کو پکڑ لیتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں۔ یہ امریکی قوم کا مزاج ہے۔ اس لئے امریکہ میں اگر اسلام پھیلایا جائے تو یہ ہمارے لئے بہت زیادہ تقویت کا باعث ہو۔ مگر ہر جگہ کے لوگوں کی یہ مشترک شکایت تھی کہ جدید ضرورتوں کے لحاظ سے ہمارے پاس اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔

امریکہ کے ایک نوجوان جو اس اجتماع میں شریک تھے، ان سے اکثر ملّی امور پر باتیں ہوتی رہیں۔ ان کا ذہن دعوتی سے زیادہ قومی تھا۔ ان سے میں نے کہا کہ آپ دوسری قوموں کو ظالم اور مسلمان کو مظلوم بتاتے ہیں۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ظالم ہیں اور دوسری قومیں مظلوم۔ دوسری قومیں ہم سے اگر ہماری دنیا چھین

رہی ہیں تو ہم دوسری قوموں سے ان کی آخرت چھین رہے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا دعوتی نقطۂ نظر ان کے ذہن میں کچھ زیادہ بیٹھ نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ جب وہ کوئی بات چھیڑتے تو اکثر میں مسکرا دیتا۔ ۲ جنوری ۱۹۸۳ کو امریکہ جانے کے لئے وہ مجھ سے رخصت ہوئے۔ چونکہ یہ طے ہوا تھا کہ اسی سال کے آخر تک دوسرا اجتماع کیا جائے۔ اس فیصلہ کے پس منظر میں انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ اب میں کچھ دنوں کے بعد آپ کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ سکوں گا :

It will be several months before I see your smiling face again

۲۵ دسمبر ۱۹۸۲ کو طرابلس ریڈیو سے میری ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر ۲۰ منٹ کی تھی۔ انھوں نے اگرچہ وقت کی تحدید نہیں کی تھی۔ تاہم میں نے ۲۰ منٹ میں اپنی تقریر ختم کر دی۔ ربیع الاوّل کی مناسبت سے میں نے سیرت پر کچھ خیالات پیش کئے۔ یہ تقریر زبانی تھی۔ اس لئے اس کا متن تحریری صورت میں ہمارے پاس برائے اشاعت موجود نہیں ہے۔

۳۰ دسمبر کو طرابلس ریڈیو پر میرا دوسرا پروگرام تھا۔ یہ سوال وجواب کی صورت میں تھا۔ انٹرویور سوالات کرتا رہا اور میں جوابات دیتا رہا۔ دوسرے عام سوالات کے علاوہ یہ سوال بھی تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کیا حال ہے، کیوں کہ ہم سنتے ہیں کہ وہاں اکثر فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ایک برّاعظم کی مانند ہے۔ اس کی آبادی بھی بہت زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ ملک کی اکثریت ابھی تک جاہل ہے۔ ایسی حالت میں کبھی کبھی جھگڑے سے لڑائی کا ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ ان حالات کے باوجود ہندستان کے مسلمان برابر ترقی کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان اقتصادی اور تعلیمی سرگرمیوں میں واضح اضافہ ہوا ہے۔ نیز یہ کہ خود اکثریتی فرقہ میں قابل لحاظ تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اسلام کا مطالعہ کر رہے ہیں اور ان میں سے ہزاروں افراد حالیہ برسوں میں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

اس ضمن میں انٹرویور کا دوسرا سوال یہ تھا کہ ۱۹۸۳ میں آپ کے نزدیک کرنے کا اہم کام کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی اسی سفر میں میں نے ریڈرز ڈائجسٹ (جولائی ۱۹۷۹) کا ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا : Islam on the March

اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام دوبارہ زندہ ہو رہا ہے اور نئی طاقت پکڑ رہا ہے۔ اسلام کے اس سفر کو ۱۹۸۳ میں ہمیں مزید شدت کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ موجودہ

زمانہ میں اسلامی دعوت کے زبردست امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ ان امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھانا وہ سب سے اہم کام ہے جس پر ہمیں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عام عرب کتابی عربی سے ایک ہندستانی عالم سے کم واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے گفتگو کے دوران "بالقوۃ" کا لفظ استعمال کیا تو عرب انٹرویوراس کو سمجھ نہ سکا۔ اس کے بعد میں نے انگریزی لفظ Potential کہا تو وہ اس کی سمجھ میں آگیا۔

طرابلس میں بڑی تعداد میں غیر عرب مسلمان مقیم ہیں۔ ان مسلمانوں کے کئی اجتماعات ہوئے جن میں میری تقریر ہوئی۔ لوگوں نے نہایت غور سے باتیں سنیں اور دینی جذبات کا اظہار کیا۔

میرٹھ کا فرقہ وارانہ فساد ابھی حال میں ہوا تھا اس لئے کچھ لوگوں نے میرٹھ کے مسلمانوں کا حال پوچھا۔ میں نے کہا کہ میرٹھ کے مسلمان جس حال میں ہیں ٹھیک ہیں۔ آپ تو اپنی فکر کیجئے۔ کیونکہ ہر آدمی پر ایک روز "میرٹھ" گذرنے والا ہے۔ موت اور موت کے بعد قیامت، یہ سب سے بڑا "میرٹھ" ہے۔ لوگ دوسروں کے "میرٹھ" کو جانتے ہیں۔ مگر اپنے "میرٹھ" کی کسی کو خبر نہیں۔

ہمارے جو رہنما بیرونی ملکوں میں جاتے ہیں اور وہاں سے کامیاب ہوکر لوٹتے ہیں وہ اکثر ملّت کی بربادی کے نام پر یہ کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کے سامنے مسلمانوں کی مظلومیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں۔ جذباتی انداز میں تقریریں کرکے لوگوں کو اکسائیں تو آپ کو کثرت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پرجوش انداز میں آپ کا تعاون کریں۔ لیکن اگر آپ دعوت دین کے لئے لوگوں کو ابھارنا چاہیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا آپ اسٹیچو کی بستی میں بول رہے ہیں جو نازک ترین بات پر بھی سننے اور تڑپنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

یہ صورت حال تمام عالم اسلام میں ہے۔ آپ قوم کی بربادی کے نام پر لوگوں سے عظیم تعاون حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر دین حق کی پیغام رسانی کے لئے کہئے تو ان کے اندر اس کام میں حصہ لینے کے لئے کوئی جذبہ نہیں بھڑکتا۔ قومی مصائب کے لئے پرجوش ہونا اور دین کی دعوت کے معاملہ میں بےحس بنا رہنا اسلام نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان آج جس مذہب پر قائم ہیں وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ پھر قومی مذہب پر ہم کو وہ انعامات کیسے مل سکتے ہیں جو صرف خدائی مذہب اختیار کرنے پر مقدر کئے گئے ہیں۔

۱۳ دسمبر کی شام کو ایک صاحب کے گھر پر نشست ہوئی۔ تعلیم یافتہ لوگ جمع تھے۔ میں نے

قرآن کے بارہ میں تقریباً ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ قرآن کو کس طرح پڑھنا چاہیئے۔ مختلف مثالیں دے کر میں نے واضح کیا کہ قرآن کا صرف پڑھنا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کو صحیح ذہن کے ساتھ پڑھا جائے۔ اکثر لوگ قرآن کو اپنے خیالات کی تصدیق کے لئے پڑھتے ہیں۔ مگر قرآن کو وہی پائے گا جو قرآن کو اپنے خیالات کی تصحیح کے لئے پڑھے۔

مثلاً ایک غیر مسلم قوم سے آپ کو نفرت ہے اور آپ کے ذہن میں یہ بھرا ہوا ہے کہ اس سے "جہاد" کیا جائے۔ اب آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ کو قرآن میں صرف یہ لکھا ہوا نظر آئے گا کہ "کافروں سے لڑو"۔ اس کے برعکس اگر آپ خالی الذہن ہو کر قرآن کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ان قوموں تک خدا کی دعوت پہنچاؤ۔ پہلا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے بیزاری کا سبق دے گا اور دوسرا مطالعہ آپ کو دیگر اقوام سے محبت پر ابھارے گا۔ پہلے مطالعہ کے مطابق آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان حریف اور رقیب کا رشتہ قائم ہوگا اور دوسرے مطالعہ کے مطابق داعی اور مدعو کا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے ـــــــ یضل به کثیراً و یهدی به کثیرا

طرابلس میں بہت سے عرب نوجوانوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی ایک دو کی صورت میں اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ کئی کئی نوجوان اکٹھے ملنے کے لئے آئے۔ میں نے ان لوگوں سے گفتگو میں خاص طور پر جس چیز پر زور دیا وہ یہ تھا کہ اسلام کا طریقہ کھلے ہوئے دائروں میں کام کرنے کا ہے نہ کہ بند دائروں میں سر ٹکرانے کا۔ عرب دنیا میں بہت بڑے پیمانہ پر نوجوانوں میں اسلام کے لئے کام کرنے کا جذبہ ابھرا ہے۔ مگر ان کی اکثریت اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے اور حکمرانوں سے ٹکراؤ کو کام سمجھتی ہے۔ میں نے صفائی کے ساتھ کہا کہ میں اس قسم کی سیاست کو اسلامی سیاست نہیں سمجھتا۔ یہ یقینی طور پر اسلام سے انحراف ہے۔ اور مزید یہ کہ یہ اپنے وقت اور قوت کو ایسے میدان میں لگانا ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے مزید کہا کہ یہ بات میں کسی مصلحت کی بنا پر نہیں کہتا۔ بلکہ یہی میرا مستقل نظریہ ہے اور میں ۲۰ سال سے مسلسل تقریر اور تحریر کے ذریعے اسی کی اشاعت کر رہا ہوں۔

ہوٹل الکبیر میں ایک روز میری ملاقات ایک افغانی نوجوان سے ہوئی۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اب اس کے والدین سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور یہ نوجوان وہیں پر تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

اس نوجوان کا نام نجیب اللہ طیبی ہے۔ اس کی عمر ۱۷ سال ہے۔ وہ صرف انگریزی یا فرنچ بول سکتا ہے۔ اس خوبصورت افغانی نوجوان سے میں نے پوچھا کہ آپ کی قوم اگر روسیوں سے لڑنے

کے لئے آپ کو افغانستان بلائے تو کیا آپ وہاں جاکر لڑنا پسند کریں گے۔ اس نے فوراً کہا ہاں۔ میں نے کہا کیا آپ کے والدین آپ کو افغانستان جانے کی اجازت دیں گے۔ جب کہ موجودہ حالات میں وہاں جانا گویا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے۔ اس نے جواب دیا، میں اپنے والدین کی اجازت کے بغیر وہاں جاؤں گا۔

بات چیت کے دوران میں میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کی یہ جنگ قوم کے لئے ہے یا خدا کے لئے ہے۔ اس نے کہا دونوں کے لئے۔ اس کے بعد کچھ دیر سوچ کر بولا:

I was born in my country and I want to die in my country

میں اپنے ملک میں پیدا ہوا اور اپنے ملک ہی میں مرنا چاہتا ہوں۔

ایک روز میں ہوٹل کی کسی منزل پر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو اس کے اندر سے کئی عورتیں برآمد ہوئیں۔ سب کی سب خالص مغربی لباس میں تھیں۔ میں نے سمجھا کہ یہ مغرب کی خواتین ہیں۔ وہ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ ایک خاتون کی آواز کان میں آئی: ما فش فائدہ (اس میں کچھ فائدہ نہیں) اس جملہ کو سن کر میں نے سمجھا کہ وہ عرب خواتین ہیں۔ اس قسم کی خواتین یہاں مصری یا لبنانی ہوتی ہیں جو کام کے تحت یہاں مقیم ہیں۔

ایک روز میں نے اپنے کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو فلم "الرسالہ" آرہی تھی۔ یہ وہ مشہور فلم ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بنائی گئی ہے۔ اسی طرح لیبیا کے مشہور مجاہد آزادی عمر مختار کی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا نام اسد الصحرا ہے۔ اسد الصحرا نہایت کامیاب فلم ہے۔ بلکہ فلموں کا شاہکار ہے۔ دوسری طرف "الرسالہ" ایک غیر موثر فلم نظر آئی۔ سیرت کا مطالعہ کرنے والے کو پیغمبر اسلام کی زندگی جتنی عظیم نظر آتی ہے، فلم کی تصویر کشی میں وہ بہت کم ہوگئی ہے۔ خالص فنی اعتبار سے غالباً اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہی ہستی کہیں نظر نہیں آتی جو کہانی کی اصل ہیرو ہے۔ مخصوص اسباب سے چوں کہ فلم ساز نہ اس میں پیغمبر اسلام کی شخصیت کو پیش کر سکا ہے اور نہ آپ کی آواز کو، اس لئے فلم گویا بے فلم ہو کر رہ گئی ہے۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جو بات فلم الرسالہ میں جائز طور پر ہے وہی پوری تاریخ میں ناجائز طور پر پائی جاتی ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت مسیح تک دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے۔ مگر انسانی تاریخ میں پیغمبروں اور ان کے کارناموں کا کوئی ذکر نہیں۔ انسان کی مدون تاریخ پیغمبروں کے ذکر سے خالی ہے۔ حتی کہ انسان نے موجودہ زمانہ میں عالم فطرت کی جو کہانی لکھی ہے

اس میں ہر چیز کا ذکر ہے مگر فاطر کا کوئی ذکر نہیں ــــــــ وہ کہانی بھی کیسی عجیب کہانی ہے جس سے اس کے ہیرو کو حذف کر دیا گیا ہو۔

یہاں نماز کے وقت ٹیلی وژن سے اذان نشر ہوتی ہے۔ ایک روز میں نے مغرب کے قریب کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تو نہایت عمدہ عربی آواز میں اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے وقت ٹیلی وژن اسکرین پر موذن کی تصویر نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ قدرت کے مختلف مناظر ایک کے بعد ایک دکھائے جا رہے تھے۔

عمدہ تصویر میں چیزیں اصل سے زیادہ حسین نظر آتی ہیں۔ چنانچہ رنگین ٹیلی وژن پر فطرت کے مناظر عجیب پر کیف معلوم ہو رہے تھے۔ آبشار کا بہنا، سبزہ کا لہلہانا، دریا کی روانی، چڑیوں کا چہکنا، پہاڑ کی بلندی، پھولوں کی قطاریں، غرض مختلف قسم کے مناظر فطرت بے حد مسحور کن انداز میں سامنے آ رہے تھے۔ اس کے بعد جب موذن نے کہا حی علی الفلاح (آؤ کامیابی کی طرف) تو ایسا معلوم ہوا جیسے جنت کی ایک جھلک دکھا کر کہا جا رہا ہو کہ یہ ہے خدا پرستی کا بدلہ۔ خدا کے سچے پرستار بن جاؤ اور خدا کی حسین جنت میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لو۔

۲۶ دسمبر کی دوپہر کو میجر جلود سے ملاقات تھی۔ قصر الشعب کے خصوصی کمرہ میں ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ انھوں نے عربی زبان میں ایک مفصل تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کا اصل کام دعوت اسلامی کا کام ہے۔ اور ہم نے خالص دعوتی کام کے لئے یہ تنظیم قائم کی ہے۔ اس سے مقصود کوئی سیاست نہیں ہے۔ وہاں سے واپسی میں کچھ تاخیر ہوئی۔ میں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں واپس پہنچا تو کمرہ کی چھوٹی میز میں ہدایتی بلب جل بجھ رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ میرے نام کوئی پیغام استقبالیہ کے دفتر میں موجود ہے۔ میں نیچے گیا تو انھوں نے ایک نوٹ میرے حوالے کیا، اس میں لکھا تھا:

The Indian Ambassador has telephoned and wants to see you

(طرابلس میں ہندستان کے سفیر نے آپ کو ٹیلی فون کیا ہے اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں) اس کے بعد میں نے ٹیلی فون پر سفیر ہند (مسٹر ارجن اسرانی) سے بات کی۔ اگلے دن موصوف کی طرف سے دوسرا ٹیلی فون ملا کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر میرے لئے شام کے کھانے کا انتظام کر رہے ہیں۔ تاہم یہاں میرے پروگرام کچھ اس قسم کے تھے کہ میں سفیر موصوف کے لئے مزید کوئی وقت نہ نکال سکا اور اس احساس کے ساتھ واپسی ہو گئی کہ میں موصوف کی دلچسپ باتیں سننے سے محروم رہا۔

دو عربوں سے باتیں کرتے ہوئے ایک بار میں نے نخنج (ننجگی) کا لفظ استعمال کیا۔ وہ سمجھ

نہ سکے۔ بالآخر میں نے یہ لفظ کاغذ پر لکھا۔ اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا اچھا نُدگ۔ یہ لوگ نفیج کا تلفظ ندگ کرتے ہیں۔ تلفظ میں اس قسم کے فرق کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غیر عرب کی بات عرب کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آتی اور اس طرح عرب کی بات غیر عرب سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔

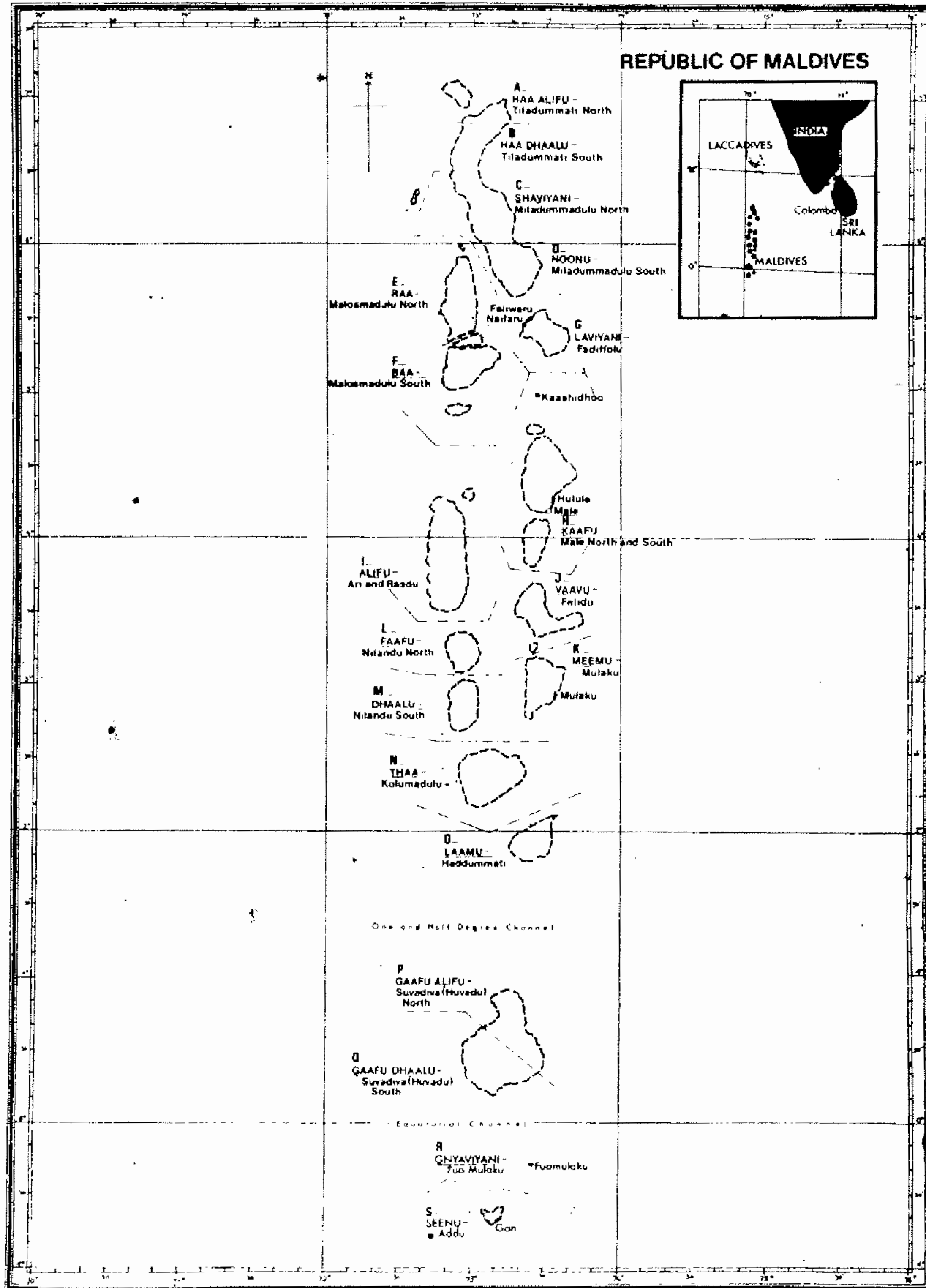
عربوں میں یہ عجیب ذوق نظر آتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے یہاں اسلامی الفاظ کے بجائے عام قسم کے معاشرتی الفاظ رائج ہو گئے ہیں۔ مثلاً جزاک اللہ کی جگہ شکراً، السلام علیکم کی جگہ صباح الخیر وغیرہ۔ موجودہ الفاظ بھی اگرچہ اچھے الفاظ ہیں۔ مگر اسلام کے دعائیہ الفاظ میں جو معنویت ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہو سکتی۔

۴ جنوری کو واپس ہوتے ہوئے میں طرابلس کے ہوائی اڈہ (مطار) پر پہنچا تو ظہر کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں میں نے سمت قبلہ دریافت کی تو مجھے بتایا گیا کہ یہاں مسجد موجود ہے۔ آپ مسجد میں جاکر نماز ادا کر لیں۔ ہدایت کے مطابق میں آگے بڑھا تو ایک خوبصورت بورڈ پر "مسجد" لکھا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہاں ایک بڑا کمرہ تھا جس میں مسجد کی تمام ضروریات کا انتظام تھا۔ وہاں کچھ لوگ پہلے سے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے بھی اطمینان سے نماز ادا کی اور اس کے بعد طرابلس سے روم جانے والا جہاز پکڑنے کے لئے باہر آیا۔

۵ جنوری ۱۹۸۳ کو میں دہلی واپس آیا۔ واپسی میں ہوائی جہاز میں میری سیٹ کے بغل میں ایک مستشرق تھے، وہ روم سے ہندستان جانے کے لئے سوار ہوئے۔ کھانے کا وقت آیا تو میں نے "ویجیٹیرین" مانگا۔ مذکورہ مستشرق نے بھی ویجیٹیرین کی فرمائش کی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو یورپ کے رہنے والے ہیں اور یورپ میں عام طور پر گوشت پسند کیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے ویجیٹیرین کی فرمائش کیوں کی۔

Dr. J. Uacek, Oriental Department
Charles University,
Prague, Czechoslovakia.

انھوں نے کہا کہ میں انڈین کلچر پر ریسرچ کر رہا ہوں اور اس وقت اسی سلسلے میں ہندستان جا رہا ہوں۔ جب میں نے انڈین کلچر پر ریسرچ کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ میں نے یہ بھی ارادہ کیا کہ میں اپنے آپ کو انڈین طریقہ کا عادی بناؤں اور اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کے قریب کروں تاکہ بخوبی طور پر اس کو سمجھ سکوں۔ چنانچہ اسی وقت سے میں گوشت چھوڑ کر سبزی کھانے لگا ہوں۔ چوں کہ ہمارے یہاں سبزی ملنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے اس لئے میری بیوی میرے گھر کے کمپاؤنڈ میں سبزی اگاتی ہیں اور میرے لئے الگ سے سبزی پکاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ میں نے سنسکرت زبان بھی سیکھی۔



مالدیپ بحر ہند کے وسط میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ لمبائی میں تقریباً ۷۶۵، کیلومیٹر ہے اور چوڑائی .

ایک سفر

۸ دسمبر ۱۹۸۲ کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہم وزارت خارجہ سے بول رہے ہیں'' یہ حکومت ہند کی وزارت خارجہ کے ڈپٹی سکریٹری BSM کا ٹیلی فون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ مالدیپ کی وزارت تعلیم کے تحت مالے Male میں ایک سیمنار ہو رہا ہے جس میں انہوں نے مجھے شرکت کی دعوت دی ہے۔ سیمنار کا عنوان ہے: اسلامی دعوت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں۔

The Cell for Islam in South and Southeast Asia.

انہوں نے کہا کہ اگر آپ شرکت کی منظوری دے دیں تو ہم حکومت مالدیپ کو ٹیلکس کے ذریعہ پیغام بھیج دیں تاکہ وہ آپ کے سفر کے انتظامات کرسکیں۔ میں نے شرکت منظور کرلی۔ تاہم جلد ہی بعد مجھے لیبیا کا سفر پیش آگیا اور سیٹ کا رزرویشن وقت پر نہ ہوسکا۔

میں لیبیا کے سفر سے واپس آیا تو مالدیپ کے سیمنار کی تاریخ میں صرف تین دن باقی تھے۔ ۹ جنوری کو روانہ ہوجانا میرے لئے بالکل ضروری تھا۔ معلوم ہوا کہ مالدیپ میں یہ سیاحوں کی آمد کا موسم ہے، اس لئے مدراس سے مالے (دارالسلطنت مالدیپ) جانے والے جہاز کی تمام سیٹیں بک ہوچکی ہیں۔ میرا نام ویٹنگ لسٹ میں نمبر ۴۶ پر ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوا کہ اب مالدیپ کا سفر ممکن نہ ہوسکے گا۔

میں نے اپنے آدمی کو وزارت خارجہ (نئی دہلی) کے دفتر میں بھیجا۔ ۸ جنوری کی شام کو ہمارا آدمی وزارت خارجہ کے دفتر میں اس وقت پہنچا جب کہ وہاں دفتر کے کام کا وقت ختم ہوچکا تھا۔ اور ڈپٹی سکریٹری اپنی کرسی سے اٹھ چکے تھے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے کیس کو سنا اور اس کے بعد دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اپنے اسٹینو کو بلایا اور اسی وقت ایک خط تیار کرکے ہمارے آدمی کے حوالے کیا۔ اور کہا کہ اس کو لے کر انڈین ایرلائنز کے منیجر سے ملیں۔ چنانچہ وہ خط انڈین ایرلائنز کے منیجر کو دکھایا گیا۔ اس نے فوری طور پر مدراس کے دفتر کو ٹیلکس کیا اور کہا کہ ''مسٹر خان'' کو اعلیٰ ترین ترجیح کی بنیاد پر مالے جانے والے جہاز میں جگہ دی جائے۔

اس کے بعد ہمارا آدمی واپس آگیا۔ چند گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ یہ انڈین ایرلائنز (نئی دہلی) کا ٹیلی فون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ آپ کی سیٹ مدراس سے کنفرم ہوگئی ہے۔ اس میں میں صرف

اتنا اضافہ کروں گا کہ یہ سب جس نے کرایا اس کا نام مسٹر آر۔ ایم اگروال تھا! اس خط کا عکس اگلے صفحہ پر درج کیا جا رہا ہے۔

ہماری پرواز ۹ جنوری کو صبح ساڑھے چھ بجے تھی۔ میں ہوائی اڈہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے تمام پروازیں تین گھنٹہ کے لئے موخر کر دی گئی ہیں۔ یہ نیا مسئلہ تھا۔ کیونکہ دہلی سے تین گھنٹہ دیر سے روانگی کا یہ مطلب تھا کہ مدراس سے دوسرا جہاز نہ ملے۔

اسی حیص بیص میں میں پالم پر اپنے جہاز پر سوار ہو گیا۔ مجھ سے ملی ہوئی سیٹ پر مسٹر سبرامنیم تھے جو دہلی الکٹرک سپلائی انڈرٹیکنگ DESU میں انجینئر ہیں۔ ان کو جب میرا قصہ معلوم ہوا تو فوراً انہوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ وہ کئی بار جہاز کے پائلٹ سے ملے اور اس سے کہا کہ مدراس کے اسٹیشن کو پیغام بھیج کر جہاز کی پوزیشن معلوم کریں۔ پائلٹ نے بھی پوری ہمدردی ظاہر کی اور دوران پرواز اگلے اسٹیشن سے وائرلس کے ذریعہ ربط قائم کیا۔ مگر ادھر سے یہ پیغام ملا کہ "ہوائی جہاز مدراس سے روانہ ہو چکا ہے۔"

میں مدراس پہنچا تو حسب قاعدہ ہوائی کمپنی نے ہوٹل (اڈیار گیٹ ہوٹل) میں میرے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ مگر اگلے جہاز سے سیٹ کے رزرویشن کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ مسٹر سبرامنیم نے دوبارہ میرا ساتھ دیا۔ وہ ہوٹل سے مجھ کو لے کر انڈین ائرلائنز کے دفتر میں گئے۔ اور وہاں ڈیوٹی آفیسر کو پوری صورت بتائی۔ ڈیوٹی آفیسر مسٹر سوامی ناتھن تھے۔ انہوں نے نہایت دلچسپی کا اظہار کیا۔ میری روٹ کو کولمبو سے بدل کر تریوندرم کے راستہ سے کیا۔ تریوندرم کے راستہ سے جانے والے جہاز کی بھی تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ مگر انہوں نے ذمہ داروں سے اصرار کر کے مجھے اس میں سیٹ دلوائی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے مالدیپ کی وزارت تعلیم کو ٹیلکس کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ میں خراب موسم کی وجہ سے مدراس میں رک گیا ہوں اور ۱۰ جنوری کو فلائٹ نمبر ۵۶۳ سے مالے پہنچوں گا۔

مدراس میں مجھے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا وہاں دوسری چیزوں کے علاوہ بائبل (اڈیشن ۱۹۸۰) کا ایک خوبصورت نسخہ بھی موجود تھا، اس نسخہ پر لکھا ہوا تھا:

This Bible is placed by the Gideon

یہ بائبل یہاں جیڈین کی طرف سے رکھی گئی ہے۔

۱۸۹۸ میں دو مسیحی مسافر سکن سن (امریکہ) کے ایک ہوٹل میں ملے۔ دونوں ایک دوسرے



विदेश मंत्रालय, नई दिल्ली-११
MINISTRY OF EXTERNAL AFFAIRS
NEW DELHI-11

No.I(i)/162/21/82 Dated 7th January, 1983

The Commercial Manager,
Indian Airlines,
New Delhi.

Sir,

Sh. Wahiduddin Khan, President of the Islamic Call and Research Centre has been invited by the Maldivian Government to participate in a seminar on the Islamic Call in South and South East Asia to be convened in Male from 10th to 12th January, 1983.

Shri Khan will be travelling on the Delhi-Madras, Madras-Colombo, Colombo-Male sector starting from Delhi on 9th January, 1983. His ticket on the Madras-Colombo sector has not been confirmed so far.

In view of the importance of the meeting which Shri Khan has to attend, we would strongly recommend that he be allotted a seat on the Madras-Colombo sector for the date mentioned above, on a top priority basis.

Yours faithfully,

(R.M. AGGARWAL)
UNDER SECRETARY TO THE GOVT.OF INDIA

کے لئے اجنبی تھے ۔ تاہم یہ ملاقات ان کی یکجائی کا سبب بن گئی ۔ انہوں نے بعض اور مسیحیوں کے مشورہ سے یہ طے کیا کہ وہ ایک تنظیم قائم کریں جس کا مقصد ہوٹلوں میں بائبل کی فراہمی ہو ۔ یہ نام بائبل (Book of Judges, 6-7) سے لیا گیا ہے ۔ آج یہ تنظیم دنیا بھر میں ۱۱۰ سے زیادہ ملکوں میں قائم ہو چکی ہے ۔ موجودہ بائبل کے آغاز میں جیڈین کا تعارف کرتے ہوئے یہ دلچسپ جملہ درج ہے :

The Lord has opened doors for the placement of His word among many strategic groups of the populations and in places through which large and important streams of national life pass from day to day.

خدا نے یہ دروازے کھول دئے ہیں کہ اس کا کلام آبادی کے بہت سے اہم حصوں کے درمیان رکھا جا سکے ۔ اور اس کا کلام ایسے مقامات پر رکھا جائے جس کے راستے سے قومی زندگی کے بہاؤ کا بڑا اور اہم حصہ روزانہ گذرتا ہے ۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ موجودہ زمانہ میں تبلیغ کے کون سے نئے نئے راستے کھل گئے ہیں ۔ اور فائدہ اٹھانے والے ان سے کس طرح فائدہ اٹھا رہے ہیں ۔ شروع کے ایک صفحہ پر ایک مضمون ہے ۔ جس کا عنوان ہے ضرورت کے وقت مدد لو ' (Help in time of need) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ آپ اپنے مشکل لمحات میں کس طرح بائبل سے اپنے لئے سہارا لے سکتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں چند عنوانات یہ ہیں :

Comfort in time of sorrow
Guidance in time of decision
Courage in time of fear
Rest in time of weariness
Comfort in time of loneliness
Relief in time of suffering
Protection in time of danger
Peace in time of turmoil

اس میں بتایا گیا ہے کہ بائبل کا ترجمہ اب تک دنیا کی ۱۱۰۰ سے زیادہ زبانوں میں ہو چکا ہے ۔ اس کے آغاز میں بتایا گیا ہے کہ بائبل کی اہم ترین تعلیم وہ ہے جو (John, 3:16) میں ان الفاظ میں ہے : کیونکہ خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو ، بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے ۔

مدراس کے ہوٹل میں میں نے اپنے کمرہ سے کسی بات کے لئے استقبالیہ میں ٹیلی فون کیا ۔ میں نے ہندستانی میں کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی " میں نہیں سمجھا " ۔ میں نے دوبارہ انگریزی میں کہا تو وہ فوراً سمجھ گیا ۔ ہندستان میں اگر آپ اعلیٰ معیار کے ہوٹل میں ٹھہریں یا ہوائی جہاز میں

سفر کریں تو آپ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ آپ انگریزی میں بولیں گے ۔ اس ملک میں انگریزی زبان اب بھی اونچی حیثیت کی نشانی بنی ہوئی ہے ۔ اس صورت حال کی وجہ سے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ملک میں نہیں بلکہ غیر ملک میں ہیں ۔ اگرچہ اکثر انگریزی بولنے والے غلط انگریزی بولتے ہیں ۔ مگر اپنی پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں کہ ملکی زبان جانتے ہوتے انگریزی زبان میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہ صورت حال صرف اس وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ ملکی زبان علمی اور ادبی اعتبار سے انگریزی زبان جیسا مقام حاصل کرلے ۔ محض قومی اپیلوں سے شاید اس کا ختم ہونا ممکن نہیں ۔

۱۰ جنوری کی دوپہر کو ہمارا ہوائی جہاز مالدیپ کے اوپر اڑ رہا تھا ۔ دو ہزار چھوٹے چھوٹے جزیروں کا یہ ملک ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ٹوٹی ہوئی مالا ہے جس کے ہرے ہرے دانے ٹوٹ کر سمندر میں بکھر گئے ہوں ۔ ہوائی اڈہ خود بھی ایک چھوٹے جزیرہ پر ہے ۔ یہاں صرف ہوائی اڈہ ہے ۔ یہاں سے اسٹیمر پر ہم مالے نامی جزیرہ پر گئے ۔ جو مالدیپ کا دارالسلطنت ہے ۔ مالے ایک میل لمبا ڈیڑھ میل چوڑا جزیرہ ہے ۔ دو ہزار میں سے دو سو جزیرے آباد ہیں ۔ کل آبادی تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار ہے ۔ یہاں کی آبادی میں صد فی صد مسلمان ہیں ۔ یہاں کوئی بھی غیر مسلم شہری نہیں ۔ مالے میں میرا قیام سوسن گی (کمرہ نمبر ۱۰) میں تھا ۔

سیمنار کی کاروائی ۱۰ ۔ ۱۱ ۔ ۱۲ جنوری ۱۹۸۳ کو ہوئی ۔ جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مسائل سے متعلق چار مقالے پیش ہوئے ۔ یہ مقالے مالدیپ کی وزارت تعلیم کی سکریٹریٹ نے تیار کئے تھے ۔ ہر مقالہ پہلے پڑھا جاتا اور اس کے بعد شرکا اس پر اظہار خیال کرتے تھے ۔

یہ اظہار عربی یا انگریزی زبان میں کیا گیا ۔ میں نے ان مقالوں پر جو اظہار خیال کیا وہ انگریزی زبان میں تھا جو سیمنار کی فائنل رپورٹ میں شائع ہو چکا ہے ۔

۱۱ جنوری کی شام کا کھانا دوسرے جزیرہ پر رکھا گیا ۔ وہاں ہم لوگ اسٹیمر پر گئے ۔ یہ جزیرہ صرف سیاحوں کے لئے ہے ۔ یہاں سیاحوں کے نقطۂ نظر سے عمارتیں اور ہوٹل تعمیر کئے گئے ہیں ۔ رات کے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سمندر کے بیچ ایک سبزہ زار تختہ پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔

سیمنار میں چار مقالے پڑھے گئے اور اس کے بعد شرکا نے ان پر اظہار خیال کیا ۔

مقالوں کے عنوانات حسب ذیل تھے :

۱- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی اشاعت ۔
۲- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں مخالف اسلام سرگرمیاں ۔
۳- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں مسلم اقلیتوں کا مسئلہ ۔
۴- جنوبی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا میں آئندہ اشاعت اسلام کی کیا تدابیر اختیار کی جائیں ۔

سیمنار میں مذکورہ علاقہ میں واقع تمام ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے ۔ جن ممالک کے نمائندے شریک ہوئے ان کے نام یہ ہیں :

مالدیپ ، ہندستان ، سری لنکا ، بنگلہ دیش ، پاکستان ، ملیشیا ، تھائی لینڈ ، انڈونیشیا ، فلپائن ، برما ، سنگاپور ، ماریشس ۔

مالدیپ مجمع الجزائر ہے ۔ اور بحر ہند کے وسط میں واقع ہے ۔ تقریباً ساڑھے سات سو کیلومیٹر لمبائی اور تقریباً سوا سو کیلومیٹر کی چوڑائی میں دو ہزار جزیرے پھیلے ہوئے ہیں ۔ یہ جزیرے اتنے چھوٹے ہیں کہ انکا مجموعی زمینی رقبہ صرف تین سو مربع کیلومیٹر ہوتا ہے ۔ ان جزائر میں تقریباً دو سو جزیرے آباد ہیں ۔ مالدیپ کی آبادی صرف ڈیڑھ لاکھ ہے ۔ تمام کے تمام باشندے مسلمان ہیں ۔ یہاں کے قانون کے مطابق کسی غیر مسلم کو مالدیپ کی شہریت نہیں دی جاسکتی ۔

پہلے مالدیپ کے باشندے بدھسٹ تھے ۔ بارہویں صدی عیسوی میں یہاں کے باشندے ایک ساتھ مسلمان ہوگئے ۔ انہوں نے عرب تاجروں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۱۵۳ء میں مراکش سے ایک عرب تاجر یہاں پہنچا جس کا نام ابو البرکات یوسف علی بربری تھا ۔ اس نے تبلیغ کی ۔ اس کی تبلیغ سے مالدیپ کے تمام باشندے مسلمان ہوگئے ۔

مالدیپ کی قدیم تاریخ معلوم نہیں ۔ یہاں کی ابتدائی تاریخ کا ذریعہ وہ عرب مورخین یا سیاح ہیں جو مالدیپ آئے ۔ المسعودی ۹۴۷ میں مالدیپ پہنچا ۔ البیرونی نے ۱۰۳۰ میں مالدیپ کی سیاحت کی ۔ الادریسی بارہویں صدی کے آغاز میں مالدیپ آیا ۔ ابن بطوطہ کی مالدیپ میں آمد ۱۳۴۴ء میں ہوئی ۔ فرانسیسی ملاح فرانکوئی لیول (Francois Pyarad de Lavel) ۱۶۰۱ میں مالدیپ پہنچا ۔ ان لوگوں نے اپنی سیاحتی ڈائری میں مالدیپ کے کچھ احوال لکھے ہیں ۔ حسن تاج الدین پہلے مالدیپی ہیں جنہوں نے ۱۷۲۶ء میں مالدیپ کے حالات قلم بند کئے ۔

مالدیپ میں ۱۱۴۱ء سے لے کر ۱۵۵۸ء تک سلاطین کی حکومت تھی ۔ اس کے بعد پرتگالیوں

نے مالدیپ پر حملہ کیا۔ ۱۵۵۸ء میں مالدیپ پر پرتگالیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد محمد خطیب کی رہنمائی میں آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی۔ جلد ہی پرتگالیوں کو واپس جانا پڑا۔ اور پندرہ سال بعد ۱۵۸۵ میں سلطان کا راج دوبارہ قائم ہوگیا۔

۱۸۸۷ء میں مالدیپ برطانی راج کے ماتحت آگیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد پرامن طور پر مالدیپ کی آزادی کی کوشش شروع ہوئی۔ حکومت برطانیہ اور حکومت مالدیپ کے درمیان تقریباً دس سال کی گفتگو کے بعد جولائی ۱۹۶۵ میں ایک معاہدہ پر دونوں حکومتوں نے دستخط کئے۔ اس کے مطابق مالدیپ کو مکمل آزادی حاصل ہوگئی۔ اسی سال سے مالدیپ اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔

مالدیپ میں صرف ہائر سکنڈری تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہاں ابھی تک کوئی کالج نہیں۔ تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے اسکولوں کے ماسٹر اکثر بیرونی لوگ ہیں۔ یہاں کی تجارت زیادہ تر مچھلی اور سیاحت ہے۔ تاہم کوریا اور جاپان کی کشتیاں یہاں کے سمندروں میں آتی رہتی ہیں۔ اور مچھلیاں پکڑ کر لے جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے مچھلی کی آمدنی پوری طرح مالدیپ کے حصہ میں نہیں آتی۔ سیاح کافی آتے ہیں وہ بلاشبہ اپنے ساتھ دولت لاتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ بہت سے مسائل بھی لا رہے ہیں۔ جن کا فی الحال کوئی حل مالدیپ کے پاس نہیں۔

۱۳ جنوری کا دن یہاں کے خاص خاص مقامات کے لئے مقرر تھا۔ صبح کو ہم لوگ جزیرہ مالے سے بنیڈوز (Bandos Resort) کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ سفر برطانیہ کی بنی ہوئی ایک کشتی پر ہوا۔ جس پر لکھا ہوا تھا: Presented by Britain

دو گھنٹہ کا یہ سفر بڑا عجیب و غریب تھا۔ راستہ میں ہم دو اور جزیروں پر اترتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچے۔ اس سفر کے دوران بار بار مختلف جزیرے سامنے آتے رہے۔ دو ہزار کی تعداد میں پھیلے ہوئے جزیرے ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدرت نے سمندر میں جگہ جگہ ہرے بھرے گلدستے پھیلا رکھے ہوں۔

یہ سفر بڑا عجیب تھا۔ ہمارے چاروں طرف بحر ہند کا پانی موجیں مار رہا تھا۔ اس میں ہمارا اسٹیمر موجوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چاروں طرف نیلا آسمان، اس کے اوپر بادل، سمندر میں جگہ جگہ ناریل کے درختوں سے ڈھکے ہوئے جزیرے، ایسا محسوس ہوا جیسے ہم حسن اور معنویت کی ایک ابدی کائنات میں رواں دواں ہیں۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا:

"کیسی عجیب بات ہوگی کہ یہاں ایسی حیرت ناک دنیا ہو اور اس کا کوئی خدا نہ ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایک موجود واقعہ کو ماننا ہے نہ کہ کسی غیر موجود چیز کو ماننا۔ خدا تو اپنی صفات کے ساتھ موجود ہی ہے۔ اب بات صرف اتنی ہے کہ اس کو اس کی ذات کے ساتھ بھی مان لیا جائے۔

بینڈوز کا جزیرہ خاص طور پر سیاحوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ وہاں کوئی دوسری آبادی نہیں ہے۔ چھوٹے سے جزیرے کے چاروں طرف سمندر لہریں مار رہا ہے۔ اس خوبصورت ماحول میں نے چند گھنٹے گذارے۔ وہیں کھانا کھایا۔ اور اس کے بعد شام کو ملے واپس آ گئے۔

مالے پہنچے تو معلوم ہوا کہ ٹریولنگ ایجنٹ نے کہہ دیا ہے کہ ۱۵ جنوری کے جہاز میں تمام سیٹیں بک ہو چکی ہیں۔ اس لئے اس دن سیٹ نہیں مل سکتی۔ یہ میرے لئے بہت تشویش ناک خبر تھی۔ کیونکہ دہلی جلد پہنچنے ہی کے لئے میں نے لنکا کا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ یہاں کے سیمنار میں جناب محمد حنیفہ (ٹرانسپورٹ منسٹر، سری لنکا) بھی آئے تھے۔ انہوں نے دعوت دی کہ سری لنکا میں کچھ وقت قیام کریں۔ اس کے بعد وہاں سے دہلی کے لئے روانہ ہوں۔ مگر میں نے وقت کی کمی کے سبب محمد حنیفہ صاحب سے معذرت کر دی تھی۔

اب میں نے جناب برج نارائن صاحب (سفیر ہند مقیم مالدیپ) کو ٹیلی فون کیا۔ اور ان کے سامنے مسئلہ رکھا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے انڈین ایرلائنز کے مینجر (مسٹر جوشی) سے ٹیلی فون پر بات کی اور چند منٹ کے بعد مجھے ٹیلی فون پر خبر دی کہ آپ کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے۔ آپ اپنے پروگرام کے مطابق سفر کریں۔ جناب برج نرائن صاحب نے مزید بتایا کہ انہوں نے ٹیلکس کے ذریعہ دہلی میں میرے آفس کو اطلاع بھیجدی ہے کہ میں ۱۵ جنوری کی شام کو دہلی پہنچ رہا ہوں۔

مالدیپ میں صدارتی نظام ہے۔ ۱۲ جنوری کی شام کو یہاں کے صدر جناب مامون عبدالقیوم سے ان کی رہائشی قیام گاہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ چنانچہ بے تکلف عربی بولتے ہیں مالدیپ میں چونکہ اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہیں ہے۔ اس لئے یہاں کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے جامعہ ازہر (مصر) کے تعلیم یافتہ ہیں۔ وزیروں اور افسروں میں کافی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے اور عربی اچھی جانتے ہیں۔

وزیروں اور افسروں میں کئی لوگ ایسے ملے جو میری کتاب الاسلام یتحدی پڑھے ہوئے تھے ان لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ میری مزید کتابیں بھی عربی اور انگریزی میں انہیں فراہم کی جائیں ۔

یہاں ملیشیا کے ایک صاحب ملے ، انہوں نے بتایا کہ الاسلام یتحدی کا ترجمہ ملائی زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے ۔

مالدیپ میں اردو جاننے والے بھی ہیں ۔ چنانچہ کئی ایسے لوگ ملے جنہوں نے بتایا کہ وہ الرسالہ منگاتے ہیں ، اور میری اردو کتابیں پڑھے ہوئے ہیں ۔

ہندستانی سفارت خانہ کے سکریٹری مسٹر نائر میرے کمرہ میں آئے اور معلوم کیا کہ کیا مجھے کوئی ضرورت ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے لائق جو بھی خدمت ہو ہم اس کو کرنے کے لئے تیار ہیں ۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس وقت مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ۔

مالدیپ کے نوجوان پوسٹ ماسٹر (مالک عبد الرزاق صاحب) تقریباً دو سال پہلے دہلی آئے تھے اور وہاں میرے دفتر میں مجھ سے ملے تھے ۔ انہوں نے بتایا کہ میں خود تو اردو نہیں جانتا مگر میرے دادا اچھی اردو جانتے ہیں ۔ اور وہ آپ کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں ۔ میں یہاں آیا تو مجھے ان سے ملنے کی خواہش تھی ۔ مگر میں دونوں صاحبان کا نام بھول گیا ۔ کچھ لوگوں سے ذکر کیا تو انہوں نے دریافت کرکے معلوم کیا اور مجھ سے ملاقات کا انتظام کیا ۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے ۔

Mr Abdul Wahab, Dhaharage, Machangoli, Male, Maldives

عبد الوہاب صاحب مطالعہ کا بہت شوق رکھتے ہیں ۔ اور خاص طور پر دینی کتابیں بہت پڑھتے رہتے ہیں ۔ ان کو اولاً میری کتاب (علم جدید کا چیلنج) ملی تھی ۔ اس کے بعد انہوں نے بقیہ کتابیں حاصل کیں ۔

مالدیپ میں چوری ، قتل ، رشوت ، آپس کے لڑائی جھگڑے وغیرہ بالکل نہیں ہیں ۔ حتی کہ مالے کے سوا کسی اور جزیرہ پر کوئی پولس پوسٹ بھی نہیں ۔ یہاں کے باشندے عام طور پر بالکل پر امن طریقہ پر رہتے ہیں ۔ البتہ سیاحوں کی آمد سے کچھ مسائل پیدا ہوئے ہیں ۔ مثلاً لڑکیوں کی آزادی ، مہنگائی ، معیار زندگی میں تبدیلی ، تنخواہوں میں اضافہ وغیرہ ۔

مالدیپ کا دار السلطنت جس جزیرہ پر قائم ہے اس کا نام مالے ہے ۔ یہ صرف دو کیلو میٹر مربع رقبہ میں ہے ۔ وسیع سمندر کے درمیان اس قسم کے چھوٹے چھوٹے جزیروں کی کوئی حقیقت نہیں ۔ اگر یہاں جوار بھاٹا آئے تو ان جزیروں پر انسانی آبادی کا کوئی وجود نہ رہے ۔ مگر قدرت کا یہ عجیب قانون ہے کہ اس قسم کے چھوٹے جزیروں پر جوار بھاٹا نہیں آتا ۔ اگر آپ جزیرہ سے ایک

کشتی یا اسٹیمر پر سوار ہو کر نکلیں تو جزیرے کے کنارے موجیں ہلکی ہوں گی۔ مگر آپ جب دور سمندر کے درمیان پہنچیں گے تو پانی کی لہریں کافی تیز دکھائی دیں گی۔

مالدیپ کا ہندستانی سفارت خانہ ہر مرحلہ میں بے حد معاون رہا۔ جناب سفیر صاحب اور مسٹر نائر (اتاشی) خود میرے یہاں آئے اور کہا کہ آپ کو جو ضرورت ہو اس کے لئے ہم حاضر ہیں۔

مالدیپ کے سیمنار میں مختلف ملکوں کے لوگوں نے شرکت کی۔ ہندستان سے صرف میں نے نمائندگی کی۔ سیمنار میں تین زبانیں رائج تھیں۔ انگریزی، عربی، اور مالدیپی۔ میں نے زیادہ تر انگریزی میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ طریقہ یہ تھا کہ منتظمین سیمنار کی طرف سے اولاً کوئی مقالہ پیش کیا جاتا اور اس کے بعد اس پر تبادلۂ خیال ہوتا۔

۱۰ جنوری کو جناب موسیٰ فتحی قاسم (چیف جسٹس، مالدیپ ہائی کورٹ) نے مقالہ پیش کیا۔ یہ مقالہ اصلاً عربی زبان میں تھا۔ اس کا عنوان تھا۔

الدعوة الاسلامية وكيف دخل الاسلام جنوب وجنوب شرق آسيا

مقالہ کے بعد مختلف لوگوں نے موضوع سے متعلق اپنے اپنے تاثرات ظاہر کئے۔ میں نے کہا کہ زیر بحث موضوع کے بہت سے پہلو ہیں۔ تاہم میرے نزدیک ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس اسلامی علاقہ میں اسلامی دعوت کی تاریخ شکست میں فتح (Victory in Defeat) کا راز بتاتی ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کے حاملین کی طرف سے کبھی کوئی فوج کشی نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود یہ علاقہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ کیسے ہوا۔ یہ تاجروں اور صوفیوں کی تبلیغ کے ذریعہ۔

۱۶ جنوری ۱۹۸۳ کو میں دہلی واپس آگیا۔

لندن میں چند روز

باربیڈوز جاتے ہوئے میں چند دن کے لئے لندن میں ٹھہرا۔ لندن میں میرا قیام ۲۳ مارچ کی شام سے لے کر ۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کی صبح تک رہا۔ اس دوران میں جو مشاہدات و تاثرات سامنے آئے، ان کو مختصراً یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

لندن کے ہوائی اڈہ ہیتھرو پر میں اترا تو آسمان میں بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ابھی پچھلے دن آسمان کھلا ہوا تھا اور گرمی کا سا موسم ہو رہا تھا کہ اچانک برسات جیسا موسم ہو گیا۔ یہ انگلستان کی عام موسمی خصوصیت ہے۔ یہاں کا موسم تقریباً سال بھر غیر یقینی رہتا ہے۔ وہ بار بار اچانک طور پر بدل جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کے موسم کو ادبی زبان میں الطقس الخائن (Treacherous Weather) کہتے ہیں۔ ابھی گرمی تھی، ابھی ٹھنڈ آگئی۔ ابھی آسمان کھلا ہوا تھا، ابھی بادل چھا گیا۔

انگریز قوم کو بار بار اپنے آپ کو موسم کے موافق بنانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی تمام سرگرمیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انگریزی قوم میں حیرت انگیز طور پر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بہت جلد اپنے آپ کو بدلتے ہوئے حالات کے موافق کر لیتی ہے۔ اور اس طرح اپنے مفادات کو محفوظ رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس نے استعماری نظام کے خاتمہ کے بعد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزی قوم کی اس مفاہمانہ خصوصیت کی کم از کم ایک وجہ، موسموں کی مذکورہ حالت بھی ہے جس نے انہیں زندہ رہنے کے لئے حالات سے موافقت کا سبق دیا۔ ایک انگریز عام طور پر خلاف مزاج بات پر مشتعل نہیں ہوتا۔ وہ گرم بات کا بھی ٹھنڈے طریقہ سے استقبال کرتا ہے۔ انگلستان کی موسمی صورت حال نے انگریزوں کی اخلاقیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

میں ۲۳ مارچ کو لندن پہنچا تو اس کے صرف ایک دن پہلے سر رچرڈ اٹن برو کی فلم "گاندھی" کو برٹش اکیڈمی کا خصوصی انعام دیا گیا تھا۔ اور اس کی شاندار تقریب منائی گئی تھی۔ اس فلم کو نہ صرف ہندستان میں بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ہیرو آف پیس (Hero of Peace) کی زندگی کو دیکھنے کی خاطر بے پناہ لوگ سینما ہاؤس کی کھڑکیوں پر ٹکٹ لینے کے لئے لمبی لمبی لائن لگا رہے ہیں۔ امریکہ میں یہ فلم اب تک ۳۰ ملین

ڈالر حاصل کر چکی ہے۔

ہندستان کے مسلمانوں کا خیال ہے کہ ملک کی آزادی میں انہوں نے قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے بطور خود اپنے قائدین کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے سیاسی الفاظ لکھ رکھے ہیں ـــــــ رئیس الاحرار، بطل حریت، شیخ الہند، امام الہند، وغیرہ۔ مگر ہمارے اپنے محدود خول کے باھر عالمی سطح پر جو تاریخ مرتب ہورہی ہے اس میں سارا مقام ان لوگوں کو مل رہا ہے جن کے نام کے ساتھ اس قسم کے شاندار القاب شامل نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی کم از کم ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ہماری جھنجھلاہٹ دراصل ہماری خوش خیالیوں کی قیمت ہے۔ اگر آپ فرضی طور پر اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیں اور دنیا آپ کی بڑائی کو نہ مانے تو اس کے بعد جو واقعہ ہوگا وہ یہی ہے کہ آپ دوسروں کو عدم اعتراف کا ملزم قرار دے کر دوسروں سے نفرت کرنے لگیں گے ـــــ بچھڑا پن صرف ایک کمی ہے۔ مگر خوش خیالی ایک جرم ہے جس کی فرد اور قوم دونوں کو بہت مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے۔

دہلی سے میں فجر کی نماز پڑھ کر چلا تھا۔ اور ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے لندن پہنچ کر ادا کیں۔ حالانکہ دہلی سے لندن کا سفر تقریباً چودہ گھنٹہ کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دہلی اور لندن کے اوقات میں تقریباً ۵ ½ گھنٹے کا فرق ہے۔ دہلی والوں کے لئے دن بڑا نہیں ہوا۔ اور نہ وہ لندن والوں کے لئے بڑا ہوا۔ البتہ میرے لئے بڑا ہو گیا۔ کیونکہ میں دہلی کی فضا سے نکل کر اسی دن لندن کی فضا میں پہنچ گیا۔ جہاں شام کا وقت دہلی کے مقابلہ میں ۵ ½ گھنٹہ بعد آتا ہے۔ ایک شخص دہلی سے نکلے اور اسی دن وہ لندن پہنچ جائے تو قدرتی طور پر اس کے لئے اس وقت بھی دن ہوگا جب کہ دہلی والوں کے لئے شام آچکی ہوگی۔

یہ ایک علامت ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے اتنے زیادہ امکانات رکھے ہیں کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ اس وقت بھی اجالے میں ہوں جب کہ دوسروں پر رات کا اندھیرا چھا چکا ہو۔

جہاز کے اندر لندن کا اخبار ٹیلی گراف پڑھنے کو ملا۔ اس کا روزانہ ایڈیشن ۲۸ صفحات پر مشتمل ہوتا ہے اور سنڈے ایڈیشن ۴۰ صفحات پر۔

ڈیلی ٹیلی گراف (۲۲ مارچ ۱۹۸۳) میں یہ خبر درج تھی کہ ایک مسلم خاتون (مسز محمودہ پٹیل) جن کی عمر ۳۰ سال ہے انہوں نے اپنے ایک مرض کے سلسلے میں لندن کے ایک ڈاکٹر کا علاج کرایا۔

ڈاکٹر نے غلط تشخیص کی اور غلط دوا دیدی جس کی وجہ سے ان کا ایک بازو جزئی طور پر مفلوج ہو گیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ چنانچہ لندن ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ مسز پٹیل کو ڈاکٹر کی طرف سے ۸۵۰۰۰ پونڈ ہرجانہ دلائے جائیں۔

اس اخبار میں دوسری خبر یہ تھی کہ ایک نوجوان (Michael Robinson) جس کی عمر ۲۵ سال ہے، وہ ایک فارم میں کام کرتا تھا۔ وہاں زرعی مشین سے اس کے سر میں چوٹ آگئی اور اس کا دماغ متاثر ہو گیا۔ اس نوجوان نے بھی مقدمہ دائر کیا۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ اس نوجوان کو تلافی کے لئے ۲۲۰۰۰۰ پونڈ ادا کئے جائیں۔

اس طرح کے واقعات ہمارے ملک میں روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ایسے مصیبت زدگان کا ہمارے یہاں جو انجام ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب جب حضرت مسیح دنیا میں آئیں گے تو وہ دمشق کے سفید منارہ کے پاس اتریں گے اور کہیں گے کہ سیڑھی لاؤ۔ اس کے بعد سیڑھی لگائی جائے گی۔ اور وہ اس کے ذریعہ سے اتر کر زمین پر قدم رکھیں گے۔ آسمان سے اتر کر اونچائی پر ٹھہرنا اور سیڑھی مانگنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ جب میں ہوائی جہاز کا سفر کرتا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ ہوائی جہاز چالیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آکر ہوائی اڈہ پر اترا اور پھر اس کے بلند دروازوں پر مخصوص قسم کی اونچی سیڑھیاں لگائی گئیں تاکہ مسافر اس کے ذریعہ سے زمین پر اتریں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث تمثیلی زبان میں تو نہیں۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ حضرت مسیح ہوائی جہاز کے دور میں آئیں گے۔

آپ اپنے مقام سے مشرق کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کریں تو دن آپ کے لئے چھوٹا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جب آپ مشرق سے مغرب کی طرف لمبا اور تیز رفتار سفر کرتے ہیں تو دن آپ کے لئے بڑا ہو جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کی طرف ہوائی جہاز سے لمبا سفر کر کے جب آپ اپنی اگلی منزل پر پہنچتے ہیں تو اس وقت بھی دن آپ کے لئے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ آپ کے اپنے مقام پر وہ ڈوب چکا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے سابق مقام پر مغرب کی نماز پڑھ کر مغرب کی سمت تیز رفتار سفر کریں تو اگلی منزل پر پہنچ کر سورج آپ کو دوبارہ نکلا ہوا دکھائی دے گا ——— عمل کے ذریعہ آدمی وقت کے اوپر بھی غالب آجاتا ہے۔

لندن کا اخبار ٹائمس ۳۲ صفحات پر نکلتا ہے۔ اس کی ۲۵ مارچ ۱۹۸۳ کی اشاعت میں ایک باتصویر خبر صفحہ اول پر درج تھی جس کی مزید تفصیلات نے صفحہ ۲۰ کے تہائی حصہ پر قبضہ کر رکھا تھا۔ خبر کا عنوان تھا :

Gurinder Singh Mandla: Broke school rules

ایک سکھ نوجوان گورندر سنگھ منڈلا (۱۸ سال) پارک گروو اسکول (برمنگھم) میں پڑھتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر لی (Audley Dowell Lee) نے اس کی پگڑی پر اعتراض کیا۔ کیونکہ وہ اسکول یونیفارم کے خلاف تھا۔ سکھ طالب علم نے اس کی تعمیل نہیں کی۔ چنانچہ ہیڈ ماسٹر نے اس کا نام اسکول سے خارج کر دیا۔

اس کیس کو فیڈریشن آف سکھ آرگنائزیشن نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انہوں نے اس پر پچاس ہزار پونڈ خرچ کئے اور پانچ سال تک مقدمہ لڑتے رہے۔ وہ عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم وہ ہمت نہیں ہارے۔ اب انہوں نے اپنا مسئلہ برطانیہ کے ہاوس آف لارڈز میں پیش کیا۔ ہاوس آف لارڈز نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ دیا کہ برطانیہ کے قانون نسلی تعلقات (Race Relations Act) کے تحت سکھ طالب علم کو پگڑی پہننے سے روکا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ یہ ان کے خلاف ایک امتیاز (Discrimination) کا معاملہ ہو گا۔ اس فیصلہ سے ان تمام سکھوں کو فائدہ پہنچے گا جو دو لاکھ پچاس ہزار کی تعداد میں برطانیہ میں آباد ہیں۔

انگریز اپنی روایات کے بے حد پابند ہیں۔ وہ اسکول یونیفارم کے معاملہ میں اس قسم کی خلاف ورزی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ مگر قانون کی موجودگی میں وہ دھاندلی کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے سخت ناپسندیدگی کے باوجود انہوں نے سکھوں کو یہ اجازت دیدی کہ وہ اسکول یونیفارم کی خلاف ورزی کریں۔ اور پگڑی پہن کر اسکول میں آئیں۔ اصول کو نہ توڑنے کا یہی مزاج ہے جو کسی قوم کو کرپشن سے بچاتا ہے۔ اصول کو توڑنا روایت کو توڑنا ہے۔ اگر آپ غیروں کی ضد میں اصول کو توڑیں تو اپنوں کے درمیان بھی آپ اصول کا احترام باقی نہیں رکھ سکتے۔

انگریزوں نے جب عراق پر قبضہ کیا تو اس زمانہ کا ایک لطیفہ ہے جو انگریزی قوم کے مزاج کو بہت خوبی کے ساتھ بتاتا ہے۔ سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) بصرہ میں انگریز گورنر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صبح کے وقت قریب کی مسجد سے موذن نے فجر کی اذان دی۔ سر پرسی کاکس کے لئے یہ نئی آواز تھی۔ اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کیسی آواز ہے۔ بتایا گیا کہ یہ

مسلمانوں کی اذان ہے۔ وہ ہر نماز کے وقت نمازیوں کو باخبر کرنے کے لئے اس قسم کی اذان دیتے ہیں۔ سرپرسی کاکس نے کہا :

"اس سے ہمارے امپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں "

کہا گیا کہ نہیں۔ اس نے کہا، پھر انہیں کرنے دو جو وہ کر رہے ہیں۔

اس سے انگریز قوم کا مزاج معلوم ہوتا ہے اور غالباً ان کا یہ مزاج بھی سکھوں کو پگڑی کا حق دینے کا سبب ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے نو آبادیاتی دور میں انگریزوں کے اس مزاج کو استعمال نہیں کیا۔ مثلاً اگر وہ غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تو انگریز قطعاً اس میں رکاوٹ نہ ڈالتے۔ بلکہ تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہے کہ انگریزوں نے خود یہ چاہا کہ مسلمان سیاسی لڑائی چھوڑ کر تعلیم اور تبلیغ کے کام میں لگ جائیں۔ جس میں ان کے نزدیک ان کی امپائر کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر مسلمان اس موقع کو استعمال کرتے تو آج یقینی طور پر تاریخ بالکل دوسری ہوتی۔ جس عمل کو انگریز اپنے امپائر کے لئے بےخطر سمجھتا تھا، اسی میں سارے باطل امپائر کی موت چھپی ہوئی تھی لیکن مسلم لیڈروں کو سب کچھ معلوم ہے مگر یہی اہم ترین بات ان میں سے کسی کو نہیں معلوم۔

مسلم قوموں کا تقابل اگر موجودہ زمانہ کی مغربی قوموں سے کیا جائے تو ایک عجیب فرق نظر آئے گا۔ مغربی قوموں میں حقیقت پسندی ہے اور مسلم قوموں میں جذباتیت۔ یہ فرق اتنا زیادہ عام ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے۔ ادب، سیاست، معاشرت، اقتصادیات، تعلیم، غرض کوئی شعبہ اس سے خالی نہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جدید دور میں مغربی قوموں کا مزاج سائنس کی فضا میں بنا اور مسلمانوں کا مزاج سیاست کی فضا میں۔ اور یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ سائنس حقیقت پسندی پیدا کرتی ہے اور سیاست جذباتی ہنگامہ آرائی۔

ہم میں سے جن لوگوں کی عمریں پچاس سال سے اوپر ہیں، ان کو ہندستان کی تقسیم سے پہلے کے وہ مناظر اچھی طرح یاد ہیں جب کہ "تقسیم ہند"، کو مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل سمجھ لیا گیا تھا۔ اقبال اس نظریہ کو پیش کرنے کے نتیجہ میں مفکر اعظم اور محمد علی جناح اس کو لیکر اٹھنے کی بنا پر قائداعظم بن گئے تھے۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں مجھے ایک کتاب پڑھنے کو ملی جس میں اس گزرے ہوئے دور کا

ایک عبرت ناک ورق موجود تھا۔ یہ ورق یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں "پاکستان" کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ مسٹر جناح اس اجلاس کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

> The problem in India is not of an inter-communal character but manifestly of an international one, and it must be treated as such. So long as this basic and fundamental truth is not realized, any constitution that may be built will result in disaster and will prove destructive and harmful not only to the Musalmans but to the British and Hindus also. If the British government are really in earnest and sincere to secure peace and happiness of the people of this sub-continent, the only course opened to us all is to allow the major nations separate homelands by dividing India into 'autonomous national states.' There is no reason why these states should be antagonistic to each other. On the other hand, the rivalry and the natural desire and efforts on the part of one to dominate the social order and establish political supremacy over the other in the government of the country will disappear. It will lead more towards natural goodwill by international pacts between them, and they can live in complete harmony with their neighbours. This will lead to further a friendly settlement all the more easily with regard to minorities by reciprocal arrangments and adjustments hetween Muslim India and Hindu India, which will far more adequately and effectively safeguard the rights and interests of Muslims and various other minorities

"ہندستان کا مسئلہ دو فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ دو قوموں کا مسئلہ ہے، اور اس کو اسی طرح حل کیا جانا چاہیے۔ اس بنیادی حقیقت کو جب تک تسلیم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک جو دستور بھی بنایا جائے گا وہ تباہ کن ہوگا۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے نقصان کا باعث ہوگا بلکہ برطانیہ اور ہندوؤں کے لئے بھی۔ برطانی حکومت اگر فی الواقع اس برصغیر کے لوگوں کو امن اور خوشی دینا چاہتی ہے تو ہم سب کے لئے ایک ہی کھلا ہوا راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ملک کو آزاد قومی ریاستوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو علیٰحدہ وطن دیدیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ یہ ریاستیں کیوں ایک دوسرے کی مخاصم ہوجائیں گی۔ اس کے بجائے یہ ہوگا کہ اس کے بعد باہمی رقابت اور ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ اور ایک دوسرے پر سیاسی برتری حاصل کی خواہش ختم ہوجائے گی۔ اس طرح کی تقسیم ان کے درمیان مزید بین اقوامی معاہدات کے ذریعہ باہم اچھے تعلقات کا سبب ہوگی۔ اور وہ کامل ہم آہنگی سے اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہیں گی۔ اس کے بعد زیادہ آسانی کے ساتھ یہ ممکن ہو جائے گا کہ اقلیتوں کے بارہ میں دوطرفہ بنیاد پر دوستانہ معاملہ کیا جاسکے اور مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا کے درمیان بہتر تعلقات قائم

کئے جاسکیں گے جو زیادہ مناسب اور زیادہ موثر طور پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گا۔ ۱۱۱

اس تقریر کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ جن خوبصورت الفاظ پر چالیس سال پہلے پوری قوم کی قوم دوڑ پڑی تھی وہ الفاظ حقیقتِ واقعہ سے کتنا زیادہ دور تھے۔ لندن میں میری ملاقات بہت سے ہندستانیوں اور پاکستانیوں سے ہوئی۔ سب سے زیادہ عجیب بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ کہ آزاد اور مدنی کے سیکولر ہندستان اور اقبال اور جناح کے اسلامی پاکستان سے زیادہ یہ لوگ انگریزوں کے لندن میں اپنے آپ کو محفوظ اور کامیاب سمجھتے ہیں، وہی انگریزوں کا لندن جس کو دونوں گروہوں نے مشترک طور پر جہنم فرض کر لیا تھا اور اپنے خوابوں کے دیس کو اپنے لئے جنت یقین کر رکھا تھا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رچرڈ نکسن نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے قائدین (leaders) اس کتاب میں بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ مصنف نے ہندستان اور پاکستان کے لیڈروں کے بارہ میں بھی اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جنگ عظیم ثانی کے بعد کی تاریخ میں بے معنی فوجی اخراجات کی سب سے زیادہ الم ناک مثالوں میں سے ایک وہ ہے جو ہندستان اور پاکستان کے جھگڑے کی صورت میں پائی جاتی ہے:

The Indo-Pakistani conflict was one of the most tragic examples of senseless military spending in post-war history.

رچرڈ نکسن کے الفاظ خواہ ہمیں کتنے ہی زیادہ ناپسند ہوں، مگر یہ خود ہمارے اپنے لیڈروں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہندستان اور پاکستان کے موجودہ حالات اگر ایسے نہ ہوتے تو امریکہ کے سابق صدر کو یہ کہنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی۔

یہاں جو ایشیائی مقیم ہیں ان کے دو سب سے بڑے مسئلے ہیں ـــــ مقامی باشندوں کا انہیں حقیر سمجھنا۔ اور اپنے بچوں کے بارہ میں ان کی بے بسی۔

انگریز قوم بے حد متحمل مزاج قوم ہے۔ اس لئے بہت زیادہ کھلے طور پر ایشیائیوں سے اس کی بیزاری کا اظہار نہیں ہوتا۔ مگر روزمرہ کی زندگی میں ایشیائیوں کو بار بار اس کا تلخ تجربہ اٹھانا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک ایشیائی خاندان کا بچہ ایک روز باہر سے آیا اور غم زدہ ہو کر اپنی ماں سے بولا "ممی انگریز بچے ہم کو بلیک (کالا) کیوں کہتے ہیں۔ ہم بلیک تو نہیں ہیں" ایک صاحب جنہوں نے

انگریز خاتون سے شادی کی ہے۔ ان کے اپنے بچے جب خفا ہوتے ہیں تو اپنے والد کو کہتے ہیں "بلیک"
جو بچے یہاں پیدا ہوئے ہیں وہ انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ انگریزی ٹیلی وژن دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف انگریزی میں بول سکتے ہیں وہ اپنے والدین کی زبان نہیں جانتے۔ والدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں سے اپنی مادری زبان میں بات نہیں کر سکتے۔ اس سے بھی زیادہ بڑا مسئلہ بچوں کی آزادی ہے جو یہاں کا پورا ماحول انہیں سکھا رہا ہے۔ موجودہ مغرب کا خاص مزاج ہے اپنے آپ سے باہر کسی اتھارٹی کو نہ ماننا۔ بچے یہاں کی فضا میں ہر وقت یہی سبق سیکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف خدا و رسول سے منحرف ہو رہے ہیں بلکہ اپنے ماں باپ کی بات ماننے کو اپنی انفرادی آزادی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ وہ صفائی سے کہتے ہیں کہ دوسرا کوئی شخص ہمارے اوپر پابندی کیسے لگا سکتا ہے۔ ہم جو کچھ کریں گے اپنی سمجھ سے کریں گے نہ کہ دوسرے کی سمجھ سے۔

کچھ ایشیائی خاندان مقاومت کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ بہت سے خاندانوں نے حالات سے مصالحت کر لی ہے۔ ایک دیندار خاندان کی بچی جو اپنے گھر میں یہ سنتی تھی کہ صرف ذبیحہ کا گوشت کھانا چاہئے۔ اس سے اسکول میں ایک دوسرے مسلمان خاندان کی بچی نے کہا کہ ہم لوگ ذبیحہ اور غیر ذبیحہ کا فرق نہیں کرتے۔ ہم وہی کھاتے ہیں جو بازار میں ملتا ہے۔ پہلے خاندان کی بچی اپنے گھر آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا "ممی آپ ہم لوگوں کو غیر ذبیحہ کا گوشت کھانے سے منع کرتی ہیں۔ حالانکہ فلاں مسلمان گھر کے لوگ غیر ذبیحہ کا گوشت کھاتے ہیں۔ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں۔ کیا ہمارا اسلام دوسرا ہے اور ان کا اسلام دوسرا"

ایشیائی لوگ مغربی ملکوں میں زیادہ کمائی کے لئے جاتے ہیں۔ تاہم میرے نزدیک اس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ محنتی آدمی اپنے ملک میں بھی کافی کمائی کر سکتا ہے۔ اگرچہ یہ فرق ضرور ہے کہ باہر جو کچھ کم محنت کر کے مل جاتا ہے اس کو اپنے ملک میں پانے کے لئے زیادہ محنت کا ثبوت دینا ہوگا۔

البتہ مغربی ملکوں میں ایک خاص چیز ہے جو ہندستان جیسے ملکوں میں موجود نہیں۔ اور وہ ہے معاملات میں دیانت داری۔ ایک صاحب نے لندن کی ایک دکان سے جوتا خریدا۔ جوتا پہلے ہی استعمال میں پھٹ گیا۔ ان کے پاس خریداری کی رسید محفوظ نہ تھی۔ تاہم انہوں نے جوتا کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کو خط لکھا۔ اس کے جواب میں ان کے پاس جو معذرت نامہ آیا اس کے ساتھ لفافہ میں پوری قیمت کا بینک چیک بھی موجود تھا۔

یہاں پیدائش کے بعد فوراً ہی بچہ کو حکومت سے وظیفہ لینے کا حق ہو جاتا ہے۔خواہ وہ بچہ ایک ایسے ماں باپ کا ہو جو یہاں اپنے ملکی پاسپورٹ پر مقیم ہیں۔آپ کو صرف ایک بار ضروری فارم لینے کے لئے متعلقہ دفتر جانا پڑے گا۔آپ فارم پر کرکے بھیج دیجئے اور ڈاک سے آپ کے یہاں ہر مہینہ چک کے ذریعہ وظیفہ کی رقم آتی رہے گی۔لندن کے لوگ اگرچہ ایشیائی لوگوں سے نفرت کرتے ہیں۔مگر قانونی طور پر ان کے جو حقوق ہیں ان کو دینے میں کبھی ان کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جاتا۔ایشیائیوں سے امتیازی سلوک کرنا اپنے نظام کو خراب کرنے کی قیمت پر ہوگا، اور وہ پسند نہیں کرتے کہ دوسروں کی ضد میں خود اپنے نظام کو خراب کرلیں۔

ایشیائی لوگوں سے امتیاز کی بات مجھ سے یہاں کے کچھ ایشیائی لوگوں نے کہی۔اس کے بعد میں نے اس کا ذکر ایک انگریز سے کیا۔اس نے کہا کہ یہ جنرلائزیشن ہے۔یعنی جزئی واقعات کو عمومی واقعات بنا دیا گیا ہے۔اس نے کہا کہ انگریزوں کے اندر نسلی تعصب نہیں پایا جاتا۔عام انگریز ایشیائی لوگوں کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے وہ خود اپنے درمیان ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔پرانے انگریز جنھوں نے نوآبادیاتی زمانہ دیکھا ہے ان میں کچھ احساس برتری ضرور ہے۔مگر نئی نسل کے نوجوانوں ایسا

میں اب تک جن جن ملکوں میں گیا ہوں، ان میں کم از کم ایرپورٹ پر مجھے سب سے زیادہ بہتر اخلاق کا ثبوت لندن میں ملا ہے۔مثلاً نیویارک کے ایرپورٹ پر جن امریکی نوجوانوں سے میرا سابقہ پیش آیا ان میں سے اکثر کے اندر میں نے احساس برتری کی جھلک دیکھی۔مگر لندن کے ہوائی اڈہ پر جو انگریز نوجوان ڈیوٹی پر متعین تھے۔انھوں نے ہمیشہ نرمی اور شرافت کا ثبوت دیا۔

ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انڈیا اور انگلستان کے درمیان تعلقات دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ گہرے ہیں۔اس کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ ہندستان اور بیرونی دنیا کے درمیان ٹیلی فون کا ربط سب سے پہلے انگلینڈ کے واسطہ سے قائم ہوا۔ایشیا اور یورپ کے یہ دو اہم ملک یکم مئی ۱۹۳۳ کو ٹیلی فون کے ذریعہ مربوط ہوئے۔آج بھی یہ حال ہے کہ ہندستان سے بیرونی ٹیلی فون ٹرافک کا تقریباً چالیس فی صد حصہ لندن ہو کر گزرتا ہے۔

اس ٹیلی فونی ربط کی پچاس سالہ تقریب ۳ مئی ۱۹۸۳ کو لندن اور نئی دہلی میں بیک وقت منائی گئی۔اس موقع پر تقریب کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے وزیر اعظم انگلستان مسز مارگریٹ تھیچر سے ٹیلی فون پر بات کی۔

ہندستان میں زندہ رہنے کے لئے آدمی کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ــــــ قوت خریداری اور خریدی جانے والی چیز کے بارہ میں جانکاری ۔ چونکہ زندگی کی ضروریات بے شمار ہیں ۔ آدمی کو کمانے اور قوت خرید حاصل کرنے میں اتنا مصروف ہونا پڑتا ہے کہ وہ ہر چیز کے بارہ میں جانکاری حاصل نہیں کرسکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں خریدار کو بار بار دھوکا کھانا پڑتا ہے ۔ وہ اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسہ کو بازار میں اس طرح دے دیتا ہے کہ اس کے بدلے میں اس کو ایسی چیز ملتی ہے جو چند دن کے استعمال کے بعد صرف اس کے مکان کے کباڑ میں اضافہ کرے ۔

لندن میں اور مغرب کے دوسرے شہروں میں یہ مسئلہ نہیں ہے ۔ یہاں آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے ۔ اور وہ یہ کہ آپ محنت کرکے کمائیں ۔ اگر آپ کے پاس رقم ہے تو آپ بازار سے اس اطمینان کے ساتھ خریداری کرسکتے ہیں کہ آپ جو چیز حاصل کرنا چاہتے تھے وہی چیز آپ نے پائی ہے نہ کہ کوئی دوسری چیز ۔ حتی کہ اگر آپ کے پاس بازار جاکر خریداری کرنے کا وقت نہیں ہے تو آپ اپنی ضرورت کی ہر چیز ٹیلی فون پر منگا سکتے ہیں ۔ اور اس طرح منگائی ہوگی ۔

مغربی قوموں میں یہ چیز غالباً سائنسی روایات سے آئی ہے ۔ سائنس حقیقت پسندی کا ذہن پیدا کرتی ہے اور یہ تمام خصوصیات بلاشبہ حقیقت پسندی کے مختلف نتائج ہیں ۔

۲۵ مارچ کو لندن میں میری قیام گاہ پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رشید صدیقی مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں ۔ موصوف یو کے اسلامک مشن (لندن) کے صدر ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنے یہاں میرا پروگرام رکھنا چاہتے ہیں میں نے رضامندی دیدی ۔ لندن سے میری روانگی ۲۹ مارچ کو تھی ، اس لئے یہ طے ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۹۸۳ کی شام کو پروگرام رکھا جائے ۔

یو کے اسلامک مشن کا صدر دفتر لینڈس ڈاون روڈ (لندن) میں قائم ہے ۔ اس کے علاوہ انگلستان میں اس کی ۳۵ شاخیں ہیں ۔ مرکزی دفتر میں کچھ تعلیم یافتہ افراد جمع ہوئے ۔ جن سے سوال وجواب کی صورت میں بات چیت ہوئی ۔ مختلف دینی موضوعات زیر بحث آئے ۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ جہالت ہے ۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوجائیں تو ان کے اکثر مسائل اپنے آپ حل ہوجائیں گے ۔ یہ سن کر ایک نوجوان نے کہا :

مغرب میں تو تعلیم بہت عام ہے ۔ مگر یہاں کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے ۔ چنانچہ

یہاں کے لوگ اب   کی بات کرنے لگے ہیں۔ وہ اب سوچ رہے ہیں کہ بے تعلیمی شاید زیادہ بہتر طور پر انسانی مسائل کو حل کرے گی ''

مذکورہ مسلم نوجوان انگلستان کے ایک انگریزی پرچہ میں کام کرتے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ آپ جو اپنے وطن سے آکر یہاں رہ رہے ہیں تو کیا یہاں آپ اپنی بے علمی کی قیمت پا رہے ہیں۔ اگر بے علمی مسئلہ کا حل ہو تو آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو بے علم بنانا چاہئے۔ مگر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے لئے اور اپنے بچوں کے لئے علم کو نمبر ایک اہمیت دئے ہوئے ہیں اور ملت کے بچوں کو وہ بے علمی کا سبق دے رہا ہے۔ یہی غیر سنجیدگی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ہمارے تمام مسائل پیدا کئے ہیں۔

مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر کے بارہ میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک تقریر میں اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں۔ ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) لندن میں معلوم ہوا کہ یہ سراسر یہودیوں کی اختراع تھی۔ انہوں نے خود سے اس کو وضع کرکے اس کو مشہور کر دیا تاکہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کا جواز فراہم ہو سکے۔

انگلستان کے ایک مورخ ارسکن چائلڈرس (Erskine Childers) نے یہودیوں کی اکاذیب پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں صدر ناصر کے مذکورہ فقرہ کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی تحقیق ناصر کی زندگی میں شروع کی تھی۔ اس نے جب اخبارات میں یہ رپورٹ پڑھی تو اس نے صدر ناصر کو خط لکھا کہ آپ نے یہ بات اپنی کس تقریر میں کہی ہے، ناصر نے لکھا کہ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے کبھی یہ بات کہی ہو۔ تاہم میں نے اپنے عملہ کو ہدایت کی ہے کہ وہ میری تمام تقریروں کا جائزہ لے۔

ناصر کی تمام تقریروں کا ٹیپ موجود تھا، وہ سب کا سب دوبارہ سنا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سراسر گھڑی ہوئی بات ہے۔ ورنہ ناصر نے کبھی ایسی بات نہیں کہی، یہودیوں نے اپنے سیاسی مقصد کے تحت یہ جھوٹ گھڑا۔ اور مسلمانوں کا حال چونکہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے بارہ میں ہر الٹی بات کو فوراً مان لیتے ہیں۔ چنانچہ جو صدر ناصر کے مخالف تھے وہ اس کو لے اڑے۔ ارسکن چائلڈرس نے اپنی کتاب میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

راقم الحروف جمال عبدالناصر کا کسی درجہ میں بھی حامی نہیں۔ مگر کسی آدمی کی طرف وہی

بات منسوب کرنی چاہئے جو فی الواقع اس نے کی ہو یا کہی ہو۔ مثلاً جمال عبدالناصر نے ۱۹۵۵ میں نہر سوئز کو نیشنلائز کیا ہیں اس کو سراسر حماقت سمجھتا ہوں۔ اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے سوا اس کا کوئی وجہ جواز نہیں۔ نہر سوئز ایک بین اقوامی معاہدہ کے تحت برطانیہ اور فرانس کے زیر انتظام تھی۔ یہ معاہدہ صرف چند سال بعد ختم ہونے والا تھا۔ اگر ناصر صبر کرتے تو چند سال بعد وہ اپنے آپ ختم ہو جاتا، مگر ناصر نے اپنی قیادت کو نمایاں کرنے کے لئے غیر ضروری طور پر قبل از وقت اس کو نیشنلائز کیا اور اس کی قیمت مصر کو بہت بڑی تباہی کی صورت میں بھگتنی پڑی۔

ہانگ کانگ کو برطانیہ نے پٹہ پر چین سے لیا تھا۔ اس کی مدت ۱۹۹۷ میں ختم ہونے والی ہے۔ چینی بالکل خاموش بیٹھے ہوئے ہیں کہ جب یہ مدت ختم ہو تو معاہدہ کی تجدید نہ کرکے دوبارہ ہانگ کانگ پر اپنا قبضہ بحال کرلیں۔ اسی طرح کیوبا میں ایک جزیرہ سابق معاہدہ کے تحت امریکی فوج کے قبضہ میں ہے۔ اس کو بھی وہاں کا موجودہ حکمراں کیسترو برداشت کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ امریکہ کا سخت مخالف ہے۔ وہ اس انتظار میں ہے کہ چند سال بعد جب معاہدہ کی مدت ختم ہو تو اس کی تجدید سے انکار کر دے اور اس طرح امریکی فوجوں کو واپس بھیج دے۔ مگر جمال عبدالناصر نے انتہائی غیر مدبرانہ طور پر نہر سوئز کو قبل از وقت قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا اور اس کے نتیجہ میں مصر اور خود نہر سوئز دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

شاہ فاروق مصر کے آخری بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنے زوال کے وقت کہا تھا کہ دنیا میں بالآخر پانچ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کا اور ایک برطانیہ کا۔ شاہ فاروق کی یہ بات لفظ بلفظ درست ثابت ہوئی۔ آج فی الواقع یہی پانچ بادشاہ دنیا میں باقی رہ گئے ہیں۔ چار تاش کے، کیونکہ تاش کے بادشاہ کو اپنی بادشاہت باقی رکھنے کے لئے کسی ملک کی ضرورت نہیں۔ وہ کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بھی اپنی بادشاہت کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اور جہاں تک برطانیہ کے بادشاہ کا تعلق ہے، اس کو برطانی قوم کی بڑھی ہوئی روایت پسندی نے قائم کر رکھا ہے۔

اس وقت ملکہ الزبتھ برطانیہ کی تاجدار ہیں۔ بادشاہ یا ملکہ کا لفظ بظاہر بڑا پرکشش معلوم ہوتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ یا ملکہ بننا اتنی زیادہ قیمت مانگتا ہے کہ اس کو جاننے کے بعد ایک حقیقت پسند آدمی کی نظر میں اس کی اہمیت بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے۔

بادشاہ اپنے ملک کا سب سے بڑا قیدی ہوتا ہے۔ لندن کے سفر کے زمانہ میں یہاں

کی ملکہ کے بارہ میں ایک دلچسپ مضمون نظر سے گزرا۔ اس کا پہلا جملہ یہ تھا:

Mystery is the Secret of Royalty

(بادشاہت کا راز اس کا پراسرار ہونا ہے) اگر لوگ یہ جان لیں کہ بادشاہ بھی انہیں جیسا ایک انسان ہے تو بادشاہت کی جڑیں اکھڑ جائیں۔ "کوا اگر یہ چاہتا ہے کہ وہ کوئل دکھائی دے تو اس کو سب سے دور کی شاخ پر بیٹھنا چاہئے۔ اور اسی کے ساتھ اپنے منھ کو بند رکھنا چاہئے"۔ لوگوں کے اوپر بادشاہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ لوگ بادشاہ کو اپنے سے زیادہ عقل مند اور بڑا سمجھیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ بادشاہ مسلسل لوگوں سے دور رہے اور کم سے کم بولے۔ کہا جاتا ہے کہ ملکۂ وکٹوریہ کبھی عوام کے درمیان ہنسی نہیں:

She never smiled in public

برطانیہ کا بادشاہ برطانی لوگوں کی روایت پرستی کی بنا پر ابھی تک بادشاہ بنا ہوا ہے۔ مگر زمانہ کی تبدیلی نے موجودہ زمانہ کے بادشاہ کے لئے ایسے مسائل پیدا کر دئے ہیں جن کا حل بظاہر آسان نہیں۔

موجودہ زمانہ آزادیٔ خیال کا زمانہ ہے۔ جابرانہ حکومتیں بھی موجودہ زمانہ میں یہ نہیں کر پاتیں کہ وہ پریس کی آزادی پر پابندی لگا دیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ مشہور ہے۔ فرانس کے جنرل ڈیگال جب اپنے ملک میں برسر اقتدار آئے تو ابتداءً اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے کافی جبر سے کام لیا۔ لوگوں پر مظالم بھی کئے گئے۔ مگر اسی زمانہ میں مشہور فلسفی سارتر آزاد تھا اور حکومت کی پالیسیوں پر کھلی تنقیدیں کرتا تھا۔ کسی نے جنرل ڈیگال سے کہا کہ آپ کی حکومت نے سارترے کے مخالف قلم کو آزاد کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ ڈیگال نے جواب دیا:

سارترے جیسے لوگ حکومتوں کا ضمیر ہوتے ہیں اور ضمیر کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

برطانی پریس نے آجکل شاہی خاندان کے اندرونی حالات چھاپنے شروع کر دئے ہیں۔ لندن کے اخبار سن نے شہزادی ڈائنا کے بارہ میں لکھا کہ محل کے باورچی خانہ میں وہ ننگے پاؤں تھیں اور ٹوسٹ پر مکھن لگا رہی تھیں۔ اس طرح کے انکشافات شاہی خاندان کی عظمت (Majesty) کو مجروح کرتے ہیں۔ چنانچہ ملکہ الزبتھ نے لندن کی عدالت میں مذکورہ اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ اس کو محل کی اندرونی باتوں کو چھاپنے سے روکا جائے۔

اسی طرح ۱۹۸۲ میں جب مسٹر فاگن (Michael Fagan) محل میں داخل ہوا اور ملکہ کی

خواب گاہ تک پہنچ گیا جہاں وہ اکیلی تھیں تو لوگوں نے سوال کرنا شروع کیا کہ فلپ صاحب کہاں تھے :

Where was Philip

اس کے بعد اخباروں نے انکشاف کیا کہ چونکہ مسٹر فلپ (ملکہ کے شوہر) سوتے وقت خراٹا لیتے ھیں اس لئے ان کو ملکہ کے کمرہ میں سونے کی اجازت نہیں ۔ وہ رات کے وقت دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ کالم نگار اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کرتا ہے :

> It must be a hard life for the royal family these days trying to keep sane, trying to be both human and royal at the same time. The more they try to maintain that dignity in public, the more hysterical they are likely to get in private. And with cooks ready to tell all to the press, they have no place to laugh or cry. It is a dilemma of our times.

شاہی خاندان کے لئے یقیناً یہ بڑی سخت زندگی ہے کہ ان حالات میں وہ اپنے آپ کو اعتدال پر قائم رکھیں ۔ ایک ہی وقت میں وہ عام آدمی بھی ہوں اور بادشاہ بھی ۔ عوام میں وہ جتنا زیادہ اپنی شاہی عظمت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں گے اتنا ہی زیادہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں جذباتی بن جائیں ۔ ایسے باورچیوں کے ساتھ جو پریس کو ہر بات بتانے کے لئے تیار رہتے ہیں، ان کے لئے نہ ہنسنے کا موقع باقی رہا ہے اور نہ چیخنے کا ۔ یہ ہمارے وقت کی ایک دوطرفہ مشکل ہے ۔

ایک ملکہ یا شہزادہ باہر سے دیکھنے میں لوگوں کو پرکشش معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر ان کو اندر سے دیکھئے تو صورت حال بالکل مختلف ہوگی ۔

ہفتہ وار ٹائم (نیویارک) میں خطوط کے کالم میں شاہی تعاقب (Royal Hunt) کے عنوان کے تحت ایک خاتون لکھتی ہیں :

> When I was little, I dreamed of marrying a prince. After reading about how the press pursues the princess of Wales I realize how nice it is that my prince is a pharmacist.

جب میں چھوٹی تھی تو میں کسی شہزادہ سے شادی کرنے کا خواب دیکھتی تھی ۔ اب یہ پڑھنے کے بعد کہ پریس کس طرح شہزادی ویلز کا پیچھا کرتا ہے، میری سمجھ میں آیا کہ یہ کتنا اچھا ہے کہ میرا "شہزادہ" ایک دواساز ہے ۔

شاہی ادارہ کو باقی رکھ کر برطانی لوگ زبردست فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ شاہ اور ملکہ کا

لفظ برطانیہ میں سیکڑوں سال کی قابل احترام تاریخ رکھتا ہے۔ اس طرح شاہ اور ملکہ برطانی عوام کے لئے اتحاد اور اتفاق کا مرکزی نقطہ (فوکس) فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ فائدہ ہے جو اندرونی اتحاد کی صورت میں برطانیہ کو شاہی ادارہ سے حاصل ہوتا ہے۔

آسٹریلیا میں یہ ذہن ابھرا کہ آسٹریلیا کامل طور پر برطانیہ سے موجودہ دستوری رشتہ کو ختم کرلے۔ برطانیہ نے یہ کیا کہ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈائنا کو وہاں بھیج دیا۔ میں جن دنوں لندن میں تھا، دونوں شاہی افراد آسٹریلیا کے دورہ پر تھے۔ ٹائمس (۲۹ مارچ ۱۹۸۳) نے رپورٹ شائع کی تھی کہ شاہی جوڑا جب سڈنی پہنچا تو عوام بیتاب ہوکر سڑکوں پر نکل پڑے۔ عوامی سمندر میں ایک شخص نے پلے کارڈ بلند کیا جس پر لکھا ہوا تھا کہ شاہ واپس جاؤ (Go Home Royals) ایک معمر خاتون لپک کر آئیں اور پلے کارڈ چھین کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ عظمت اور تقدس کی طویل روایت کے ساتھ آسٹریلیا کے شاہی دورہ نے وہاں کے معاملہ کو ٹھنڈا کر دیا۔

برطانیہ نے اگرچہ اپنا سیاسی امپائر کھو دیا ہے۔ مگر اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنی عالمی تصویر کو محفوظ رکھا ہے۔ پاکستان ایرویز کے بعد برٹش ایرویز غالباً واحد ہوائی کمپنی ہے جس کے جہازوں میں چھ زبانوں کے ساتھ اردو زبان میں بھی ہدایات لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس طرح انگریز اپنی عالمی تصویر کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے ان کو زبردست سیاسی اور تجارتی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔

جو ممالک اب بھی "برطانی کامن ویلتھ" کے نام سے برطانیہ کی چھتری میں موجود ہیں ان کو اپنے ساتھ باندھے رکھنے کے لئے بھی بادشاہت کا ادارہ بہت موثر ہے، جب بھی کسی ملک میں ناراضگی کی لہر اٹھتی ہے تو انگریز اپنے بادشاہ یا ملکہ کو وہاں بھیج دیتے ہیں۔ جو وہاں جاکر کیمرہ کے سامنے مسکراتا ہے اور ہاتھ ہلا کر لوگوں کو مبارک باد دیتا ہے۔ اس کے بعد تمام مسئلے اپنے آپ ختم ہو جاتے ہیں۔

اس طرح برطانیہ نے اپنے پچھلے مقبوضات میں بہت بڑے پیمانہ پر اپنے اقتصادی مفادات محفوظ کر رکھے ہیں۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں میں نے اپنی گھڑی میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب لندن میں چھ بجے کا وقت ہوتا تو میری گھڑی میں بارہ بج رہے ہوتے۔ ایک مرتبہ جب میں نے اچانک اپنی گھڑی دیکھی تو ایک لمحہ کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں لندن والوں کے مقابلہ میں چھ گھنٹے

آگے ہوں ۔ مگر بہت جلد میری غلط فہمی دور ہو گئی جب مجھے یاد آیا کہ میرا آگے ہونا صرف اس بنا پر ہے کہ میں لندن میں بیٹھ کر دہلی کی گھڑی اپنے ہاتھ پر باندھے ہوئے ہوں ۔

اس طرح کی خوش فہمی اس وقت بڑی خطرناک ہوتی ہے جب کہ وہ فکری اور اعتقادی روپ اختیار کر کے آدمی کے ذہن میں داخل ہو جائے ۔ ایسا آدمی اپنے جھوٹے تخیلات کی بنا پر بڑے بڑے اقدامات کر گزرتا ہے ۔ اور جب قانون قدرت کے مطابق وہ ناکامی سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لئے مزید غلطی یہ کرتا ہے کہ دوسروں کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان جاری کر دیتا ہے ۔ پہلے اگر اس نے فرضی اقدام کی نادانی کی تھی تو اب وہ فرضی شکایت کی نادانی میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ اس طرح وہ اپنے وقت اور اپنے مسائل کو برباد کرتا رہتا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنے آخری انجام کو پہنچ کر قبر میں چلا جاتا ہے تاکہ وہاں تقدیر کے پردہ پر اپنی حقیقی تصویر کو دیکھے ، صرف اس قیمت پر کہ دوبارہ اس کے لئے لوٹنے یا تلافی کرنے کا موقع نہ ہو ۔

واپسی کے وقت ایک عجیب لطیفہ پیش آیا ۔ روم سے میں ایر انڈیا پر سفر کر رہا تھا ۔ ایر انڈیا میں انگریزی کے ساتھ ہندی میں اعلان ہوتا ہے ۔ اناؤنسر نے اعلان کرتے ہوئے کچھ الفاظ کہے تو مجھے سنائی دیا :

" بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے "

یہ سن کر میں سمجھا کہ شاید کوئی بات گڑبڑ ہو گئی ہے اور ہوائی جہاز میں آگ لگنے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے ۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا ۔ مگر دریافت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ میں نے پورا اعلان نہیں سنا ۔ پورا اعلان یہ تھا :

ٹائلٹ میں سموکنگ نہ کریں ۔ اس سے بمان میں آگ لگنے کا ڈر ہے ۔

ہمارے سماج میں پچاس فی صد سے زیادہ باتیں اسی قسم کی ادھوری معلومات کی بنا پر ہوتی ہیں ۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو رائے قائم کرنے سے پہلے تحقیق کی ضرورت محسوس کرتے ہوں ۔

انجمن خدام القرآن (لاہور) ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جو ہر سال محاضرات قرآنی (قرآنی سیمنار) کے نام سے لاہور میں اجتماع کرتا ہے ، اس میں ملک اور بیرون ملک کے علماء اور دانشور قرآن کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کرتے ہیں ۔

سال رواں میں انجمن خدام القرآن کا یہ اجتماع یکم اپریل تا ۵ اپریل ۱۹۸۳ منعقد ہوا ۔

اس اجتماع میں شرکت کے لئے میرے نام دعوت نامہ آیا تھا۔ انجمن نے اپنے اعلانات میں میرا نام بھی شائع کردیا تھا۔ مگر افسوس کہ میں اس اجتماع میں شریک نہ ہوسکا۔ میں نے ۲ مارچ ۱۹۸۳ کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ میں درخواست دی تھی مگر پاکستان کی "اسلامی حکومت" نے مجھے ویزا نہیں دیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ مارچ کے پہلے عشرہ میں ہندستان میں ناوابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی کانفرنس تھی۔ اس سلسلے میں پاکستان کے صدر جناب ضیاء الحق صاحب نئی دہلی آئے ہوئے تھے۔ نئی دہلی کے دوران قیام انھوں نے ایک روز پاکستانی سفارت خانہ کا معائنہ کیا۔ وہاں ہندستانی لوگوں نے بتایا کہ ان کو پاکستان کے سفر کے لئے ویزا حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ جناب ضیاء الحق صاحب نے حکم دیا کہ آج کی تاریخ تک جتنی درخواستیں آچکی ہیں ان سب کو ویزا جاری کردیا جائے۔ چنانچہ پاکستانی سفارت خانہ نے اس دن ۲۴ گھنٹہ کام کرکے تقریباً دو ہزار درخواستوں کا ویزا جاری کردیا۔

امید تھی کہ اس مجموعی فیاضی میں ہم کو بھی حصہ ملا ہوگا۔ کیونکہ انہیں تاریخوں میں ہماری درخواست بھی پاکستانی سفارت خانہ میں موجود تھی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ۲۲ مارچ کو ہمارا آدمی پاکستانی سفارت خانہ گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ ویزا جاری کرنے کے بارہ میں صدر پاکستان کا جو حکم تھا وہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لئے پاکستان جارہے ہوں۔ آپ چونکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے جارہے ہیں اس لئے آپ کے ویزہ کے لئے اسلام آباد سے منظوری ملنا ضروری ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ میں اگلے دن لندن کے لئے روانہ ہورہا ہوں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں معلوم کرلیں۔ اسلام آباد سے اجازت نامہ آتے ہی ہم لندن کے پاکستانی سفارت خانہ کو ٹیلیکس کردیں گے۔

لندن میں میرے قیام کے آخری دن ۲۸ مارچ کو لندن کے پاکستانی سفارت خانہ میں ٹیلیفون کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ ہم کو نئی دہلی کے پاکستانی سفارت خانہ سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ویزا نہ ملنے کی وجہ سے میں لاہور کے قرآنی سیمینار میں شریک نہ ہوسکا۔

کیسی عجیب ہوگی وہ اسلامی حکومت جس کو نہ صرف غیر اسلامی پارٹیوں سے خطرہ ہو بلکہ خود اسلام سے بھی خطرہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں کو اسلام سے اتنا اندیشہ نہیں جتنا ان مسلم حکومتوں کو ہے جنھوں نے اپنے دعوے کے مطابق اپنے یہاں مکمل اسلام قائم کر رکھا ہے۔

ایک سفر

براعظم امریکہ دو بڑے خشکی کے ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ایک کو شمالی امریکہ اور دوسرے کو جنوبی امریکہ کہتے ہیں۔ ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان بحیرۂ کریبین (Caribbean Sea) ہے جس میں تقریباً ۲۰ چھوٹے چھوٹے جزیرے واقع ہیں۔ انھیں میں سے ایک جزیرہ وہ ہے جس کا نام باربیڈوز Barbados ہے۔

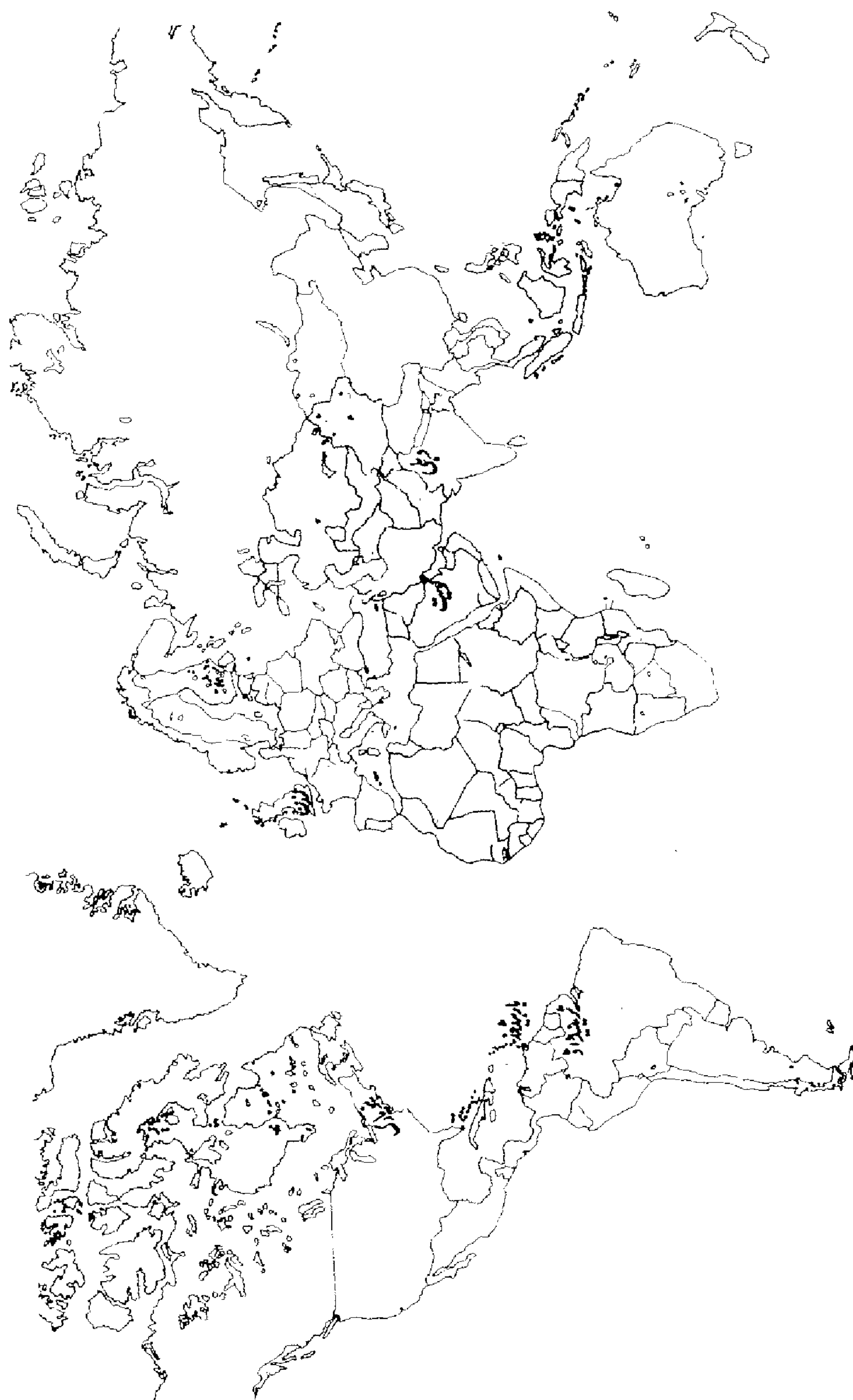
اس علاقہ میں پہلی کریبین اسلامک کانفرنس ۲۴ - ۲۸ اپریل ۱۹۸۱ کو پورٹ اسپین میں ہوئی تھی۔ دوسری کریبین اسلامک کانفرنس باربیڈوز میں ہوئی۔ مجھے اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ اس سلسلے میں باربیڈوز کا سفر پیش آیا۔ یہ کانفرنس ۳۱ مارچ سے لیکر ۴ اپریل ۱۹۸۳ تک جاری رہی۔

۲۳ مارچ کی صبح کو پالم ایرپورٹ سے برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۱۴۶ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ہوائی جہاز کا سفر، کم از کم میرے لئے، جلد منزل پر پہنچنے کی خاطر ایک ناخوشگوار چیز کو برداشت کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا کہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم جیسا طویل سفر میں پیدل طے کرسکوں تو یقیناً میں پیدل سفر کو ترجیح دیتا۔ کیونکہ پیدل چلنے والا خدا کی کھلی ہوئی دنیا میں چلتا ہے۔ اور ہوائی جہاز کا مسافر انسان کی بنائی ہوئی اڑن جیل میں۔

ہوائی جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا میگزین ہائی لائف (High Life) شمارہ مارچ ۱۹۸۳ تھا۔ اس میں لارڈ نارورچ Lord Norwich کے قلم سے ایک مضمون تھا جس کا عنوان تھا:

Where Cross and Cresent Meet

اس مضمون میں صلاح الدین ایوبی کی ایک دلچسپ کہانی درج تھی۔ عمان اور عقبہ کے درمیان گزرنے والی سڑک پر قدیم شہر موآب ہے۔ اس میں کراک کا قلعہ واقع ہے۔ یہ ایک پہاڑ کے اوپر ہے جہاں سے بحر مردار دکھائی دیتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی ۱۱۸۳ء میں یہاں داخل ہوا اس کو معلوم ہوا کہ یہ عین وہی دن ہے جب کہ یروشلم کی شہزادی ازبیلا کی شادی تورون کے شہزادہ ہمفری سے ہوئی ہے۔ دلہن کی ماں نے شادی کے



THE MUSLIM WORLD

ناشتہ کا کچھ سامان صلاح الدین ایوبی کے پاس بھجوایا۔ صلاح الدین ایوبی نے پوچھا کہ قلعہ کے کس ٹاور میں نوجوان میاں بیوی رات گذاریں گے۔ جب اس کو بتایا گیا تو اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیدیا کہ اس ٹاور پر گولے نہ پھینکے جائیں۔ اس قصہ کو بیان کرنے کے بعد مضمون نگار نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ کاش یہ مثال بار بار دہرائی جاتی:

One wishes that the example could have been more frequently followed

ہائی لائف میگزین میں اشتہار کی اپیل کرتے ہوئے ایک دلچسپ مکالمہ درج ہے۔

I hear that High Life has an audience of over
1.25 million air travellers a month.

Yes, and 64% are business people. In fact, High Life has more
business readers than most business oriented publications.

یہ مکالمہ ظاہری طور پر درست ہے۔ مگر اس کو سمجھنے کے لئے اس میں اتنا اور اضافہ کرنا ہوگا کہ ہائی لائف کی قسم کے "ان فلائٹ میگزین" اتنے کم دلچسپ ہوتے ہیں کہ بہت تھوڑے ہوائی مسافران کو باقاعدہ پڑھنے کی زحمت گوارہ کرتے ہیں۔ "شماریات" کی زبان بظاہر بڑی قطعی معلوم ہوتی ہے۔ مگر اکثر اوقات حقیقت اس سے زیادہ وسیع ثابت ہوتی ہے کہ وہ شماریات کی حدبندی میں سما سکے۔

گیارہ بجے ہم دبئی پہنچے۔ ہوائی جہاز کو یہاں ایک گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ دبئی کا ہوائی اڈہ ان ہوائی اڈوں میں سے ہے جہاں آگے جانے والے مسافروں کو وقتی طور پر اترنے کی اجازت ہے۔ آپ "ٹرانزٹ پاس" لے کر ایک گھنٹہ کے لئے یہاں اتر سکتے ہیں۔ ہوائی جہاز سے نکل کر ایک عرب ملک کی زمین پر قدم رکھنا بظاہر "برٹش دنیا" سے نکل کر "مسلم دنیا" میں قدم رکھنا تھا۔ مگر مغربی تہذیب کے غلبہ نے موجودہ زمانہ میں اس فرق کو بہت کم باقی رکھا ہے۔ مسافر جب ہوائی جہاز سے نکل کر باہر آتا ہے تو وہ ایک دنیا اور دوسری دنیا میں بظاہر بس اتنا فرق پاتا ہے کہ جہاز کے اندر تختیوں پر انگریزی الفاظ اوپر لکھے ہوئے تھے اور عربی الفاظ نیچے۔ اس کے برعکس باہر کی دنیا میں تمام تختیوں پر عربی الفاظ اوپر لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور انگریزی الفاظ نیچے۔ تاہم چھ گھنٹہ کی اڑان کے بعد جہاز کویت کی فضا میں پہنچا تو یہاں دوسرے اعلانات کے ساتھ عملہ کی طرف سے یہ اسلامی اعلان بھی کیا گیا کہ "جو مسافر یہاں اتر رہے ہیں ان کی اطلاع کے لئے بتایا جاتا ہے کہ کویت کے اندر

شراب لے جانا بالکل منع ہے ۔"

۲۳ مارچ کو جب کہ ہمارا جہاز ایک گھنٹہ کے لئے کویت کے ہوائی اڈہ پر کھڑا تھا، اس وقت ہمارے دو ساتھی کویت کے دورہ پر تھے ۔ دہلی سے ٹیلی فون کی گفتگو میں ان کو میرا پروگرام بتایا جا چکا تھا ۔ اگر ٹرین کی طرح ہوائی جہازوں پر بھی آکر ملنے کی اجازت ہوتی تو وہ ضرور اندر آکر مجھ سے ملاقات کرتے ۔ مگر ہوائی جہاز کے مخصوص قوانین کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہوسکا ۔ "ٹرین" بھی سواری ہے اور "ہوائی جہاز" بھی سواری۔ اس لفظی اشتراک کی بنا پر اگر کوئی شخص "پلیٹ فارم" ٹکٹ لینے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچ جائے تو اس کے حصہ میں ناکام واپسی کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا ۔

دہلی سے دبئی اور کویت تک کافی ہندستانی مسافر جہاز میں تھے ۔ وہ زور زور سے باتیں کرتے تھے ۔ اس کی وجہ سے جہاز کے اندر سکون کی فضا برہم ہو رہی تھی ۔ مجھے ۳۰ اگست ۱۹۸۲ کا دن یاد آیا جب کہ میں مالٹا سے فرانس کی طرف سفر کر رہا تھا ۔ ہوائی جہاز میں مجھ سے ملی ہوئی دو سیٹوں پر دو فرانسیسی بچے تھے ۔ دونوں بھائی بہن تھے اور برابر آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔ مگر وہ دونوں اتنے آہستہ بولتے تھے کہ میں بالکل ان کی بغل میں ہونے کے باوجود ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکا ۔ کتنا فرق ہے ایک انسان اور دوسرے انسان میں ۔ میں نے ان سے بعض سوالات کئے تو انہوں نے اتنے مہذب انداز میں ان کے جوابات دئے کہ ہندستان میں بہت کم اس کی امید کی جا سکتی ہے۔

۲۳ مارچ کو میں لندن پہنچا ۔ وہاں چند روز قیام کے بعد ۲۹ مارچ ۱۹۸۲ کو آگے کے لئے روانگی ہوئی ۔ برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۵۷ ہم کو لے کر اٹلانٹک کے اوپر اڑ رہی تھی ۔ آٹھ گھنٹہ مسلسل سمندر کے اوپر اڑنے کے بعد جہاز اینٹی گا (Antigua) اترا ۔ یہ بہت چھوٹا جزیرہ ہے۔ جزیرہ میں ہر طرف ہریالی نظر آئی ۔ صنعتی کثافت سے دور ہونے کی وجہ سے یہاں بڑے شہروں کے وہ لوگ کثرت سے آتے ہیں جو اپنے شہر کی انسان کش خصوصیات سے گھبرا اٹھتے ہیں اور چھٹیاں گزارنے کے لئے قدرت کا سادہ ماحول چاہتے ہیں ۔ جہاز سے بہت سے مسافر یہاں اترے اور دوبارہ بہت سے سوار ہوئے ۔ یہ سب سیاح تھے ــــــ اس دنیا میں اگر ترقی یافتہ ہونے کی قیمت ہے تو ان لوگوں کی بھی قیمت ہے جو ترقی کی دوڑ میں ابھی پیچھے ہوں ۔

اینٹی گا سے تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد ۲۹ مارچ کی شام کو ہم باربیڈوز پہنچے

جو اس سفر میں ہماری اصل منزل تھی ۔ لندن سے احمد ڈرامی کا ساتھ ہوگیا تھا ۔ وہ گامبیا (افریقہ) کے رہنے والے ہیں ۔ ہوائی اڈہ پر احمد ڈرامی عام مسافروں کے ساتھ باہر نکل آئے۔ ایمگریشن کی کھڑکی پر انہیں فوراً دس دن کا ویزا دید یا گیا ۔ مگر مجھے روک لیا گیا ۔ دیر تک میرے کاغذات کی جانچ ہوتی رہی ۔ اس کے بعد میرا پاسپورٹ مجھے واپس دیا گیا تو اس پر صرف ایک دن کی اجازت مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھی ہوئی تھی :

Permitted to enter & remain in the Island for one day

میرے مقامی ساتھیوں نے اس کے بعد ویزا میں دو ہفتہ کی توسیع کرالی ۔تاہم مجھے یہ کھوج تھی کہ میرے ساتھ امتیازی سلوک کیوں کیا گیا ۔

اس فرق کا راز مجھے اس وقت معلوم ہوا جب کہ میں باربیڈوز شہر (برج ٹاؤن) پہنچا۔ یہاں لوگوں نے بتایا کہ باربیڈوز چونکہ سیاحوں کا جزیرہ ہے ، یہاں آنے والوں کے لئے داخلہ کے قوانین بہت نرم ہیں ۔ پہلے یہ اجازت عام تھی ۔اب اس میں ہندستان اور پاکستان کا استثناء ہوگیا ہے ۔ ہندستان اور پاکستان کے لوگوں نے ضابطہ کی خلاف ورزی کی انہوں نے اپنے لوگوں کو یہاں بلایا اور غلط معلومات پیش کرکے ان کو باربیڈوز کا شہری بنا لیا ۔حکومت کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے یہ قانون بنا دیا کہ ہندستان اور پاکستان سے آنے والے لوگوں کے کاغذات کی سخت جانچ کی جائے اور ان کو پیشگی ویزا کے بغیر باربیڈوز آنے سے روکا جائے ـــــ اپنے بھائیوں کے کردار کی یہ قیمت تھی جو مجھ کو باربیڈوز ہوائی اڈہ پر ادا کرنی پڑی ۔

یورپ اور امریکہ کے سیاح جو یہاں آتے ہیں وہ تفریح کی غرض سے آتے ہیں ۔ وہ یہاں خرچ کرتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس ہندستان کے لوگ یہاں کمانے کے لئے آتے ہیں ۔ ایک دینے کے لئے آتا ہے اور دوسرا لینے کے لئے ۔ اور دینے والا ہمیشہ مطلوب ہوتا ہے اور لینے والا ہمیشہ غیر مطلوب ۔

باربیڈوز میں ہندستان سے آئے ہوئے کافی لوگ ہیں ۔ یہ برطانی شہنشاہیت کے زمانہ میں یہاں لائے گئے ۔ برطانیہ نے اپنے عروج کے زمانہ میں دنیا کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا ۔ ان میں بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل تھے ۔ انہیں میں کریبین سمندر کے کئی جزائر بھی شامل ہیں جن میں سے ایک باربیڈوز ہے ۔سو سال پہلے یہ

جزیرے زیادہ تر غیر آباد تھے ۔ مگر ان پر قدرتی وسائل کافی مقدار میں موجود تھے ۔ برطانیہ نے انیسویں صدی کے آخر میں ان جزائر کے وسائل کو استعمال کرنے کے لئے باہر سے مزدور بھرتی کئے اور ان کو پانی کے جہازوں کے ذریعہ لاکر یہاں بسایا ۔ باربیڈوز میں زیادہ تر گنے کی کاشت کے لئے یہ مزدور لائے گئے ۔ کسی جزیرہ میں قیمتی لکڑی تھی اور وہ برطانیہ کو اپنے فرنیچر اور اپنے مکانوں کی تعمیر کے لئے مطلوب تھی ۔ وغیرہ ۔ ان مقاصد کے تحت ابتداءً ان جزائر میں مزدور قسم کے لوگ لائے گئے ۔ تاہم اب ترقی کرتے کرتے ان جزائر کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ۔ یہاں ہندستان کے مقابلہ میں کمائی زیادہ کی جاسکتی ہے اور پرامن طور پر رہا جاسکتا ہے ۔

سابق مسلمانوں کے لڑکے اور پوتے اب تعلیم یافتہ ہوکر ایک ترقی یافتہ ملک کے شہری بن گئے ہیں ۔ باربیڈوز میں مسلمانوں کی تعداد تقریبًا پانچ سو ہے ۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ ہندو صاحبان کی بڑی بڑی دکانیں اور اسٹور ہیں ۔ مسلمانوں کی زیادہ تعداد پھیری کرکے مال فروخت کرتی ہے ۔ ان کی یہ پھیری کاروں پر ہوتی ہے ۔

مقامی باشندے ان مسلمانوں کو قلی مان (قلی مین) کہتے ہیں ـــــــ ہندستان میں مسلمانوں کو ہندؤں سے شکایت ہے ۔ مگر باربیڈوز میں وہ اپنے سوا کس کو پائیں گے جس کی شکایت کریں ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور تابعین اس طرح دنیا میں پھیلے کہ وہ ہر ملک میں اور ہر مقام پر نظر آنے لگے ۔ آج بھی یہ حال ہے کہ آپ جس ملک میں جائیں اور جس علاقہ کو دیکھیں وہاں آپ مسلمانوں کو پائیں گے ۔ تاہم ظاہری یکسانی کے باوجود دونوں واقعات میں زبردست فرق ہے ۔ صحابہ اور تابعین کو دعوت کے محرک نے پھیلایا تھا ، اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو معاش کے محرک نے ۔ صحابہ اور تابعین اس تڑپ کے تحت سارے عالم میں پھیل گئے کہ وہ دوسری قوموں کو حق کا پیغام پہنچائیں اور موجودہ مسلمان صرف اس لئے پھیلے ہیں کہ وہ دوسروں کے مادی دسترخوان میں سے اپنے لئے کچھ حصہ لے سکیں ۔ ہمارے اسلاف دینے کے لئے گئے تھے اور ہم لینے کے لئے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ہر جگہ مقامی آبادی کا مطلوب اور محبوب بنے اور ہم ہر جگہ صرف مبغوض بن رہے ہیں ۔

بار بیڈوز میں (اور اس طرح کے دوسرے مقامات پر) جو مسلمان ابتداءً آئے تھے، ان کی اکثریت قدیم اسلامی (بالفاظ دیگر مشرقی) انداز زندگی پر قائم ہے۔ مگر ان کی نئی نسل کا رنگ بالکل دوسرا ہے۔ یہ لوگ مغرب کے آزاد ماحول سے شدت کے ساتھ متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان کم اور انگریزی زبان زیادہ سمجھتے ہیں۔ مغربی کلچر اور مغربی فکر ان کے اندر تیزی سے سرایت کر رہا ہے۔ ان کے بڑے ان سے کسی بات کے لئے کہتے ہیں تو وہ نہایت آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ میرے لئے نہیں (not me) یا یہ میرا کام نہیں ہے:

It's not may business

نقشہ سامنے رکھئے۔ ایک طرف یورپ اور افریقہ ہے اور دوسری طرف امریکی براعظم کے دونوں حصے۔ درمیان میں اٹلانٹک سمندر ہے۔ اگر اٹلانٹک کی دونوں خشکی کو قریب لایا جائے تو دونوں اس طرح ایک دوسرے سے مل جائیں گے جیسے کہ وہ ایک ہی ٹکڑا تھا جس کو توڑ کر الگ کر دیا گیا۔ جدید جغرافی تحقیق کے مطابق یہ محض قیاس نہیں۔ بلکہ واقعہ ہے۔ ماضی میں فی الواقع یہ دونوں خشکی کے ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر وہ ٹوٹ کر جدا ہو گئے۔ اس نظریہ کو جغرافی اصطلاح میں انتشار براعظم (Drifting Continent) کہا جاتا ہے۔ بار بیڈوز اسی علاقہ میں بحر اٹلانٹک کے انتہائی مغربی کنارے پر واقع ہے۔

ہوائی جہاز کی انفلائٹ میگزین میں بحر اٹلانٹک اور اس کے دونوں طرف خشکی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا —— ہم آپ کو اٹلانٹک کے اس پار ایک عظیم ہوٹل میں اتار سکتے ہیں:

We can land you in a great hotel across the Atlantic

۲۹ مارچ ۱۹۸۳ کو میرے ساتھ گویا اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ میں ہندستان سے چل کر بار بیڈوز کے ہوٹل سام لارڈ کیسل (Sam Lord's Castle) میں پہنچا تو نہ صرف بحر اٹلانٹک بلکہ خشکی کا بھی بڑا حصہ طے کر چکا تھا۔ چنانچہ ہندستان میں میں مغرب کی سمت نماز ادا کرتا تھا۔ مگر بار بیڈوز میں مجھے مشرق کی جانب نماز ادا کرنی پڑی۔

براعظم امریکہ کے دونوں خشکی کے ٹکڑوں کے درمیان میں تقریباً بیس جزیرے ہلال کی صورت میں ہیں جن کو "سمندر کا ہار" کہا جاتا ہے۔ انہیں میں سے ایک جزیرہ

باربیڈوز (Barbados) ہے۔ اس جزیرہ کا دارالسلطنت برج ٹاؤن (Bridgetown) ہے۔ اسی مقام پر دوسری کریبین اسلامک کانفرنس ہوئی جو ۳۱ مارچ سے لیکر ۴ اپریل ۱۹۸۳ تک جاری رہی۔

باربیڈوز کا نام اس جزیرہ کو پرتگیزیوں نے دیا۔ پرتگیزی سب سے پہلے ۱۵۳۶ء میں اس جزیرہ سے گزرے۔ اس وقت یہ جزیرہ بالکل غیر آباد تھا۔ یہاں کے ساحلوں پر اس وقت خاص طرح کے درختوں کی کثرت تھی جن میں ریشے لٹکتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر پرتگیزیوں نے کہا (Los Barbados) یہ اسپینی زبان کا لفظ ہے اس کے معنی ہوتے ہیں۔ "داڑھی والا" یہ کہہ کر پرتگیزی آگے بڑھ گئے۔ اس کے بعد ۱۶۴۵ء میں انگریز یہاں آئے تو انہوں نے اسی نام کے ساتھ اس کو آباد کیا۔

باربیڈوز کے خوبصورت ہوٹلوں میں سب سے زیادہ عام منظر یورپ اور امریکہ کے سفید فام سیاح ہیں جو نیم برہنہ لیٹے، بیٹھے یا گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان مردوں اور عورتوں کا کام صرف دو ہے ــــ شراب پینا اور باہم عیش کرنا۔ ان میں سے کچھ افراد سے ہماری باتیں ہوئیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا واقعی انہیں زندگی کی لذت حاصل ہے۔ ان کی گفتگو اور ان کے مشاہدے سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ صرف لذت کی تلاش میں ہیں۔ عملاً انہیں ان کی مطلوبہ لذت حاصل نہیں۔

مغرب کے لوگ شادی کرتے ہیں۔ جب اس سے انہیں مطلوبہ لذت نہیں ملتی تو طلاق دے کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ اس سے بھی مقصد حاصل نہیں ہوتا تو آزاد معاشرہ (Permissive Society) کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی تو ننگے پن کی طرف دوڑتے ہیں۔ وہ انہیں چیزوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مایوسی کے عالم میں مر جاتے ہیں۔ ان کا یہ ناکام خاتمہ صرف اس نادانی کی قیمت ہے کہ انہوں نے موجودہ دنیا میں وہ چیز حاصل کرنی چاہی جو موجودہ دنیا میں ملنے والی نہیں۔

باربیڈوز کی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے اس کو مختلف نام دیئے گئے ہیں۔ مثلاً:

Tropical Paradise — Happiness Island — Jewel of the Caribbean

جزیرہ باربیڈوز اٹلانٹک کے ہار کا ایک موتی کہا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی صرف ۲۱ میل

اور چوڑائی ۱۴ میل ہے ۔ مجموعی رقبہ ۱۶۶ میل ہے ۔ اس کی صورت تقریباً سری لنکا جیسی ہے ۔ یہاں آپ انٹرنیشنل ڈرائیور لائسنس پر گاڑی چلا سکتے ہیں ۔ ایسے آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ جب وہ ہوائی اڈہ پر اترے تو وہاں پندرہ ڈالر (باربیڈین) دے کر اپنا نام رجسٹر کرالے ۔

باربیڈوز میں قتل اور اس طرح کے دوسرے جرائم نہیں ہوتے ۔ اس لیے یہاں وردی پوش پولس بھی کہیں نظر نہیں آتی ۔ یہاں کی کل آبادی ۲۵۰۰۰۰ ہے ۔ باربیڈوز کے لوگوں کا نظریہ بس کھانا کمانا اور خوش رہنا ہے ۔ یہاں ہر قسم کے کھیلوں کا انتظام ہے ۔ سب سے پہلے سولہویں صدی میں جنوبی امریکہ کے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے ۔ اس کے بعد یہ جزیرہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا ۔ ۱۹۶۶ میں باربیڈوز نے برطانیہ سے سیاسی آزادی حاصل کی ۔ اب وہ کامن ویلتھ کا ممبر ہے ۔

باربیڈوز لندن سے ۴۷۵۰ میل دور واقع ہے ۔ مگر وہ برطانی کلچر سے اتنا زیادہ متاثر ہے کہ اس کو چھوٹا انگلینڈ (Little England) کہا جاتا ہے ۔ آب و ہوا بہت اچھی ہے ۔ آبادی تقریباً سب کی سب عیسائی ہے ۔ خاص پیداوار شکر ہے ۔ اس کے بعد آمدنی کے ذرائع مچھلی اور سیاحت اور جہازرانی ہیں ۔ رسمی طور پر یہاں کی حکمراں ملکہ برطانیہ ہے ۔ انگریزی زبان باربیڈوز کی سرکاری زبان ہے ۔

باربیڈوز سیاحوں کا جزیرہ ہے ۔ یہاں تفریح مذہب ہے ۔ باربیڈوز کی تعارفی کتاب میں ہم کو یہ جملہ لکھا ہوا ملا کہ کرکٹ ہمارا دوسرا مذہب ہے :

Our second religion is Cricket

باربیڈوز کے اخبارات میں سیاحوں کے تاثرات چھپتے رہتے ہیں ۔ ہم نے اخبار دزیبڑ (۲۸ مارچ ۱۹۸۳) میں کناڈا کے باب ینگ (Bob Young) کے تاثرات پڑھے ۔ وہ بارہ سال سے ہر سال اپنی چھٹیاں گذارنے باربیڈوز آتے ہیں ۔ انہوں نے باربیڈوز کے سکون اور خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا ۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ باربیڈوز میں ہمیشہ رہوں :

I just want to stay in Barbados forever

آدمی ابدی جنت چاہتا ہے مگر اس کو موجودہ زندگی میں صرف وقتی جنت دی گئی ہے ۔ ہندستان سے نکل کر کیریبین سمندر میں پہنچنا گویا کرہ ارض کا تقریباً نصف حصہ طے

کرنا ہے۔ اس قسم کا سفر کیسا عجیب ہے، اس کا تصور آپ اس طرح کر سکتے ہیں کہ جب میں ہندستان میں تھا تو گویا میں زمین کے اوپر کھڑا ہوا تھا۔ مگر جب میں اپنی منزل پر پہنچا تو ہندستان کی نسبت سے وہاں میں زمین کے نیچے لٹکا ہوا تھا۔

میرا قیام سام لارڈ کیسل کے کمرہ نمبر ۴۲۲ میں تھا۔ یہ ہوٹل دراصل ایک رزورٹ (Resort) ہے جو سمندر کے کنارے ۷۲ ایکڑ رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے کمرہ کے ایک طرف سرسبز پھولوں کا قدرتی منظر تھا۔ اور دوسری طرف بحر اٹلانٹک کا پانی ہر وقت موجیں مارتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ایک ایسا ماحول تھا جہاں ایک طرف اتھاہ سمندر خدا کی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔ دوسری طرف پھولوں اور درختوں کا ہرا بھرا منظر اور ان میں اڑتی ہوئی چڑیوں کی آوازیں خدائی حمد کے نغمے بکھیر رہی تھیں۔ دہلی اور بمبئی میں آدمی اپنے آپ کو تمدن کے پنجرے میں بند پاتا ہے۔ یہاں وہ ہر آن محسوس کرتا ہے کہ ہم خدا کے پڑوس میں ہیں۔ ہم قدرت کی فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔

بار بیڈوز میں میں نے جو چیزیں دیکھیں ان میں ایک خاص چیز ہیریسن غار (Harrison's Cave) تھے۔ یہ غار اولاً ایک مغربی سیاح نے دریافت کئے۔ ان غاروں کے اندر قدرت کے بعض عجیب مناظر ہیں اور ان کے اندر آبشار اور چشمے جاری ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً ایک میل کی لمبائی میں سرنگ کھود کر سڑک بنائی گئی ہے۔ اس کے اندر خاص طرح کی ٹرام کے ذریعہ دیکھنے والے اندر جاتے ہیں۔ اور مصنوعی روشنی میں غار کے مناظر دیکھ کر باہر آتے ہیں۔

غار کے وسط میں پہنچ کر ایک منٹ کے لئے تمام روشنیاں بجھا دی جاتی ہیں تاکہ زائرین کو غار کے اندر کی صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ ہم نے ۱۶ اپریل کو یہ غار دیکھے۔ اندر پہنچ کر جب روشنی بجھائی گئی تو وہاں مکمل تاریکی تھی۔ کسی بھی قسم کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ آنکھ رکھتے ہوئے ہم سب لوگ اندھے تھے۔ غار کے باہر سورج روشن تھا۔ مگر غار کے اندر تاریکی ہی تاریکی تھی۔ روشنی خدا کا ایک عجیب و غریب انعام ہے۔ اگر خدا کسی سے روشنی واپس لے لے تو اس کے بعد اس کے لئے اس دنیا میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں۔ من لم یجعل اللہ لہٗ نورا فمالہ من نور۔

کانفرنس میں کریبین جزائر کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ دیگر

ممالک کے اہل علم بھی معقول تعداد میں مدعو تھے۔ مجموعی طور پر تقریباً دو درجن ملکوں کی نمائندگی یہاں موجود تھی۔ ڈیلی گیٹوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ تھی۔

کانفرنس کی کارروائی ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ کی شام کو تلاوت قرآن سے شروع ہوئی، پہلے دن افتتاحی کارروائی کے بعد صدر کانفرنس کا خطاب ہوا۔ اگلے دنوں میں چھ مقالے پیش ہوئے۔ ہر مقالہ اولاً پڑھا گیا اور اس کے بعد اس کے بارہ میں سوال و جواب ہوا۔

پروگرام کے مطابق یہاں تین دن کے اندر چھ مقالے پیش کئے گئے۔ پہلا مقالہ میرا تھا جو ۲ اپریل ۸۳ کو پیش کیا گیا۔ یہ علاقہ چونکہ مغربی علاقہ ہے۔ یہاں کے لوگوں کی مادری زبان انگریزی ہے۔ کانفرنس کی تمام کارروائی انگریزی میں ہوئی۔ اس لئے یہ مقالہ میں نے انگریزی میں تیار کیا۔ مقالہ تقریباً ۴۵ منٹ کا تھا۔ مقالہ پڑھنے کے بعد لوگوں نے سوالات کئے جن کے جوابات بھی میں نے انگریزی میں دئے۔

یہ میری زندگی میں غالباً پہلا موقع تھا کہ میں نے انگریزی میں مقالہ پیش کیا اور انگریزی زبان میں لوگوں کے سوالات کے جواب دئے۔ امریکہ کے ایک نومسلم عبداللہ مصطفیٰ (قدیم نام اسٹیو اسکلر) کئی بار ہمارے دفتر میں آئے ہیں۔ میرے خیالات سننے کے بعد انہوں نے کہا کہ آپ کے لئے دعوتی کام کا اصل میدان امریکہ ہے۔ دوسرے حضرات جو اس وقت وہاں اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں آپ کا انداز دعوت مغرب کو زیادہ اپیل کرنے والا ہے۔ میں نے کہا امریکہ میں کام انگریزی زبان میں کرنا ہوگا۔ اور مجھ کو انگریزی بولنے کی زیادہ مشق نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آخر مجھ سے آپ انگریزی میں بات کرتے ہیں اور میں اچھی طرح آپ کے نقطہ نظر کو سمجھ لیتا ہوں۔ آپ کا انداز سائنٹفک ہوتا ہے اس لئے وہ جلد سمجھ میں آجاتا ہے۔ مجھے ابھی تک عبداللہ مصطفیٰ صاحب کی بات پر زیادہ یقین نہیں تھا۔ مگر باربیڈوز کی کانفرنس کے تجربہ کے بعد اس بارے میں اب خدا کے فضل سے مجھے اعتماد ہو گیا ہے۔

میں نے اپنا مقالہ ۲ اپریل ۱۹۸۳ کی صبح کی نشست میں پڑھا۔ مقالہ ختم کرنے کے فوراً بعد ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی اعتراض کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر انہوں نے یہ کہا کہ یہ مقالہ ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف ایک بار پڑھ دیا جائے۔ یہ

مستقل اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہم سب لوگوں کو اس کے ایک ایک نسخے فراہم کئے جائیں۔ صدر اجلاس کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ مقالہ کی کاپیاں تیار کی جا رہی ہیں اور اسی اجلاس کے دوران وہ تمام لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اگلے دن مقالہ کی مطبوعہ کاپی ہر شریک اجتماع کی میز پر موجود تھی۔

پانچ دن کی ہر نشست قرآن کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مسلمانوں کا ھر اجتماع ہمیشہ قرآن کی تلاوت سے شروع ہوتا ہے۔ جب بھی اس طرح کا موقع آتا ہے تو مجھ پر ایک عجیب احساس ہوتا ہے۔ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ اس کے ہر صفحہ پر آخرت اور جنت اور دوزخ کا بیان ہے۔ چنانچہ جب بھی قرآن کا کوئی حصہ قاری پڑھتا ہے تو اس میں ہمیشہ آخرت کا اور جنت دوزخ کا بیان انتہائی شدت کے ساتھ ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی وہ بات جو بطور "تلاوت" ہر اجتماع میں دہرائی جاتی ہے وہی آج تک میرے کانوں نے خود اجتماع کی کارروائیوں میں کہیں نہیں سنی۔ دوسرے لوگ جو کسی اجتماع سے لوٹ کر آتے ہیں ان سے بھی جب متعلقہ اجتماع کی کارروائی کے بارہ میں میں پوچھتا ہوں تو ہمیشہ ایسی تفصیلات سننے کو ملتی ہیں جن میں سب کچھ ہوتا ہے مگر یہی ایک چیز نہیں ہوتی۔ اجتماع کا خاتمہ ۴ اپریل ۱۹۸۳ کو قرآن کی تلاوت اور دعا پر ہوا۔

ڈاکٹر معتوق الزبیدی نے اپنی تقریر میں ایک ایمان افروز واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ویٹکن کے پوپ نے ساحل العاج (Ivory Coast) کا دورہ کیا۔ پوپ کی آمد پر حکومت نے ہدایت جاری کی کہ تمام لوگ، خواہ وہ جس مذہب کے بھی ہوں پوپ کے استقبال کے لئے نکلیں۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی اس عمومی حکم کے تحت نکلنا پڑا۔ مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ میدان میں جمع ہوئے۔ وہاں ظہر کا وقت آگیا۔ مسلمانوں نے یہ کیا کہ وہیں بلند آواز سے اذان دی اور میدان میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ پوپ نے باجماعت نماز کا منظر دیکھا تو اس پر بہت اثر ہوا۔ پوپ نے کہا: جب تک مسلمان کے اندر یہ اتحاد اور اسپرٹ باقی ہے ہمارا وجود یہاں بالکل بے معنی ہے۔

ایک مصری عالم (عبد المنعم الخطاب) جو امریکہ میں رہتے ہیں، نے بتایا کہ امریکہ کے بلیک مسلم آج اس سے مختلف ہیں جو اس کے ابتدائی بانی ایلیجا محمد کے زمانہ میں تھے۔

الیجا محمد سفید فام تہذیب کا ردعمل تھے ۔ انہوں نے کہا کہ اسلام صرف کالوں کا مذہب ہے ۔جنت میں کالے لوگ جائیں گے ۔ انہوں نے رسول خدا ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔

مگر بلیک مسلم کے موجودہ قائد جو الیجا محمد کے لڑکے ہیں ،جن کا اصل نام اکبر ہے' انہوں نے الازہر (قاہرہ) میں تعلیم حاصل کی ۔ اس کے بعد بلیک مسلم طبقہ کے لوگ کثرت سے مسلم ممالک میں گئے ۔ انہوں نے مسلمانوں کو دیکھا ۔ وہ حج کرنے گئے ۔ان تجربات نے ان میں بنیادی تبدیلیاں کیں ۔ خاص طور پر حج میں انہوں نے دیکھا کہ کالے اور گورے ہر قسم کے لوگ ایک ہی قسم کا لباس پہنے ہوئے کعبہ کے گرد طواف کر رہے ہیں ۔ اب بھی اگرچہ بلیک مسلموں میں کچھ خرابیاں ہیں مگر اب انہیں پہلے کی طرح گمراہ نہیں کہا جا سکتا ۔

کانفرنس کی کارروائیاں شہر (برج ٹاؤن) سے باہر ایک ہوٹل میں ہوئیں ۔ برج ٹاؤن میں پانچ سو سے کچھ زیادہ مسلمان آباد ہیں ۔ان میں سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور شہر جانے کے لئے اصرار کیا ۔چنانچہ میں کانفرنس سے فارغ ہو کر شہر چلا گیا ۔اور وہاں چار روز برابر قیام رہا ۔

باربیڈوز میں مسلمان نسبتاً زیادہ ہیں ۔تاہم کریبین کے اکثر جزیروں میں مسلمان آباد ہیں ۔ یہ لوگ ابتداءً برطانی سلطنت کے زمانہ میں انیسویں صدی میں یہاں آئے ۔ انگریز ان کو زرعی مزدور کے طور پر یہاں لائے تھے ۔ اب یہ لوگ یہاں کے باشندے ہیں اور زیادہ تر تجارت کا کام کرتے ہیں ۔

باربیڈوز (برج ٹاؤن) میں دو مسجدیں ہیں ۔ دونوں آباد ہیں ۔ان دونوں مسجدوں میں اور مسجد کے باہر میری چند تقریریں ہوئیں ۔ لوگ بہت دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے ۔ وہ مصر تھے کہ میں مزید کچھ دن باربیڈوز میں ٹھہروں ۔ کچھ لوگ مجھ کو باصرار ٹرینیڈاڈ لے جانا چاہتے تھے ۔ اور وہاں کم از کم دو ہفتہ کا پروگرام رکھ رہے تھے ۔ مگر بعض فوری کاموں کی وجہ سے مجھے دہلی جلد واپس آنا ضروری تھا اس لئے میں ٹرینیڈاڈ (Trinidad) کا سفر نہ کر سکا ۔

باربیڈوز میں جو مسلمان ہیں وہ زیادہ تر گجرات (ہندستان) کے علاقہ سے آئے ہوئے ہیں ۔ یہ لوگ زیادہ تر پھیری کی تجارت کرتے ہیں ۔ وہ برج ٹاؤن کی بڑی بڑی

دکانوں سے مختلف مال (مثلاً کپڑا وغیرہ) خریدتے ہیں اور اس کو کار پر رکھ کر بستیوں میں جاتے ہیں اور ادھار فروخت کرتے ہیں۔ ان کا کاروبار زیادہ تر ان لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو نقد ادائگی کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور سامان خرید کر قسطوں میں اس کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یہ مسلمان تاجر دونی قیمت پر ان کے ہاتھ مال بیچتے ہیں اور عام دکانداروں سے زیادہ نفع کماتے ہیں۔ یہاں کی زبان میں ان کو "قلی مان" کہا جاتا ہے۔ یعنی "قلی مین"۔

باربیڈوز کے لوگ اب اس حقیقت کو جاننے لگے ہیں۔ ۵ اپریل ۱۹۸۳ کو اسی قسم کے ایک مسلمان مجھے اپنی تجارتی گاڑی پر لے کر جا رہے تھے۔ ہم لوگ یہاں کا ایک تاریخی مقام دیکھنے جا رہے تھے۔ راستہ میں باربیڈوز کے کچھ عیسائی نوجوان ملے جو مذکورہ "قلی مان" کے گاہک تھے۔ ایک نوجوان نے ان کو دیکھا تو ہنس کر کہا ــــــ تم غریب کو دھوکہ دے کر لوٹنے جا رہے ہو:

You are going to cheat the poor

اس نوجوان نے یہ بات اگرچہ مذاق کے طور پر کہی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ یہاں کی نئی نسل میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ہندستانی لوگ ان کو لوٹتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہاں کے ہندستانی مسلمانوں کے لئے عقل مندی یہ ہے کہ وہ اپنے کو حالات کے مطابق بنالیں قبل اس کے کہ مذاق حقیقت کی صورت اختیار کرلے۔

"قلی مان" لوگوں کا کام چونکہ کار کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے تھوڑے دنوں میں وہ ایک "شاندار" کار خرید لیتے ہیں۔ اب مقامی لوگ جب ان کو شاندار کاروں میں سفر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والوں کے پاس شاندار کاریں ہیں اور ہمارے پاس کچھ نہیں۔ کار کو چلتی پھرتی دکان کی صورت دینا بہت عمدہ ہے مگر موجودہ حالت میں وہ غیر ضروری طور پر مسلمانوں کی خوشحالی کا چلتا پھرتا اعلان بن گیا ہے اور مقامی باشندوں میں ان کے خلاف حسد اور رقابت کے جذبات کو بڑھا رہا ہے۔

۸ اپریل ۱۹۸۳ کو میں نے باربیڈوز سے نیویارک کے لئے سفر کیا۔ بی ڈبلیو آئی اے (BWIA) کی فلائٹ سے پانچ گھنٹہ کی پرواز تھی۔ باربیڈوز سے نیویارک کا سفر پورا کا پورا

اٹلانٹک کے اوپر ہوا۔ پانچ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد ہم جان کنیڈی ایرپورٹ پر اترے۔ یہ امریکی ایرپورٹ کافی بڑا ہے مگر وہ مجھ کو جدہ کے بین اقوامی ایرپورٹ سے کم شاندار نظر آیا۔

مجھے بعض ضرورتوں کے تحت جلد دہلی پہنچنا تھا۔ اس لئے اصرار کے باوجود میں باربیڈوز میں کم ٹھہرا اور وہاں سے ٹربنیڈاڈ بھی نہ جاسکا چنانچہ میں نیویارک میں بھی زیادہ قیام نہ کرسکتا تھا۔ صرف ایک دن وہاں گزارے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک امریکن مل گیا۔ یہ سیکورٹی گارڈ کا ایک افسر تھا اور بہت شریف اور معقول آدمی تھا۔ اس سے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اپنی بعض انگریزی چیزیں اس کو دیکھنے کے لئے دیں۔ اور پھر اس سے کہا کہ نیویارک میں میرے لئے زیادہ قیام کا وقت نہیں ہے۔ البتہ میں نیویارک کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ بخوشی راضی ہو گیا۔ اس نے مجھ کو اپنی گاڑی پر بیٹھایا اور نیویارک کی سڑکوں پر گھماتا رہا۔ اس طرح چند گھنٹوں کے اندر میں نے نیویارک شہر پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی۔

مگر یہاں بھی وہی بات پیش آئی جو میں نے کنیڈی ایرپورٹ کے بارے میں لکھی ہے۔ نیویارک کی ظاہری عظمتوں میں مجھے ایک قسم کی پستی لپٹی ہوئی نظر آئی۔ یہاں کی اونچی اونچی عمارتیں مجھے عمودی سلم (Vertical Slum) کے روپ میں دکھائی دیں۔ اس کی مادی رونقوں میں روحانی تاریکی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں مادی ترقی کے قبرستان میں پہنچ گیا ہوں نہ کہ کسی قسم کی مادی ترقیات کی جنت میں۔

آخر میں جب مذکورہ امریکی نے مجھے ہوائی اڈہ پر لا کر چھوڑا تو میں نے اس کا نام و پتہ پوچھا۔ اس نے اپنا نام لوئی (Mr. Louis) بتایا۔ مگر پتہ بتانے سے یہ کہہ کر معذرت کر دی —— "ہم سیکورٹی کے لوگ ہیں، ہم کو اپنا پتہ بتانے کی اجازت نہیں"

میرا یہ سفر دہلی سے شروع ہوا۔ اور لندن، باربیڈوز اور نیویارک ہوتا ہوا دوبارہ دہلی پر ختم ہوا۔ اس پورے سفر کی مسافت تقریباً ۲۴ ہزار میل تھی، یعنی تقریباً اتنی ہی جتنی زمینی گولائی کی کل مسافت ہے۔

مختصر مدت میں یہ طویل سفر طے کر کے میں ۲۰ اپریل ۱۹۸۳ کو ایرانڈیا کی فلائٹ نمبر ۱۱۰ سے دہلی ایرپورٹ پر اترا تو میرے ذہن میں ایک عجیب خیال آیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ قیامت قریب آگئی ہے اور خدا نے مادہ (matter) کو حکم دے دیا ہے کہ وہ زندگی کے سفر کو

انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ تمام کردے تاکہ خدا اپنی آخری عدالت قائم کرے جہاں خدا کے گواہ لوگوں کے بارہ میں اپنی گواہیاں پیش کریں اور ہر ایک کے لئے اس کے عمل کے مطابق ابدی جنت یا ابدی جہنم کا فیصلہ کردیا جائے۔

آج زمین پر بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں مگر وہی کام نہیں ہو رہا ہے جو سارے تخلیقی منصوبہ کا اصل مطلوب ہے۔ یعنی حمد خداوندی۔ موجودہ انسانی دنیا اپنے وجود کا جواز کھو چکی ہے۔ اب آخری طور پر وہ لمحہ آچکا ہے جب کہ موجودہ امتحانی دنیا کو ختم کردیا جائے اور وہ معیاری دنیا شروع ہو جہاں خدا کے سوا کسی اور کی حمد نہ کی جاسکے۔ جو حقیقی بھی ہو اور اسی کے ساتھ ابدی بھی۔

اس کے باوجود موجودہ دنیا کیوں ختم نہیں کی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کو ایک آخری عمل کا انتظار ہے جو ابھی تک اَن ہوا پڑا ہے۔ یہ عمل ہے آج کے انسانوں کے اوپر اتمام حجت۔ جب تک یہ نہ ہو کہ دعوت حق اٹھائی جائے اور اس کو ابلاغ تام کی حد تک پہنچا دیا جائے۔ اس وقت تک موجودہ دنیا کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اس عمل کی تکمیل تک قیامت معلق پڑی رہے گی۔ خدا کو آج سب سے زیادہ اعلان حق کا انتظار ہے۔ مگر دین کے نام پر بے شمار سرگرمیوں کے باوجود یہی وہ کام ہے جس کا کرنے والا کوئی نہیں۔ ہر آدمی خود ساختہ دین کی تبلیغ میں مصروف ہے نہ کہ حقیقۃً خدا کے دین کی تبلیغ میں۔

مسلمانوں میں اسلام کی دھوم تو درکنار ہندستان کے ہندوؤں یا افریقہ کے مشرک قبیلوں میں دین کا پیغام پہنچانے سے بھی اتمام حجت کی وہ شرط پوری نہیں ہوتی جو آج خدا کو مطلوب ہے۔ آج خدا کو عالمی اتمام حجت کا انتظار ہے اور عالمی اتمام حجت صرف اس وقت متحقق ہوگا جب کہ وہ ان قوموں پر انجام دیا گیا ہو جن کو آج کی دنیا میں لیڈر شپ کا مقام حاصل ہے۔ یعنی مغربی قومیں، خاص طور پر امریکہ۔ جن قوموں کو آج عالمی لیڈر شپ کی حیثیت حاصل ہے ان پر اتمام حجت ہی سے عالمی اتمام حجت کی شرط پوری ہوگی اور اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ خدا اسرافیل کو حکم دے کہ اب صور پھونک دو تاکہ تخلیقی منصوبہ کے آخری مرحلہ کی تکمیل کی جاسکے۔

مسلمانان عالم کو آج یہی کام انجام دینا ہے۔ اسی پر ان کی قسمت کا آخری فیصلہ معلق ہے، دنیا کی قسمت کا بھی اور آخرت کی قسمت کا بھی۔

ایک سفر

۱۶ اکتوبر ۱۹۸۳ کی شام کو ۹ بجے میں دہلی ایئرپورٹ کی انتظارگاہ میں تھا۔ مجھ کو جاپان ایئر لائنز سے روم ہوتے ہوئے افریقہ جانا تھا۔ اس اثنا میں بغل کی سیٹ سے دو خوش پوش مسافروں کی گفتگو کے یہ الفاظ میرے کان میں آئے :

آپ کہاں جارہے ہیں

روم

آپ کہاں جارہے ہیں

لندن

میں نے سوچا کہ انسان کس قدر بے خبر ہے۔ اس کی جیب میں چونکہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ ہے، اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ وہ روم اور لندن جارہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ اس کے اوپر خدا کے طاقتور فرشتے مقرر ہیں، جو اس انتظار میں ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور وہ آدمی کو اپنی پکڑ میں لے کر اس کو خدا کی عدالت میں پہنچا دیں۔ آدمی بالآخر خدا کی دنیا میں جانے والا ہے۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود اپنی دنیا میں جارہا ہے۔ انسان کی یہ بے خبری بھی کیسی عجیب ہے۔

جاپان ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ سے میں نے روم تک کا سفر کیا۔ میں اکثر معروف کمپنیوں کے جہازوں میں سفر کرچکا ہوں۔ مگر جاپان ایئر لائنز مجھے سب سے بہتر معلوم ہوئی۔ اس جہاز کی ہر چیز دوسرے جہازوں سے بہتر تھی۔ جہاز کی بناوٹ، عملہ کی کارکردگی، مسافروں کی ضروریات کا اہتمام وغیرہ ہر چیز میں جاپان ایئر لائنز دوسری کمپنیوں سے ممتاز نظر آئی۔

روم سے طرابلس کا سفر الیتالیا کے ذریعہ طے ہوا۔ جہاز کی تقریباً نصف سیٹیں خالی نظر آئیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ لیبیا میں بیرونی دنیا کے لئے تجارتی مواقع زیادہ نہیں۔ سیاحت کی کشش بھی لیبیا میں زیادہ نہیں ہے۔ اور آجکل ہوائی سفر زیادہ تر یا تجارت کے لئے ہوتا ہے یا سیاحت کے لئے۔

تاہم پٹرو ڈالر کی طاقت کا اندازہ اس سے ہوا کہ الیتالیا (Alitalia) میں دوران پرواز جب دن کا کھانا آیا تو اس کے ساتھ ٹرے میں ایک کارڈ بھی تھا جس میں عربی اور دوسری تین زبانوں میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا :

(الیتالیا) تضمن لکم ھذا الغذاء خالی من لحم الخنزیر (الیتالیا اس بات کی ذمہ داری لیتی ہے کہ اس کھانے میں خنزیر کا گوشت شامل نہیں ہے)

طرابلس میں میرا قیام فندق الکبیر کے کمرہ نمبر ۸۱۳ میں تھا۔ یہ کمرہ سمندر کی طرف کھلتا ہے۔ میرے سامنے دور تک نہایت پرکشش منظر تھا۔ سمندر کے کنارے پختہ فیلڈ بنی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ لڑکے بےفکری کے ساتھ گیند کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ اس منظر کو میں نے دیکھا تو اس میں مجھے دنیا میں پھیلے ہوئے غافل انسانوں کی تصویر دکھائی دی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا ——
لوگ کھیل رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ نہ کھیل سکیں۔ لوگ خوش ہیں تاکہ دوبارہ انھیں خوشیاں نصیب نہ ہوں۔ لوگ جھوٹی لذتوں میں گم ہیں تاکہ وہ خدا کی بڑی لذتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ کو صبح کا وقت تھا۔ میں سمندر کے رخ پر بیٹھا ہوا کمرہ کے باہر دیکھ رہا تھا سورج کی سنہری شعاعوں میں ہر چیز نہایت شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ سڑک پر جدید ترین کاروں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ سمندر کا پانی موجیں مارتا ہوا عجیب حسین منظر پیش کر رہا تھا۔ آسمان پر بادل کے ٹکڑے آسمان کے آفاقی حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔ سمندر میں جگہ جگہ سمندری جہاز ابھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ مناظر دیکھتے دیکھتے اچانک مجھ پر ایک لمحاتی تجربہ گذرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں خدا کے دیکھنے کو دیکھ رہا ہوں۔ جیسے میں خدا کے ہونے کا تجربہ کر رہا ہوں۔ خدا بھی تو اسی طرح کائنات کو دیکھ رہا ہوگا۔ میں نے سوچا اگر یہ ممکن ہے کہ یہاں ایک انسان ہو۔ اس کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہو۔ وہ سوچے اور دیکھے۔ کائنات سے الگ اس کی اپنی مستقل ہستی ہو۔ اگر ایسے ایک انسان کا وجود ممکن ہے تو خدا کا وجود کیوں کر ممکن نہیں۔

تھوڑی دیر کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ذات میں خدا کی ذات شامل ہو گئی ہو۔ میں اپنے وجود میں خدا کے وجود کو دیکھنے لگا۔ میرا شعور ذات میرے لئے شعور خداوندی کے ہم معنی بن گیا۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں انھیں اس سے پہلے خود اپنا انکار کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ اپنا انکار نہیں کر سکتے تو انھیں یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ خدا کے وجود کا انکار کریں۔

اس سفر میں میری ملاقات مختلف ملکوں کے مسلم دانش وروں سے ہوئی۔ ان سے گفتگو کے

دوران میں نے محسوس کیا کہ ہر ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک ہی چیز چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کے اوپر غیر قوموں کے حملہ کا مسئلہ۔ چنانچہ ہر آدمی بس دفاعی ذہن کے تحت سوچتا ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت ہمارا سب سے بڑا مسئلہ مسلم دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی دوسرا کام کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ آرائی کا ماحول ختم نہ کیا جائے، ملّت کی تعمیر و ترقی کا کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں

سب سے عجیب بات جس کا مجھے بار بار تجربہ ہوا وہ یہ کہ آجکل دنیا بھر کے مسلمانوں میں "اسلامی دعوت" کا لفظ بہت زیادہ بولا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی دعوت کا عملی مفہوم لوگوں کے ذہن میں شاید یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کے لئے جو بھی چیخ و پکار کی جائے وہ سب کا سب اسلامی دعوت ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی دعوت کا لفظ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی قومی دعوت کے ہم معنیٰ بن کر رہ گیا ہے۔

میں نے لوگوں کے سامنے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کیا کہ اپنی قوتوں کو قومی دفاع کے محاذ پر خرچ کرنا گویا سبب کو چھوڑ کر نتیجہ پر محنت کرنا ہے۔ ہمارے تمام مسائل دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ جب تک امّت مسلمہ اپنے اس فرض منصبی کو ادا نہیں کرے گی وہ دوسری قوموں کی جارحیت کا شکار ہوتی رہے گی۔ اس صورت حال سے نکلنے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں۔

فندق الکبیر میں ۱۸ اکتوبر کو دوپہر کے کھانے میں میرے ساتھ دوسرے دو آدمی میز پر تھے۔ ایک صاحب یورپ کے ایک ملک سے آئے تھے، دوسرے امریکہ سے۔ ایک صاحب نے گفتگو کے دوران اپنی جیب سے دو رنگین فوٹو نکالے۔ یہ دو بچوں کے فوٹو تھے۔ ایک ۱۰ ماہ کا اور دوسرا دو سال کا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں میرے بچے ہیں اور وہ میری زندگی ہیں (They are my life)

اس کے بعد دوسرے صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی بچی کا فوٹو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "یہ میری نواسی ہے اور میں ہر وقت اس کا فوٹو اپنی جیب میں رکھتا ہوں"

اسی طرح ایک بار ایک افریقی عالم کے ساتھ باہر جانا ہوا۔ راستہ میں بازار پڑتا تھا۔ وہ کپڑے کی ایک دکان میں گھسے اور اس طرح لال پیلے کپڑے کی خریداری شروع کر دی جیسے اس سے زیادہ اہم ان کے نزدیک کوئی کام ہی نہیں۔

میں نے سوچا کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں میں جی رہے ہیں۔ اور یہی

لوگ ہیں جو بین اقوامی اسٹیج پر بیٹھ کر ملت اسلامیہ کے موضوع پر مجاہدانہ تقریریں کرتے ہیں۔
کناڈا سے آئے ہوئے ایک مسلمان پروفیسر نے سوال کیا کہ آپ کے اس قسم کے بیرونی سفروں کو انڈیا کی حکومت کس نظر سے دیکھتی ہے۔ میں نے کہا کہ میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں۔ اس لئے وہ اس میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ حسب ضرورت تعاون کرتے ہیں (جیسا کہ میں مالدیپ کے سفر کے ذیل میں لکھ چکا ہوں) وہ فوراً بولے :

مگر اسلام تو سیاست سکھاتا ہے اور ہر مسلمان کو سیاسی ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مزید گفتگو کے دوران انھوں نے مہاتما گاندھی کا ذکر کیا اور کہا کہ :

He was an enemy of Islam

میں نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔ مہاتما گاندھی اسلام دشمن نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس مسلم سیاست کے مخالف تھے جو تقسیم ملک کے نظریہ کے تحت ہندستانی مسلمانوں نے چلائی تھی۔ آپ چاہیں تو انھیں تقسیم دشمن کہہ سکتے ہیں مگر اسلام دشمن کہنا سراسر غلط ہے۔
یہ سن کر وہ مسکرائے اور کہا کہ آپ ہم کو حکومت ہند کے آدمی معلوم ہوتے ہیں ـــــــ موجودہ مسلمانوں کی یہی منفی ذہنیت ہے جس نے ان سے حقیقت پسندانہ طرز فکر کو چھین لیا ہے۔ اور جس قوم سے حقیقت پسندانہ طرز فکر چھن جائے اس سے گویا سب سے بڑی چیز چھن گئی۔ ایسی قوم کا انجام صرف یہ ہے کہ وہ اپنے مفروضہ تخیلات کی دنیا میں جیتی رہے۔ اس کو خدا کی حقیقی دنیا میں کبھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔
۲۰ اکتوبر کو طرابلس کے ایک اخبار کے نمائندہ نے صحافتی انٹرویو لیا۔ انھوں نے ہمارے اسلامی مرکز سے متعلق اور عالم اسلام سے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ دور جدید کے مسلم مسائل کے بارے میں آپ کس طرح سوچتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کے تمام مسائل ان کی اسلام سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔ جب تک یہ اصل وجہ دور نہ کی جائے کسی اور تدبیر سے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اسلامی مرکز کے بارہ میں میں نے بتایا کہ وہ ۱۹۷۰ سے قائم ہے اور ماہنامہ الرسالہ اور کتابوں اور اجتماعات کے ذریعے پورے ملک میں خاموشی کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اسلامی مرکز ایک خالص غیر سیاسی ادارہ ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں حقیقی اسلام کو زندہ کرنا ہے اور غیر مسلم اقوام کو سچے اسلام سے متعارف کرنا ہے۔ میں نے بتایا کہ اسلامی مرکز کا صدر دفتر دہلی میں ہے اور اس کا ایک تحتی مرکز حیدر آباد میں قائم کیا گیا ہے۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ دہلی کے مرکز کو اردو اور عربی

اور انگریزی اور ہندی میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی کا مرکز بنائیں اور حیدر آباد کے تحت مرکز کو ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کا۔

طرابلس سے واپسی میں میں نے لیبین ایئر لائنز کے ذریعہ سفر کیا۔ یہ جہاز پہلے دمشق میں اترا۔ اس کے بعد اس نے مجھ کو کویت پہنچایا۔

ظہر اور عصر کی نمازیں میں نے اسی جہاز پر ادا کیں۔ ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے جب میں نے اپنا سر سجدہ میں رکھا تو عجیب احساس ہوا۔ سطح زمین پر سجدہ کرنے کے بجائے یہ فضا میں سجدہ تھا۔ جہاز جب فضا میں اڑ رہا ہوتا ہے تو بیک وقت دو چیزوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ مادہ کو خدا نے کس طرح انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اس کو لئے ہوئے فضا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ دوسرا احساس اپنی بے چارگی کا رہتا ہے۔ دوران پرواز اگر جہاز میں کوئی خرابی ہو جائے تو اس کے بعد صرف موت ہوتی ہے جو مسافر کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ سجدہ میں یہ دونوں احساسات اس طرح سمٹ آئے کہ دیر تک سجدہ سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہا۔ دل نے کہا: خدایا، کیسے عجیب ہیں تیرے کرشمے اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو ان کرشموں کو دیکھ کر بھی نہیں تڑپتے۔ جن کی آنکھیں بدستور خشک رہتی ہیں اور جن کی دنیا اس کے بعد بھی تیری گذرگاہ نہیں بنتی۔

کویت میں جہاز بدلنا تھا مگر یہاں تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے برٹش ایرویز کا اگلا جہاز چھوٹ گیا۔ اس لئے کویت میں مجھ کو ۲۴ گھنٹہ رکنا پڑا۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳ کو دوبارہ میں دہلی واپس آ گیا۔

طرابلس سے کویت تک کا سفر میں نے لیبین ایرویز کے ذریعہ طے کیا۔ کویت سے دہلی کا سفر مجھے برٹش ایئر ویز کے ذریعہ طے کرنا تھا۔ مگر لیبین ایرویز کا جہاز لیٹ ہو گیا۔ ہم کویت اس حال میں پہنچے کہ جب لیبین ایرویز کا جہاز ہم کو لے کر کویت کے ہوائی اڈہ پر اتر رہا تھا تو برٹش ایرویز کا جہاز کویت کے ہوائی اڈہ سے پرواز کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ زندگی کا بڑا سفر بھی آدمی کو اسی طرح مرحلہ وار طے کرنا ہوتا ہے۔ یہاں بھی ایک "جہاز" کے بعد دوسرا "جہاز" درکار ہوتا ہے جو آدمی کے سفر کو برابر جاری رکھے۔ جس آدمی کی نظر صرف سامنے کی سواری پر ہو، اگلی سواری سے وہ بے خبر ہو تو عین ممکن ہے کہ جب وہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں پہنچے تو وہاں صرف یہ خبر اس کو سننے کو ملے کہ اگلے جہاز کا وقت آ چکا تھا اس لئے وہ تم کو لئے بغیر چلا گیا ——— پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہوئے اگلے زینہ پر بھی نگاہ رکھئے، اسی وقت آپ سلامتی کے ساتھ چھت تک پہنچ سکتے ہیں۔

ایک سفر

۲۹ فروری ۱۹۸۴ کی صبح کو میں دہلی کی مسجد کی اذان پر فجر کی نماز کے لئے اٹھا تھا۔ اگلے دن یکم مارچ کی صبح کو میں مدینہ منورہ کے موذن کی اذان پر فجر کی نماز کے لئے اٹھا اور مسجد نبوی کے امام کے پیچھے "بین اقوامی جماعت" میں شریک ہو کر فجر کی نماز ادا کی۔

ہزاروں کیلومیٹر کا فاصلہ "راتوں رات" طے ہونے کا واقعہ بظاہر اتنا ہی عجیب ہے جتنا چودہ سوسال پہلے سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ کا واقعہ لوگوں کو عجیب معلوم ہوا تھا۔ مگر آج کا انسان چوں کہ تیز رفتار کاروں اور ہوائی جہازوں کے زمانہ میں ہے اس لئے ایسی خبر سن کر آدمی کے اوپر حیرانگی طاری نہیں ہوتی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چودہ سوسال پہلے "اسرار" کا واقعہ بھی اتنا ہی غیر عجیب تھا جتنا موجودہ زمانہ کا واقعہ۔ آج کا "اسرار" جس نظام اسباب کے تحت ہوتا ہے وہ چونکہ انسان کے سامنے کھلا ہوا ہے اس لئے اس پر انسان کو حیرانی نہیں ہوتی۔ مگر چودہ سوسال پہلے کا "اسرار" جس نظام اسباب کے تحت ہوا تھا وہ انسان کی نظروں سے اوجھل تھا اس لئے انسان اس کو سمجھ نہ سکا۔ تاہم قیامت میں اس دوسرے نظام (خدائی نظام) سے پردہ ہٹ جائے گا۔ اس وقت انسان جان لے گا کہ اسرار خداوندی بھی اسی طرح عین ممکن تھا جس طرح آج اسرار مشینی بالکل ممکن نظر آتا ہے۔

"بیل گاڑی" کے دور میں انسان کے لئے "ہوائی جہاز" ایک ناقابل یقین چیز تھی۔ کیوں کہ اس وقت ہوائی جہاز مستقبل کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ اسی طرح موجودہ زندگی میں ابھی آخرت کا دور انسان کی نظروں سے چھپا ہوا ہے۔ پردہ ہٹنے کے بعد عالم غیب کی باتیں بھی آدمی کے لئے اسی طرح قابل فہم بن جائیں گی جس طرح عالم شہود کی باتیں آج قابل فہم بنی ہوئی ہیں۔

مدینہ کی موجودہ مسجد نبوی غیر معمولی پر وسیع اور عظیم ہے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہوا تو اس کی عظمت میرے لئے خدائی عظمت کی علامت بن گئی۔ میرا دل بھر آیا اور بے اختیار زبان سے نکلا کہ خدایا، تو ہم پر رحم فرما اور ہم کو بخش دے۔ اگر تو رحم نہ کرے اور مغفرت نہ فرمائے تو یقیناً ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو کر رہ جائیں گے۔ (وان لم ترحمنا وتغفرلنا لنکونن من الخاسرین)

میرا یہ سفر بڑے عجیب حالات میں ہوا۔ سفر سے صرف چند دن پہلے معلوم ہوا کہ میرے پاسپورٹ کی مدت ۶ مارچ کو ختم ہو رہی ہے۔ مزید یہ کہ پاسپورٹ پر ایف لکھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ "فائنل" ہے۔ یعنی اب اس کی تجدید نہیں ہوگی۔ بلکہ حسب قاعدہ دوسرا پاسپورٹ از سر نو بنوانا ہوگا۔

اس کے علاوہ سفر میں چند چیزیں ساتھ لے جانی تھیں جو اب تک تیار نہ تھیں۔ مثلاً انگریزی الرسالہ (مارچ ۱۹۸۴) انگریزی میں تعارفی سٹ، مرکز کا تعارف نامہ وغیرہ۔ صرف چند دن کے اندر یہ سارے کام ہو جانا ضروری تھا۔ سعودی عرب ایئر لائنز نے دو ٹکٹ دیدئے، ایک میرے لئے اور ایک میرے ساتھی کے لئے۔ ۲۹ فروری کی صبح کے لئے ریزرویشن بھی کرا لیا گیا۔ مگر ۲۸ فروری آگئی اور ابھی تک کام پورا نہیں ہوا تھا۔ یقین نہیں تھا کہ میرا سفر ہو سکے گا۔

۲۸ فروری کی صبح کو میں نے اپنے لڑکے ثانی اثنین کو کاموں کی فہرست دے کر گھر سے روانہ کیا۔ ثانی اثنین کی سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ اتنا سب کام صرف ایک دن میں کس طرح انجام پائے گا۔ رات کو واپس آکر ثانی اثنین نے بتایا کہ میں نظام الدین سے روانہ ہوا تو اجمیری گیٹ تک مجھ کو تمام چوراہوں پر گرین سگنل ملا۔ پہلی بار بالکل غیر معمولی طور پر ایسا ہوا کہ کسی ایک جگہ رکے بغیر بس سیدھا اجمیری گیٹ پہنچ گیا۔ اس واقعہ سے میری ہمت بندھی، مجھے یقین ہو گیا کہ ہمارے ساتھ اللہ کی مدد شامل ہے۔ اور ضرور تمام کام ہو جائے گا۔ چنانچہ رات تک حیرت انگیز طور پر سارا کام مکمل ہو چکا تھا۔ ایک ہفتہ کا کام صرف ایک دن میں مکمل ہو گیا اور میں حسب پروگرام ۲۹ فروری کو صبح ۱۰ بجے سعودی ایئر لائنز کی فلائٹ سے مدینہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے میرے پروگرام کی قطعی اطلاع الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ) کو نہیں دی جا سکی تھی۔ میری روانگی کے بعد ۲۹ فروری کی دوپہر کو جامعہ کے نام دہلی سے ٹیلکس کیا گیا جب کہ اسی دن شام کو میں مدینہ پہنچنے والا تھا۔ ظہران اور ریاض ہوتا ہوا مدینہ ایئر پورٹ پر پہنچا تو جامعہ کا نمائندہ وہاں معاونت کے لئے موجود تھا ——— موجودہ زمانہ میں مواصلات کی ترقی نے انسان کے لئے کس قدر آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس کے باوجود انسان خدا کا شکر ادا نہیں کرتا۔

مدینہ ایئر پورٹ سے ہم الجامعۃ الاسلامیہ کے نمائندہ کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ فندق النخیل میں پہنچا دئے گئے۔ یہاں ہمارا قیام کمرہ نمبر ۹۰۱ اور ۹۰۲ میں تھا۔ اگلے دن ہم الجامعۃ الاسلامیۃ لے جائے گئے۔ وہاں رئیس الجامعۃ دکتور عبداللہ صالح العبید اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی۔ عرب لوگ ملاقات کے وقت دعائیں بہت دیتے ہیں۔ یرحمکم اللہ، یحییکم اللہ جیسے کلمات کی فضا میں ملاقاتیں ہوئیں۔ رئیس الجامعۃ بار بار فرصۃ طیبۃ، فرصۃ طیبۃ کہتے رہے۔ ذمہ داروں کے مشورے کے بعد محاضرات کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلے میں ذمہ داروں کی طرف سے اخبار میں بھی اعلان شائع کر دیا گیا۔ جامعہ کے شائع کردہ سرکلر کا عکس مقابل صفحہ پر دیا جا رہا ہے۔

الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة
عمادة شئون الطلاب

" بسم الله الرحمن الرحيم "

برنامج لقـــاءات

الشيخ وحيد الدين خان بمنسوبى الجامعـــة

تستضيف الجامعة المفكر الاسلامى المعروف الشيخ وحيد الدين خان .. وتنظم لـــه

عدة لقاءات مع منسوبى الجامعة كالآتى :-

اليوم والتاريخ	الوقـــت	المكـان	موضوع المحاضرة
الأحد ١٤٠٤/٦/٢	بعد المغرب	قاعة المحاضرات	الاسلام والانسان المعاصر
الاثنين ١٤٠٤/٦/٣	" "	مسجد الجامعة	الاسلام والمشاكل العصرية
الثلاثاء ١٤٠٤/٦/٤	" "	قاعة المحاضرات	التضامن والدعوة الاسلامية
السبت ١٤٠٤/٦/٨	" "	صالة الـــدور الثالث بمجمع ب	امكانيات جديدة للدعـــوة الاسلامية
الأحد ١٤٠٤/٦/٩	" "	قاعة المحاضرات	حوار مفتوح

والدعوة عامة للجميـــع .

والله الموفـــق ...

عميد شئون الطلاب

د . احمد بن سعد حمدان الغامدى

مدینہ کا یہ سفر الجامعۃ الاسلامیۃ (مدینہ منورہ) کی دعوت پر ہوا۔ جمادی الاول ۴ ۱۴۰ھ میں جامعہ میں المؤتمر الثانی للدعوۃ الاسلامیۃ کا اجلاس ہوا۔ جس میں دنیا کے مختلف حصوں سے دعاۃ اور اہل علم بلائے گئے تھے۔ مجھے بھی اس موتمر میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مطبوعہ پروگرام میں میرا نام شامل کیا جا چکا تھا۔ مگر اس وقت میں بعض اسباب کی بنا پر سفر نہ کر سکا۔ تاہم جامعہ مجھ کو بلانا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے ایک ہفتہ کا مستقل پروگرام بنایا جس میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ سے ملاقاتیں تھیں اور ہر روز شام کو جامعہ میں میرا ایک محاضرہ (لکچر) رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام کے تحت یہ سفر ہوا۔ ۲۹ فروری کو دہلی سے روانہ ہو کر یکم مارچ ۱۹۸۴ کو مدینہ پہونچا۔

ظہران کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترا تو اعلان کیا گیا کہ تمام مسافر، خواہ وہ ظہران سے آگے جا رہے ہوں یہاں اتریں اور کسٹم پر جا کر معائنہ کرائیں۔ اس قسم کی غیر معمولی چیکنگ ان سیاسی مجاہدین کی نادانیوں کی قیمت ہے جو وہ اسلام کے نام پر موجودہ زمانہ میں کر رہے ہیں۔ اسلام انسانوں کے لئے رحمت بن کر آیا تھا مگر اسلام کے نادان دوستوں نے اس کو انسانوں کے لئے زحمت بنا دیا ہے۔ ظہران کے ہوائی اڈہ پر ہماری کتابیں اور کاغذات کسٹم والوں نے بے رحمی کے ساتھ نکال کر بکھیر دئے۔ ان کو ہر لٹریچر پر "باغیانہ لٹریچر" کا شبہہ ہوتا ہے۔ اتنے میں شیخ محمد یونس نجرامی آگئے جو یہاں مراقب المطبوعات ہیں، وہ مجھ کو جانتے تھے۔ انھوں نے اسٹاف کے لوگوں سے کہا کہ ھو من کبار علماء الہند۔ اس کے بعد انھوں نے ہم کو چھوڑ دیا۔

۲ مارچ کو جامعہ کے بڑے ہال میں پہلا محاضرہ تھا۔ اصل محاضرہ عربی میں تھا اور اس کا موضوع تھا: التضامن والدعوۃ الاسلامیۃ۔ وسیع ہال بھرا ہوا تھا۔ ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے مقالے کے چند صفحات پڑھے اور پھر یہ کہہ کر اس کو مولانا صفی احمد صاحب کو دے دیا اور انھوں نے بقیہ صفحات پڑھ کر مقالہ کو مکمل کیا: سیوالی القرأۃ انشاء اللہ اخی الفاضل صفی احمد نیابۃً عنی وبید اللہ التوفیق

۳ مارچ کو جامعہ کی مسجد میں پروگرام تھا۔ یہ مسجد بہت بڑے ہال کی مانند ہے اور انتہائی سادہ ہوتے کے باوجود انتہائی شاندار ہے۔ یہ دوسرا محاضرہ انگریزی میں تھا۔ میں نے اصل انگریزی محاضرہ کا کچھ حصہ بطور خلاصہ پڑھا اور اس کے بعد کہا:

> ھذہ خلاصۃ مقالتی وسیلقیھا مفصلۃ باللغۃ العربیۃ فضیلۃ الاستاذ محی الدین العربی۔

محی الدین عربی ایک مصری عالم ہیں۔ انھوں نے پہلے سے میرے انگریزی مقالہ کا عربی ترجمہ تیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ

انھوں نے مکمل ترجمہ خالص عربی لہجہ میں پڑھ کر سنایا۔

۴ مارچ کو دوبارہ جامعہ کے بڑے ہال (قاعة المحاضرات) میں پروگرام تھا۔ محاضرہ کا عنوان تھا: امکانیات جدیدة للدعوة۔ یہ مقالہ عربی میں تھا۔ میں نے خود پورا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ بعد کو لوگوں نے کہا کہ آپ کے پڑھنے کا طریقہ بہت اچھا تھا۔ اور آئندہ آپ کو اپنا مقالہ خود ہی پڑھنا چاہئے خواہ وہ عربی میں ہو یا انگریزی میں۔

اس کے بعد تین دن کا وقفہ تھا۔ اگلا پروگرام ۱۱ مارچ کو دن میں ہوا۔ اصل مقالہ انگریزی میں تھا۔ میں نے ابتدائی کچھ کلمات خلاصہ کے طور پر کہے۔ اس کے بعد محی الدین عربی نے اس کا مکمل عربی ترجمہ پڑھ کر سنایا۔ شام کو نماز مغرب کے بعد حوار مفتوح (سوال وجواب) کا پروگرام تھا۔ میں نے تمہید کے طور پر کچھ ابتدائی کلمات عربی میں کہے۔ اس کے بعد طلبہ کے سوالات کاغذ پر لکھے ہوئے آنا شروع ہوئے۔ کافی سوالات آئے اگرچہ بعض سوالات میرے ذوق کے خلاف تھے۔ تاہم میں نے تمام سوالات کے جوابات دئے۔ اس کی شکل یہ ہوئی کہ ایک ایک سوال پڑھ کر سنایا جاتا اور میں اس کا جواب دیتا۔

یہ مجلس کافی دلچسپ رہی۔ لوگ آخر تک نہایت دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔ اساتذہ اور ذمہ داروں کی بھی ایک تعداد ہال کے اندر تھی۔

۲ مارچ کی شام کو نماز عشا کے بعد جامعہ اسلامیہ کے ہندستانی طلبہ بڑی تعداد میں ہوٹل کے کمرہ میں آگئے۔ ان کی خواہش پر میں نے بتایا کہ میرا حاصل مطالعہ کیا ہے اور میں نے اب تک کے مطالعہ سے کیا پایا ہے۔ یہ گفتگو زیادہ تر اسلامی دعوت کے جدید امکانات کے پہلو پر تھی۔ اس مجلس میں جامعہ کے بعض استاد بھی شریک تھے۔ مزید میں نے کہا کہ سورہ یوسف سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی دنیا میں یہ بھی ممکن ہے کہ جہاں لوگ آپ کی تاریخ ختم کرنا چاہتے ہوں وہاں سے آپ کے لئے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے۔ آپ کا اسوۂ القصص احسن القصص میں تبدیل ہو جائے۔ مگر اس عظیم خدائی انعام کو پانے کی دو لازمی شرطیں ہیں۔ تقویٰ اور صبر (یوسف ۹۰)

۷ مارچ کی شام کو ایک صاحب کے مکان پر ہندستانی طلبہ کا اجتماع ہوا۔ یہاں میں نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا کہ "مومن" ہونے کا مطلب کیا ہے اور جنت میں داخلہ آدمی کو کس طرح ملے گا۔ آخر میں کچھ لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ اپنے مرکز کے مقاصد کے بارہ میں کچھ بتائیں۔ اس سلسلے میں میں نے ضروری تفصیلات عرض کیں۔

مجھ کو ایک عجیب تجربہ یہ ہوا کہ اگر الاسلام تحدی کی قسم کی سائنس والی باتیں کی جائیں تو لوگ خوب خوش

ہوتے ہیں اور حل من مزید کا مطالبہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر حمد خداوندی کی باتیں کی جائیں اگر جنت اور جہنم کا تذکرہ کیا جائے۔ اگر رزق ربانی کے نغمے چھیڑے جائیں تو لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پہلا اسلام ان کی پہچان والا اسلام ہے۔ جب کہ دوسرا اسلام ان کی پہچان والا اسلام نہیں۔ آج مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے سرمایہ فخر بنا رکھا ہے۔ اس لئے پہلی قسم کی باتیں ان کو اسلام کا سائنسی قصیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کو سن کر ان کی نفسیاتِ فخر کو تسکین ملتی ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر دوسری قسم کی باتیں ان کو اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اسلام کے نام سے وہ اس قسم کی کسی چیز کو جانتے ہی نہیں۔ اسلام ان کے لئے قومی فخر کا عنوان ہے نہ کہ اصلاحِ ذات کا عنوان فخر والی بات کی جائے تو وہ اس میں اپنے لئے غذا پا لیتے ہیں۔ مگر اصلاحِ ذات والی باتیں کی جائیں تو وہ اس سے متوحش ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اس کا مطلب اپنی نفی ہے۔ اور کون ہے جو اپنی نفی کی قیمت پر حق کا اعتراف کرے

رابطہ عالم اسلامی کے ہفتہ وار الدعوۃ (الریاض) مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۴ میں شائع شدہ رپورٹ یہاں نقل کی جاتی ہے:

وحيد الدين خان في الجامعة الاسلاميه

المدينة المنورة / مندوب الدعوة ــــــــ ضمن الموسم الثقافي و الذي تنظمه عمادة شئون الطلاب بالجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة۔ استضافت الجامعة الداعية الاسلامي الشيخ وحيد الدين خان، احد كبار علماء الهند والذي يزور الجامعة حاليًا، حيث القى اربع محاضرات خلال الاسبوع الماضي۔ هذا وقد انهى الشيخ وحيد الدين محاضراته بحوار مفتوح مع طلبة الجامعة۔

سعودی عرب کے ماہنامہ الفیصل (ریاض) میں ایک کالم الحركة الثقافية في الوطن العربي کے عنوان سے ہوتا ہے۔ مذکورہ جریدہ کی اشاعت شعبان ۱۴۰۴ھ (مئی ۱۹۸۴ء) میں صفحہ ۱۳ پر جو رپورٹ درج ہے وہ یہاں نقل کی جاتی ہے:

محاضرات

۱ الاسلام المعاصر۔ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان، وذالك بالجامعة الاسلامية (المدينة المنورة)

۲ الاسلام و المشاكل العصرية ــ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان بالجامعة الاسلامية

۳ التضامن والدعوة الاسلامية ــ محاضرة القاها الشيخ وحيد الدين خان بالجامعة الاسلامية

٤ امکانات جدیدة للدعوة الاسلامیة ۔ محاضرة القاها الشیخ وحید الدین خان
وذالك بالجامعة الاسلامیة بالمدینة المنورة

والجدیر بالذکر ان هذه المحاضرات الاربع قد القاها فضیلته خلال شهر جمادی الاخرة ١٤٠٤ھ وذالك خلال زیارته للجامعة

۴ مارچ کو ایک صاحب عبدالقادر المغاری (الجزائر) نے انٹرویو لیا۔ وہ اخبار المدینہ کے نمائندہ تھے۔ انھوں نے ایک کاغذ پر بہت سے سوالات لکھ رکھے تھے۔ میں نے کچھ سوالات کے جوابات دئے اور کچھ اختلافی نوعیت کے سوالات کے جوابات سے معذرت کی۔ میں نے دیکھا کہ میرے جوابات کے بعد دوبارہ وہ نئی شق نکال کر سوال نہیں کرتے تھے۔ اور میری معذرت فوراً قبول کر لیتے تھے۔

عبدالقادر جزائری تبلیغی جماعت سے متاثر ہیں اور کسی جماعت کے ساتھ دہلی (نظام الدین) بھی جا چکے ہیں۔ مجھے گفتگو کے دوران بار بار یہ تجربہ ہوا کہ تبلیغی جماعت کے افراد بحثوں میں نہیں الجھتے۔ اور نہ اختلافی امور میں زیادہ شدت ظاہر کرتے۔ یہ ان کے دینی مزاج کا ثبوت ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں ان سے گفتگو کے دوران اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کو سب سے زیادہ دلچسپی اختلافی امور سے ہے۔ کوئی بھی جواب انھیں چپ نہیں کرتا۔ ہر جواب کے بعد وہ ایک نیا لفظی شوشہ نکال کر نئی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

تیونس سے ایک ماہوار رسالہ نکلتا ہے جس کا نام ہے جوہر الاسلام۔ پتہ یہ ہے:

جوہر الاسلام، ۲۸ نہج جمال عبد الناصر۔ تیونس (ٹیلی فون ۱۰۸-۲۵۹)

۴ مارچ کی شام کو جوہر الاسلام کے دو نمائندے آئے اور اپنے رسالہ کے لئے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات کچھ ہمارے مشن کے بارہ میں تھے اور کچھ موجودہ مسلم سیاست کے بارہ میں۔ میں نے اپنے مشن کے بارہ میں سوالات کے جوابات دئے۔ مگر موجودہ سیاست کے بارے میں جواب دینے سے اعراض کیا۔

روزنامہ عکاظ کے دو نمائندے اا مارچ کی شام کو میری قیام گاہ پر آئے۔ اور اپنے اخبار کے لئے انٹرویو لیا۔ ان کے سوالات بھی کچھ مرکز اسلامی کے بارہ میں تھے۔ اور کچھ عالم اسلام کے بارہ میں۔

المعہد العالی للدعوة الاسلامیة (مدینہ) کی طرف سے ایک ماہانہ پرچہ نکلتا ہے جس کا نام ہے رسالۃ المعہد اس کے نمائندہ محمد ضیاء الدین صاحب نے ۵ مارچ کی شام کو رسالۃ المعہد کے لئے انٹرویو لیا۔ محمد ضیاء الدین صاحب نوجوان ہیں اور حلب (شام) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ مدینہ میں وزارۃ الاعلام کے تحت کام کر رہے ہیں۔ رسالۃ المعہد کے جوابات کا اردو ترجمہ یہاں بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

۱۔ دعوت اسلامی کا مطلب میرے نزدیک دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں دعوت الی اللہ کو جو چیلنج درپیش ہے وہ میرے نزدیک الحادی فکر کا غلبہ ہے۔ اس لئے دعوت اسلامی کی راہ ہموار کرنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ دنیا سے الحادی فکر کا غلبہ ختم کیا جائے۔

قدیم زمانہ میں مادی مظاہر کو خدا قرار دے کر انسان نے خدا کو چھوڑ دیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں مادی مظاہر کے پیچھے کام کرنے والے سلسلۂ اسباب کو خدا قرار دے دیا گیا ہے اور اسی کا نام الحاد ہے۔ جب تک اس فکری ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے کوئی دوسرا کام نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ موجودہ زمانہ کے داعیوں کا اصل مسئلہ وہ ہے جو داخلی ہے۔ وہ ابھی تک دعوت اور قومیت کو اور اسی طرح دعوت اور سیاست کو الگ الگ نہیں کر سکے ہیں۔ جس دن وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں گے اسی دن ان کے مسائل کے خاتمہ کا بھی آغاز ہو جائے گا۔

۳۔ صحافت یقیناً اسلامی دعوت کے لئے نہایت اہم ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ مسلمان ابھی تک صرف قومی صحافت کو جانتے ہیں، وہ عالمی صحافت کے میدان میں داخل نہیں ہوئے۔ عالمی صحافت کے لئے موضوعیت (objectivity) لازمی طور پر ضروری ہے اور مسلمان موضوعیت سے محروم ہیں۔

۴۔ میری زندگی کسی "حادثہ" کے نتیجہ میں نہیں بنی۔ میں نے اسلامی علوم اور غیر اسلامی علوم کا تقریباً ۴۰ سال تک مطالعہ کیا ہے۔ میری شخصیت اسی مطالعہ کے ذریعہ بنی ہے۔

۵۔ جدید علمی انکشافات کو تفسیر قرآن میں استعمال کرنا میرے نزدیک عین درست ہے بشرط صرف یہ ہے کہ معیار اصلی قرآن ہو نہ کہ جدید انکشافات۔ یعنی جدید انکشافات کو قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے نہ کہ قرآن کو جدید انکشافات کی روشنی میں۔

علمی نظریات کے بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دور اول میں جب قرآن نے کہا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں پر غور کرو تو انسان نے اپنی اس وقت کی معلومات کی روشنی میں زمین و آسمان پر غور کیا۔ آج بھی یہی ہوگا کہ انسان اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں آیات کون پر غور کرے گا۔ اس کی وجہ سے نہ پہلے کوئی اعتقادی خرابی پیدا ہوئی اور نہ آج ہو سکتی ہے۔

حج کے زمانہ میں حرم میں جو غیر معمولی بھیڑ ہوتی ہے اس کو میں صرف حج کی خصوصیت سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ غیر حج کے زمانہ میں مسجد خالی رہتی ہوگی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آجکل بھی نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی تقریباً پوری بھر جاتی ہے۔ اور جمعہ کے دن تو بڑی تعداد میں لوگ مسجد کے باہر نماز ادا کرتے ہیں

جیساکہ حج کے زمانہ میں نظر آتا ہے۔

قدیم مسجد نبوی کے مقابلہ میں موجودہ مسجد نبوی بہت زیادہ بڑی ہو چکی ہے۔ پوری مسجد بڑے بڑے پایوں پر قائم ہے۔ پایوں کے اوپر خاص طرح کے نشانات اس کی توسیع کی تاریخ بتاتے ہیں۔ اندر کی طرف کچھ پایوں پر خاص طرح کے رنگ مسجد نبوی کے قدیم رقبہ کو بتا رہے ہیں۔ اس کے بعد کے پایوں پر دوسرے نقوش ہیں جو اس توسیع کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس توسیع کے نشانات ہیں جو ترک خلافت کے زمانہ میں کی گئی۔ اور اس کے بعد نسبتاً جدید طرز کی شاندار تعمیرات ہیں جو سعودی حکومت کے زمانہ میں کی گئی ہیں۔ اس کے باوجود جب نماز کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اپنی تمام توسیع اور اضافوں کے باوجود بدستور ناکافی ہے۔

حرم میں نماز کے وقت امام کی آواز بہت صاف سنائی دیتی ہے، امام خواہ سجدہ میں ہو یا رکوع میں یا قیام میں۔ میں نے جاننا چاہا کہ یہاں لاؤڈ اسپیکر کا کیا انتظام ہے کہ ہر حال میں امام کی آواز مقتدیوں تک بالکل صاف پہنچتی رہتی ہے۔ ایک روز قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ امام کی جگہ پر کئی بہت اچھے قسم کے مائک لگے ہوئے ہیں۔ یہ مائک نیچے سے لے کر اوپر تک ہیں۔ چنانچہ امام خواہ سجدہ میں ہو یا رکوع میں یا قیام کی حالت میں، مائک ہر حالت میں اس کی پوری آواز پکڑ لیتا ہے۔

یہی انتظام موذن کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ موذن جب اذان دیتا ہے تو اس کی آواز میلوں تک سنائی دیتی ہے۔ قدیم مسجد نبوی کی اذان اگر ایک فرلانگ تک سنائی دیتی ہوگی تو آج مشینی دور میں یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اس کی زبان سے نکلی ہوئی اللہ اکبر اور حی علی الفلاح کی آواز ایک سو فرلانگ کے دائرہ میں گونجے ـــــــ تاریخ کے امکانات کہاں سے کہاں تک جا پہنچے ہیں۔

حرم کے بالکل قریب ٹھہرنے کی وجہ سے پانچوں وقت کی نمازیں حرم میں ادا کرنے کا موقع ملا۔ یہ نعمت مجھے خدا کے فضل سے دو بار ملی۔ پہلی بار حج کے موقع پر۔ دوسری بار موجودہ سفر میں۔ تاہم ایک چیز میرے لئے بڑی عجیب تھی۔ اور وہ تھا حرم میں خواتین اسلام کا اپنا "حق مساوات" وصول کرنا۔ حرم کا ایک بڑا حصہ صرف خواتین کے لئے مخصوص ہے۔ یہ حصہ عام طور پر بھرا رہتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس حصہ میں عام طور پر جماعت شروع ہونے سے پہلے خاموشی رہتی ہے۔ مگر جیسے ہی جماعت کی نماز شروع ہوتی ہے اس حصہ سے بچوں کے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یہ آوازیں مسلسل جاری رہتی ہیں یہاں تک کہ جیسے ہی امام سلام پھیر کر جماعت ختم کرتا ہے بچوں کے شور کی آوازیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آجکل والدین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے زندہ کھلونا بنے

رہتے ہیں۔ چنانچہ خواتین جب نماز کے لئے حرم میں آتی ہیں تو بچوں کو لانا بھی ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ نماز شروع ہونے سے پہلے بچے اپنے ماؤں کی گود میں ہوتے ہیں۔ جب نماز شروع ہوتی ہے تو پاس کی جگہ پر انھیں رکھ کر وہ نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین جب نماز میں مشغول ہوتیں تو ان کے بچے اپنے کھلونے سے محروم ہو جاتے۔ اور اس بنا پر رونے چیخنے لگتے۔ نماز ختم ہوتے ہی فوراً انھیں اپنا کھلونا مل جاتا اور وہ دوبارہ چپ ہو جاتے۔

یکم مارچ کی شام کو مغرب سے کچھ پہلے میں مسجد نبوی چلا گیا۔ ہمارا ہوٹل (النخیل) مسجد نبوی سے اتنا قریب تھا کہ تکبیر کی آواز بھی ہمارے کمرہ تک سنائی دیتی تھی۔ مسجد کے صحن میں بیٹھ کر میں سبز گنبد کو دیکھ رہا تھا جس کے نیچے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا گویا میں تصور کی سطح پر رسول خدا کے ساتھ مربوط ہو گیا ہوں۔ درمیان کا زمانی فاصلہ تھوڑی دیر کے لئے حذف ہو گیا۔ سبز گنبد میرے لئے ایک تاریخی تسلسل کی علامت بن گیا۔

اسلام میں بلاشبہ قبر پرستی نہیں ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کی قبر کا ثابت شدہ حالت میں مدینہ میں موجود ہونا آپ کی تاریخی اعتباریت کا ایک پختہ نشان ہے۔ آدمی سبز گنبد کو دیکھ کر گویا ایک تاریخ کو دیکھنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے پیغمبر اسلام کی "پختہ" قبر کا موجود رہنا بھی اسلام کی ایک استثنائی ضرورت ہے۔

یکم مارچ کی صبح کو ایک بار میں دسویں منزل سے اپنے کمرہ سے نیچے اترا۔ واپسی کے وقت معلوم ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی ہے اور لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر بہت سے لوگ بجلی کی آمد کے انتظار میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ایک خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ بظاہر دماغ میں یہ تھا کہ اب ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ بجلی کے آنے کا انتظار کریں۔ کیوں کہ "دسویں منزل" تک سیڑھیوں کے ذریعہ چڑھ کر پہنچنا بہت مشکل کام ہے۔

"آیئے کچھ ورزش کریں" اچانک میرے ساتھی نے کہا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں بیٹھے رہنے کے بجائے ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے باہر کہیں ٹہل لیں۔ مگر جلد ہی معلوم ہوا کہ وہ سیڑھیوں کے ذریعہ چل کر اوپر جانے کی بات کر رہے تھے۔ میں فوراً آمادہ ہو گیا اور ہم دونوں سیڑھی کے ذریعہ اوپر چڑھنے لگے۔ چند منٹ گزرے تھے کہ میں اپنی منزل پر کمرہ نمبر ۹۰۱ میں داخل ہو چکا تھا ـــــ ہر کام جو بظاہر مشکل یا ناممکن نظر آتا ہے۔ وہ یقینی طور پر ممکن اور آسان ہے، بشرطیکہ ہمت کر کے اس کو شروع کر دیا جائے۔

ہندستان میں اگر کسی کی موت ہو اور اس کو نماز جنازہ کے لئے مسجد میں لایا جائے تو فرض نماز

کے بعد اعلان ہوگا" جنازہ تیار ہے" یہاں حرم میں اکثر کوئی نہ کوئی جنازہ ہوتا ہے اور نماز کے بعد اس کے لئے نماز کا اعلان ہوتا ہے۔ مگر اعلان کے الفاظ اس قسم کے ہوتے ہیں:

الصّلوة على الرجل يرحمكم الله ، الصلوة على المرأة يرحمكم الله ، الصلوة على الطفل يرحمكم الله

عربی زبان کا یہ انداز اسلام کی دین ہے۔ اسلام کی چھاپ عربی زبان پر اتنی زیادہ ہے کہ وہ اس کے تمام اسالیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے کمرہ کا ٹیلی وژن کھولا تاکہ سعودی عرب کی خبریں سن سکیں۔ اس وقت اتفاق سے ملک فہد کی ایک تقریر کا کچھ حصہ نشر کیا جارہا تھا۔ ملک فہد کی تقریر میں بار بار اسلامی کلمات ادا ہورہے تھے۔ مثلاً ایک موقع پر انھوں نے سنجیدہ لہجہ میں کہا:

ونرجوا ربنا عز وجل ان يساعدنا...

ایک روز ایسا ہوا کہ حرم میں کوئی صاحب مل گئے۔ اور ان سے بات کرتے ہوئے میں فرش پر بیٹھ گیا جہاں میں بیٹھا وہ اتفاق سے راستہ تھا۔ ایک عرب جو چاہتے تھے کہ میں راستہ سے ہٹ جاؤں تاکہ لوگوں کو نکلنے میں آسانی ہو، انھوں نے کہا:

خل الطريق للناس يرحمك الله

عربی زبان کا یہ انداز اس لئے ہے کہ اس کا نشو ونما اسلام کی روایات میں ہوا۔ اس کے برعکس اردو کا نشو ونما بالکل دوسرے حالات میں ہوا۔ چنانچہ مدینہ کے ایک ہندستانی طالب علم نے ایک ملاقات کے موقع پر سوالیہ انداز میں کہا:

الرسالہ کا تو کوئی دفتر نہیں ہوگا۔ وہ جمعیۃ بلڈنگ کے کمرہ میں ہوگا۔

میں نے یہ جملہ سنا تو میری زبان سے نکلا " الرسالہ کا دفتر زمین وآسمان میں ہے۔"

عربوں کے ذہن پر عام طور پر سب سے زیادہ جو مسئلہ سوار ہے وہ یہود کا مسئلہ ہے۔ وہ یہودیوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ ایک عرب مصنف کے قلم سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے ـــــ اليهود وراء كل جريمة (تمام جرائم کے پیچھے یہودی ہیں) ایک تعلیم یافتہ عرب سے بات ہورہی تھی تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ آج دوبارہ ہم کو ایک صلاح الدین ایوبی کی ضرورت ہے۔ ایک مقام پر مجھے کچھ اہل علم کی مجلس میں اظہار خیال کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ آجکل دنیا بھر کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک قسم کے احساس مظلومی Persecution Complex میں مبتلا ہیں۔ کہیں یہودی ان کو اپنے اوپر ظلم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں غیر یہودی۔ یہ کسی قوم کے لئے نہایت بری علامت ہے۔ قومیں احساس یافت پر اٹھتی ہیں نہ کہ احساس محرومی پر۔ قرن اول میں جو لوگ مکہ سے ہجرت کرکے حبشہ گئے۔ وہ موجودہ

زمانہ کے مسلمانوں سے زیادہ بڑے ظلم سے دوچار تھے۔ مگر شاہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر طیار نے جو تقریر کی اس میں وہ "کھونے" کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ "پانے" کا ذکر کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو اگر دوبارہ اٹھانا ہے تو ان کے اندر بھی یہی ذہن پیدا کرنا ہوگا۔

ایک غیر عرب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عالم تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ قرآن پر ایک تحقیقی کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ قرآن کے مطالعہ میں گزارا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ اپنے مطالعہ کی روشنی میں بتائیے کہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: "اس حیثیت سے میں نے زیادہ غور نہیں کیا۔ میرے لئے یہ سوال اچانک ہے۔ اس لئے مجھے سوچ کر بتانا ہوگا۔" اسی طرح ایک اور صاحب ملے انھوں نے کہا کہ میرا موضوع قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ کوئی ایسی بات بتائیے جو آپ نے خود قرآن میں پائی ہو، جو آپ کی اپنی دریافت ہو۔ مگر وہ قرآن میں کسی خود دریافت کردہ حقیقت کی نشاندہی نہ کرسکے ——— کیسے عجیب ہوں گے وہ قرآن کو پڑھنے والے جن کے ذہنی اثاثہ خانہ میں قرآن نے کسی نئی چیز کا اضافہ نہ کیا ہو۔

اس سفر کے دوران ایک عرب ملک کی ایک بڑی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا عرب امام نے کافی لمبا خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں "بیع" کے مسائل نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے تھے۔ تاہم ان مسائل میں اکثر ایسے تھے جن کا آج کے حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ بس کتاب کی باتوں کو دہرائے چلے جارہے ہیں۔

مثلاً انھوں نے کہا کہ جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کریں ان کو ہتھیار بیچنا حرام ہے (بیع السلاح علی من یحارب المسلمین حرام) یہ مسئلہ صلیبی جنگوں کے زمانہ کا ہے۔ اس زمانہ میں عراق و شام کے علاقہ میں دنیا کے بہترین ہتھیار بنتے تھے۔ چنانچہ جنگ کے وقفوں میں یوروپی تاجر یہاں آکر ہتھیار خریدتے تھے۔ چوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ ہتھیار دہ یوروپی قوموں کے ہاتھ پہنچیں گے اور وہ ان کو اگلی صلیبی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس لئے اس وقت کے علماء نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ مسلمانوں سے برسر جنگ ہوں ان کو ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے۔

یہ مسئلہ خود بتاتا ہے کہ وہ ایسے وقت سے متعلق ہے جب کہ مسلمان ہتھیار فروخت کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ مگر موجودہ زمانہ میں تو مسلمان صرف اس کے خریدار ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہتھیاروں کی صنعت پوری طرح "کافروں" کے ہاتھ میں جاچکی ہے۔ اور خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ ان سے ہتھیار خریدے بغیر اپنے دشمنوں سے اپنا دفاع نہیں کرسکتے۔ ہمارے اکثر بڑے بڑے خطیبوں کا یہ حال

ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "وہ بیسویں صدی میں نہیں بول رہے ہیں بلکہ "صلاح الدین کے منبر" پر کھڑے ہو کر اقوام عالم کو خطاب کر رہے ہیں۔

۵ مارچ کو دوپہر کا کھانا رئیس جامعۃ اسلامیہ دکتور عبد اللہ صالح العبید کی طرف سے تھا۔ انھوں نے میرے اعزاز میں مدینہ کے ہوٹل میں ظہرانہ دیا۔ اس ظہرانہ میں چنی ہوئی اعلیٰ شخصیتیں موجود تھیں جس میں وزارت تعلیم کے وکیل بھی تھے۔ اسی طرح ایک اور صاحب نے ایک خصوصی دعوت کی جس میں رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل کے پی اے استاد اسامہ خلیفہ بھی شریک تھے۔

ان مواقع پر ذمہ دار لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ شیخ محمد عمر فلاتہ سے اسلامی مرکز کے موضوع پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہم سیاست سے دور رہ کر خالص دعوت کے میدان میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں میری زبان سے نکلا کہ ہندستان کے حالات میں موثر کام کرنے کے لئے سیاست سے دور رہنا ضروری ہے۔ شیخ محمد عمر فلاتہ نے فوراً کہا کہ ہندستان ہی میں نہیں بلکہ ہر ملک میں ضروری ہے۔ سیاست میں مشغول ہو کر کوئی موثر کام نہیں کیا جا سکتا۔

پچھلے برسوں میں سیاسی اسلام کا ذوق اتنا بڑھا کہ اسلامی دعوت کو سیاسی دعوت کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ جہاد غیر مسلموں سے مقابلہ کے لئے تھا۔ انھوں نے جہاد کو مسلمانوں کی باہمی جنگ کا عنوان بنا لیا۔ مگر عملی تجربہ نے اس کو ناکام ثابت کر دیا۔ چنانچہ عالم اسلام میں اب وہ دور شروع ہو گیا ہے جو بالآخر اس فکر کو بالکل بے قیمت بنا کر رکھ دے گا۔ اس سفر میں میری ملاقات ایک عرب قائد سے ہوئی۔ وہ پہلے سیاسی اسلام کے داعی تھے۔ اب وہ اس کو ترک کر چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اسی کو صحیح اسلام سمجھتا ہوں۔ اور پچھلے ۲۰ سال سے اس کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ جس فکر پر آپ ۲۰ سال پہلے پہنچ گئے تھے، ہم اس پر صرف ایک سال پہلے پہنچے ہیں۔

رئیس الجامعہ دکتور عبد اللہ صالح العبید سے میں نے پوچھا کہ آپ نے الاسلام یتحدیٰ پڑھی ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کس نے نہیں پڑھی ہے۔ اکثر لوگ مجھ سے یہ پوچھتے کہ الاسلام یتحدیٰ کے بعد دوسری تصنیفات کیا ہیں اور وہ عربی میں منتقل ہوئیں یا نہیں۔

یہاں جس جگہ بھی جانا ہوا یا جس سے بھی ملاقات ہوئی اس نے یہی بتایا کہ اس نے الاسلام یتحدیٰ پڑھی ہے۔ بعض نے کہا کہ میں نے اس کے بارہ میں بہت کچھ سنا ہے۔ اور اس کو پڑھنا چاہتا ہوں۔ الجامعۃ الاسلامیۃ میں انڈونیشیا کے ایک طالب علم نے بتایا کہ انڈونیشی زبان میں بھی الاسلام یتحدیٰ کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے میرا پتہ لیا اور کہا کہ اس کا ایک نسخہ میں آپ کو ڈاک سے روانہ کروں گا۔

شیخ محمد عمر فلاتہ ۲ مارچ کو ہوٹل میں ملنے کے لئے آئے۔ اتفاق سے میں موجود نہ تھا تو حسب ذیل تحریر چھوڑ گئے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

فضيلة الشيخ وحيد الدين خان حفظه الله

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد

حضرت للتشرف بالسلام عليكم

بعد صلاة المغرب فلم أسعد بلقائكم

وسأعود مرة أخرى إن شاء الله

وإنني على [illegible]

يكلل الله مساعيكم بالنجاح والتوفيق

أخي

عمر محمد فلاتة [illegible]

۱۰ مارچ کی شام کو شیخ محمد عمر فلاتہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے الجامعۃ الاسلامیۃ کے بعض عجیب واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں جامعہ کے تحت ایک سفر کے دوران کیمرون گیا۔ وہاں جامعہ کے ایک فارغ طالب علم سے ملاقات ہوئی تو وہ باربار جامعہ کے ایک مستخدم (ملازم) کے بارہ میں سوال کرتا اور اس کا حال پوچھتا۔ میں نے پوچھا کہ تم جامعہ کے شیوخ سے زیادہ مستخدم کے حالات دریافت کر رہے ہو، کیا بات ہے۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ میں تعلیم کی غرض سے جامعہ گیا۔ میں اپنے ساتھ کوئی رقم نہیں لے گیا تھا۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ ساری کفالت جامعہ کی طرف سے ہوگی۔ جب وہ مدینہ کے ایر پورٹ پر اترا تو اس کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں کوئی گاڑی اس کی مدد کے لئے موجود نہیں ہے۔

نوجوان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ٹیکسی کرے۔ اگرچہ اس کی جیب میں کوئی رقم موجود نہ تھی۔ تاہم اس نے ٹیکسی کی اور اس کے ذریعہ ایر پورٹ سے جامعہ پہنچا۔ یہاں جب ٹیکسی والے نے کرایہ (پندرہ ریال) مانگا تو نوجوان نے کہا کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس پر ٹیکسی والا غصہ میں آگیا۔ اور نوجوان کو دھوکہ باز، شیطان وغیرہ کہنے لگا۔

نوجوان بے بسی کے انداز میں ٹیکسی والے کی سخت کلامی کو سن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ اتنے میں جامعہ کا ایک مستخدم شور سن کر وہاں آگیا اور ٹیکسی والے سے کہا کہ تم کیوں اس طالب علم کو پریشان کر رہے ہو۔ اس نے کہا کہ یہ دھوکے باز ہے۔ مجھ کو ایر پورٹ سے لایا اور اب کرایہ دینا ہے تو کہتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ مستخدم نے کہا کہ اپنی زبان روکو، یہ ضیوف الرحمن ہیں اور یہ مجھ سے اور تم سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

اس کے بعد مستخدم نے اپنی جیب سے پندرہ ریال نکالے اور اس کو ٹیکسی کے مالک کے حوالے کیا۔ اس کے بعد یہ مستخدم نوجوان کو لے کر دفاتر میں گیا۔ ضروری کارروائی کرائی اور اس کے سامان کو اس کے کمرہ تک پہنچایا۔ آخر میں جب وہ رخصت ہونے لگا تو اس نے دوبارہ اپنی جیب سے ۲۰ ریال نکالے اور طالب علم کے حوالہ کر کے باہر چلا گیا۔

ایک ہندستانی طالب علم سے میں نے عربوں کے بارہ میں ان کے تجربات پوچھے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے عربوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے اندر توسع کا مزاج ہوتا ہے جو ہندستان اور پاکستان جیسے علاقوں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہم لوگ کسی محفل میں ایک تقریر کرتے ہیں یا کسی موقع پر ایک سوال کا معمولی جواب دیتے ہیں تو ہمارے اساتذہ فراخ دلی کے ساتھ احسنت احسنت کہتے ہیں۔ ان کا مزاج ہوتا ہے کہ جو خوبی ہے اس کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور جو کمی ہے اس کو نظر انداز

کیا جائے۔

بیرونی ممالک کے سفروں میں بار بار مجھ کو اس کا تجربہ ہوا کہ میرے جیسی شکل وصورت کے آدمی کو "ہندستانی" ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملک میں ہندستانی کی تصویر اچھی نہیں۔

مدینہ میں ہم جس ہوٹل میں ٹھہرائے گئے وہ یہاں کے معیار کے مطابق درجہ اول کا ہوٹل تھا تاہم عملہ کا رویہ ابتداءً کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ انھوں نے ہم کو بس ایک "ہندستانی مسلمان" سمجھا۔ اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ شیوخ و اکابر مجھ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔ جامعہ کے مہمانوں کے لئے یہاں قیام وطعام کے بعد صرف مقامی ٹیلی فون کی سہولت ہوتی ہے مگر ہمارے لئے جامعہ اسلامیہ سے ہوٹل کو ہدایت دی گئی کہ "شیخ وحید الدین سعودی مملکت کے دوسرے شہروں نیز خارجی ممالک میں بھی ٹیلی فون کر سکتے ہیں اور یہ جامعہ کی طرف سے ان کے لئے خاص ہے" (وھی خاصة للشیخ وحیدالدین من ادارة الجامعة) رئیس الجامعۃ (مدینہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر) نے اسی ہوٹل میں ہمارے اعزاز میں خصوصی ظہرانہ دیا اور آخر میں رخصت ہوتے ہوئے خود آگے بڑھ کر میرے لیے لفٹ کا بٹن دبایا۔ اس قسم کے واقعات کو دیکھ کر ہوٹل والوں کی روش خود بخود درست ہوگئی۔ وہ پہلے جتنا خشک تھے۔ اب وہ اتنا ہی ہمارے اوپر مہربان ہوگئے۔ ہوٹل کے منیجر نے خود ہمارے کمرہ میں آکر کہا کہ ہم ہر وقت آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ حتیٰ کہ اگلے دن تازہ پھل دو ٹرے میں رکھ کر ہمارے لئے بھیجے گئے۔ جس کے ساتھ خوبصورت کارڈ پر یہ لکھا ہوا تھا: مع تحیاتنا لسیادتکم بطیب الاقامة

اوپر کی سطح پر اگر آپ کا اعتراف کر لیا جائے تو نیچے کی سطح کے لوگ خود بخود آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

۵ مارچ کی صبح کو ہم دو فلسطینی نوجوانوں کے ساتھ مدینہ کے تاریخی آثار دیکھنے کے لئے نکلے۔ تقریباً نصف دن گزرا مصطفٰے شادر (فلسطینی ثم اردنی) کو آثار عرب کے بارے میں کافی معلومات ہیں۔ چنانچہ وہ رہنمائی کرتے رہے۔ مدینہ میں رسول اللہ اور صحابہ کے زمانہ کے اصل آثار اب بہت کم باقی ہیں۔ ان آثار کی ایک حیثیت تاریخی تھی اور دوسری یہ تھی کہ لوگ ان کو مقدس قرار دے کر یہاں آکر مشرکانہ افعال کرتے تھے۔ ذمہ داروں نے ان کی دوسری حیثیت کی بنا پر انھیں ختم کر دیا۔ اس وقت جو آثار ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جہاں نئی تعمیرات کھڑی ہیں۔ مثلاً ایک شخص آپ کو بتائے گا کہ یہاں سقیفہ بنی ساعدہ تھا۔ مگر آج وہاں صرف کھجور اور درخت نظر آتے ہیں۔ مسجد الجمعہ اور مسجد قبا آج موجود ہیں مگر ان کی تعمیرات وہ نہیں ہیں جو ابتدا میں تھیں۔

تاہم کچھ چیزیں آج بھی اپنی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔ مثلاً بئر رومہ جس کو حضرت عثمان نے ایک یہودی سے خرید کر عام مسلمانوں کے لئے وقف کیا تھا۔ اسی طرح کعب بن اشرف کا قلعہ نما مکان بھی کھنڈر کی صورت میں ابھی تک موجود ہے۔ ہم نے یہ مقامات دیکھے۔ ان کو دیکھ کر عجیب عبرت حاصل ہوئی۔

پھر ہم احد پہاڑ کو دیکھنے گئے۔ یہاں دیگر آثار کے علاوہ وہ شق (غار) بدستور موجود ہے جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے شکست کے بعد پناہ لی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر غار میں داخل ہوا اور ان پتھروں پر دیر تک بیٹھا رہا جہاں حسب روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہونے کے بعد بیٹھے تھے۔ اس وقت طبیعت پر عجیب اثر ہوا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے تاریخ کا درمیانی وقفہ حذف ہو گیا ہے اور میں براہ راست رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پہنچ گیا ہوں۔

مدینہ منورہ میں ہمارا آخری پروگرام ۱۱ مارچ ۱۹۸۴ کو النادی الادبی میں تھا۔ فلسطینی نوجوان مصطفیٰ شاور ایک روز مجھ کو ایک کتاب کے سلسلے میں ایک دفتر میں لے گئے۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہاں کے ذمہ دار اعلیٰ (دکتور محمد ہاشم رشید) مجھ سے بخوبی واقف ہیں اور میری عربی مطبوعات پڑھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ النادی الادبی میں بھی ضرور میرا ایک پروگرام ہو۔

چنانچہ مشورہ کے بعد اس کی تاریخ ۱۱ مارچ کی شام طے ہوئی۔ النادی الادبی کے ذمہ داروں نے اخبار میں اس کا اعلان کر دیا۔ نیز حسب ذیل سرکلر مختلف تعلیم یافتہ افراد کے نام شخصی طور پر روانہ کیا گیا۔

المملكة العربية السعودية
الرئاسة العامة لرعاية الشباب
نادى المدينة المنورة الادبى

يتشرف نادى المدينة المنورة الادبى بدعوة حضرتكم للاشتراك فى الندوة المفتوحة التى سيقيمها النادى مع صاحب الفضيلة العلامة الداعية الاسلامى الكبير الشيخ وحيد الدين خان / مساء يوم الاحد الموافق ٩-١٠/٦/١٤٠٤هـ بعد صلاة العشاء مباشرة على صالة المحاضرات في مقر النادي بقباء شاكرين لكم حسن استجابتكم وتعاونكم مع النادى ،،،،،،

رئيس نادى المدينة المنورة الادبى

[signature]

محمد هاشم رشيد

۱۱ مارچ کی شام کو نشست ہوئی۔ النادی الادبی کے وسیع صحن میں کرسیاں بچھادی گئیں۔ علماء اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ شریک تھے۔ مقالہ کا عنوان تھا:

الاسلام فی القرن العشرین

تلاوت قرآن کے بعد النادی الادبی کے رئیس دکتور محمد ہاشم رشید نے مفصل طور پر راقم الحروف کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے الاسلام یتحدی پڑھی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک منفرد کتاب ہے اور میری دعا ہے کہ مصنف اسی انداز کی اور کتابیں لکھیں۔

اس کے بعد میں نے عربی مقالہ پڑھ کر سنایا۔ آخر میں اعلان کیا گیا کہ مقالہ سے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہو تو وہ بتائیں۔ مقالہ نگار اس کا جواب دیں گے۔ مگر کسی نے کوئی سوال پیش نہیں کیا۔ البتہ دو آدمیوں نے مقالہ کے اعتراف پر تقریر کی۔ ایک صاحب نے کہا کہ مقالہ اتنا اعلیٰ اور اتنا مکمل تھا کہ ہم کوئی چیز نہیں پاتے کہ سوال کر سکیں۔ بس خدا سے دعا ہے کہ وہ مصنف کو صحت کے ساتھ بہت دن تک زندہ رکھے اور وہ بار بار مدینہ آئیں تاکہ ہم ان سے استفادہ کر سکیں۔

ہندستان واپس آتے ہوئے ہوائی جہاز میں ہم کو جو اخبارات مطالعہ کے لئے دئے گئے ان میں جدہ کا سعودی گزٹ (۲۱ مارچ) بھی تھا۔ اس اخبار کے مطالعہ کے دوران اس کے ایک صفحہ پر النادی الادبی کے اجتماع کی رپورٹ نظر سے گذری جو اخبار سے لے کر یہاں نقل کی جاتی ہے:

Indian Scholar Traces Glory of Islam

Sheikh Wahiduddin Khan, a famous Muslim scholar of India, recently delivered a lecture at the Madina Literary Club in which he reviewed the stages through which mankind passed till the appearance of the hight of Islam. Sheikh Wahiduddin also spoke about the great achievements realised by Islam and Muslims for the benefit of the entire human race since the mission of Prophet Muhammad till today. He was invited by the Islamic University, Madina. His lecture was entitled' "Islam and the Twentieth Century." Sheikh Wahiduddin is the authoı of the book "*Al -Islam Yatahadda*" which is currently being studied in various universities and scientific organisations. He is fluent in several languages, has written more than 30 books on Islam and has read more than 10,000 pages of books on Communism and scientific Socialism and has counter-acted them in more than 100 articles. He has worked as the Chief Editor of *Al-Risala* magazine, Delhi and was the President of the Islamic Centre for Research and Call in India. *(Al-Nadwa)*

Saudi Gazette (Jeddah) March 21, 1984

فلسطین کے ایک نوجوان احمد عزام سے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے اردن میں فلسطینی تحریک کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردن میں فلسطینی اتنے طاقت ور تھے کہ اسرائیل ان کے ڈر سے کانپنے لگا تھا (کانت اسرائیل ترجف خوفا)

میں نے پوچھا کہ شاہ حسین نے ابتداءً فلسطینیوں کی کافی مدد کی۔ پھر بعد کو وہ کیوں ان کے خلاف ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ فلسطینیوں کی قوت شاہ حسین کی قوت پر غالب آگئی تھی۔ (قوتها تغلبت علی قوۃ الملك حسین) اس بنا پر شاہ حسین نے ان کو مار کر اردن سے نکال دیا۔ کیسی عجیب بات ہے، اسرائیل اور شاہ حسین جس قوت سے کانپ رہے تھے وہی قوت اپنے کمزور حریفوں سے مغلوب ہو کر رہ گئی۔

فلسطینی تحریک کے موجودہ مرحلہ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ——— بدأ فی فلسطین المحتلة ظاهرة العودة الی الاسلام من جدید ویظهر ذالك من خلال الالتزام التام لمعظم الشباب الفلسطینیین ولذالك اری بان المستقبل هو مستقبل الجهاد۔ لان الناس قد اقتنعوا بان الثورات الوطنیة لن تحقق شیئ۔ وان الجهاد هو الکفیل بتحریر فلسطین انشاء الله

یعنی مقبوضہ فلسطین میں اسلام کی طرف واپسی دوبارہ شروع ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ فلسطینی نوجوانوں کی اکثریت کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اور اس بنا پر میرا خیال ہے کہ فلسطین کا مستقبل جہاد کا مستقبل ہے۔ کیوں کہ لوگوں نے جان لیا ہے کہ وطنی جدوجہد سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ اور جہاد ہی فلسطین کی آزادی کی ضمانت ہے انشاء اللہ۔

موجودہ زمانہ میں "دور اسلام کا آغاز" کی حقیقت بس وہی ہے جو اوپر کے واقعہ میں نظر آتی ہے۔ لوگوں کا اصل مقصد بدستور قومی اور وطنی جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد میں قومی اور وطنی نعرے لگانے سے کامیابی نہ ہو سکی۔ اب ان کی مایوسانہ نفسیات نے اسلامی نعرے میں اپنے لئے نئی پناہ تلاش کر لی ہے۔

کچھ قائدین اسلام سے ایک مخصوص گروہ کے بارے میں گفتگو تھی۔ انھوں نے اس گروہ کی ظلم و زیادتی کا ذکر کیا اور ان کے بارہ میں سخت الفاظ استعمال کئے۔ میں نے کہا کہ ——— اللہ انھیں ہدایت دے۔ انھوں نے غصہ میں آکر کہا: ان الله لا یهدی القوم الکافرین. ان الله لا یهدی القوم الظلمین

ہمارے پر جوش قائدین عموماً ایسے موقع پر اس طرح کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اپنی روش کی تائید میں وہ قرآن کی محکم دلیل پیش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ یہ سراسر غیر قرآنی بات ہے۔ ان آیات میں کافر اور ظالم سے مراد وہ لوگ نہیں ہیں جن کو ہم بطور خود کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالے۔ اور خدا ان لوگوں کو کافر اور ظالم کے خانہ میں ڈالتا ہے جن پر

اتمام حجت کی حد تک دعوت پہنچائی جائے، پھر بھی وہ کفر اور ظلم کی روش پر قائم رہیں۔

بعض اشخاص نے عالم اسلام کے دینی مدارس کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں اور دوسرے ملکوں میں جو اسلامی ادارے قائم ہیں وہ اپنے اعلان کردہ مقصد کے برعکس نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان اداروں کا نظام جدلی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں سارا زور اساسیات کے بجائے جزئیات پر ہے۔ ان میں سے کسی کا زور اعتقادی اختلافات پر ہے، کسی کا فقہی اختلافات پر اور کسی کا سیاسی اختلافات پر۔ اب چوں کہ جزئیات میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کے ماحول میں جس کی تربیت ہوتی ہے وہ خلافیات کا ماہر ہو کر نکلتا ہے۔

ایک عرب عالم نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھی۔ الدین فی مواجہۃ العلم پڑھی۔ الاسلام والعصر الحدیث پڑھی یہ سب کتابیں مجھے پسند آئیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر رحمت کا دروازہ کھولا ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے آپ کی کتاب ''حکمۃ الدین'' پڑھی تو وہ پسند نہیں آئی۔ اس میں آپ نے الاخوان المسلمین کی سیاست پر تنقید کی ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ دشمنان اسلام ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ہم کو صرف وہی باتیں کرنی چاہئیں جس سے اتفاق پیدا ہو۔

اس قسم کی باتیں اور بھی کئی بار سننے کو ملی ہیں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسا عجیب مطالبہ ہے۔ جن جماعتوں پر میں نے تنقید کی ہے، وہ موجودہ زمانہ میں باہمی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ انھوں نے مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں کے دو طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور دونوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ جاری کر دیا ہے۔ میں تو زیادہ سے زیادہ صرف علمی تنقید کرتا ہوں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اختلاف سے گزر کر مسلمانوں کو باہمی تصادم میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی اختلاف پیدا کرنے کا الزام میرے اوپر ہے۔

تاہم عربوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود کسی آدمی سے محبت کر سکتے ہیں۔ عرب نوجوانوں کی بڑی تعداد اخوانی تحریک سے متاثر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اخوانی تحریک کا ناقد ہوں۔ اس کے باوجود الاسلام یتحدی کی بنیاد پر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ محمد ضیاء الدین ملا جبغی (حلب، شام) اخوانی نوجوان ہیں اور اخوانیوں کے بارہ میں میرے خیالات کو جانتے ہیں۔ مگر وہ نہایت احترام اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملتے رہے۔ وہ دوسری بار آئے تو بتایا کہ میں نے شام میں اپنے والد سے ٹیلیفون پر بات کی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت میں خود نہیں آسکتا۔ تم شیخ وحید الدین کو میرا اسلام کہو اور میری طرف سے ان کے ہاتھ کا بوسہ دو (قبّل یداہ بالنیابۃ عنی)

۱۲ مارچ ۱۹۸۴ کو مسجد نبوی میں فجر کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد نبوی میں ہماری آخری نماز تھی۔ نماز سے فارغ ہوکر جب میں باہر نکل رہا تھا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: خدایا یہ وہ مقام ہے جہاں تیرے پیغمبر نے نمازیں پڑھی ہیں۔ جہاں پیغمبر کے اصحاب کے قدم پڑے ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی مجلسیں قائم ہوئی ہیں جن کو تو نے جنت کی بشارت دی ہے۔ خدایا مجھے بھی اس مجلس میں شریک ہونے والوں میں شامل فرما۔ خدایا، جس طرح تو نے انھیں بخشا اسی طرح مجھے بھی اپنی رحمت سے بخش دے۔

۱۲ مارچ کی دوپہر کو، ہم مدینہ سے ریاض پہنچے۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۸۴ میں الجامعۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مدینہ (سعودی عرب) کا سفر ہوا۔ وہاں ایک ہفتہ کے لئے راقم الحروف کے لکچروں کا پروگرام تھا (اس کی تفصیل الگ سفرنامہ میں ملاحظہ فرمائیں) مدینہ سے واپسی میں میں اپنے ساتھی کے ہمراہ ۱۲ مارچ کی دوپہر کو ریاض پہنچا۔ ریاض قدیم زمانہ میں ایک گاؤں تھا جس کا نام حجر الیمامہ تھا۔ شہر میں گھومتے ہوئے اب بھی کہیں کہیں کچی اینٹوں کی دیواروں کی صورت میں قدیم بستی کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم آج کا ریاض پورے معنوں میں ایک جدید شہر ہے جو سعودی عرب کا دارالسلطنت ہے۔

ریاض میں پہاڑ دکھائی نہیں دیتے۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا اور منصوبہ بند شہر ہے۔ اس کا بیشتر حصہ صحرا میں بسایا گیا ہے۔ تشجیر الشوارع کی اسکیموں نے صحرا میں خشک سڑکوں کو ہرا بھرا کر رکھا ہے۔ سڑکیں عام طور پر نہایت عمدہ اور بے حد کشادہ ہیں۔ تاہم یہ شہر ابھی "زیر تعمیر" مرحلہ میں ہے۔ چنانچہ ہر طرف توڑنے اور بنانے کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

۱۴ مارچ ۱۹۸۴ کو سعودی عرب کے سب سے بڑے عالم شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو ٹیلی فون پر بتایا گیا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ "شیخ سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آج دوپہر کا کھانا وہ میرے ساتھ کھائیں"۔ چنانچہ ہم لوگ ظہر کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچے۔

یہ غیر معمولی طور پر ایک بہت بڑا مکان تھا۔ ایک نہایت وسیع ہال میں نشست تھی۔ تقریباً بیس علماء کرسیوں پر موجود تھے۔ مجھ کو شیخ ابن باز کی بالکل قریبی کرسی پر بٹھایا گیا۔ اس کے بعد حسب معمول قہوہ آیا۔ آدمی نے پہلی پیالی شیخ ابن باز کی طرف بڑھائی۔ شیخ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: فَضّل یا شیخ

شیخ ابن باز نہایت عزت اور محبت کے ساتھ پیش آئے۔ زیادہ تر مسلم دنیا اور میرے کام کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ کھانا کھانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

ریاض سے روانگی کے دن دوبارہ شیخ ابن باز سے ان کے دفتر میں ملنے گیا۔ شیخ کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ وہ حکومت کا سکریٹریٹ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ ایک بہت بڑے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر نشست تھی۔ وہ عام طور پر لوگوں کو بیٹھے بیٹھے رخصت کر رہے تھے۔ مگر جب میں سامنے آیا تو شیخ فوراً کھڑے ہوئے اور دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ مجھ کو رخصت کیا۔

۱۴ مارچ کو دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی سے ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہ سعودی عرب کی سب سے بڑی یونی ورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے مدیر (Rector) ہیں۔ ان کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ خود ایک یونی ورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ ملاقات کا کمرہ ہندستان کے وزیر اعظم کے کمرہ سے بھی زیادہ وسیع اور شاندار نظر آیا۔ تاہم اس کے اندر جو انسان بیٹھا ہوا تھا وہ سراپا تواضع اور سنجیدگی کی تصویر معلوم ہوتا تھا۔

زیادہ تر ہندستان کے حالات اور اسلامی مرکز (دہلی) کے بارے میں گفتگو رہی۔ آخر میں وہ نماز ظہر کے لئے اٹھے۔ میں یہ سمجھا کہ وہ عقبی کمرہ میں نماز ادا کرنے کے لئے جارہے ہیں۔ مگر وہ ہمارے ساتھ بیرونی دروازہ کی طرف چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ زینہ سے اتر کر قریب کی مسجد میں پہنچے جو مدیر کے دفتر سے متصل بنائی گئی ہے۔ یہاں کافی لوگ نماز کے لئے جمع تھے۔ دکتور ترکی چلتے رہے یہاں تک کہ وہ امام کی جگہ پہنچ گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ جو شخص یونی ورسٹی کا ریکٹر ہے وہ یہاں کی مسجد کا امام بھی ہے۔

دکتور عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی نے ایک بڑی عرب شخصیت سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ——— الشیخ وحید الدین، مدیر المرکز الاسلامی فی الهند، هو معروف لدینا بنشاطه وصدق سعیه۔

سعودی عرب میں دو لاکھ سے زیادہ ہندستانی ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان، اور عیسائی سب شامل ہیں۔ ریاض میں بھی ان کی کافی تعداد ہے۔ ریاض کے زمانۂ قیام میں بعض ہندستانی دوستوں کی خواہش ہوئی کہ ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا کھایا جائے۔ اس موقع پر ہندستانی دوستوں کی ایک تعداد جمع ہوگئی۔ قرآن کی بعض آیات کی روشنی میں میں نے دین کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی۔

سعودی عرب میں جو ہندستانی مقیم ہیں وہ عام طور پر خوش ہیں۔ یہاں وہ مسائل مطلق نہیں ہیں جو ہندستان جیسے ملکوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ وطن اور خاندان سے دوری کا احساس ہر ایک کو رہتا ہے۔ دوسری بات بچوں کی تعلیم کی ہے۔ اکثر لوگ اس احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ وطن سے دور رہنے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو ویسی تعلیم نہیں دلا پاتے جیسا وہ چاہتے ہیں۔

دکتور عبد الحلیم عویس جامعۃ الامام میں علوم اجتماعیہ (Social Sciences) کے پروفیسر ہیں۔ ان سے بڑی دلچسپ اور مفید ملاقاتیں رہیں۔ ایک گفتگو میں انھوں نے بڑی عمدہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ انسان مال بناتا ہے مگر مال انسان نہیں بناتا۔ (الانسان یصنع المال ولکنّ المال لا یصنع الانسان)

دکتور عبدالحلیم عویس مصری ہیں اور نہایت ذہین ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کئی مصریوں نے اردو پڑھی ہے اور وہ اردو اتنی ہی اچھی جانتے ہیں جتنا کہ اہل زبان (ھم یجیدون الاردیۃ کاھلھا) ان میں سے تین مصری اس وقت جاپان میں ہیں۔ دکتور عبدالحلیم عویس نے اخبار الشرق الاوسط کے لئے میرا انٹرویو لیا۔

ریاض میں ایک سعودی نوجوان عبداللہ الشویعر سے ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔ ان کے پاس میری تمام عربی کتابیں کئی کئی تعداد میں موجود ہیں۔ وہ خود پڑھنے کے علاوہ دوسروں کو بھی تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ ایک روز گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ واللہ ہم آپ سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرتے ہیں۔ ہم کو تمام اسلامی مصنفین سے محبت ہے اور آپ اس میں چوٹی پر ہیں (و انتم علیٰ قِمَّتِها)

ساحل العاج کے ایک نوجوان ابوبکر السماسی سے ملاقات ہوئی۔ وہ یہاں جامعۃ الامام میں کلیۃ الشریعۃ کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج کی آبادی ۹ ملین ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس میں سے ۵۴ فی صد مسلمان ہیں۔ تاہم خود مسلمانوں کا خیال ہے کہ ان کی آبادی ۶۵ فی صد سے کم نہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ صدر حکومت مسلمان ہے اور وزارت میں کئی مسلمان شامل ہیں۔

مذکورہ نوجوان سے میں نے پوچھا کہ ساحل العاج میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مسلمانوں نے یہاں کی یونی ورسٹی میں شاندار مسجد بنالی ہے۔ ٹیلی ویژن پر ہر جمعہ کو اسلامی پروگرام ہوتا ہے۔ ان کو حکومت ہر طرح کی سہولت دیتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر اس کو انھوں نے حکومت کے "تملق" سے تعبیر کیا۔ یہ بھی عجیب ذہن ہے کہ حکومت اگر کچھ کرے تو وہ متملق ہے اور نہ کرے تو ظالم۔

انھوں نے بتایا کہ ساحل العاج میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ ایک مقام پر صرف ایک دن میں چار ہزار آدمی مسلمان ہو گئے۔ میں نے پوچھا کہ کن لوگوں کی کوششوں سے ایسا ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا ——— الفضل یرجع الی اللہ و الی الکتب المترجمۃ الی الفرنسیۃ۔

۱۵ مارچ کو دوپہر کا کھانا شیخ ابوعبدالرحمٰن بن عقیل الظاہری کے یہاں تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے مصنف اور عالم ہیں۔ مگر ہندستان میں اور عرب میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کے علماء بول چال کے موقع پر بھی کتابی زبان بولتے ہیں۔ مگر اکثر عرب علماء لکھتے وقت تو کتابی زبان لکھتے ہیں مگر بولنے کے وقت ان پر عوامی زبان کا اثر آجاتا ہے۔ مثلاً ہمارے میزبان نے ایک موقع پر گھر کے ایک لڑکے سے کہا، ایش تبغون (تم کیا چاہتے ہو) اس طرح کی زبان سمجھنا ان لوگوں کے لئے کسی قدر مشکل ہوتا ہے جو صرف کتابی عربی سے واقف ہیں۔

عرب لوگ قہوہ اور چائے بہت پیتے ہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا تو میں نے چائے پینے سے معذرت کی۔ انھوں نے باصرار چائے کی پیالی دیتے ہوئے کہا: پیجئے یہ ہضم کے عمل میں آسانی پیدا

کرتا ہے (یسھل عملیۃ الھضم انشاء اللہ)

ایک صاحب جو محامی (وکیل) ہیں اور یہاں کھانے میں شریک تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے درمیان بڑے درد کے ساتھ کہا: الناس کلھم یا اخی متعطشون الی الاسلام (میرے بھائی، آج تمام لوگ اسلام کے پیاسے ہیں)

۱۶ مارچ (بروز جمعہ) ڈاکٹر احمد توتونجی کو ٹیلی فون کیا گیا اور میری ریاض میں آمد کا ذکر کیا گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فوراً کہا کہ انا احب الشیخ واحرص علی لقائہ۔ مگر انھوں کہا کہ میں آج ہی دوپہر کو برونی (افریقہ) روانہ ہو رہا ہوں۔ تاہم میں نماز جمعہ کے فوراً بعد شیخ کی قیام گاہ پر آکر ان سے ملاقات کروں گا۔

جمعہ کی نماز ہم لوگوں نے مسجد سلیمانیہ میں ادا کی۔ ایک عرب باصرار اپنے ساتھ وہاں لے گئے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر لوٹے تو دکتور احمد توتونجی یہاں موجود تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بار بار کہتے رہے کہ ہم آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کے کاموں کی ہمارے دل میں بہت قدر ہے۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ ایک خوبصورت قسم کا بند پیکٹ اپنے ساتھ لائے تھے جس پر لکھا ہوا تھا۔

ھدیۃ الی الشیخ وحید الدین خان سلمہ اللہ تعالیٰ ــــــ شیخ احمد توتونجی سے میں نے کہا کہ یہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ آپ کے لئے ہے۔ میں نے کھولا تو اس کے اندر دو ایسی کتابیں تھیں جو عین میرا مطلوب تھیں۔ ایک قرآن کا جیبی نسخہ جو بائبل پیپر پر چھاپا گیا تھا۔ دوسرا حیاۃ الصحابہ (مولانا محمد یوسف کاندھلوی) کی جلدیں دمشق کی چھپی ہوئی۔ مجھے قرآن کے مذکورہ نسخہ کی عرصے سے تلاش تھی۔ اسی طرح حیاۃ الصحابہ کا دمشق میں چھپا ہوا نسخہ بھی میں بہت چاہتا تھا۔ الحمد للہ کہ آج ڈاکٹر توتونجی کے ذریعہ دونوں چیزیں مجھے مل گئیں

دکتور احمد توتونجی آج ہی بیرونی (افریقہ) جارہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے دکتور طٰہٰ جابر العلوانی کو مقرر کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملتے رہیں اور میری جو بھی ضرورت ہو اس میں میری معاونت فرمائیں۔

اصحاب رسول کی زندگیاں اسلام کا زندہ نمونہ ہیں۔ چنانچہ اصحاب رسول کے بارہ میں اسلاف نے کثرت سے کتابیں اور تراجم لکھے ہیں۔ تاہم اس موضوع پر قدیم کتابوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک ایک صحابی کو عنوان بنا کر اس کے تحت ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کیا کہ عملی عنوانات قائم کر کے اس کے تحت صحابہ کے احوال درج کئے۔ یہ ایک بے حد مشکل کام تھا جو

سالہاسال کی محنت کے بعد تمام ہوا۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن حیدر آباد سے چھاپا گیا تھا تاہم اس میں کثرت سے مطبعی غلطیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے دو عرب علماء، شیخ نائف العباس اور شیخ محمد علی دولہ کو یہ توفیق دی کہ وہ پوری کتاب کو دوبارہ تصحیح اور تعلیق کے ساتھ شائع کریں۔ وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے جگہ جگہ جزئی اضافے بھی کئے ہیں (ونضیف الکلام الذی نسبیه المؤلف اثناء النقل) کتاب کا کاغذ، چھپائی اور جلد ہر چیز نہایت عمدہ ہے اور دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ اس کو پڑھنا شروع کر دیں۔

ریاض میں ڈاکٹر عبد الرشید صاحب سے ملاقات بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے ایک بڑی عجیب بات کہی۔ وہ قرآن کے مطالعہ کا بے حد ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قرآن اللہ اور بندہ کے درمیان مقام اتصال (Point of contact) ہے۔ اسی طرح انھوں نے کہا کہ بحیثیت ڈاکٹر جب میں انسان کے جسم کو دیکھتا ہوں تو بس خدا کے کمالات میں ڈوب جاتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ہر وقت خدا کے اختیار میں ہے۔ یہ گویا ایک ریموٹ کنٹرول کا نظام ہے۔ خدا اگر ریموٹ کنٹرول سے ہارٹ بیٹنگ کو روک دے تو ایک لمحہ میں ہمارا وجود ختم ہو جائے ——— جدید دریافتوں نے اسلامی حقیقتوں کی تفہیم کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔

۱۷ مارچ کی شام کو میں نے ریاض سے دہلی ٹیلیفون پر بات کی۔ ریاض اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ ٹیلیفون پر حسب ذیل نمبروں پر انگلی رکھی گئی:

0091 - 11 - 611128

اور ایک منٹ کے اندر دہلی میں ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے رسیور اٹھا کر "ہلو" کہا تو دوسری طرف سے ثانی اثنین کی آواز آئی ——— یہ موجودہ زمانہ کی بہت زیادہ عام سہولت ہے۔ مگر کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اس وقت آدمی اگر خالق کو یاد کرے تو اس کا حال یہ ہوگا کہ بظاہر اگرچہ وہ ٹیلیفون پر کسی آدمی سے بات کرے گا مگر اس کی روح خدا سے ہم کلام ہو رہی ہوگی۔ ٹیلیفونی ربط اس کو خدا سے مربوط کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔

سعودی عرب میں مختلف اخبارات نکلتے ہیں۔ اکثر عرب ملکوں کے اخبارات محض پروپگنڈے والی باتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تاہم سعودی عرب کے اخبارات نسبتاً کافی بہتر نظر آئے۔

یہاں ایک روزنامہ "عرب نیوز" کے نام سے نکلتا ہے جو بیک وقت جدہ اور ریاض سے شائع ہوتا ہے۔ عرب نیوز میں ہر روز آخری صفحہ پر ایک دلچسپ کالم ہوتا ہے۔ ۱۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ (۱۲ مارچ ۱۹۸۴) ایک رپورٹنگ کے ذیل میں حسب ذیل لطیفہ درج تھا۔

لبنان میں ایک چڑیا پائی جاتی ہے جس کو چوہا خور (Mouse eater) کہتے ہیں۔ یہ باز سے کچھ بڑی ہوتی ہے اور عام طور سے بڑے بڑے درختوں کی اوپر کی شاخوں پر بیٹھتی ہے۔

اس چڑیا کے متعلق لبنان میں ایک لطیفہ مشہور ہے۔ صبح کو جب سورج نکلتا ہے تو وہ زمین پر اپنے سایہ کو دیکھتی ہے۔ اس وقت چونکہ اس کو اپنا سایہ بہت بڑا نظر آتا ہے، وہ منصوبہ بناتی ہے کہ آج میں ایک اونٹ کو اپنی خوراک بناؤں گی۔ مگر جیسے جیسے سورج اونچا اٹھتا ہے اس کا سایہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت اس کا سایہ بالکل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس پر قناعت کر لیتی ہے کہ ایک چوہا پکڑ کر اس کو کھالے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ہوا ہے۔ فرضی تصور کے تحت اپنے کو "عظیم" سمجھ کر وہ بڑے بڑے منصوبے بناتے ہیں۔ مگر بالآخر ان کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف ایک "چھوٹا چوہا" ہے۔ اور کبھی چھوٹا چوہا بھی نہیں۔

یہاں کے عربی اخبارات اب کافی ترقی یافتہ ہو چکے ہیں۔ مثلاً وہ ایسی چیزیں چھاپنے کی پوزیشن میں ہو گئے ہیں جو عام طور پر ہمارے اردو اخبارات کی دسترس سے باہر ہوتی ہیں۔

روزنامہ الشرق الاوسط (ریاض) کی اشاعت ۲۸ جنوری ۱۹۸۴ میں ایک مفصل مضمون نظر سے گذرا جس کا عنوان تھا:

وثائق الخارجية البريطانية السرية لعام ۱۹۵۳۔ اس میں سابق برطانی وزیراعظم سر ونسٹن چرچل کے ایک خط کا حوالہ ہے جو ۲۲ اپریل ۱۹۵۳ کو لکھا گیا تھا۔ اس خط کے ایک حصہ کا عربی ترجمہ اخبار میں حسب ذیل الفاظ میں درج تھا:

ان آخر المعلومات السرية المتوفرة تظهر مدى خطورة السماح للامور بالاستمرار على حالها بينما يستخدم محمد نجيب الماناً نازيين لتعليم الجيش المصري والارهابيين التخريب وحرب العصابات	آخری خفیہ اطلاعات بتاتی ہیں کہ یہ کس قدر خطرناک ہوگا کہ حالات کو بدستور جاری رہنے دیا جائے جبکہ محمد نجیب (صدر مصر) نازی جرمنوں کو مصری فوج کی تربیت کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور دہشت پسندوں کو تخریب کاری اور گوریلا جنگ کے لئے تیار کر رہے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۳۰ سال پہلے اسرائیل کے سرپرست عربوں سے کس قدر خوف زدہ تھے۔

روزنامہ الریاض ۲۸ صفحات پر شائع ہوتا ہے۔ اور اس کی قیمت ایک ریال ہوتی ہے۔ اس میں ہر قسم کی معلومات اور ہر طرح کے مضامین ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ تنقیدی خطوط بھی شائع ہوتے ہیں۔ مثلاً الریاض (۱۳ مارچ ۱۹۸۴) میں علی الدویحی الغامدی (جامعۃ ام القریٰ) کا ایک خط نظر سے گذرا۔ جس میں انھوں نے اخبارات کے مواد پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کو پڑھنے والا ان میں ایسی چیز نہیں پاتا جو اس کی عقل کو اکسائے اور سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرے (لایجد القاری فیہا مایثیر عقلہ ومایہدیہ الی الصراط المستقیم)

عربی زبان کا ٹائپ اور اس سے متعلق مشینیں اعلیٰ ترین ترقی کے مقام پر پہنچ چکی ہیں۔ عربی اخبارات اور جرائد اور کتابوں کو دیکھ کر خواہش ہوتی ہے کہ کاش اردو والوں نے بھی ٹائپ اختیار کر لیا ہوتا تو آج اردو زبان بھی "ٹائپ" کے دور میں پہنچ چکی ہوتی جس طرح فارسی زبان ایسا کر کے ٹائپ کے دور میں پہنچ چکی ہے۔ اردو زبان ابھی تک ٹائپ کے دور کے فوائد سے محروم ہے اور غیر ضروری طور پر نستعلیق کا ٹائپ بنانے کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے۔ اردو کے لئے اس علیحدہ تشخص کی ضرورت آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

جن ملکوں میں لوگوں کے پاس دولت آئی ہے ان کے یہاں عجیب عجیب تفریحات اور تعیشات رواج پاگئے ہیں۔ مثلاً خاندانی تقریبات کی فلم تیار کرنا۔ جو لوگ زیادہ دولت مند ہیں ان کے پاس خود اپنی ذاتی مشینیں ہوتی ہیں۔ ورنہ ایسی کمپنیاں ہوتی ہیں جو فلمی تصویر کشی (video shooting) کا انتظام کرتی ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ پاکستان میں ایک شادی کی فلم پانچ ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے لوگ شادی کی تقریب یا دوسری خاندانی تقریبات کی فلم بنا کر رکھ لیتے ہیں اور پھر تفریح کے طور پر اس کو وی۔ سی۔ آر پر دیکھتے ہیں۔

جدید دنیا کے دوسرے شہروں کی طرح عرب شہروں میں چلتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک تمدنی جنگل میں ہیں۔ جہاں یا تو ٹھہرے ہوئے مکانات ہیں یا دوڑتی ہوئی گاڑیاں۔ انسان اپنے آپ سے اور اسی کے ساتھ قدرت سے اپنے کو دور محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید تمدن نے انسان سے اس کی اپنی ذات کو بھی چھین لیا ہے۔ اور اس کے خدا کو بھی۔

روزنامہ المدینۃ (۷ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں دکتور عبداللہ عمر نصیف کا ایک انٹرویو نظر سے گذرا۔ موصوف اس سے پہلے جامعۃ الملک عبدالعزیز (جدہ) میں مدیر تھے۔ اب وہ رابطہ عالم اسلامی کے امین عام ہیں۔ انٹرویو لینے والے نے ان سے جو سوالات کئے ان میں سے ایک سوال دنیا کے مسلمانوں کے بارہ میں

تھا۔ دکتور عبداللہ نصیف نے غم ناک انداز میں کہا:

نحن نری حال المسلمین فی کل مکان وضعهم السیئ۔ امکانیاتهم الضعیفة۔ فقرهم جهلهم۔ انتشار الامراض بینهم

ہم ہر مقام کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا حال برا ہے۔ ان کے وسائل بہت کم ہیں۔ ان میں غریبی اور جہالت ہے۔ ان کے درمیان بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۸ مارچ کی دوپہر کو ہم وزارت داخلہ کے دفتر میں پہنچے۔ عظیم عمارت کی تیسری منزل کے وسیع ہال سے گذرے تو وہاں بڑے بڑے قالین لپیٹے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابھی نماز ظہر ادا کی گئی ہے۔ اسی طرح سعودی مملکت کے تمام دفاتر میں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہے اور تمام کارکنان کے لئے لازم ہے کہ وہاں وقت پر آکر نماز ادا کریں۔

اس کے بعد ہم لوگ نائب وزیر کے دفتر میں داخل ہوئے۔ جدید طرز کے عظیم دفتر میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا جو بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی " مولوی " ہے۔ نائب وزیر موصوف نے انتہائی اکرام کے ساتھ ملاقات کی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم آپ کی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں اور آپ کے بے حد قدردان ہیں۔ انھوں نے اسی وقت وزیر محترم سے ملاقات کے لئے ٹیلیفون کیا۔ وزیر موصوف اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق نماز ظہر سے فارغ ہو کر عوام کی شکایات سن رہے تھے۔ یہ نماز ظہر کے بعد ان کا روزانہ ایک گھنٹہ کا معمول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس عوامی ملاقات میں شیخ وحید الدین سے ملنا مناسب نہیں بہتر ہے کہ کل ان سے باقاعدہ ملاقات ہو۔ چنانچہ کل کا وقت طے ہوا۔

اگلے دن ۱۹ مارچ کو وزیر داخلہ (سعودی مملکت) سے ملاقات ہوئی۔ یہ شہزادہ نائف بن عبدالعزیز ہیں جو موجودہ شاہ فہد کے حقیقی بھائی ہیں۔ جتنا عظیم الشان ان کا دفتر ہے اور ان کے گرد جتنے وسیع انتظامات ہیں اس کے لحاظ سے ہمارا سامنا ایک ایسے شخص سے ہونا چاہئے تھا جو کبر کی تصویر بنا ہوا ہو۔ مگر جب ہم ملے تو ہمارے سامنے ایک ایسا شخص تھا جو سراسر تواضع کا نمونہ دکھائی دیتا تھا۔

گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ شہزادہ مذکور مجھ سے اور میرے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے نہایت توجہ سے ہماری دعوتی باتوں کو سنا۔ اور اس پر اپنی طرف سے آیات اور احادیث کا اضافہ کرتے رہے۔ انھوں نے نہ تو اپنے کارناموں کو بیان کیا اور نہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف جوش و غضب کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ ہم سب کو اللہ توفیق دے کہ اتحاد و اتفاق کے ساتھ دین کا کام کرسکیں۔

سعودی عرب کے ذمہ داروں سے ملاقات کے وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس علاقہ پر خدا کی خاص

نظر ہے۔ شاید یہ خدا کا منصوبہ ہے کہ دین کی قدریں جب دوسری جگہ مٹ رہی ہوں اس وقت بھی وہ یہاں موجود رہیں۔ شاید یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ——— ان الدین لیارز الی الحجاز کما تارز الحیة الی جحرها.

ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر جس طرح یہاں کا اکثریتی فرقہ چھایا ہوا ہے۔ اسی طرح عربوں کے ذہن پر یہودیوں اور عیسائیوں کا مسئلہ چھایا ہوا ہے۔ روزنامہ المدینہ (۱۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ) میں ایک مضمون (صفحہ ۹) نظر سے گذرا۔ مضمون نگار اس میں مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

ولم یکن الاستعمار فی العصر الحدیث اقل شراسة من الحروب الصلیبیة. فلا فرق بینه وبین الحروب الصلیبیة الا فی اختلاف الوسیلة. فاذا کانت وسیلة الحرب الصلیبیة هی القهر العسکری فان وسیلة الاستعمار الحدیث هی محو شخصیة الشعب والقضاء علی مقوماتها الاساسیة من عقیدة ولغة وتقالید.

موجودہ زمانہ کا استعمار صلیبی جنگوں سے کم برا نہیں ہے۔ اس میں اور صلیبی جنگوں میں کوئی فرق نہیں سوا وسائل کے فرق کے۔ صلیبی جنگوں کا وسیلہ اگر فوجی تھا تو جدید استعمار کا وسیلہ قوم کے تشخص کو مٹانا اور ان کی ان بنیادی قدروں کو ختم کرنا ہے جو عقیدہ اور زبان اور روایات سے تعلق رکھتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صلیبی قومیں اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں سے واپس لینے کے جذبہ کے تحت اٹھی تھیں۔ جب کہ موجودہ زمانہ کا استعمار نئی قوتوں کے زور پر ابھرا۔ مسلمانوں نے چوں کہ دونوں کو ایک سمجھا اس لئے انھوں نے جدید "استعمار" کے مقابلہ میں صرف منفی ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ قدیم صلیبی حملوں کی طرح وہ ان کے خلاف لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اگر وہ "استعمار" کی حقیقت کو صحیح طور پر سمجھتے تو ان کو نظر آتا کہ وہ صرف استعمار نہیں ہے بلکہ وہ جدید امکانات کا ہراول بھی ہے، دعوت اسلامی کے اعتبار سے بھی اور دنیوی ترقی کے اعتبار سے بھی۔

۱۸ مارچ کو ہم موسسة الملک فیصل الخیریہ (ریاض) میں گئے۔ اس کی عمارت اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کو دیکھ کر شاہی محل کا گمان ہوتا ہے۔ اس ادارہ کی بہت سی دینی اور تعمیری سرگرمیاں ہیں جن میں سے ایک فیصل انعام بھی ہے جو پانچ قسم کے میدان میں کام کرنے والوں کو امتیاز کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ اس کے تحت ایک ذیلی ادارہ بھی ہے جس کا نام مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیہ ہے۔

۱۸ مارچ کی شام کو ریاض ٹیلیوژن پر دو انٹرویو ہوئے۔ دونوں آدھ آدھ گھنٹہ کے تھے۔ جب میں اپنے ساتھی دکتور محمد مانع الجھنی (الامین العام المساعد للندوہ العالمیہ للشباب الاسلامی) کے ساتھ ٹیلی وژن سنٹر پر پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں " ریاض " میں نہیں ہوں بلکہ امریکہ کے کسی انتہائی جدید قسم کے عالیشان دفتر میں ہوں۔ یہ مغرب کا وقت تھا۔ دکتور مانع الجھنی نے کہا کہ ہم لوگ پہلے نماز پڑھ لیں۔ اس کے بعد ہم پہلی منزل کے ایک بڑے ہال میں داخل ہوتے تو یہاں مصلّے بچھا ہوا تھا اور بالکل مسجد کا منظر تھا۔ امریکی طرز کی عمارت میں اسلامی طرز کا عبادت خانہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

انٹرویو انگریزی میں تھا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ دکتور محمد مانع الجھنی سوال کرتے تھے اور میں اس کا جواب دیتا تھا۔ پہلا انٹرویو زیادہ تر میرے بارہ میں اور المرکز الاسلامی کے بارہ میں اور ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں تھا۔ دوسرا انٹرویو زیادہ تر الاسلام یتحدی کے بارہ میں اور جدید چیلنج اور اسلام کی طرف سے اس کے جواب کے بارہ میں تھا۔

۱۹ مارچ کی شام کو ہم ریاض سے جدّہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جہاز (۴۷) جدہ ہوتے ہوئے لندن جارہا تھا۔ جہاز کی روانگی کے ساتھ اعلانات شروع ہوئے۔ سعودی ایئرلائنز شاید واحد ایئرلائنز ہے جس کے اعلانات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور باذن اللہ تعالیٰ جیسے الفاظ کے ساتھ مسافر کے کانوں میں پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد خالص عرب لہجہ میں قرآن کی آیات اور سفر کی دعا سنائی گئی۔

۲۰ مارچ کی صبح کو ہم جدہ میں تھے۔ دکتور عبداللہ عمر نصیف سے ٹیلی فون پر وقت لیا گیا تھا اور انھوں نے مکہ میں ۱۱ بجے دن کا وقت دیا تھا۔ مگر ہم لوگ جدہ میں دیر سے پہنچے اور بظاہر ممکن معلوم نہیں ہوا کہ ہم لوگ وقت پر مکہ پہنچ کر ان سے مل سکیں گے۔ میں نے جناب حامد الدین صاحب (جامعہ عبدالملک عبدالعزیز) سے کہا تو انھوں نے کہا کہ وہ اس وقت اپنے مکان پر ہوں گے۔ اس لئے ابھی ان سے ٹیلی فون کرکے دوسرا وقت مقرر کر لیا جائے۔ یہ نماز فجر کے بعد کا وقت تھا۔ حامد الدین صاحب نے ٹیلی فون ملایا تو السلام علیکم کے بعد پہلا جملہ یہ کہا: I hope I did not disturb you.

(ڈاکٹر صاحب، مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کو خلل نہیں ڈالا ہوگا) میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ انداز خطاب تعلیم سے آتا ہے۔ اگر قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا جائے تو قوم کے تمام مسائل اپنے آپ ختم ہو جائیں۔ کیوں کہ تعلیم قوم کے افراد کو مہذب بھی بناتی ہے اور باشعور بھی۔

اس کے مطابق شام کو نماز عصر کے بعد دکتور عبداللہ نصیف سے ان کی قیام گاہ (جدہ) پر ملاقات ہوئی۔ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور اسلامی مرکز کی سرگرمیوں کے بارہ میں معلومات کرتے رہے۔ انھوں نے خواہش

ظاہر کی کہ ہندستان کے اگلے سفر کے موقع پر اسلامی مرکز کی بھی زیارت کریں۔

جدہ میں ہم نے سرکاری مہمان بننے کے بجائے جناب محمد رفیق قریشی کی میز بانی کو پسند کیا۔ اس کی وجہ سے یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات کا موقع ملا۔

دکتور احمد محمد علی سے ملاقات ہوئی جو اسلامک ڈوپلمنٹ بنک کے صدر رہیں۔ مختلف ملاقاتوں کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ راقم الحروف نے جو آواز بیس سال پہلے بلند کرنا شروع کیا تھا اس کی اہمیت اب عام طور پر محسوس کی جانے لگی ہے۔ اب سوچنے سمجھنے والا طبقہ عام طور تسلیم کرتا ہے کہ دعوت اسلامی کا کام قومی اور سیاسی جھگڑوں سے الگ ہو کر کرنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جو بات پچھلے برسوں میں اجنبی بنی ہوئی تھی۔ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب کہ وہی تمام لوگوں کی بات ہوگی۔

۲۱ مارچ کی صبح کو ہم مولانا عبدالوحید ندوی کے ساتھ عمرہ کرنے کے لئے مکہ پہنچے۔ طواف کعبہ کے دوران بھیڑ نہیں تھی، اس لئے حجر اسود تک پہنچنے کا موقع بھی آسانی سے مل گیا۔ حجر اسود ایک بڑے پیالہ کے مانند نظر آیا۔ عمرہ گویا چھوٹا حج ہے۔ کعبہ کے گرد گھومتے ہوئے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے جو احساسات ایک مومن پر طاری ہوتے ہیں ان کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ایک سفر

مارچ ۱۹۸۴ میں میں سعودی عرب میں تھا۔ اس سفر کی تفصیلات پچھلے سفرنامہ میں آچکی ہیں۔ اس سفر کے دوران ریاض میں مجھے شارجہ سے دکتور سالم کا ٹیلی فون ملا۔ انھوں نے اصرار کے ساتھ تجویز پیش کی کہ سعودی عرب کے بعد میں شارجہ کا سفر کروں۔ ان کی دعوت پر شارجہ (عرب امارات) کا سفر ہوا۔

۲۱ مارچ ۱۹۸۴ کو ہم جدّہ سے دوبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ سفر سعودی ایرلائنز کے ذریعہ ہوا۔ ہمارا ٹکٹ ابتداءً جدہ سے دہلی کے لیے تھا۔ ہم نے چاہا کہ اس کو بدل کر جدّہ۔ دوبئی دہلی کرالیں۔ مگر ہوائی کمپنیوں کے سخت قوانین کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا۔ دکتور سالم نے خود براہِ راست کوشش کی۔ مگر ہوائی کمپنی کسی بھی طرح روٹ میں تبدیلی پر راضی نہ ہوئی۔ آخر کار دکتور سالم نے اپنی طرف سے نیا ٹکٹ بھیجا، اس کے ذریعہ سے جدّہ سے دوبئی کا سفر طے ہوا۔

۲۱ مارچ کی شام کو ہم جدہ سے دوبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز میں مجھے سردی کا احساس ہوا تو اوپر کا خانہ کھولا کہ اس میں سے کمبل نکال کر پیروں پر ڈال لوں۔ مگر وہاں صرف تکیہ رکھا ہوا تھا۔ مجھ کو ٹٹولتے ہوئے دیکھ کر جہاز کا ایک کارکن قریب آیا اور بولا:

Can I help you.

(کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں) اردو میں اسی بات کو کہنا ہو تو آدمی کہے گا "آپ کو کیا چیز چاہیے"۔ زبان کا یہ اسلوب دونوں زبان کے بولنے والوں کے مزاج میں بھی منتقل ہوا ہے جس کا مظاہرہ مختلف عملی پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔

۲۰ مارچ کی شام کو ہمارا جہاز دوبئی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ جیسے ہی میں ہوائی جہاز کی سیڑھی سے نیچے اترا، ہوائی اڈہ کا ایک افسر میرے قریب آیا اور سوالیہ انداز میں کہا: "الشیخ وحید الدین" میں نے کہا نعم۔ اس نے مرحبا کہا اور کہا کہ دکتور سالم عبد اللہ المحمود باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر ہوائی اڈہ کی عمارت میں داخل ہوا تو دوبارہ ہوائی اڈہ کے ایک ذمہ دار آگے بڑھے اور مذکورہ سوال کیا۔ اور پھر ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ یہاں تک کہ ہم کو باہر پہنچا دیا جہاں لوگ ہمارے منتظر تھے۔

بسم الله ا

يلقي الكاتب والمفكر الا

مجاض

الإسلام في مو

يوم الخميس بعد ص

١٩ / جمادى الثانية ١٤٠٤هـ

وذلك بمقر

عبدالله بن علي ال

الكائن بالشارقة - ...

والدعو

ن الرحيم

لامي الشيخ وحيد الدين خان

بعنوان

جهة التحديات العصرية

ة العشاء مباشرة

لوافق ٢٢/ ٣/ ١٩٨٤م

كتبة الشيخ

محمود «رحمه الله»

ب دائرة المرور

عامة

دکتور سالم عبداللہ المحمود شارجہ کے ممتاز ترین ڈاکٹر ہیں۔ ان کے والد الشیخ عبداللہ بن علی المحمود شارجہ کے ایک انتہائی ممتاز شخص تھے۔ یہاں ان کا مکان بجائے خود ایک محل معلوم ہوتا ہے۔ شارجہ میں ہماری آمد ڈاکٹر سالم عبداللہ المحمود کی دعوت پر ہوئی ہے۔ انھوں نے غیر معمولی کوشش کی۔ ہمارے سعودی مملکت میں قیام کے دوران ان کے درجنوں ٹیلی فون آتے رہے۔ یہاں کے سفر میں ہمارے لئے مختلف قسم کی شدید رکاوٹیں حائل تھیں مگر انھوں نے اپنے اثر ورسوخ سے ان تمام رکاوٹوں کو حل کیا۔ یہاں تک کہ شارجہ میں ہمارا داخلہ ممکن ہو سکا۔

شارجہ کا ہوائی اڈہ الگ ہے۔ تاہم ہم دوبئ کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ یہاں سے شارجہ ۱۵-۲۰ منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ دوبئ ہوائی اڈہ سے چلے تو دوبئ شہر کے مناظر سامنے تھے۔ اس کی شہری پلاننگ نہایت اعلیٰ ہے۔ غالباً تمام عرب ملکوں میں دوبئ اس اعتبار سے نمبر ایک پر ہے۔ اس کی غیر معمولی طور پر پر رونق دنیا سے گزرتے ہوئے میرے دل نے کہا:

پٹرول کے کرشموں کا یہ حال ہے تو پٹرول کے خالق کے کرشموں کا کیا حال ہوگا۔
عمل کثیف کی امکانیات اتنی زیادہ ہیں تو عمل لطیف کی امکانیات کتنی زیادہ ہوں گی۔

ہماری گاڑی ایک وسیع مکان کے سامنے رکی جو یہاں کی اہم ترین سڑک کے کنارے ہے۔ یہ "مکتبۃ الشیخ عبداللہ بن علی المحمود" کی عمارت تھی۔ یہ شارقہ (شارجہ) کا سب سے زیادہ سرسبز اور صاف ستھرا علاقہ ہے یہاں بڑے بڑے شیوخ رہتے ہیں۔ سڑکیں نہایت چکنی اور صاف ستھری ہیں۔ اور ان کے دونوں طرف یک منزلہ یا دو منزلہ مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔

اسی مکتبہ (لائبریری) کی وسیع عمارت میں میرا قیام تھا۔ اور اس کے وسیع ہال میں تقریر کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ عمارت کے باہر ایک بڑا سا خوبصورت بورڈ نظر آیا جس پر پروگرام کی تفصیل درج تھی۔ اس مضمون کا پوسٹر تیار کر کے پوری عرب امارات میں پھیلا دیا گیا تھا۔ پوسٹر کا مختصر عکس علاحدہ صفحہ پر درج کیا جا رہا ہے۔

۲۳ مارچ کی شام کو نماز عشاء کے بعد پروگرام تھا۔ لائبریری کا وسیع ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ بازو کے بڑے کمرے میں بھی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ٹیلیوژن Closed-circuit television کے ذریعہ آواز اور تصویر پہنچانے کا انتظام تھا۔ تاہم کرسیاں ناکافی ثابت ہوئیں اور کثرت سے لوگ کھڑے ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ پورے عرب امارات سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ صرف میری تقریر سننے کے لئے آیا تھا۔ لائبریری کے ایک کارکن نے بتایا کہ یہاں اکثر اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے

صرف ایک بار لوگ جمع ہوئے تھے جب کہ لائبریری کا افتتاح تھا اور سلطان شارقہ خود اس کا افتتاح کرنے لئے تشریف لائے تھے۔

ابتدائی کارروائی کے بعد میں نے عربی مقالہ "الاسلام والتحدیات العصریۃ" پڑھ کر سنایا۔ لوگ انتہائی خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ مقالہ سے لوگوں کی غیر معمولی دل چسپی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ مقالہ ختم ہونے کے بعد بڑی تعداد میں لوگ ہال میں ٹھہرے رہے اور دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ لوگ موضوع کے بارہ میں مزید تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس موضوع پر میں انشاء اللہ ایک جامع کتاب تیار کر رہا ہوں جس کا انگریزی نام God Arises ہوگا۔

اجتماع کے بیشتر شرکا بے حد خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ مقالہ کو سنتے رہے اور مقالہ سننے کے بعد غور و فکر میں ڈوبے ہوئے نظر آئے۔ مگر چند لوگ جن کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا اور جو سیاسی اسلام کے بارہ میں میری تنقیدوں سے برہم ہیں وہ غیر متعلق سوالات کر کے فضا کو برہم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے سوالات زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق اصل موضوع سے نہ تھا بلکہ میری ذات کو مطعون کرنا تھا۔ مثلاً آپ نے جہاد کو ساقط کر دیا ہے۔ آپ حدیث کی حجیت کے منکر ہیں۔ آپ اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ آپ قادیانیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ظالموں کی حمایت کرتے ہیں۔ وغیرہ

اجتماع کے عام شرکا کو ان سوالات سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ چند آدمی (خاص طور غالباً دو آدمی) اس سلسلے میں بہت پیش پیش تھے۔ میں نے ابتداءً مختصر جوابات دئے مگر ان کی تیزی اور شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ بہت زور زور سے بولنے لگے۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا کہ اسلامی اصول کے مطابق ان سے اعراض کرنا چاہئے۔ چنانچہ میں نے مائک پر حسب ذیل الفاظ کہے اور پھر خاموش ہو گیا:

عفواً یا اخی، لا فائدۃ فی مثل هذه الاسئلة والاجوبة۔ لان هذه الاسئلة ليست اسئلة بل هي كلها جدال۔ ونبينا صلى الله عليه وسلم قد نهانا عن الجدال۔ واني لا اقول الا ما قال المومنون الاولون عن المجادلين، سلام عليكم، لانجاهلكم۔ لنا ما نحن عليه ولكم ما انتم عليه (یہ آخری قول نجران کے ان مومنین کا تھا جن کا ذکر قرآن کی سورۃ القصص، آیت ۵۵ میں آیا ہے)۔

۲۵ مارچ کی صبح کو محمد رضی نے انٹرویو لیا۔ وہ ایک مصری نوجوان ہیں۔ اور یہاں ماہنامہ الاصلاح (دبئی) سے وابستہ ہیں۔ انٹرویو میں میری ذات سے متعلق سوالات، المرکز الاسلامی کے مقاصد اور سرگرمیاں اور ہندستان اور عالم اسلام کے حالات کے بارہ میں سوالات تھے۔ انٹرویو تقریباً

ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

نماز ظہر کے فوراً بعد ہم لوگ الشیخ علی الحویتی (رئیس المحکمۃ الشرعیۃ) کی دعوت پر ان کے مکان کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ شارقہ (خاص) سے ۸۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر زید میں رہتے ہیں۔ زید یہاں کا نہایت سرسبز اور شاداب علاقہ ہے۔ یہاں شیخ کا وسیع مکان ہے اور اس سے متعلق دور تک پھیلے ہوئے ان کے باغات ہیں۔ جن میں کھجور کے درخت ہیں اور مختلف قسم کی زراعت ہوتی ہے۔

زید جاتے ہوئے طویل فاصلہ صحرا میں طے کرنا پڑا۔ نہایت عمدہ بنی ہوئی سڑک کے دونوں طرف ریتیلے صحرا ہیں جن میں جھاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہ صحرا قدیم ترین زمانہ سے بظاہر "بے قیمت" پڑے ہوئے تھے۔ مگر ان صحراؤں کے نیچے ایک ایسی چیز دفن تھی جو ہر دوسری چیز کی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ظاہر ہو کر قیمت ادا کی اور آج انھیں صحراؤں میں شاندار شہر آباد نظر آتے ہیں۔

صحرا میں دور آگ کے بہت بڑے بڑے شعلے جلتے ہوئے نظر آئے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ گیس کے فضلات ہیں جو جل رہے ہیں۔ گیس کے یہ فضلات انتہائی قیمتی ہیں۔ ان سے ہزاروں چیزیں بنتی ہیں۔ انھیں سے وہ کوکنگ گیس بنتی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے ہندستان میں ایک آدمی کو کئی کئی سال تک لائن لگانی پڑتی ہے۔ مگر خلیجی ممالک میں اکثر یہ قیمتی چیز پھینک دی جاتی ہے اور جلتی رہتی ہے۔ اگر ان کو استعمال میں لایا جائے (جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک ان کو استعمال میں لا رہے ہیں) تو وہ دولت کا عظیم الشان خزانہ بن جائے۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۴ کو شارقہ میں ایک بڑے شیخ کے یہاں ایک خصوصی نشست تھی۔ اتنے میں ہندستان کے ایک مسلم قائد وسیع کمرہ میں داخل ہوئے۔ ملاقات کے بعد انھوں نے کچھ چھپے ہوئے کاغذات عرب شیوخ کے درمیان تقسیم کرنے شروع کئے۔ میں نے دیکھا تو اس میں ہندستان کے مسلمانوں پر حکومت کے "مظالم" کے خلاف چیخ پکار تھی۔ گفتگو کے دوران قائد موصوف نے کہا :

"ہندستان میں اسلام آزاد نہیں ہے۔ مسجد کے اندر بھی سجدہ کی آزادی نہیں"

یہ سن کر ایک عرب شیخ نے کہا : ہم نے کئی بار ہندستان کی زیارت کی ہے۔ اور وہاں مختلف مقامات پر مسجدوں کے اندر نمازیں پڑھی ہیں۔ ہم نے تو نہیں دیکھا کہ وہاں مسجدوں میں سجدہ کرنے کی "آزادی نہ ہو"

اس موقع پر قائد موصوف نے ایک "پریس اسٹیٹمنٹ" تقسیم کیا جس کے چھ نکات میں سے ایک نکتہ یہ تھا :

A urinal was constructed at the tomb of famous Urdu poet Zauq

۲۶ مارچ ۱۹۸۴ کی صبح کو ہم برٹش ایرویز (۱۴۷) کے ذریعہ دہلی واپس پہنچے۔

ایک سفر

المعہد العلمی للفکر الاسلامی (International Institute of Islamic Thought)
مختلف ملکوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کا ایک ادارہ ہے جس کا مرکزی دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اس ادارہ کے ٹرسٹیوں کا ایک بورڈ ہے جس میں حسب ذیل افراد شامل ہیں:

ڈاکٹر عبد الحمید سلیمان، صدر
ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، ڈائرکٹر
ڈاکٹر طٰہ جابر العلوانی ممبر
ڈاکٹر جمال البرزنجی ممبر
ڈاکٹر انور ابراہیم (وزیر زراعت ملیشیا) ممبر

اس ادارہ کا مقصد اس کے الفاظ میں اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of knowledge) ہے۔
اس کے تحت اس کا تیسرا انٹرنیشنل سمینار جولائی ۱۹۸۴ میں کوالالمپور میں ہوا۔ اس سمینار کو منظم کرنے والا مذکورہ ادارہ تھا۔ اور اس کی میزبانی کے فرائض حکومت ملیشیا کی وزارت ثقافت نے انجام دئے۔ راقم الحروف کو اس سمینار میں مقالہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کوالالمپور کا سفر ہوا۔ اس اجتماع میں ملیشیا کے علاوہ دوسرے مختلف ملکوں کے تقریباً پچاس افراد شریک ہوئے۔ یہ سب کے سب اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ اجتماع کی کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا کوئی بین اقوامی اجتماع ہو تو اس کے شرکاء کی اکثریت کے لئے، کم از کم اب تک، سب سے زیادہ قابل فہم زبان انگریزی ہی ہوتی ہے۔

میرے سفر کا راستہ یہ تھا: دہلی۔ بینکاک، کوالالمپور۔ بینکاک۔ دہلی۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۴ کو واشنگٹن (امریکہ) میں ٹکٹ خریدا گیا۔ اور پورے سفر کا رزرویشن "اوکے" ہو کر ۱۷ جولائی کو تھائی ایرویز (نئی دہلی) کی معرفت مجھے اپنے دفتر میں وصول ہوگیا۔ اس کے بعد ۲۳ جولائی کو جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو اسی دن دوپہر کے وقت میں کوالالمپور پہنچ چکا تھا۔

موجودہ زمانہ میں دور دراز ملکوں میں سفر کتنا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ خدا نے یہ آسانیاں اس لئے پیدا کی تھیں کہ پیغمبر آخر الزماں کے امتی ان کو استعمال کرکے خدا کے دین کی دعوت ساری دنیا میں پہنچا دیں۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے ان سہولیات کو اپنی بے نتیجہ سیاست

کے لئے توخوب استعمال کیا مگر وہ اسے اللہ کے پیغام کو اہل عالم تک پہنچانے کے لئے استعمال نہ کرسکے۔

یہ عملی غفلت اب فکری غفلت تک جا پہنچی ہے۔ چنانچہ اب یہ حال ہے کہ اگر ان کو اس فریضہ کی طرف توجہ دلائی جائے تو کوئی کہے گا کہ تم مسلمانوں کو جہاد کے محاذ سے ہٹانا چاہتے ہو۔ کسی کا جواب یہ ہوگا کہ ابھی تو مسلمانوں کا اپنا وجود خطرہ میں ہے پھر وہ کوئی دوسرا کام کس طرح کرسکتے ہیں۔ کسی کو کہنے کے لئے یہ الفاظ مل جائیں گے کہ پہلے مسلمانوں کی اصلاح کر لیجئے اس کے بعد دوسروں کی اصلاح کی فکر کیجئے۔

قدیم زمانہ میں مسلمانوں کے اندر دعوت کا جذبہ تھا۔ اس وقت ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچنے کے لئے مہینوں کا وقت درکار ہوتا تھا۔ پھر بھی وہ سمندروں کو پار کر کے دور دراز ملکوں میں پہنچے اور مشرک ملکوں کو موحد ملک بنا دیا۔ آج چوں کہ مسلمانوں کے اندر سے دعوت کا جذبہ نکل گیا ہے اس لئے وہ طرح طرح کے عذر رلنگ تراش کر کے اپنے آپ کو اس سے فارغ کئے ہوئے ہیں۔

الرسالہ پڑھنے والوں کو "ملیشیا" سے میری دل چسپی کا راز جاننا مشکل نہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ملیشیا کا علاقہ اسلام کی دعوتی قوت کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ اس علاقہ میں اسلام صرف اپنی دعوتی قوت کے ذریعہ پھیلا۔ یہاں کوئی بھی عسکری طاقت استعمال نہیں کی گئی۔ بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت مسلم تاجروں کے ذریعہ اس وقت ہوئی جب کہ اسلام کی عسکری قوت بالکل برباد ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر آرنلڈ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اگرچہ بعد کے سالوں میں اسلام کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور اس کی سیاسی طاقت ختم ہوگئی تاہم اس کی روحانی فتوحات کسی وقفہ کے بغیر جاری رہیں۔ جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کر دیا اور عباسی مملکت کو خون میں ڈبو دیا۔ اور جب مسلمان ۱۲۳۶ء میں قرطبہ سے فرڈینینڈ کے ہاتھوں نکال دئے گئے اور غرناطہ جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا اس نے عیسائی بادشاہ کو خراج ادا کیا تو عین اس وقت اسلام سماترا میں داخل ہو چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنی فتوحات کا آغاز کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی انحطاط کے زمانہ میں بھی اسلام نے شاندار روحانی ترقی حاصل کی ہے:

Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongol hordes sacked Baghdad (A.D. 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty — when the Muslims were expelled from Cordova by Ferdinand of Leon and Castile (A.D. 1236), and Granada, the last stronghold of Islam in Spain, paid tribute to the Christian king — Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the Island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests.

Arnold, *The Preaching of Islam*, Lahore 1976 p. 2.

اگر آپ اسپین اور بغداد کا الگ الگ مطالعہ کریں اور ملیشیا کا الگ تو آپ کو اس میں کوئی سبق نہیں ملے گا۔ مگر جب دونوں کو ملا کر دیکھا جائے تو وہ عظیم سبق برآمد ہوتا ہے جس کی طرف اوپر کے اقتباس میں اشارہ کیا گیا ہے۔

جب میں ملیشیا کی طرف جا رہا تھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی ملک کی طرف نہیں جا رہا ہوں بلکہ اسلام کی تاریخ کی طرف جا رہا ہوں۔ ایک ایسی تاریخ جو اہل اسلام کو یہ سبق دیتی ہے کہ اگر تمھارے پاس مادی اور عسکری طاقت موجود نہ ہو تب بھی تمہارے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔ تم اپنی فکری اور روحانی طاقت کو استعمال کرکے ازسرنو اپنے لئے ایک نئی دنیا بنا سکتے ہو۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو میں کوالالمپور کے لئے روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت میرا جہاز رات کو ۲ بجے تھا۔ اسی طرح جب میں کوالالمپور سے واپس ہوا تو میں دوبارہ دہلی میں رات کے وقت اترا۔ جو لوگ باہر کی دنیا میں سفر کرتے رہتے ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس طرح غیر موزوں (odd) اوقات میں سفر کرنے کا معاملہ زیادہ تر دہلی میں پیش آتا ہے۔ یہ دراصل ملک کی پس ماندگی کی قیمت ہے۔ دہلی کے ایک انگریزی اخبار نے پالم ہوائی اڈہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

Palam airport's main problem is overcrowding during the night hours. There is a lull all day. This happens because many countries do not allow night-landings in order to eliminate noise. India cannot afford to follow their example because it would lose much of the traffic it gets. There is, therefore, bunching of aircraft leading to congestion.

پالم ایئرپورٹ کا بنیادی مسئلہ رات کے اوقات میں غیر معمولی بھیڑ ہے۔ یہاں سارے دن سناٹا رہتا ہے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ اکثر ممالک شور کو ختم کرنے کے لئے رات کو اپنے یہاں جہاز اترنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہندستان ایسی پابندی نہیں لگا سکتا۔ کیوں کہ اگر وہ ایسا کرے تو وہ اپنے اکثر مسافروں کو کھو دے گا۔ اس بنا پر یہاں رات کو جہازوں کی کثرت رہتی ہے جس کی وجہ سے یہاں رات کے اوقات میں بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔

اگر آپ قومی سطح پر پس ماندہ ہیں تو موجودہ مقابلہ کی دنیا میں بہرحال آپ کو اس کی قیمت دینی پڑے گی۔ اسباب کی اس دنیا میں اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کی رات کو ۲ بجے میں تھائی ایئرویز (فلائٹ ۳۰۴) کے ذریعہ دہلی سے روانہ ہوا۔ فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ہوائی کمپنیوں کا معاملہ اس قدر خصوصی ہوتا ہے کہ ان کے لئے بورڈنگ کارڈ بھی زیادہ شاندار کاغذ پر چھاپے جاتے ہیں۔ یہاں ہر چیز کا معیار اعلیٰ ہوتا ہے۔ ہر چیز

کا انداز عام اکانومی کلاس سے مختلف رکھا جاتا ہے۔ خصوصی تحفے بھی دئے جاتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ دنیا کا موجودہ نظام بھی انسان کو کس قدر دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ دنیا میں یہ تمام فرق پیسہ کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ یہاں صرف پیسہ کی زیادتی اور کمی پر ایک شخص کو اونچا درجہ مل جاتا ہے اور دوسرے کو نیچا۔ اس سے انسان اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ پیسہ ہی اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی اور ساری طاقت صرف پیسہ کو حاصل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ وہ اسی میں مصروف رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وسیع تر زندگی کے اعتبار سے یہاں پیسہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ سوچ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ میری زبان سے نکلا: کاش آج کے انسان کو بتایا جا سکے کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر وہ کس چیز کو اپنا مسئلہ بنائے ہوئے ہے۔ یہی اصل دعوتی کام ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جس کو کرنے والا آج کوئی نہیں۔

ایک دنیا وہ ہے جس کا نام "دہلی" ہے۔ دوسری دنیا وہ ہے جس کا نام "کوالالمپور" ہے۔ دونوں ہمارے معلوم دائرہ کے مقامات ہیں۔ ایک آدمی دہلی سے کوالالمپور جا رہا ہو یا کوالالمپور سے دہلی آرہا ہو تو وہ جانتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں جا رہا ہے۔ اس کو اپنے آغاز اور اپنے انجام کا پورا یقین ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا بھی ہے۔ ہر آدمی ایک مسافر ہے۔ ہر آدمی موجودہ دنیا سے آخرت کی دنیا کی طرف جا رہا ہے۔ وہ ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف سفر کر رہا ہے۔ مگر کوئی نہیں جس کو اس واقعہ کا سچا یقین ہو۔ جو دوسرے سفر کا بھی اسی طرح زندہ احساس رکھتا ہو جس طرح وہ اپنے پہلے سفر کا زندہ احساس رکھتا ہے۔

بینکاک سے کوالالمپور جانے کے لئے دوسرا جہاز پکڑنا تھا۔ بینکاک کا ہوائی اڈہ دلی کے ہوائی اڈہ سے زیادہ باقاعدہ اور زیادہ منظم نظر آیا۔ میں کاؤنٹر پر گیا تاکہ تھائی ایر ویز کی اگلی فلائٹ (۴۱۵) کے لئے بورڈنگ کارڈ حاصل کروں۔ کاؤنٹر پر کھڑی ہوئی خاتون نے میرا ٹکٹ لیا اور کمپیوٹر کی چند کنجیوں پر انگلی ماری اور اچانک میرے ٹکٹ اور رزرویشن کی پوری تفصیل اسکرین پر آگئی۔ موجودہ زمانہ میں کمپیوٹر نے جو انقلاب برپا کیا ہے یہ اس کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ کمپیوٹر گویا ایک قسم کا مشینی "حافظہ" ہے۔ آپ اس کے حافظہ میں بے شمار معلومات ڈال سکتے ہیں اور پھر ضرورت کے وقت بٹن دبانے پر ایک لمحہ میں وہ ساری معلومات سکرین پر نمایاں ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گی۔

دوران پرواز ایئر ہاسٹس ناشتہ کے لئے مختلف قسم کا سامان میز پر رکھ کر لے آئی۔ ان میں سے مجھے اپنے لئے انتخاب کرنا تھا۔ میں نے دیکھا تو اس میں زیادہ تر گوشت کی چیزیں تھیں یا مغربی طرز کے کھانے تھے۔

گوشت کے ساتھ حلال کا مسئلہ تھا اور مغربی طرز کے کھانے میرے ذوق کے مطابق نہیں۔ میز کے ایک طرف چاول نظر آیا۔ میں نے کہا یہ چاول دے دو۔ ایر ہاسٹس نے فوراً کہا :

It is ham-rice sir, do you take ham?

میں نے کہا کہ نہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ ہیم (لحم خنزیر) کی اس دنیا میں اگر چاول بھی اس سے محفوظ نہیں تو آخر کیا چیز ہے جس کو یہاں کھایا جائے۔

چوں کہ بنکاک میں جہاز بدلتا ہے اس لئے جاتے اور آتے ہوئے کچھ اوقات بنکاک میں گزرے اس طرح تھائی لینڈ کو کسی قدر دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ تھائی لینڈ کی کل آبادی تقریباً ۴۵ ملین ہے۔ اس میں ۹۰ فی صد بدھسٹ ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً دوملین (۲۰ لاکھ) ہے۔ وہ زیادہ تر تھائی لینڈ کے جنوبی حصہ میں بستے ہیں۔ یعنی لمبائی میں پھیلے ہوئے ملک کا وہ حصہ جو ملیشیا سے ملا ہوا ہے۔ یہ لوگ تھائی اور ملائی زبان بولتے ہیں۔

بنکاک سے مسلمانوں کے دو ماہنامے نکلتے ہیں۔ ایک الجہاد، دوسرا رابطہ۔ دونوں تھائی زبان میں ہیں۔ "الجہاد" کے اڈیٹر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ دونوں ماہناموں کی تعداد اشاعت پانچ پانچ ہزار ہے۔ تھائی لینڈ میں تقریباً دو ہزار مسجدیں ہیں۔ یہاں کوئی بڑی اسلامی درس گاہ نہیں۔ البتہ چھوٹے چھوٹے مدرسے سیکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ جنوبی تھائی لینڈ کے مسلمان ملائی زبان بولتے ہیں۔ شمالی تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی زبان تھائی ہے۔ مگر مسلمانوں کا رسالہ یا کتابیں صرف تھائی زبان میں چھپتے ہیں۔ کیوں کہ تھائی لینڈ کے قانون کے مطابق صرف تین زبانوں میں کوئی چیز چھاپی جاسکتی ہے۔ تھائی، انگریزی، چینی۔ تاہم ملیشیا سے ملائی زبان کی کتابیں اور رسالے آتے رہتے ہیں۔ تھائی زبان کا رسم الخط ناگری سے ملتا جلتا ہے۔

تھائی قوم کی اصل چینی ہے۔ وہ غالباً بارھویں صدی عیسوی میں جنوبی چین سے آکر یہاں آباد ہوئے۔ یہاں عام طور پر تھائی زبان بولی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی زبان رائج ہے۔ آبادی کا ۷۰ فی صد حصہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ تھائی لینڈ دیہاتوں اور قصبات کا ایک ملک ہے۔ اس کا واحد بڑا شہر بنکاک ہے جو بین اقوامی گزرگاہ ہونے کی بنا پر کافی مشہور ہے۔ یہاں کا پہلا بادشاہ بینگرائی اعظم تھا۔ مختصر حکومت کے بعد ۱۳۴۵ء میں اس کا خاتمہ سادہ طور پر اس طرح ہوا کہ اس کو گھڑیال نے نگل لیا۔

تھائی لینڈ کے لفظی معنی ہیں "آزادی کا ملک"۔ یہاں کی زندگی اور رسم ورواج پر سب

سے زیادہ بدھزم کا اثر ہے جو بنیادی طور پر ایک رواداری مذہب ہے۔ مزید یہ کہ تھائی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو نوآبادیاتی نظام کی ماتحتی سے بچا رہا۔ اس بنا پر یہاں غیر ملکی تہذیب کے خلاف نفرت اور تعصب کی وہ فضا نہیں ہے جو دوسرے ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

ان اسباب نے تھائی لینڈ میں دعوت وتبلیغ کا میدان بہت بڑے پیمانہ پر کھول دیا ہے۔ مگر اس سے صرف عیسائی مبلغین فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ابھی تک یہاں دعوت وتبلیغ کے لئے کوئی قابل ذکر نظام نہیں بنایا۔

بینکاک سے کوالالمپور جاتے ہوئے راستہ میں انگریزی اخبار، بینکاک پوسٹ (۲۳ جولائی ۱۹۸۴) پڑھنے کو ملا۔ عجیب اتفاق کہ اس اخبار کے صفحہ اوّل کی پہلی سرخی جہاز کی تباہی (Plane crash) کی تھی۔ دو انجن کا یہ چارٹرڈ جہاز تھائی حکومت کے اعلیٰ افسروں کو لئے ہوئے اڑ رہا تھا۔ وہ ہوائی اڈہ سے صرف ۱۲ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا کہ کنٹرول ٹاور کو اس کا پیغام ملا کہ ہمارے انجن میں خرابی آگئی ہے اور مجبوراً ہم دھان کے کھیت میں جہاز اتار رہے ہیں۔ اس کے بعد اچانک پیغام آنا بند ہوگیا۔ جہاز کھیت میں اتر رہا تھا کہ ٹکرا کر تباہ ہوگیا۔

ایک کسان جو اس منظر کو دیکھ رہا تھا اس نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ جہاز ڈگمگاتے ہوئے نیچے آرہا ہے۔ اس کے بعد یکایک زور دار دھاکہ (Loud explosion) ہوا اور جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ مرنے والوں میں تھائی لینڈ کے منرل رسورسز ڈپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ شدید زخمی ہوکر اسپتال پہنچائے گئے اور وہاں جاکر مر گئے۔

یہ خبر میں نے ایسی حالت میں پڑھی کہ میں خود بھی ایک جہاز میں بیٹھا ہوا فضا میں اڑ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے حادثہ خود میرے ساتھ گزر رہا ہو۔ زندگی اور موت ایک دوسرے سے بالکل قریب نظر آئے۔

زمینی سواری میں کوئی خرابی آجائے تو اس کو ٹھہرا کر درست کیا جاسکتا ہے۔ مگر اسی طرح آپ ہوائی جہاز کو فضا میں نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاز میں کوئی خرابی آنے کا مطلب ہمیشہ حادثہ ہوتا ہے۔ جہاز اپنے مسافروں کے لئے گویا اڑتی ہوئی قبر ہے۔ کسی کی یہ قبر فضا میں بن جاتی ہے اور کسی کو جہاز اڑا کر تیزی سے وہاں پہنچا دیتا ہے جہاں اس کو عام قبر میں دفن کیا جاسکے۔

انسان کتنا زیادہ موت سے قریب ہے مگر وہ کتنا زیادہ اپنے آپ کو موت سے دور سمجھتا

ہے۔

کوالالمپور میں میرا قیام پہلے دن ہالی ڈے ان (Holiday Inn) میں کمرہ نمبر ۲۱۹ میں رہا۔ مجھے یہاں نماز پڑھنے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت اتفاق سے کوئی قبلہ کا رخ بتانے والا نہ تھا۔ تردد ہوا کہ کس طرف رخ کرکے نماز پڑھی جائے۔ اچانک میری نظر چھت کی طرف گئی تو چھت پر تیر کی شکل کا ایک کاغذ یا پلاسٹک کا ٹکڑا چپکا یا ہوا تھا جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا "قبلہ" یہ تیر بتا رہا تھا کہ قبلہ کی سمت کدھر ہے۔ چنانچہ اطمینان سے اس رخ پر نماز ادا کی۔ تیر نے موجودہ زمانہ میں ہتھیار کی حیثیت سے اپنی قیمت کھودی ہے مگر رخ کے نشان کے لئے اب بھی ساری دنیا میں اس کا کوئی بدل نہیں۔

ہوائی اڈہ سے ہوٹل آتے ہوئے جب ہم لوگ بازار سے گزرے تو سڑک کے دونوں طرف کی بڑی بڑی دکانوں پر ایسے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر انگریزی کے ساتھ چینی زبان میں بھی دکان کا نام لکھا گیا تھا۔ میلوں تک یہی منظر تھا۔ میرے ساتھی (وزارت ثقافت کے سکریٹری) نے بتایا کہ جن جن بورڈوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا ہے وہ چینیوں کی دکانیں ہیں۔ میں نے دیکھا تو اکثر بڑی دکانوں پر چینی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

ملیشیا چھوٹی چھوٹی مسلم سلطنتوں کا مجموعہ ہے۔ اب بھی یہ تمام سلطان موجود ہیں مگر عملاً پارلیمنٹ کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے ۔۱۹ ویں صدی میں ملیشیا (ملایا) برطانی اقتدار کے ماتحت آگیا۔ برطانیہ نے اپنے دور اقتدار میں کثرت سے چینی اور ہندستانی مزدور ملیشیا میں درآمد کئے۔ یہ لوگ یہاں اس لئے لائے گئے تھے کہ ٹن کی کانوں اور ربر کے باغوں میں کام کرسکیں جن کے مالک انگریز تھے۔ ٹن اور ربر اب بھی ملیشیا کے بنیادی ذرائع آمدنی ہیں۔

چینی دھیرے دھیرے یہاں کی تجارتوں میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ وہ ملیشیا کی اقتصادیات پر قابض ہوگئے۔ ملائی قوم زیادہ تر دیہاتوں میں آباد رہی۔ اور چینی شہروں پر چھاگئے۔ ملایا نے ۱۹۵۷ میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ اس درمیان میں سنگاپور میں چینیوں کی اکثریت ہوچکی تھی۔ ابتداءً سنگاپور فیڈریشن کے ماتحت ملیشیا سے وابستہ رہا۔ ۱۹۶۵ میں اس نے کامل آزادی حاصل کرلی۔

۲۴ جولائی کو دوپہر بعد ہمیں "انٹرنیشنل ہاؤس" میں لے جایا گیا۔ اور آئندہ یہیں پر کمرہ نمبر ۱۳۰۲ میں قیام رہا۔ انٹرنیشنل ہاؤس ایک بین اقوامی ترقیاتی مرکز

(Asia and Pacific Development Centre) کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ ہالی ڈے اِن اگرچہ یہاں کا بڑا ہوٹل ہے مگر وہ شہر کے اندر واقع ہے۔ اس کے برعکس انٹرنیشنل ہاؤس شہر کے باہر پہاڑی کے دامن میں قائم کیا گیا ہے۔ یہاں چاروں طرف قدرت کے مناظر ہیں۔ نیز یہاں ہوٹل کے ماحول کے بجائے "علمی" ماحول ہے۔ یہاں ایک بڑی لائبریری بھی ہے۔ یہ دوسری جگہ مجھ کو زیادہ پسند آئی۔

ہالی ڈے اِن کی ایک سجی ہوئی نشست گاہ کے دروازہ پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے (Rama Rama) اس سے مجھے شبہہ ہوا کہ یہ شاید کوئی ہندو ہوٹل ہے۔ بعد کو میں نے ایک ملیشیائی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے معنی ملائی زبان میں تتلی کے ہیں ـــــ تحقیق سے پہلے ایک چیز کچھ نظر آتی ہے اور تحقیق کے بعد کچھ بن جاتی ہے۔

سیمنار کی طرف سے ہم کو جو بیگ دیا گیا تھا، میں نے ایک ذمہ دار سے پوچھا کہ یہ ملیشیا کا بنا ہوا ہے یا باہر کے کسی ملک کا۔ انھوں نے بتایا کہ ملیشیا کا۔ میں نے دوبارہ پوچھا: مسلم کارخانہ کا یا چینی کارخانہ کا۔ انھوں نے مسکرا کر کہا "اگرچہ مجھے تعین کے ساتھ معلوم نہیں ہے۔ مگر یقین ہے کہ وہ چینی کارخانہ کا ہوگا۔ کیوں کہ میرے علم کے مطابق کوالالمپور میں مسلمانوں کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جو ایسا بیگ سپلائی کر سکے"

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملیشیا کی موجودہ صورت حال کیا ہے۔ یہاں مسلمان ۵۰ فی صد ہیں۔ حکومت پر ان کا قبضہ ہے۔ مگر تجارتی اور اقتصادی سرگرمیوں کو زیادہ تر چینی کنٹرول کرتے ہیں۔

ہندستان میں مسلمانوں کو شکایت ہے کہ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اکثریت ان کا استحصال کر رہی ہے۔ پھر ملیشیا کے بارہ میں وہ کیا کہیں گے جہاں حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باوجود یہاں کی دولت کا بہت بڑا حصہ چینی اقلیت کے قبضہ میں ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی اقتصادی قوت کی بنا پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر دوسرے شعبوں پر بھی گہرے طور پر انداز ہوتے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس دن میں کوالالمپور پہنچا ٹھیک اسی دن مسٹر یاسر عرفات بھی اپنے وفد کے ساتھ یہاں آئے۔ وہ اپنے مقرر پروگرام سے ۵ گھنٹے لیٹ کوالالمپور پہنچے۔ ۲۵ جولائی کا مقامی اخبار ٹائمس (New Straits Times) یاسر عرفات کی خبروں اور تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کے

مشہور اسٹیڈیم نگارا (Stadium Negara) میں ان کی تقریر ہوئی تو وسیع اسٹیڈیم انسانوں سے آخری حد تک بھرا ہوا تھا۔ ان کی تقریر کا خلاصہ اخبار کی اس سرخی میں تھا:

Our struggle will only end with victory

(ہماری جدوجہد صرف فتح پر ختم ہوگی) اخباری اطلاع کے مطابق انھوں نے عربی میں تقریر کی جس کا ساتھ ساتھ انگریزی میں ترجمہ کیا جارہا تھا۔

انھوں نے فلسطین کے موجودہ مسئلہ کی تمام تر ذمہ داری امریکہ اور اسرائیل پر ڈالی۔ مگر سوال یہ ہے کہ قرآن میں صریح وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل کفر کو اللہ ایمان پر ہرگز غلبہ کا موقع نہیں دے گا۔ (لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا) پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ امریکہ اور اسرائیل تقریباً ۴۰ سال سے اس آیت کریمہ کی تردید کر رہے ہیں اور خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔

جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے، فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کی دینی غفلت کا نتیجہ ہے۔ خاتم النبیین کے ظہور سے پہلے فلسطین بنی اسرائیل کیلئے خدائی علامت تھا۔ جب خدا ان سے خوش ہوتا تو ان کو فلسطین پر قبضہ دے دیتا اور جب خدا ان سے ناراض ہوتا تو فلسطین کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیتا۔ یہی معاملہ اب مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ فلسطین ایک حسی علامت ہے جس سے مسلمان اپنی اسلامیت کو ناپ سکتے ہیں۔ خدا جب جب مسلمانوں سے راضی رہا تو اس نے فلسطین کو ان کے قبضہ میں دے دیا۔ اور جب وہ ان سے ناراض ہوا تو اس کو ان سے چھین کر ان کے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ ماضی میں بھی ایسا ہو چکا ہے اور آج بھی ایسا ہو رہا ہے۔ اس لئے امریکہ اور اسرائیل کو برا بھلا کہنے کے بجائے ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہئے۔ اپنی کمزوریوں کو دور کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق بنانا چاہئے کہ خدا دوبارہ فلسطین کو ہمارے حوالے کر دے۔

انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک وسیع اور صاف ستھری لائبریری ہے اس سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ کراچی کے اخبار ڈان (۱۹ جولائی ۱۹۸۴) میں کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی وزارت کی منسوخی پر طویل نوٹ تھا۔ اس کو پولیٹکل ڈراما قرار دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا تھا:

> The manner in which Dr Farooq Abdullah's rival, Dr. G.M. Shah, has been inducted into the Chief Ministership in Srinagar does not point to any deep commitment to democratic norms and principles, on the part of the Indian leadership.

ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے حریف ڈاکٹر جی ایم شاہ کو جس طرح سرینگر میں وزیر اعلیٰ بنایا گیا ہے اس سے ظاہر

نہیں ہوتا کہ ہندستان کی قیادت جمہوری اصولوں سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔

اس کو پڑھتے ہوئے میرے دل نے کہا "دوسرے پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر آدمی حد درجہ اصول پرست نظر آتا ہے۔ مگر جب خود اپنا معاملہ ہو تو وہ اصول پرستی کے بجائے مفاد پرستی کو اپنا دین بنا لیتا ہے۔ لوگوں کے اندر اتنی غیرت بھی نہیں کہ جس غلطی میں خود مبتلا ہیں اسی غلطی کے معاملہ میں دوسرے کے اوپر تنقید نہ کریں۔

یہاں ہوٹل میں صبح سویرے مقامی اخبار نیو اسٹریٹ ٹائمس (New Straits Times) کمرہ میں پہنچ جاتا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۸۴ کے اخبار میں سنگاپور کے ڈپٹی پریمیئر مسٹر سناتھمبی راجارتنم (Sinnathamby Rajarathnam) کی ایک تقریر پڑھنے کو ملی۔ انھوں نے سنگاپوری باشندوں کی مادیت پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ سنگاپور کے آدمی نے دولت کو مذہب کا بدل بنا لیا ہے:

Money is his substitute for religion

یہ بات صرف سنگاپوریوں کے لئے نہیں ہے بلکہ آج دنیا بھر کے انسانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ دولت ایک ذریعہ ہے مگر اس کو بذات خود مقصد سمجھ لیا گیا ہے۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد ایسا ہوا کہ یہاں کی وزارت مالیات نے ہم سب لوگوں کو ایک عالیشان ہوٹل میں ڈنر دیا۔ یہاں قدرت کا حسین منظر، ساز و سامان کی جگمگاہٹ، زرق برق کاروں کا ہجوم تھا۔ اس قسم کے مناظر کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ دولت کو مذہب کا قائم مقام بنانے کا سبب کیا ہے۔ وہ ہے موجودہ زمانہ میں دولت کے استعمال کی بڑھی ہوئی مدات۔ قدیم زمانہ میں جب جدید تمدنی لوازم نہیں پیدا ہوئے تھے، انسان کے لئے دولت کا مصرف بہت محدود تھا۔ آج بے شمار نئی نئی چیزوں کے ظہور نے دولت کے استعمال کی مدوں کو لامتناہی طور پر بڑھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر آدمی دولت کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔

لیکن اگر زندگی کی حقیقت کو سوچا جائے تو دولت بالکل بے قیمت نظر آئے گی۔ زندگی کی حقیقت موت ہے۔ اسی اخبار میں کئی موتوں کی خبر تھی۔ مثلاً تنگکو اندیراپترا (Tengku Inder Petra) جو ریاست کلنتن کے راجہ تھے وہ ۲۳ جولائی ۱۹۸۴ کو انتقال کر گئے جب کہ ان کی عمر ۷۲ سال تھی۔ جیسا کہ خبر میں بتایا گیا ہے، موصوف غیر معمولی صلاحیت کے آدمی تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۴ میں وہ بزنس میں داخل ہوئے اور کئی بڑی بڑی تجارتوں کے مالک بن گئے۔ وہ فیبرولن گروپ کے وائس

پریسیڈنٹ تھے۔ ایبرہیم تن اور مال پترا کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل تھے۔ مگر وہ اپنی دولت کے درمیان ۲ ، سال سے زیادہ نہ رہ سکے۔

جو دولت اتنی کم مدت تک انسان کا ساتھ دے وہ کس قدر بے حقیقت ہے۔ مگر دنیا کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا خیرہ کر رکھا ہے کہ ہر آدمی اس پر ٹوٹ رہا ہے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس کو اپنے لئے حاصل کر لے۔

باہر جب کسی شخص کو بلایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے لئے ہر قسم کی سہولت کا اعلیٰ انتظام کیا جاتا ہے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ ہر سہولت جیسے مجھ کو کاٹتی ہے۔ جو لوگ مجھ کو جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ مجھ کو سادگی میں راحت ملتی ہے نہ کہ تکلف میں۔

یہی وجہ ہے کہ بظاہر خواہ کتنی ہی سہولیات ہوں مگر مجھے باہر کے سفروں میں کبھی سکون نہیں ملتا۔ کوالالمپور کے لئے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں انھوں نے بطور خود واپسی کا رزرویشن ۲ اگست کو کیا تھا۔ جب کہ روانگی کا رزرویشن ۲۳ جولائی کے لئے تھا۔ مجھے گھبراہٹ تھی کہ اتنے دنوں تک میں کیسے مصنوعی ماحول میں رہوں گا۔ چنانچہ میں نے کوالالمپور پہنچ کر سابقہ رزرویشن منسوخ کرادیا اور دوبارہ ۳۰ جولائی کے لئے واپسی کا رزرویشن کرایا۔

سیمنار کے ذمہ داروں کو معلوم ہوا تو انھوں نے سخت اختلاف کیا۔ وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ چنانچہ مجھ کو دوبارہ اسے ۲ اگست کا کرانا پڑا۔ اس سارے معاملہ کا سبب وہ اکتاہٹ تھی جو مجھے ہر سفر میں ہوتی ہے۔ ٹکٹ جب دوبارہ تبدیل ہو کر میرے ہاتھ میں آیا تو دل کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا : انسان آج اکتاہٹ کو بھی برداشت نہیں کرپاتا پھر کل وہ عذاب کو کیسے برداشت کرے گا۔

لندن سے ایک اعلیٰ معیار کا ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام ساؤتھ (South) ہے۔ ناشرین کے الفاظ میں یہ تیسری دنیا کا میگزین (The Third World Magazine) ہے۔ اس میں افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کا ماہانہ جائزہ ہوتا ہے۔ جولائی ۱۹۸۴ کے شمارہ میں ہندستان کے بارہ میں جو مضمون تھا اس کا خلاصہ میگزین کے اپنے الفاظ میں یہ تھا۔

With the fires of Hindu-Muslim riots barely damped down in Bombay, the Sikhs of the Punjab prepared to face the final assault on the Golden Temple in Amritsar.

بمبئی میں ہندو مسلم فساد کی آگ ابھی مشکل سے بجھی تھی کہ پنجاب کے سکھوں کو امرت سر کے سورن مندر

پر آخری حملہ کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہونا پڑا۔

گویا ہندستان میں اس مدت میں جو قابل ذکر واقعہ ہوا وہ صرف مذکورہ بالا واقعہ تھا۔ موجودہ زمانہ کی صحافت اپنے تجارتی مقصد کے تحت انھیں واقعات کو نمایاں کرتی ہے جو سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک کی صحافت کا حال ہے۔ حالاں کہ واقعات کی اصل فہرست اس سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جو شخص ملک کے اندر ان سنسنی خیز واقعات کو پڑھ رہا ہو وہ بھی اگرچہ اس سے گمراہ ہوتا ہے۔ مگر نسبتاً کم۔ کیوں کہ خود واقعات کے درمیان ہونے کی بنا پر وہ دوسری قسم کے واقعات کا بھی تجربہ اور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مگر جو شخص باہر کے ملک میں ہو اور جس کا ذریعہ صرف مذکورہ بالا قسم کی صحافت ہو وہ کسی ملک کے بارہ میں عجیب وغریب قسم کی رائے قائم کر لیتا ہے۔ جو سراسر غیر حقیقی اور مغالطہ آمیز ہوتی ہے۔

باہر کے ملکوں میں اپنے ملک کی خبر پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم اپنے ملک کے بارہ میں نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی اجنبی ملک کے بارہ میں پڑھ رہے ہیں۔ حیدرآباد کے فساد (جولائی ۱۹۸۴) کے موقع پر میں کوالالمپور میں تھا۔ وہاں کے اخبار نیو سنڈے ٹائمس (۲۹ جولائی ۱۹۸۴) میں بیرونی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے حیدرآباد کے فرقہ وارانہ فساد کی خبر چھپی۔ یہ خبر بجائے خود بھی مبالغہ آمیز تھی۔ مگر خبر کے ساتھ یہ الفاظ انتہائی حیرت انگیز تھے:

Hindus and Muslims have long had cultural and religous antagonisms. When the Muslims ruled India in the 10th and 18th centuries, they attempted to crush worship and culture, fuelling Hindu resentment.

(انڈیا کے) ہندو اور مسلم لمبے عرصہ سے ثقافتی اور مذہبی دشمنی میں مبتلا ہیں۔ جب ۱۰ ویں صدی اور اٹھارویں صدی کے درمیان ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو انھوں نے (ہندوؤں کے) مذہب اور ثقافت کو کچلنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں میں ناراضگی کا جذبہ بھڑک اٹھا۔

جو لوگ اس قسم کی خبریں پڑھیں ان کا ذہن کس قدر غلط بنے گا۔ مگر اس کے لئے ہمیں خود اپنے آپ کو الزام دینا چاہئے نہ کہ دوسروں کو۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں قدیم ذہن کے ساتھ داخل ہوئے۔ وہ زندگی کے صرف انھیں شعبوں سے آشنا تھے جو ہزاروں برس سے چلے آرہے تھے۔ نئے شعبوں سے وہ بالکل بے خبر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شعبوں (مثلاً خطابت اور شاعری) میں انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔ مگر جدید شعبوں کی اہمیت سے وہ اس قدر بے خبر تھے کہ وہ اس میں داخل بھی نہیں ہوئے۔ انھیں میں ایک خبر رسانی کا ادارہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں

چھ خبر رساں ادارے ہیں جو دنیا کی خبروں کا ۸۰ فی صد حصہ فراہم کرتے ہیں اور وہ سب کے سب یہودیوں کے ہیں یا عیسائیوں کے۔

۲۶ جولائی کو انٹرنیشنل ہاؤس کے بڑے ہال میں کارروائی شروع ہوئی۔ سیمینار کا افتتاح ملیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Bin Mohamad) نے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی:

The future of Muslim societies is with Islam.
Without Islam, they have no future.

مسلم اقوام کا مستقبل اسلام کے ساتھ ہے۔ اسلام کے بغیر ان کا کوئی مستقبل نہیں۔

یہ گویا "دکانزہ" کا اجتماع تھا۔ تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان کی اکثریت مغربی یونی ورسٹیوں کی تعلیم یافتہ تھی۔ طریق کار یہ تھا کہ مقالہ نگار اپنا مقالہ پڑھ کر سناتا یا اس کو سامنے رکھ کر اس کا خلاصہ بیان کرتا اور اس کے بعد حاضرین اس پر اظہار رائے کرتے۔ آخر میں وہ لوگوں کے تبصروں کا جواب دیتا۔ یہ سلسلہ ۲۶ جولائی کی شام سے ۳۱ جولائی کی صبح تک جاری رہا۔

آخر میں مختلف علمی شعبوں کے حلقے (ورک شاپ) قائم کئے گئے۔ ہر ایک گروہ نے الگ الگ کمرہ میں اپنے موضوع کو اسلامی بنانے کے بارہ میں بحث کی اور اپنی رپورٹ تیار کی۔ ورک شاپوں کی یہ رپورٹیں ۳۱ جولائی کی نشست میں پڑھی گئیں۔ پھر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر عبدالحمید ابوسلیمان کی اختتامی تقریر ہوئی۔ آخر میں ڈاکٹر احمد ذکی (امریکہ) کی دعا پر سیمینار کا اختتام ہوا۔

میں نے اس موقع پر جو مقالہ پیش کیا وہ انگریزی میں تھا۔ اس کا اردو خلاصہ ان شاء اللہ الرسالہ کے آئندہ اڈیشن میں شائع کر دیا جائے گا۔

سیمینار کے سلسلے میں چند سبق آموز یادداشتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل فاروقی نے اپنی انگریزی تقریر میں کہا کہ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ کا آخری نشانہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے لئے مکمل نصاب بنانا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ دنیا بھر کے مسلم اسکالروں سے رابطہ قائم کر رہے ہیں۔ جن کی تعداد جلد ہی تقریباً ۳۰ ہزار ہو جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی مدد سے وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے تین دور ہیں:

۱. مغربی علوم کی کامل مہارت (Mastery of western tradition of learning)

۲. اسلامی علوم کی کامل مہارت (Mastery of Islamic tradition of learning)

۳. تنقیدی جائزہ (criticism)

۴. دونوں کے امتزاج سے صحیح اسلامی نصاب کی تیاری (synthesis)

انھوں نے بتایا کہ اس وقت مختلف ملکوں کے نصف ملین مسلمان مغربی یونی ورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مسئلہ کتنا اہم ہے۔ پوری جدید نسل کا ذہن بگاڑا جا رہا ہے۔ اس کو درست کرنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ جدید معیار کے مطابق اعلیٰ نصاب تیار کیا جائے۔

سیمنار کے حاضرین نے اس تخیل کو بے حد پسند کیا۔ ایک صاحب نے فرمایا:

Idea of producing textbooks is absolutely a wonderful idea

تاہم ذاتی طور پر میں اس معاملہ میں پرجوش نہ ہو سکا۔ میرے نزدیک اولاً تو اس قسم کا نصاب بنانا ہی مشکل ہے۔ اور بالفرض اگر وہ بن جائے تو موجودہ حالت میں وہ رائج نہیں ہو سکتا۔ آج کی تعلیم گاہوں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ درحقیقت وقت کے غالب افکار کا انعکاس ہے۔ جب تک عالمی سطح پر ان افکار کا غلبہ ختم نہ کیا جائے، کوئی دوسرا نصاب جدید تعلیم گاہوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اور بالفرض مسلمان خود اپنے تعلیمی ادارے بنا کر وہاں ان کتابوں کو پڑھائیں تو ایسی درس گاہوں کا وہی انجام ہوگا جو موجودہ زمانہ میں ان اسلامی مدرسوں کا نظر آتا ہے جن کے آگے ہم نے "جامعہ" کا بورڈ لگا رکھا ہے۔

بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ نصاب کے ساتھ ساتھ ہمیں اساتذہ بھی تیار کرنے ہوں گے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے مثال دی کہ سوڈیم اور کلورین دونوں الگ الگ زہر ہیں۔ مگر جب ان کو ملایا جاتا ہے تو ان کا مرکب (سوڈیم کلورائڈ) سادہ نمک بن جاتا ہے۔ اسکول کا استاد جب طالب علم کو یہ بتاتا ہے تو طالب علم پوچھتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوتا ہے۔ استاد اس کے جواب میں "نیچر" کا لفظ بول دیتا ہے۔ وہ مقام جہاں طالب علم کے ذہن میں "خدا" کا تصور ڈالا جا سکتا تھا، وہاں غلط استاد اس کے ذہن میں "نیچر" کو ڈال دیتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ طالب علم سمجھ لیتا ہے کہ سب کچھ نیچر کر رہی ہے۔ تقلیدی طور پر اگر وہ خدا کو مانے تب بھی اس کا اصل ذہن غیر خدا والا بن جاتا ہے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول نقل کیا: لن یسأل الجھلاء لِمَ لَمْ یتعلّموا ولکن یُسأل العلماء لِمَ لَمْ یعلّموا (نہج البلاغۃ)

جاہلوں سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سیکھا کیوں نہیں۔ بلکہ عالموں سے یہ پوچھا جائے گا کہ انھوں نے سکھایا کیوں نہیں۔

اس قسم کے اقوال کو عام طور پر لوگ مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کا مسئلہ بھی ہے۔ جو لوگ سچائی سے بے خبر ہیں ان سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جو سچائی سے باخبر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی یہی غفلت ہے جس نے انھیں اللہ کی مدد سے محروم کر رکھا ہے۔ جب تک مسلمان بے خبروں کو باخبر کرنے کے لئے نہ اٹھیں گے وہ خدا کی مدد کے حق دار نہیں بن سکتے۔

۲۷ جولائی کو ڈاکٹر روزے گارودی کا مقالہ تھا۔ انھوں نے اپنا مقالہ فرانسیسی زبان میں لکھا تھا جو ان کی مادری زبان ہے۔ اس مقالہ کا ترجمہ کوالالمپور میں انگریزی میں کرایا گیا۔ یہی انگریزی مقالہ انھوں نے پڑھ کر سنایا۔ آج ہال سب سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر گارودی کے مقالہ کا خلاصہ یہ تھا کہ اسلام اور عقل میں کوئی حقیقی ٹکراؤ نہیں۔ یہ پہلے بھی مصنوعی تھا اور آج بھی مصنوعی ہے۔ لوگ بطور خود کچھ نظریات بناتے ہیں اور ان کو اسلامی کہہ کر پیش کرتے ہیں اس سے عقل اور اسلام کے درمیان مصنوعی ٹکراؤ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

It arises artificial conflict between reason and Islam

ڈاکٹر گارودی نے کہا کہ اسلام کو زندہ کرنے لئے ضرورت ہے کہ قرطبہ یونی ورسٹی کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اسپین میں دوبارہ اسلام پھیل رہا ہے۔ اسپینی نوجوان اسلام قبول کر رہے ہیں۔ وہاں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو "اسلام کو اسپینی تاریخ کا لاینفک جزء" قرار دیتے ہیں۔ ایک اسپینی نومسلم نے کہا "بہت جلد قرطبہ میں مسلمانوں کی تعداد خلافت کے زمانہ سے بھی زیادہ ہو جائے گی"

ڈاکٹر روزے گارودی (پیدائش ۱۹۱۳) فرانس کے کمیونسٹ لیڈروں میں سے تھے۔

Dr. Roger Garaudy
18-A, Av. du Boucht, 1209 Geneve, Switzerland

انھوں نے ۱۹۸۲ میں اسلام قبول کر لیا۔ ان سے سیمنار کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے اسلام قبول کرنے کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ میرے لئے کوئی اچانک فیصلہ نہیں تھا۔ میں نے اسلامی کلچر پر اپنی پہلی کتاب ۱۹۴۶ میں لکھی تھی۔ یہ کتاب اولاً فرانسیسی

ہیں اور اس کے بعد عربی میں شائع ہوئی۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں، اسلام میرے لئے تبدیلی مذہب نہیں تھا بلکہ وہ میرے لئے تکمیل تھا،

I accepted Islam not as a rupture but as an accomplishment

میں نے مزید پوچھا کہ اسلام کے کس خاص پہلو نے آپ کو متاثر کیا۔ ان کا جواب تھا کہ اس کے ثقافتی پہلو (Cultural aspect) نے۔

لسانیات (linguistics) کی بحث کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ عرب آج قرآن کی زبان نہیں بولتے۔ اس کے جواب میں ایک عرب عالم نے بجا طور پر کہا کہ یہ صحیح ہے کہ عرب ممالک میں کئی لہجے رائج ہیں۔ مگر عوامی زبان میں دوسرے ملکوں میں بھی یہ فرق پایا جاتا ہے۔ جہاں تک علمی عربی کا تعلق ہے اس میں یہ فرق موجود نہیں۔ آج بھی عرب کے اجتماعات میں، ان کی ریڈیو اور ٹیلی وژن کی نشریات میں یا کتابوں میں وہی زبان ہوتی ہے جو قرآن کی زبان ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کسی زبان کو جاننے کے لئے اس کے اسلوب کو جاننا ضروری ہے۔ مثلاً عربی گرامر کے ماہرین ہمیشہ یہ لکھتے ہیں کہ صیغۃ الامر (افعل) تفید الوجوب۔ امر کا صیغہ وجوب کا معنی رکھتا ہے۔ مگر اس کو مطلق معنی میں لینا درست نہیں۔ اگر اس کو مطلق وجوب کے معنی میں لے لیا جائے تو عجیب صورت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً قرآن میں ہے واذا حللتم فاصطادوا یہاں فاصطادو امر کا صیغہ ہے۔ اب اگر اس کو نحوی تعریف کے معنی میں لے لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احرام کھولنے کے بعد ضرور شکار کرو۔ حالاں کہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ یہاں امر کا صیغہ صرف اباحت کے معنی میں ہے۔ نہ کہ وجوب کے معنی میں۔ اسی طرح مثلاً اعملوا ما شئتم۔ وغیرہ۔

ایک صاحب نے بتایا کہ کسی زبان کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کو مجموعی طور پر دیکھنا چاہئے نہ کہ کسی جزئی پہلو کی بنا پر رائے قائم کر لی جائے۔ مثلاً اسکیمو کی زبان میں برف کے لئے پچاس الفاظ ہیں۔ جب کہ کسی اور زبان میں برف کے لئے اتنے الفاظ موجود نہیں۔ مگر یہ معیار درست نہیں۔ اسکیمو چوں کہ برفانی علاقوں میں رہتے ہیں اس لئے برف کے بارہ میں ان کے یہاں مختلف الفاظ ہیں۔ مگر دوسرے اعتبارات سے ان کی زبان انتہائی ابتدائی اور معمولی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ کوئی کام کرنے والی طاقت اصلاً انسان ہے نہ کہ کوئی نظام۔

انھوں نے مثال دی کہ عبرانی زبان سیکڑوں سال سے مردہ زبان تھی۔ اسرائیل بننے کے بعد ایک یہودی عالم اسرائیل آیا۔ وہ اور اس کا خاندان عبرانی زبان بولتا تھا۔ اس نے کہا کہ میں اسرائیل کی زبان عبرانی بناؤں گا۔ لوگوں نے اس کو ناقابل عمل سمجھا۔ بہتوں نے اس کو پاگل کہا۔ ایک یہودی عالم نے کہا کہ زبان کی مثال گلاس کی سی ہے۔ گلاس ٹوٹ جائے تو اس کو دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح زبان ایک بار ختم ہو جائے تو اس کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر مذکورہ یہودی نے مجنونانہ طور پر اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آج عبرانی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ وہ اسرائیل کی سرکاری زبان ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے گلاس کو دوبارہ جوڑ دیا۔

ایک صاحب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر بالکل بے علم اور بے خبر ہوتا ہے۔ اس کا سارا علم خارج سے حاصل شدہ علم ہوتا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے قرآن کی یہ آیت پڑھی:

واللّٰہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً۔۔ النحل ۷۸

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آدمی کوئی نظریہ قائم کرے اور اس کی تائید میں ایک آیت پیش کر دے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کی بات قرآن سے ثابت ہوگئی ہے۔ کیوں قرآن میں اگر مذکورہ بالا آیت ہے تو اسی کے ساتھ اس میں دوسری آیات بھی ہیں مثلاً:

وعلّم آدم الاسماء کلھا

فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا

پہلی آیت کے ظاہری الفاظ سے اگر یہ نکلتا ہے کہ آدمی بے علم حالت میں پیدا ہوتا ہے تو دوسری آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کو علم اسماء دیا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں کچھ باتوں کا علم پیدائشی طور پر پیوست کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے نظریۂ علم کو سمجھنے کے لئے دونوں قسم کی آیتوں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنی پڑے گی۔

پاکستان کے ایک صاحب سے گفتگو ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ نہ اِدھر کے رہے اور نہ ادھر کے رہے۔ پاکستان میں ہم کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے:

We are not the sons of soil, so we are treated as second class citizens

ان کے بیان کے مطابق سرکاری ملازمتوں وغیرہ میں مہاجرین کے ساتھ سخت امتیاز کیا جاتا ہے۔ اگر ان کا کہنا صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں بھی وہی صورت حال مختلف شکل میں موجود ہے جس کی ہندستان کے مسلمان اپنے بارہ میں شکایت کرتے ہیں۔ کیسی عجیب تھی "تقسیم" کی سیاست جس نے ایک ملک کے مسلمانوں کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور تینوں میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا۔ البتہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ چھین لیا۔

مگر اس سیاست کی ذمہ داری انگریزوں پر یا مسٹر جناح پر ڈالنا بدترین کمینگی ہے۔ یہ اپنے قصور کے لئے دوسرے کو ملزم ٹھہرانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر جناح یا انگریز نے مسلمانوں کو غلط رخ کی طرف پکارا تو مسلمان اس کی طرف دوڑ کیوں پڑے۔ چنانچہ آج بھی قوم کا حال یہی ہے۔ آج بھی اگر کوئی اللہ کا بندہ مسلمانوں کو حقیقت پسندی کی طرف بلائے تو وہ اس کی آواز کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور دوبارہ جناح جیسی آوازوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ آہ وہ لوگ جن کا حال اس آیت کا مصداق بن جائے:

وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا

ایک خاتون نے آرٹ کو اسلامی بنانے کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کافی معلوماتی اور دل چسپ تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلام موسیقی (Sound art) کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی مثال خود قرآن ہے:

Qur'an is a sound art par excellence

ہر مسلمان قرآن کو ساؤنڈ آرٹ کے ساتھ روزانہ صبح کو دہراتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی آواز میں ایک حسن ہے۔ مگر اس خصوصیت کو فن کی حیثیت دینا غالباً اس قیمت پر ہوگا کہ "تدبر" کا پہلو اوجھل ہو جائے جو کہ قرآن کی اصل حیثیت ہے۔ اس کی مثال موجودہ زمانہ میں تجوید کا وہ فن ہے جس نے قرآن کی تلاوت کو ایک قسم کا آرٹ بنا کر تدبر کے پہلو کو مجروح کر دیا ہے۔

جو "دکاترہ" اس انٹرنیشنل سیمینار میں شریک تھے ان میں بڑی تعداد ان افراد کی تھی جو اپنے ملک میں اپنی قومی حکومت کے ظلم کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد اپنے ملک میں حالات نامساعد پا کر وہ مختلف بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔ انھیں میں سے ایک تعداد یورپ یا امریکہ پہنچ گئی۔ ان لوگوں کے لئے چوں کہ ذاتی محنت کے سوا کوئی اور سہارا باقی نہ تھا انھوں نے محنت شروع کر دی۔

وہ تعلیم میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ تعلیم کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ اس طرح ان لوگوں کی زندگیاں یہ سبق دے رہی ہیں کہ محرومی میں بھی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہوتا ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو امت کے مسائل پر بات کرتے ہوئے اس حقیقت کو امت کے وسیع تر مسائل میں بھی منطبق کرنے کا شعور رکھتے ہوں۔

ڈائننگ ہال میں جو لڑکے اور لڑکیاں کام کر رہی تھیں ان میں ایک لڑکا بہت مستعد اور فعال نظر آتا تھا۔ ایک روز میں نے اس کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ عیسائی ہے ـــــ دوسری قوموں کا یہ حال ہے کہ اگر ان کا کوئی فرد کہیں اقلیت میں ہو تو وہ زیادہ چوکنا رہتا ہے اور زیادہ محنت کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اپنی "کمی" کی تلافی زیادہ محنت ہی کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہندستان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں ان کا اقلیت میں ہونا ان کو صرف ایک سبق دے رہا ہے۔ لامتناہی طور پر احتجاج اور شکایت میں مبتلا رہنا۔

مجھے کئی بار یہ تجربہ ہوا کہ جب میں گفتگو میں یا تقریر میں کہتا ہوں کہ "میرا خیال یہ ہے" تو اردو کے ماحول میں اس کو انا کے اظہار کے معنی میں لے لیا جاتا ہے۔ مگر انگریزی زبان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ یہاں ہر آدمی جب کوئی رائے پیش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

To my mind . . .
It seems to me that . . .

اس طرح کے الفاظ انگریزی میں بات کو گھٹا کر کہنے کے ہم معنی ہیں اور اردو میں بڑھا کر کہنے کے۔ ایک جگہ وہ تواضع کا مفہوم رکھتے ہیں اور دوسری جگہ انانیت کا۔ کیسا عجیب فرق ہے ایک زبان میں اور دوسری زبان میں۔

۲۷ جولائی کو جمعہ کا دن تھا۔ ذمہ داروں نے پروگرام بنایا کہ میں کوالالمپور کی جامع مسجد میں نماز پڑھاؤں اور خطبہ دوں۔ میں نے اس سے انکار کیا۔ البتہ اسی مسجد میں جمعہ پڑھا جو یہاں کی قدیم ترین مسجد ہے۔

ہم مسجد میں پہنچے تو گیٹ پر ایک بورڈ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ اوپر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" عربی میں تھا اور نیچے انگریزی عبارت دکھائی دیتی تھی۔ میں قریب گیا تو معلوم ہوا کہ انگریزی رسم الخط میں ملائی زبان ہے۔ ۱۹۵۷ کے سرکاری فیصلہ کے مطابق ملائی زبان کو رومن رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً عید الفطر کو یہ لوگ اپنی زبان میں (Aidilfitri) لکھتے ہیں۔ خوش آمدید کو (Selamat Datang) سرکاری

کام اور دوسرا زیادہ تر کام رومن رسم الخط میں انجام دیا جاتا ہے۔ تاہم ایک طبقہ ابھی تک ایسا موجود ہے جو قدیم رسم الخط کو استعمال کرتا ہے جو عربی سے ملتا جلتا ہے۔ اب دوبارہ تحریک چل رہی ہے کہ رومن رسم الخط کو ترک کرکے سابق رسم الخط کو از سر نو اختیار کر لیا جائے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ وہ کسی معاملہ میں ایسا فیصلہ نہیں کر پاتے جو ان کے درمیان نسل در نسل چلے۔ ایک حکمراں ہنگامہ خیز عمل سے گزر کر ایک دستور بناتا ہے۔ اور اگلا حکمراں اس کو بدل دیتا ہے۔ ایک قائد مسلمانوں کو ایک رخ پر دوڑاتا ہے۔ اگلا قائد آکر دوبارہ دوسرے رخ پر دوڑانا شروع کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان ابھی تک درمیانی راستہ میں ہیں۔ وہ منزل تک نہیں پہنچ سکے۔

جامع مسجد کا طرز تعمیر ہندستان کی مساجد سے بالکل مختلف تھا۔ مسجد نہایت صاف ستھری دکھائی دی۔ اس مسجد کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ ہندستان کی اکثر مسجدوں میں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ جمعہ کے دن لوگ صفوں میں ہیں۔ کوئی سنت پڑھ رہا ہے۔ کوئی ذکر کر رہا ہے اور دو آدمی ان کے درمیان کپڑا پھیلائے ہوئے ادھر سے ادھر سے گزر رہے ہیں اور مسجد کا چندہ مانگ رہے ہیں۔ یہ منظر نمازیوں کے لئے بہت ناخوش گوار ہوتا ہے اور نماز کا احترام بھی اس کی وجہ سے مجروح ہوتا ہے عرب ملکوں میں چونکہ حکومت کا محکمہ اوقاف مساجد کی تمام ضرورتوں کا کفیل ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں اس کا مسئلہ نہیں۔

مسجد جامع کوالالمپور میں مجھے اس کا بہترین حل نظر آیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اٹیچی کے بقدر ایک چھوٹا سا خوبصورت بکس ہے۔ جس میں اندرونی تالا بند ہے۔ اور اوپر ایک سوراخ بنا ہوا ہے۔ اس بکس کے نیچے جدید قسم کا عمدہ پہیہ لگا ہوا ہے۔ یہ بکس صفوں کے درمیان ایک کے بعد ایک گھومتا رہتا ہے۔ تقریباً ہر آدمی اس میں کچھ نہ کچھ ڈالتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی رقم ڈال چکتا ہے تو وہ بکس کو آگے دھکیل دیتا ہے۔ دوسرا آدمی اپنی رقم ڈال کر دوبارہ بکس کو آگے کر دیتا ہے۔ اس طرح بکس ایک کے بعد ایک تمام صفوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری مسجد کا چکر لگا لیتا ہے۔

انٹرنیشنل ہاؤس کی چودہ منزلہ بلڈنگ میں تیسری منزل پر ایک بڑے کمرہ میں نماز باجماعت کا انتظام تھا۔ فجر کے وقت میں وہاں پہنچا تو ایک صاحب کھڑے ہوئے اذان دے رہے تھے۔ ان کا دایاں ہاتھ کان پر تھا اور بایاں ہاتھ لٹک رہا تھا۔ حی علی الصلوٰۃ اور حی علے الفلاح پر انھوں نے دائیں یا بائیں رخ نہیں کیا۔ بلکہ سامنے کی طرف رخ کئے ہوئے پوری اذان دیتے رہے

اگلے دن ایک اور صاحب نے اذان دی اور وہ اپنا دونوں ہاتھ لٹکائے رہے۔ انھوں نے ایک حی علے الصلوٰۃ پر دائیں طرف چہرہ کیا اور دوسری حیّ علے الصلوٰۃ پر بائیں طرف۔ اسی طرح حی علے الفلاح پر بھی۔ اسی طرح نماز کی ادائگی میں بھی مختلف قسم کے فرق نظر آتے ہیں۔ یہ فقہی مسالک کا فرق ہے۔ ہندستان میں ان معاملات میں اس قدر شدت ہے کہ مذکورہ بالا طرز پر کسی کو اذان دیتے دیکھیں تو اس کو مسجد سے نکال دیں۔ مگر یہاں ان معاملات میں کوئی شدت نہیں۔

میں نے اپنی کتاب (تجدید دین) میں اس کی حمایت کی تھی کہ فقہی مسائل میں شدّت کے بجائے توسع کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہاں ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ لوگوں نے عجیب عجیب خود ساختہ مطلب نکال کر اس کتاب کو بدنام کیا۔ حالاں کہ یہی لوگ جب باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں تو اس قسم کے فرق کو خندہ پیشانی کیساتھ برداشت کرتے ہیں۔ وہاں ماحول کے دباؤ سے ہر آدمی وہی بات مان لیتا ہے جس کو دلیل کی بنیاد پر وہ اپنے ملک میں ماننے کے لئے تیار نہیں۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایران سے آئے تھے ان سے کافی باتیں ہوئیں۔ وہ تہران یونی ورسٹی کے شعبہ سائنس میں پروفیسر ہیں۔ اور تعلیم کے تحت ساڑھے دس برس امریکہ میں رہ چکے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ نے جو کچھ دیکھا اس میں کیا اچھی چیز تھی اور کیا بری چیز تھی۔ اچھی چیز ان کے الفاظ میں یہ تھی کہ وہ لوگ ہمیشہ بنیادی چیزوں (basic things) پر متوجہ رہتے ہیں اور معمولی چیزوں (minor things) کو ہمیشہ نظر انداز کرتے ہیں۔ مسلم قوموں میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ زیادہ تر معمولی چیزوں میں الجھے رہتے ہیں۔ اور بڑی بڑی چیزیں اکثر ان کی توجہ کا مرکز نہیں بن پاتیں۔

مغرب کی بری چیز کے سلسلے میں انھوں نے میٹریلزم (مادیت) کا نام لیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سوچ اور ان کی دوڑ دھوپ کا مرکز و محور صرف مادی چیزیں ہوتی ہیں۔ اس سے اوپر اٹھ کر وہ سوچ نہیں پاتے۔

ڈاکٹر مہدی گلشنی نے ایران کے حالات کے ذیل میں بتایا کہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی نے ۱۹۷۸ میں ایک امریکی مجلہ (ورلڈ میگزین) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

With an army of 700,00 nobody can overthrow me.

یعنی میرے پاس سات لاکھ فوج ہے۔ کوئی مجھے ایران کے تخت سے بے دخل نہیں کر سکتا۔ اس انٹرویو کے ایک سال بعد فروری ۱۹۷۹ میں شاہ ایران کو نہایت بے دردی کے ساتھ

تخت سے بے دخل کر دیا گیا۔ جب کہ فوج آخر وقت تک شاہ کی وفادار بنی ہوئی تھی۔

ایک گفتگو کے موقع پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ جدید معلومات کی روشنی میں قرآن کی نئی تفسیر کرنا جائز ہے یا نہیں۔ کیوں کہ صحابہ و تابعین کو سارے قرآن کا علم تھا۔ اس لئے وہ جو کچھ تفسیر کر گئے ہیں وہی کافی ہونا چاہئے۔ ایک سعودی عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ جدید تفسیر کے لئے خود صحابی کا اجازت نامہ حاصل ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عباس جو حبر الامۃ کہے جاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ: القرآن یُفسّرہ الزمان۔ یعنی زمانہ قرآن کی مزید تفسیر کرتا رہے گا۔ گویا قرآن کی تفسیر ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ علم کی ترقی کے ساتھ برابر جاری رہے گی۔

ایک مصری ڈیلی گیٹ نے اپنا ذاتی مشاہدہ بتایا کہ جمال عبدالناصر کو جب مصر میں اقتدار ملا تو شروع میں لوگوں نے ان کی زبان سے خوب اسلامی باتیں سنیں۔ حتی کہ انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک تقریر میں جمال عبدالناصر کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں:

ایھا الناس لا تکونوا ابناء الدنیا وتکونوا ابناء الآخرۃ

یہ واقعہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی سیاست داں اگر اسلامی باتیں کرے تو اس کو بہت زیادہ سنجیدہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے عوام کو ساتھ لینا ہوتا ہے۔ اور عوام کو ساتھ لینے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے دینی باتیں کی جائیں۔ یہ ظاہر کیا جائے کہ اس کی حکومت اسلام لانا چاہتی ہے۔ گویا مسلم ملک کے ڈکٹیٹر ٹھیک اسی طرح اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں جس طرح غیر مسلم ملک کے ڈکٹیٹر اسی مقصد کے لئے سوشلزم اور قومی اتحاد کے نعرے استعمال کرتے ہیں۔

کوالالمپور میں روزانہ شام کو کسی نہ کسی منسٹری کی طرف سے کسی عالی شان ہوٹل میں کھانا ہوتا تھا جو میرے لئے سخت وحشت ناک تھا۔ میرے نزدیک اس قسم کی دعوتیں صرف پیسہ اور وقت کا ضیاع ہیں۔ تاہم نظم کی پابندی میں ان میں شرکت کرنی پڑتی تھی۔ البتہ اس میں ۳۰ جولائی کے کھانے کا استثناء تھا۔

۳۰ جولائی کی شام کا کھانا وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ یہ سادہ قسم کی رہائش گاہ ابھی حال میں بنائی گئی ہے۔ تمام لوگ مغرب سے پہلے وہاں پہنچا دئے گئے۔ ایک بڑے ہال کو مکمل طور پر خالی کر کے مسجد کی مانند بنا دیا گیا تھا۔ ایک عرب (ڈاکٹر احمد ذکی) نے امامت کی۔ تقریباً ۷

مقتدیوں میں وزیر اعظم بھی شریک تھے۔ امام نے پہلی رکعت میں یہ آیت پڑھی :

یا داؤد انا جعلناك خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ... النحل ۲۶

اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے "مذہب" امامت کے مقام پر ہے اور وقت کا "حکمراں" اس کے پیچھے کھڑا ہوا احکام خداوندی کو سن رہا ہے۔ یہ واقعہ تھوڑی دیر کے لئے میری نظر میں مستقبل کی تمثیل بن گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں آئندہ آنے والے اس دور کی تصویر دیکھ رہا ہوں جس کی پیشین گوئی احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

نماز کے بعد حاضرین کی طرف سے چند تقریریں ہوئیں۔ آخر میں وزیر اعظم ڈاکٹر محمد (Dr Mahathir Mohammad) نے مختصر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں کے ہاتھوں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ نقصان ہے جو خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو پہنچ رہا ہے۔ انھوں اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اپنے مسائل کے لئے دوسروں کو الزام نہیں دے سکتے۔ ہمیں خود اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا ہوگا :

We cannot blame others. We have ourselves to blame.

یہاں کھانا بھی سادہ تھا۔ کھانا شروع ہوا تو وزیر زراعت ڈاکٹر انور ابراہیم میری میز پر میری کرسی سے ملی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ ملایا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً پچاس فی صد ہے۔ مگر حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان متحد ہیں جب کہ دوسرے فرقے متحد نہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں تبلیغی کام ہو رہا ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم۔ البتہ دوسرے میدانوں میں کافی ترقیاتی کام ہو رہے ہیں۔

اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ ملیشیا میں برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد زیادہ تر مسلمانوں نے کی۔ چوں کہ انھوں نے نوآبادیاتی دور میں جدوجہد آزادی کی قیادت کی تھی اس لئے دور آزادی میں انھیں غالب سیاسی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ہندستان میں بھی مسلمانوں کو اپنی سیاسی تاریخ کی وجہ سے یہ فائدہ مل سکتا تھا۔ مگر تقسیم کی تحریک چلا کر یہاں مسلمانوں نے خود اپنے آپ کو اپنی تاریخ سے کاٹ لیا۔

کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس میں ایک بڑا ہال نماز باجماعت کے لئے خاص کیا گیا تھا۔ یکم اگست کو میں وہاں پہنچا تو میں اکیلا تھا۔ ہال کی لمبی دیواریں پوری کی پوری شیشہ کی تھیں اس لئے باہر کی دنیا بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اندر ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس کے اندر مکمل سناٹا

تھا۔ باہر کی دنیا میں بھی چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف درخت اور پہاڑ اور بادل اور آسمان دکھائی دے رہے تھے۔

اس طرح کی ایک دنیا میں میں اکیلے ایک انسان کی حیثیت سے کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میرا وجود خدا کے وجود کا ثبوت بن رہا ہے۔ جو لوگ خدا کو نہیں مانتے وہ اسی لئے نہیں مانتے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مادی کائنات میں کہیں کوئی زندہ اور باشعور ہستی بھی ہے۔ جو ہم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے۔ انھیں لوگوں کو اس وقت کوئی تعجب نہیں ہوتا جب کائنات کے کسی بعید مقام پر ایک نیا ستارہ دریافت ہو۔ وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں مگر ان کو یہ یقین نہیں آتا کہ یہاں خدا جیسا کوئی زندہ وجود بھی ہے جو کائنات میں کہیں متمکن ہے۔

مگر مذکورہ ہال میں جب میں ایک زندہ وجود کی حیثیت سے تھا اور چیزوں کو دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ تو اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے وجود کی صورت میں خدا کے وجود کو دیکھ رہا ہوں۔" جیسے میں یہاں ہوں اسی طرح خدا بھی تو ہوگا"۔ میں نے سوچا اگر یہاں ایک زندہ شخص موجود ہے تو کسی دوسرے مقام پر دوسری زندہ اور باشعور ہستی کیوں موجود نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے۔ جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ایک ماننے اور دوسرے ماننے میں صرف درجہ کا فرق ہے، ان میں نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

سیمنار کی کارروائی ۲۱ جولائی کی دوپہر کو ختم ہو گئی۔ اس کے بعد شہر میں ایک تقریر کا پروگرام تھا کوالالمپور میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن۔ اس ادارہ کا مقصد مختلف شعبوں میں کام کرنے والے سرکاری افسران کی تربیت کرنا ہے۔ ۲۱ جولائی کی سہ پہر میں یہاں میرا ایک پروگرام تھا۔ طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ایک تقریر ہوئی جس میں ان کے سامنے اسلام کا عمومی تعارف کیا گیا۔ یہ تقریر انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

کوالالمپور میں ایک اسلامی ادارہ ہے جس کا نام ہے،

Regional Islamic Da' wah Council of Southeast Asia and the Pacific

اس ادارہ کے صدر سابق وزیر اعظم تنکو عبد الرحمٰن ہیں۔ اور اس کے ڈائرکٹر ایک امریکی نومسلم ہیں جن کا نام حاجی فضل اللہ ولموٹ ہے۔ یہ نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ولموٹ صاحب کے پاس انگریزی الرسالہ آتا ہے۔ ان سے کوالالمپور میں وزیر اعظم کی رہائش گاہ

پر ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ " آپ کا انگریزی الرسالہ ہم کو برابر مل رہا ہے اور بہت پسند ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ مسلم دنیا میں غالباً اتنا اچھا کوئی دوسرا انگریزی رسالہ موجود نہیں "

الرسالہ کے انگلش اڈیشن کے بارہ میں اس طرح کے تاثرات مختلف مقامات سے مل رہے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص نے لکھا ہے " انگریزی الرسالہ کا ترجمہ بہت شاندار ہوتا ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی بے حد موزوں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس دعوتی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرے "

ایک روز ایک عرب عالم نے ایک شخص سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا انھوں نے ایک کتاب (الاسلام یتحدیٰ) لکھی ہے جس کو ہماری نسل کے ہر نوجوان نے پڑھا ہے۔ (قرأہ کل شاب فی جیلنا) یہاں سیمنار میں بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ عرب آئے تھے۔ وہ سب کے سب میری مذکورہ کتاب پڑھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی ان کو معلوم ہوتا کہ الاسلام یتحدیٰ کا مصنف یہاں موجود ہے، وہ بڑے جوش اور محبت کے ساتھ ملتے۔ مگر سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ ان کو " الاسلام یتحدیٰ " کے بعد میری سرگرمیوں کے بارہ میں صرف یہ معلوم تھا کہ میں ایک بدنام حکمراں سے وابستہ ہوں۔ اس کے سوا انھیں میری سرگرمیوں کے بارہ میں بہت کم واقفیت تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ۱۹۶۷ سے ۱۹۷۴ تک الجمعیۃ ویکلی کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی تعمیر کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۷۶ سے اردو الرسالہ برابر جاری ہے اور ادارہ الرسالہ کے تحت میری کئی درجن اردو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ " بدنام حکمراں " سے وابستگی کے مفروضہ کا تعلق بھی میری اردو تحریروں سے ہے اور مذکورہ تعمیری اور دعوتی کام بھی اردو میں ہوا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عرب علماء کو اردو کے ایک جزء کا علم مغالطہ آمیز اضافوں کے ساتھ ہے اور دوسرے بڑے جزء کا انھیں کوئی علم نہیں۔

اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب اردو زبان سے واقف نہیں۔ اس لئے ان کو واقف کرانے والے ہمارے اردو داں دوست ہیں۔ جو مختلف اسباب کے تحت آجکل تمام عرب دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی حضرات اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو میں ہونے والے ۹۹ فی صد کام سے ان کو باخبر نہیں کیا۔ اور اردو کے ایک فی صد جزء کو تحریف اور تغیر کے ساتھ بڑھا

چڑھا کر غلط شکل میں بتایا۔

وہ لوگ جن کو دوسرے کے اعتراف کے لئے سچے الفاظ نہ ملیں، البتہ اس کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹے الفاظ مل جائیں، وہ اپنے عمل سے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ اسلام کے اس آخری معیار پر بھی قائم نہیں کہ: من کان یومن باللہ والیوم الاٰخر فلیقل خیرا او لیصمت۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کو میں نے کوالالمپور چھوڑا۔ اور تھائی ایئرویز کی فلائٹ نمبر ۴۱۶ سے واپس روانہ ہوا۔ بنکاک سے دہلی کا سفر ایئر فرانس کی فلائٹ نمبر ۱۷۵ سے ہوا۔

۲ اگست کی صبح کو جب میں کوالالمپور کے انٹرنیشنل ہاؤس سے نکلا تو میری زبان پر یہ فقرہ تھا: خدایا، جب تک آپ نے چاہا مجھ کو یہاں رکھا اور جب آپ نے چاہا مجھ کو یہاں سے لے جا رہے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں جب تک آپ چاہیں گے رکھیں گے اور جب چاہیں گے یہاں سے اٹھا لیں گے۔ خدایا، مجھ کو دنیا میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھئے اور آخرت میں بھی اپنی رحمتوں کے سایہ میں جگہ دیجئے۔

کس قدر مشابہت ہے دنیا میں اور آخرت میں، حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو دنیا کا ہر واقعہ اس کے لئے آخرت کی یاد دلانے والا بن جائے گا۔

ایئر فرانس کے جہاز میں ضروری ہدایات عربی زبان میں بھی لکھی ہوئی نظر آئیں۔ یہ تیل کی قوت کا ایک اعتراف تھا۔ مثلاً بچاؤ سے متعلق ہدایات کے کارڈ پر لکھا ہوا تھا —— تعلیمات الطواری۔ یعنی حفاظتی ہدایات۔ اسی طرح ایک لفافہ اور ایک ورق فراہم کیا گیا تھا تاکہ مسافر حضرات اس پر اپنے تاثرات لکھیں۔ اس پر عربی زبان میں یہ عبارت درج تھی:

الرجاء تزويدنا بملاحظاتكم على خدمتنا على الأرض واثناء السفر وان تدونوا كذلك مقترحاتكم على هذه البطاقة ثم ارسالها بالبريد او تسليمها الى طاقم الطائرة. شكرا.
الخطوط الجوية الفرنسيـــــة.

یعنی آپ سے درخواست ہے کہ زمین پر اور سفر کے دوران ہماری خدمات کے بارہ میں اپنے خیالات اور تجویزیں اس کارڈ پر لکھیں اور پھر اس کو یا تو ڈاک سے ہمیں روانہ کریں یا جہاز کے عملہ کو دستی طور پر دے دیں۔ ایئر فرانس کی طرف سے شکریہ۔

انسان صرف اپنے ماحول میں مطمئن رہتا ہے۔ اگر اس کو اس کے ماحول سے الگ کر دیا جائے تو وہ بے چین ہو کر رہ جائے گا۔ کوالالمپور کے دس روزہ قیام میں اگرچہ بظاہر ہر قسم کی سہولتیں تکلفات کے درجہ میں حاصل تھیں۔ مگر اپنے ماحول سے دوری کی بنا پر ایک ایک دن گزارنا مشکل معلوم

ہوتا تھا۔

۲ اگست ۱۹۸۴ کی شام کو جب میں سفر سے واپس ہوکر دہلی پہنچا تو میرا حال اس جانور کا سا ہوا جو پنجرہ میں بند ہو اور پھر اس کو پنجرہ سے نکال کر دوبارہ اس کے طبعی ماحول (habitat) میں پہنچا دیا جائے۔ میں نے سوچا ـــــ کوالالمپور سے دہلی واپس آنے کے لئے میرے پاس ریٹرن ٹکٹ موجود تھا، اس لئے بآسانی میں اپنے وطن واپس آگیا۔ مگر موت کے بعد آدمی کا کیا حال ہوگا۔ کیوں کہ موت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں آدمی کے پاس واپسی کا ٹکٹ نہیں ہوتا۔

آہ، کیسا عجیب دن انسان کے اوپر آنے والا ہے مگر اس کے باوجود وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

ایک سفر

ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے سلسلہ میں مراکو کا سفر ہوا۔ جولائی ۱۹۸۴ میں ملیشیا جانا ہوا تھا۔ اب نومبر ۱۹۸۴ میں مراکو جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ گویا اس مسلم دنیا کا ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف سفر تھا جو ملیشیا اور انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک پھیلی ہوئی ہے۔

مراکو مغرب کی سمت میں افریقہ کا آخری ملک ہے جو اسپین کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ اس ملک کا دوسرا نام مغرب ہے۔ مراکو کا رقبہ دو لاکھ ۷۵ ہزار مربع میل ہے۔ اور آبادی ۲۰ ملین سے کچھ زیادہ ہے جس میں بیشتر تعداد مسلمانوں کی ہے۔ اس کی راجدھانی رباط ہے اور شاہ حسن ثانی اس کے موجودہ حکمراں ہیں۔

مراکو کو بنو امیہ کے دور میں عقبہ بن نافع نے فتح کیا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقبہ بن نافع نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔ جب وہ خشکی کو فتح کرتے ہوئے مراکو کی آخری سرحد پر پہنچے جس کے آگے اٹلانٹک سمندر موجیں مار رہا تھا تو انھوں نے اسلامی جوش کے تحت اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا اور پانی کے اندر کھڑے ہو کر کہا:

واللہ لو علمت ان وراء ھذا البحر بلدا لخضته حتی لا یعبد احد دونک	خدا کی قسم اگر میں جانتا کہ اس سمندر کے پار بھی کوئی ملک ہے تو میں سمندر کو عبور کر کے وہاں پہنچتا یہاں تک کہ ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

دور اول کے مسلمان جس مقصد کے لئے سرشار ہو کر اٹھے تھے وہ لوگوں کو خدائے واحد کا عبادت گزار بنانا تھا۔ نہ کہ ملکی فتوحات حاصل کرنا۔ مگر بعد کی نسلیں اس راز کو بھول گئیں۔ انھوں نے فتوحات اور سیاسی کارناموں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اسی وقت سے مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا۔

۲۵ نومبر کو جب میں نے یہاں اپنے ہوٹل کے کمرہ میں کھڑے ہو کر اٹلانٹک کی لہروں کو موجیں مارتے ہوئے دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ موجیں آج بھی عقبہ بن نافع کے اس تاریخی قول کی امانت لئے ہوئے ہیں اور اس کو توحید کا نام لینے والوں تک پہنچا دینا چاہتی ہیں۔

مراکو کی فتح کے بعد طارق بن زیاد کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا۔ یہ وہی طارق بن زیاد ہے جس کے نام سے جبل الطارق (جبرالٹر) موسوم ہے۔ اس نے آبنائے جبرالٹر کے مقام پر سمندر کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہو کر اس کا بڑا حصہ فتح کر ڈالا۔ اس کے بعد اسپین کی تقریباً آدھی آبادی مسلمان ہو گئی۔ مگر بعد کو جب

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے نتیجہ میں مسیحی دوبارہ اسپین میں غالب آگئے تو انھوں نے چاہا کہ اسپین سے اسلامی تاریخ کو بالکل مٹا دیں۔ انھوں نے زبردست مظالم کئے چنانچہ مجبور ہو کر یہاں کے مسلمان یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے یا دوبارہ مسیحی بن گئے۔

مراکو میں فرانسیسی ۱۹۰۱ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ تک مراکو پر باقاعدہ قبضہ کر لیا۔ اسی دوران اسپینی بھی مراکو کے اس حصہ میں داخل ہو گئے جو ان کے قریب سمندر کی دوسری طرف تھا۔ تاہم ۱۹۵۶ میں فرانس اور اسپین دونوں سلطان کے حق میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ اب مراکو مکمل طور پر ایک آزاد ملک ہے۔

راقم الحروف نے مراکش (مراکو) کا نام سب سے پہلے بچپن میں شبلی نعمانی کی نظموں کے ذریعہ سنا تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں مراکش پر مغربی قوموں کا قبضہ ہو گیا تو شبلی نعمانی نے ایک نظم میں کہا تھا:

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے　　کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

مراکش (مراکو) اور فارس (ایران) اگرچہ آج مغربی اقوام کے سیاسی قبضہ سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے مغربی تہذیب کے قبضہ سے نکلنے میں بھی کامیابی حاصل کر لی ہے۔

مراکش (بتشدید الراء) یہاں کا ایک قدیم شہر ہے۔ یورپی لوگ اکثر اسی نام کی نسبت سے یہاں کی حکومت کو حکومت مراکش کہتے تھے۔ اس طرح مراکش پورے ملک کے لئے بھی بولا جانے لگا۔ یہی لفظ بعد کو خود یورپینوں کے اثر سے بگڑ کر مراکو (Morocco) بن گیا۔ مراکو دراصل مراکش کی بدلی ہوئی مغربی شکل ہے۔ مراکو ہی وہ ملک ہے جہاں سے گزر کر مسلمان یورپ میں داخل ہوئے تھے۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۴ کو صبح سویرے ایر انڈیا (۱۳۱) کے ذریعہ دہلی سے روم کے لئے روانگی ہوئی۔ ہوائی جہاز کی ایجاد نے موجودہ زمانہ میں دور دراز مقامات کے سفر کو بہت آسان بنا دیا ہے۔ مگر خود ہوائی کمپنی کے لئے یہ صنعت براہ راست نفع بخش نہیں۔ بالواسطہ نفع کی بنیاد پر آج تقریباً تمام ملکوں نے اپنی ہوائی کمپنیاں قائم کر رکھی ہیں۔ مگر اکثر ہوائی کمپنیاں خسارہ پر چل رہی ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہوائی مسافروں کی کمی ہے۔ چنانچہ اکثر جہاز اپنی وسعت سے کم مسافر لے کر چلتے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ ہوائی جہاز ہیں جو خلیج کے مسافروں کو لے کر چلتے ہیں۔ کیوں کہ اس علاقہ میں پچھلے برسوں میں سفر بہت بڑھ گیا ہے۔

جہاز کے اندر مختلف اخبار ورسائل پڑھنے کو ملے۔ ٹائم میگزین (۱۹ نومبر ۱۹۸۴) کو الکشن اسپشل کے طور پر چھاپا گیا ہے۔ اس میں بہت سی دل چسپ باتیں تھیں صفحہ ۴۹ پر امریکی لیڈر مانڈیل (Mondale) کا ایک قول درج تھا:

We're dealing with real problems, and we want real answers. This is not Hollywood.

ہم حقیقی مسائل سے نمٹ رہے ہیں اور ہم حقیقی جوابات چاہتے ہیں۔ یہ ہالی وڈ نہیں ہے۔

ہالی وڈ امریکہ کی فلمی دنیا کا نام ہے۔ فلم کی دنیا میں طرح طرح کے کردار ادا کئے جاتے ہیں مگر وہ سب کے سب غیر حقیقی ہوتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ ہر قسم کی طاقت رکھنے کے باوجود یہ جانتے ہیں کہ فلمی دنیا والی کارکردگی دکھانے سے حقیقی دنیا میں نتائج نہیں نکل سکتے۔ مگر اسی دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کے پاس کوئی طاقت نہیں۔ اس کے باوجود وہ فلمی دنیا جیسے ڈرامے دکھا کر یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی میں کامیابی کا ہمالیہ پہاڑ بنالیں گے۔

ان دنوں روس کے بچوں کے تھیٹر کے ڈائرکٹر پچنیکوف (Gennady M. Pechnikov) ہندستان آئے ہوئے تھے۔ پیٹریاٹ (۲۴ نومبر ۱۹۸۴) میں ان کا ایک بیان شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے رامائن اور مہابھارت پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ اس سلسلہ میں یہ جملہ بھی تھا:

Ramayana is much more than a religious book. It reflects man's eternal quest for truth.

رامائن کی حیثیت مذہبی کتاب سے بہت زیادہ ہے۔ وہ خارجی دنیا میں انسان کی تلاش حق کی عکاسی کرتی ہے۔

پچنیکوف نے یہ بات اس لئے کہی کہ وہ اپنے اشتراکی ذہن کی وجہ سے مذہب کو صرف ایک مفروضہ روایت سمجھتے ہیں۔ اگر وہ مذہب کی حقیقت کو جانتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ مذہب اور سچائی دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ انسان کی تلاش حق کے صحیح جواب ہی کا دوسرا نام مذہب ہے۔

دہلی سے ٹھیک ساڑھے چھ بجے صبح کو روانگی ہوئی۔ نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہمارا جہاز روم میں اترا۔ دہلی سے روم کا فاصلہ سات ہزار کلومیٹر سے کچھ زیادہ ہے۔

میں اگلے جہاز کے انتظار میں روم کے بین اقوامی ہوائی اڈہ پر تھا۔ میرے سامنے ہوائی اڈہ کا وسیع میدان پھیلا ہوا تھا۔ ایک کے بعد ایک جہاز روانہ ہو رہے تھے۔ ابتداءً وہ کھڑے ہوئے نظر آتے پھر وہ متحرک ہو کر تیز دوڑنے لگتے۔ پھر وہ فضا میں بلند ہو کر اڑنے لگتے۔ بظاہر جہاز ایک بے جان مادہ کا مجموعہ ہے مگر یہی بے جان مادہ متحرک ہو کر تیزی سے چلنے لگتا ہے۔

"یہ واقعہ بھی موسیٰ کے عصا سے کم عجیب نہیں،" میں نے سوچا " وہ اندھے لوگ تھے جن کو عصا کا معجزہ دکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ ورنہ یہاں کائنات کی ہر چیز معجزہ ہے۔ حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا متحرک

ہوکر زمین پر چلنے لگنا جتنا عجیب ہے آتنا ہی عجیب یہ بھی ہے کہ بے حرکت مادہ ایسی سواریوں میں تبدیل ہوجائے جو دوڑتی ہیں، جو اڑتی ہیں۔ جو تیز رفتاری کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو بھی وہی خدا چلا رہا ہے جس نے موسٰی کے عصا کو چلایا تھا۔

اس حقیقت کی طرف خود قرآن میں اشارہ موجود ہے۔ حضرت موسٰی کے عصا کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ: فاذا ھی حیـــۃ تســـعٰی اور عام چیزوں کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ یخرج الحی من المیت ان دونوں آیتوں کے الفاظ الگ الگ ہیں۔ مگر دونوں آیتیں ایک ہی حقیقت کو بتا رہی ہیں۔ روزمرہ کے مشاہدہ میں مادہ کا زندہ چیز بن کر چلنے لگنا بھی اسی خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے جس کے حکم سے ایک لاٹھی سانپ بن کر چلنے لگی تھی۔

روم میں چند گھنٹے قیام کے بعد ایر مراک (۹۵۵) کے ذریعہ آگے کے لئے روانگی ہوئی۔ شام کو میں کیسا بلانکا پہنچا۔ یہ مراکو کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کا کچھ حصہ پرانے وضع کا ہے اور کچھ حصہ جدید وضع پر بنایا گیا ہے۔ یہ اس ملک کا تجارتی مرکز ہے۔ بیرونی ملکوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے ہیں، تجارت کے لئے بھی اور سیاحت کے لئے بھی۔

کیسا بلانکا اٹلانٹک کے عین ساحل پر واقع ہے۔ اس کا قدیم عربی نام الدار البیضاء ہے۔ مغربی استعمار کے زمانہ میں وہ کیسا بلانکا (Casablanca) کے نام سے مشہور ہوا۔ دونوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی سفید گھر۔ الدار البیضا عربی لفظ ہے اور کیسا بلانکا اسی کا اسپینی مترادف ہے۔

کیسا بلانکا میں میرا قیام ہوٹل سفیر (روم ۱۲۰۷) میں تھا۔ یہ ہوٹل اٹلانٹک کے ساحل کے قریب ہے۔ یہاں سے اٹلانٹک کی موجیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جب اس پر نظر پڑی تو یہ سوچ کر میری عجیب کیفیت ہوئی کہ یہی وہ سمندر ہے جس کے دوسری طرف کھڑے ہو کر طارق بن زیاد نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا: البحر وراءکم والعـــدو امامکم (سمندر تمہارے پیچھے ہے اور دشمن تمہارے آگے ہے) پھر یہیں سے گزر کر طارق بن زیاد اسپین میں داخل ہوا اور یورپ میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کیا۔ اگرچہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے یہ پیش قدمی زیادہ دور تک نہیں پہنچ سکی۔ تاہم یہ تاریخ مسلمانوں کو بہت بڑا سبق دے رہی ہے۔ یہ کہ انھیں کیا کرنا چاہئے اور یہ بھی کہ انھیں کیا نہیں کرنا چاہئے تاکہ ان کی قوتیں اسباب کی اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر نہ رہ جائیں۔

۲۵ نومبر کو میں ہوٹل کے باہر کی سڑک پر ٹہل رہا تھا کہ پولس کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے عربی میں بات شروع کی۔ مجھے اس کے لہجہ کو سمجھنے میں دقت پیش آئی۔ میں نے اس سے اپنا کلام دہرانے کے

لئے کہا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا کہ یہ تو ہم فصیح عربی زبان میں بولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ہم مراکو کے لہجہ میں عربی بولیں تو وہ آپ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس کے بعد وہ مراکو کے لہجہ میں بولنے لگا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا وہ عربی کے علاوہ کوئی اور زبان بول رہا ہے۔

حضرت علی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف عرب قبائل سے ان کی اپنی بولی میں گفتگو کرتے تھے اور ہم اس کو بالکل سمجھ نہیں پاتے تھے۔ یہ صورت حال اسی لہجہ کے فرق سے پیدا ہوتی تھی۔ لہجہ کا فرق سننے والے کے لئے ایک زبان کو ایسی زبان بنا دیتا ہے جیسے وہ کوئی دوسری زبان ہو۔

ہندستان میں میں پچھم کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتا تھا۔ مراکو میں اس کے برعکس پورب کی طرف رخ کرکے نمازیں ادا کیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو قبلہ کے دوسری سمت میں واقع ہے۔ اس سفر نے مجھے زمین کے ایک طرف سے اٹھا کر اس کی دوسری طرف پہنچا دیا تھا۔ مراکو میں اس طرح نماز پڑھتے ہوئے اچانک یہ احساس ہوا کہ مسلمان "پورب" اور "پچھم" کا پابند نہیں، وہ صرف "قبلہ" کا پابند ہے۔ دنیا اس رخ پر جا رہی ہو یا اس رخ پر، ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم خدا کے رخ پر قائم رہیں، ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے کبھی نہ ہٹیں۔

کیسا بلانکا میں شہر کے اندرونی حصوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جو یہاں کا باشندہ ہے۔ مگر وہ صرف فرانسیسی میں بول سکتا تھا۔ عربی زبان بولنے پر قادر نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کچھ ایسے خاندان بھی ہیں جو فرانسیسی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے۔ یہ فرانس کے دور اقتدار کی نشانی ہے۔ یہاں ٹیلی وژن سے لے کر زبان اور فرنیچر ہر چیز پر فرانسیسی تہذیب کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام پس منظر میں جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کہ وہ ایک تاریخی روایت بن گیا ہو۔

کیسا بلانکا کی مختلف سڑکوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ مگر سڑک پر کوئی مسجد یا مینار دکھائی نہیں دیا۔ اذان کی آواز بھی کسی وقت سننے میں نہیں آئی۔ سڑکوں پر ہوٹل اور بینک اور دفاتر کی بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے درمیان کہیں مسجد ابھری ہوئی نظر نہ آئی۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ مسجدیں سڑکوں کے پیچھے پائی جاتی ہیں۔ تاہم وہ زیادہ شاندار نہیں ہیں۔

ہندستان سے نکل کر ہم بہت سے ملکوں سے گزرتے ہوئے مراکو پہنچے۔ مثلاً خلیج عرب کے ممالک، شام ترکی، یونان، اٹلی وغیرہ۔ ان ملکوں میں سے کسی کا میرے پاس ویزا نہیں تھا۔ جب کہ مراکو میں داخلہ کے لئے مجھے نئی دہلی کے سفارت خانہ سے باقاعدہ ویزا لینا پڑا۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مراکو میں میں زمینی مسافر تھا اور یہاں مجھ کو قیام کرنا تھا۔

جب کہ دوسرے ملکوں کا میں نے صرف ہوائی سفر کیا اور ان کی زمین پر نہیں اترا ــــــ اگر آپ کسی شخص یا قوم کے اوپر اوپر گزر جائیں تو وہ آپ سے تعرض نہیں کرتا لیکن اگر آپ اس کی حقیقی زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کریں تو وہ تعرض کرے گا اور آپ کے خلاف رکاوٹیں ڈالے گا۔

قوموں کا یہ مزاج زندگی میں کامیابی کا نہایت گہرا اصول دیتا ہے۔ یہ کہ آدمی لوگوں کو چھیڑے بغیر اپنا کام کرے۔ وہ اپنا منصوبہ اس طرح پورا کرے کہ وہ لوگوں کو بالکل بے ضرر معلوم ہو۔ شاید یہی وہ بات ہے جس کو حضرت مسیح نے ان لفظوں میں فرمایا تھا "تم سانپ کی مانند ہوشیار اور کبوتر کی مانند بے آزار بنو۔"

بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان اس کے برعکس ثابت ہوئے ہیں۔ ان کے لیڈر ضرر رسانی سے اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔ دین کے نام پر قتل، دین کے نام پر نفرت، دین کے نام پر جھگڑوں اور ہنگاموں نے اکثر ملکوں میں دینی کام کرنے کو انتہائی دشوار بنا دیا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب جو کیسا بلانکا کی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ملک میں مسلمان چوں کہ عام طور پر پرامن ہیں اور وہ بڑی حد تک سیاست سے الگ رہتے ہیں، اس لئے وہاں تبلیغ اسلام کے کام پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں اگرچہ عیسائی حکومت ہے مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتی۔ چاہے سارے لوگ اسلام سے نکل جائیں یا سارے لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں (الحکومة لا تهتم بذالك فليخرجوا كلهم او يدخلوا كلهم)۔ یہی صورت حال تقریباً پورے افریقہ میں ہے۔

اس صورت حال نے افریقہ کے عظیم براعظم میں اس کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ یہاں بغیر روک ٹوک اسلام کی اشاعت کی جاسکے۔ اگرچہ عملاً ابھی اس امکان کو بہت کم استعمال کیا جاسکا ہے ــــ کچھ ملکوں میں مسلمان اپنے خلاف جھوٹی رکاوٹیں کھڑی کر کے دینی کام کی راہ میں مشکلات پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور کچھ ملکوں میں اپنی غفلت کی وجہ سے مواقع کو استعمال کرنے سے محروم ہیں۔ نتیجہ دونوں جگہ یکساں ہے۔ اگرچہ ایک مقام پر ایک سبب سے اور دوسرے مقام پر دوسرے سبب سے۔

میرے پاس کانفرنس کی طرف سے جو ٹکٹ آیا تھا اس میں ۲۴ نومبر کا پیشگی رزرویشن تھا۔ میں نے سمجھا کہ شاید ۲۵ نومبر سے کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ رزرویشن کے مطابق ۲۴ نومبر کو دہلی سے روانہ ہو کر اسی دن شام کو کیسا بلانکا پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اصل کارروائی ۲۸ نومبر سے شروع ہوگی۔ اس طرح مجھے تین دن (۲۵ - ۲۶ - ۲۷ نومبر) غیر ضروری طور پر کیسا بلانکا میں گزارنے پڑے۔ یہ تین دن اگرچہ مجھے " فائو اسٹار ہوٹل " میں گزارنا تھا۔ مگر یہ تین دن آتنی مشکل سے گزرے کہ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ تین صدیاں گزر گئیں۔ میں نے آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے بالوں کی سفیدی میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔ جن لوگوں کے سامنے کوئی برتر مقصد نہ ہو ان کے لئے اس طرح کے ایام تفریح کے ایام ہوتے ہیں۔ مگر ایک با مقصد انسان کے لئے تین دن یقیناً تین صدیوں سے کم نہیں۔

وہ چیز جس کو فائیو اسٹار ہوٹل کہتے ہیں حقیقۃً ایئر کنڈیشنڈ جیل خانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایسے ہوٹلوں میں آدمی کو ایک ایسے ماحول میں بند کر دیا جاتا ہے جہاں ہر چیز مصنوعی ہوتی ہے۔ دھوپ کی جگہ بجلی، ہوا کی جگہ ایئر کنڈیشنر، گھاس کے فرش کی جگہ قالین، سبزہ کی جگہ پلاسٹک کے پھول اور پودے۔ چڑیوں کے نغمے کی جگہ انسانی موسیقی، نیلے آسمان کی جگہ منقش چھت، غرض ہر چیز مصنوعی طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ آدمی بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے سے قدرت کے مناظر دیکھتا ہے مگر وہ ان سے براہ راست مربوط نہیں ہوسکتا۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ قدرت کے مشینی بدل کے اندر محبوس ہو کر اپنے صبح و شام گزارتا رہے۔

ہوٹل سفیر میں میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ اس کے اندر کوئی کھلی ہوئی جگہ ہے جہاں قدرتی ہوا اور دھوپ مل سکے۔ انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ انھوں نے ہر قدرتی چیز کو بند کر رکھا ہے (ھم قفلوا کل شئ)۔ تلاش و جستجو کے بعد بالآخر میں نے ایک جگہ ڈھونڈ نکالی اور وہاں جا کر دھوپ اور کھلی ہوا میں بیٹھنے لگا۔ میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے انھوں نے کہا آپ کو اس قسم کا ماحول بہت پسند ہے۔ میں نے کہا، اس میں مجھے ایک قسم کا ربانی لمس محسوس ہوتا ہے۔

اس کانفرنس میں مختلف ملکوں اور براعظموں کے لوگ شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں نے افریقہ کے ایک صاحب سے افریقہ کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے بارہ میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم ان میں آئی ہے مگر ابھی اس معاملہ میں وہ اپنے پڑوسی عیسائیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ ماضی میں ہمارے لوگوں کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ تعلیم ایک ایسی چیز ہے جو آدمی کو ایمان سے دور کر دیتی ہے (التعلیم شئ یُبعد الرجل من الایمان)۔ یہی حال ہندستان میں بھی مسلمانوں کا ہوا ہے۔

جن بزرگوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا وہ اگرچہ نیک نیت تھے۔ مگر ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم کی نوعیت کو سمجھ نہ سکے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کمیونزم کی تعلیم سے روکتے تو یہ صحیح ہوتا کیونکہ کمیونزم ذہن کے فساد کا دوسرا نام ہے۔ مگر انھوں نے سائنس کی تعلیم سے بھی مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ حالانکہ سائنس موجودہ زمانہ میں قوت کے ہم معنی تھی۔ سائنس کی تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے مسلمان دور جدید میں کم از کم سو سال پیچھے ہو گئے۔ مسلمانوں کے پاس اگرچہ قدرتی ذخائر کی کثرت ہے۔ مگر دوسری قومیں ان کا

استغلال کر رہی ہیں اور اپنی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے وہ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔

کیسا بلانکا میں شراب اور نائٹ کلب تک کی آزادی ہے۔"پورک" کی دکان بھی نظر آئی۔ اس لئے یہاں مغربی سیاح کثرت سے آتے ہیں۔ یہ سیاحوں کا شہر بن گیا ہے۔ ایک عرب اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ آئے اور ہوٹل سفیر میں مقیم ہوئے۔ وہ غالباً سیاحت کی غرض سے یہاں آئے تھے۔ میں نے دیکھا تو ان کے بیوی بچے فیشن کے سامان اور جدید طرز کے کھلونوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ان عرب صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف بے تکان بولنے لگے۔ میں نے سوچا کہ وہ لوگ بھی کیسے عجیب ہیں جو خود تو عملاً اپنے پورے خاندان کے ساتھ مادی تہذیب میں غرق ہیں اور زبان سے اس کے خلاف تقریر کرنے میں مشغول ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ میں اکثر پڑھے لکھے مسلمانوں کا حال ہو گیا ہے۔ وہ جدید مادی تہذیب کے خلاف خوب لکھتے اور بولتے ہیں مگر ان کے گھر کو اور ان کے بیوی بچوں کو دیکھئے تو سراپا مادی تہذیب میں ڈوبے ہوئے نظر آئیں گے۔ حتیٰ کہ ایک مسلمان جو میرے ساتھ ہوائی جہاز میں میرے بغل کی سیٹ پر تھے، انھوں نے ہوائی جہاز کی ضیافت کو قبول کرتے ہوئے شراب لی۔ اتفاق سے وہ بھی اسی ہوٹل سفیر میں آکر ٹھہرے۔ ایک ملاقات کے دوران ان سے گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ "آجکل مسلمانوں کے معاملات بالکل غیر اسلامی ہو گئے ہیں"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کے لئے اسلام بھی مختلف فیشنوں میں سے ایک فیشن بن گیا ہے۔ ہر مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود جو چاہے کرے۔ اس کو اپنے آپ پر اسلام کو نافذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی اسلامیت کے ثبوت کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دوسروں کی غیر اسلامی روش پر لکھنے اور بولنے کی لاتنا ہی صلاحیت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر لکھنے اور بولنے والے بے شمار تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں مگر لوگوں کا یہی وہ تضاد ہے جس نے ان کی تمام کوششوں کو بالکل بے نتیجہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

کیسا بلانکا میں چڑیاں کافی نظر آئیں۔ مگر یہ سب سمندری چڑیاں تھیں۔ جانور ہمیشہ اپنے ماحول کی مناسبت سے جمع ہوتے ہیں۔ سمندری ماحول میں سمندری چڑیاں، صحرائی ماحول میں صحرائی چڑیاں اور سرسبز پہاڑوں کے ماحول میں پہاڑی چڑیاں۔ یہی حال انسانوں کا بھی ہے۔ وہ بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی تحریک کے ساتھ سیاست کی چاشنی لگا دیں تو سیاسی ذوق کے لوگ جوق در جوق آپ کے پاس اکٹھا ہو جائیں گے۔ اگر آپ کی تحریک کے ساتھ تصوف کی غذا موجود ہو تو برکت تلاش کرنے والوں کی بھیڑ آپ کے گرد نظر آنے لگے گی۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو کینیا سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ ان کی

عمر ابھی ۳۷ سال ہے۔ مگر کم عمر ہونے کے باوجود انھوں نے وہ کام کیا ہے جو بڑوں کے کام سے زیادہ قیمتی ہے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Shariff Salim Shariff Hussein
P.O. Box 128, Marsabit, Kenya. E. Africa

آجکل کی زبان میں وہ کوئی معروف و مشہور آدمی نہیں مگر انھوں نے بہت قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ جناب شریف سالم شریف حسین نے بتایا کہ وہ پہلے راجدھانی نیروبی میں رہتے تھے۔ وہاں ان کے لئے ذاتی اعتبار سے بہت مواقع تھے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ شہروں سے کام کرنا مکان کو گویا چھت کی طرف سے تعمیر کرنا ہے۔ وہ نیروبی چھوڑ کر ایک ہزار کلو میٹر دور ایک گاؤں مرسابت چلے گئے۔ وہاں اس وقت ان کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے بنیاد کھود کر ایک مدرسہ اور مسجد بنایا۔ انھوں نے کچھ ساتھیوں کو جوڑ کر یہ کوشش کی کہ لوگوں کے ذہن کو جگائیں۔ انھوں نے غریب بچوں کے کپڑے فراہم کئے۔ انھوں نے ضرورت مند کسانوں کو مویشی خرید کر دئے۔ اس علاقہ کے لوگ بہت غریب ہیں۔ مگر انھوں نے لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کیا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں تمہاری سب سے بڑی دولت ہیں مثلاً وہ ایک گاؤں میں گئے۔ وہاں وعظ کیا۔ گاؤں والوں نے کہا ہمارے یہاں نہ مسجد ہے اور نہ مدرسہ۔ انھوں نے کہا کہ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ تمہارے پاس پانی ہے۔ مٹی ہے پتھر ہے لکڑیاں ہیں۔ اور خدا کے دئے ہوئے ہاتھ ہیں ان کو استعمال کرو۔ چنانچہ ان کی تحریک سے لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اینٹ تیار کی اور لکڑیاں جمع کیں اور تھوڑی سی سمینٹ خرید کر خود اپنی محنت سے ایک مسجد اور مدرسہ کھڑا کر دیا۔

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ مسجد اور مدرسہ اگر کسی بیرونی ملک کے ڈالر سے بنا ہوتا تو کسی کو اس سے دلچسپی نہ ہوتی۔ مگر آج گاؤں والوں کو اس کی ایک ایک اینٹ سے محبت ہے کیونکہ اس اینٹ کو انھوں نے خود اپنا پسینہ بہا کر بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پورا علاقہ اس سے پہلے پس ماندہ حالت میں پڑا ہوا تھا مگر آج اس کو ہمارے گاؤں نے جگا دیا ہے (ولکن قرءیتنا ھذا الاٰن ایقظتھم)

وہ تعلیم، تعمیر، دعوت اور اصلاح ہر میدان میں کام کر رہے ہیں انھوں نے اس کی جو تفصیل بتائی اس کو لکھنے کے لئے ایک پورا مضمون چاہئے تاہم اس کو سن کر میرے دل نے کہا کہ یہی غیر معروف لوگ ہیں جو دراصل اسلام کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ جہاں تک معروف اور مشہور لوگوں کا تعلق ہے انھوں نے تو اسلام کے نام پر اپنی شخصیت کی تعمیر کی ہے نہ کہ خود اسلام کی۔

۲۷ نومبر کو جب میں صبح ۴ بجے سو کر اٹھا تو اچانک خیال آیا کہ اگر دنیا سے ہوائی جہاز کا نظام ختم ہو جائے پانی کے مشینی جہاز بھی موجود نہ رہیں تو میں کیسا بلانکا سے دہلی کس طرح واپس جاؤں گا۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو اتنا دور دراز سفر طے کرکے دوبارہ میرے لئے اپنے وطن واپس پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ اگر میں کسی طریقہ سے واپس روانہ ہوں تو شاید راستہ ہی میں مر جاؤں گا۔ غالب گمان یہ ہے کہ میرے مرنے کی خبر بھی میرے گھر والوں کو نہ مل سکے گی۔

ہمارے وہ اسلاف کیسے عجیب لوگ تھے جنھوں نے مشینی انقلاب سے پہلے خدا کے دین کو سارے عالم میں پہنچایا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے کیا کیا مشقتیں اٹھائی ہوں گی، آج کے ایک انسان کے لئے ان کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں ——— دین کا جو کام انھوں نے محنتوں کے ذریعہ کیا اس کو آج ہم سہولتوں کے ذریعہ بھی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ریاض کے اخبار الشرق الاوسط (۲۸ نومبر ۱۹۸۴) میں ایک مضمون اسرائیل کے بارہ میں تھا۔ اس میں یہ قصہ درج تھا کہ ایک عرب خاتون اسرائیل کے زیر قبضہ علاقہ سے باہر جا رہی تھی۔ سرحد پر ایک واقعہ گزرا جو اخبار کے الفاظ میں یہ تھا:

قال لها الضابط الاسرائيلي: وين رايحة يا مرة (الى اين انت ذاهبة يا امرأة)	اسرائیلی فوجی نے کہا کہ اے عورت تو کہاں جا رہی ہے۔
قالت له انها ذاهبة الى الكويت لزيارة ابنائها۔	اس نے جواب دیا کہ میں کویت جا رہی ہوں، اپنے بچوں سے ملنے کے لئے۔ فوجی نے کہا کہ ان سے میرا اسلام
قال لها: سلمي عليهم وقولي لهم سنكون عندهم	کہنا اور ان سے کہنا کہ ہم جلد ہی ان کے یہاں ہوں گے۔

ایک صاحب لندن سے آئے تھے۔ وہ خود تو اردو نہیں جانتے تھے مگر وہ میرے لئے کچھ اردو اخبارات کا تحفہ لائے تھے جو پاکستانی حضرات لندن سے شائع کرتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ اخبارات نہیں ہیں بلکہ قوم کی موت کا مرثیہ ہیں۔ دو سرخیاں ملاحظہ ہوں:

۱. جشن میلاد النبی پر لندن میں فرزندان توحید کا فقید المثال جلوس
عاشقان رسول کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر (وطن ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

۲. پاکستان بھارت سے مرعوب نہیں ہوگا۔
بھارت کو فوج کشی کا شوق ہے تو اسے پورا کرکے دیکھ لے (جنگ ۲۶ نومبر ۱۹۸۴)

یہ دونوں سرخیاں ان اخبارات کی شاہ سرخیاں ہیں۔ جس قوم کے دانشور اتنے سطحی ہو جائیں کہ اس قسم کی سرخیوں کے ساتھ اخبار نکالیں اور جس قوم کے عوام اتنے بے شعور ہوں کہ اس قسم کی خبروں اور سرخیوں کو

پڑھ کر خوش ہوتے ہوں ان کو تاریخ کے تھیٹر میں شاید جگہ مل سکتی ہو، مگر حقیقی دنیا میں بہر حال وہ جگہ پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

یہ کانفرنس " اسلام کی عالمی دعوت" کے موضوع پر تھی۔ اس موقع پر مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لوگوں پر یہ بات واضح نہیں ہے کہ اسلامی دعوت خود کیا چیز ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر، سب کی باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے "مشاکل العالم اور مشاکل المسلمین" کے میدان میں کام کرنے کو اسلامی دعوت کا کام سمجھا اور اسی کے بارہ میں تقریریں کیں۔

میں نے اپنے مختصر اظہار خیال میں کہا کہ وہ چیز جس کو " الدعوۃ الاسلامیۃ " کہا جاتا ہے، اس کا تعلق دنیا کے مسائل سے نہیں بلکہ آخرت کے مسائل سے ہے۔ خدا نے جس منصوبہ کے تحت انسان کو پیدا کیا ہے اور اس منصوبہ کے مطابق بالآخر انسان کو جس فیصلہ الٰہی کا سامنا کرنا ہے اس سے لوگوں کو باخبر کرنا وہ چیز ہے جس کو اسلامی دعوت کہا گیا ہے۔ مسلمان موجودہ دنیا میں جن مشکلوں سے دوچار ہیں یا قومیں جن مسائل میں مبتلا ہیں ان کے سلسلے میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اس کام کا عنوان دعوت الی اللہ نہیں۔

کانفرنس جس ہال کے اندر ہوئی وہاں جلی حرفوں میں قرآن کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی: یاایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس۔ میں نے اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آیت کے مطابق عصمت من الناس کو حاصل کرنے کا ذریعہ دعوت الی اللہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے لئے جو یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ ہم دوسری قوموں کے ظلم و تعدی سے محفوظ نہیں ہیں، وہ اس آیت کے مطابق دعوت الی اللہ کے کام کو چھوڑنے کا نتیجہ ہیں۔ بذات خود اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی مشکلات کو حل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کے اصل کام کو جاری کیا جائے۔

ایک صاحب سوئزرلینڈ سے آئے تھے۔ ان کے یہاں انگریزی الرسالہ پابندی سے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی سوئزرلینڈ سے ایک انگریزی ماہنامہ شائع کرتے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ انگریزی کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ میں اور میرے ساتھی آپ کا میگزین شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں مغز (substance) ہوتا ہے۔ جب کہ مسلمانوں کے انگریزی اور عربی جرائد میں یہی چیز سب سے کم ملتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلم دنیا کا کوئی بھی پرچہ مجھے نہیں معلوم جس میں اتنا مغز (substance) ہوتا ہو جتنا آپ کے انگریزی الرسالہ میں ہوتا ہے۔

ایک صاحب گامبیا سے آئے تھے۔ ان کو ہمارے یہاں کا چھپا ہوا تعارفی سٹ (انگریزی) بھیجا گیا

تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کئی لوگوں نے اس کو پڑھا اور اتنا زیادہ پسند کیا کہ ان کو بے حد اشتیاق ہو گیا کہ مصنف کو دیکھیں۔ وہ لوگ مزید انگریزی کتابوں کا شدت کے ساتھ تقاضا کر رہے ہیں۔ ان کے نام الرسالہ انگریزی جاری کر دیا گیا ہے۔

ایک صاحب یوگوسلاویہ سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ دنیا بھر میں پناہ گزینوں (لاجیئن) کی جو تعداد ہے، اس میں ۸۰ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر وہ چیز طاری کر دی گئی ہے جس کو قرآن میں "ذلت و مسکنت" کہا گیا ہے۔ ہم کو گہرائی کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ مسلمانوں کا یہ حال کیوں ہے۔ مسلمان موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں سے پیچھے کیوں ہو گئے۔

ایک صاحب جو کویت سے آئے تھے۔ انھوں نے موجودہ زمانہ کی مسلم تنظیموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیمیں قرآن و سنت کی بنیاد پر اٹھی ہیں اس لئے ان کے پاس اچھے افکار کی کمی نہیں۔ مگر اس دنیا میں صرف فکر کافی نہیں بلکہ نظم اور منصوبہ بندی بھی لازمی طور پر ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ان تنظیموں کی حالت افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ مغربی ممالک اسی لئے ہم سے آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ منظم انداز سے کام کرتے ہیں۔ اور ہم اس لئے پیچھے ہو گئے ہیں کہ ہمارا کام نظم و ترتیب سے خالی ہوتا ہے (وما تفوق الغرب منا الا بالنظام وما تاخرنا منه الا بالفوضى وعدم النظام)

ایک صاحب جو کناڈا سے آئے تھے، انھوں نے بتایا کہ کناڈا کی کل ۲۵ ملین آبادی میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کناڈا میں مکمل آزادی ہے۔ کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں ہے۔ وہاں اسلامی دعوت کا کام کرنے کے زبردست مواقع ہیں۔ مگر ہندستان اور پاکستان کے لوگوں نے وہاں آکر آپس کے مذہبی جھگڑے کھڑے کر دئے ہیں۔ وہاں دوسروں کی طرف سے ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔ مگر اپنوں کی طرف سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں ایک نئی مسجد بنائی گئی ہے جس کی مالیات کی فراہمی میں میں نے ۸۰ فی صد تک تعاون کیا تھا۔ مگر جب مسجد بن گئی تو اس کے اندر شدید مذہبی جھگڑے کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ میں نے اور میری طرح بہت سے لوگوں نے اس مسجد میں جانا ہی چھوڑ دیا۔

انھوں نے بتایا کہ مغرب میں مسلمانوں کی تصویر بہت خراب ہے۔ ان کو امکانی دہشت پسند (Potential terrorists) کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ یہودی پروپگنڈے کا دخل ہے۔ مگر خود مسلمانوں نے اپنے عمل سے بھی اس کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اور یہ دوسرا پہلو یقیناً زیادہ افسوس ناک

رابطۃ الجامعات الاسلامیہ (ص۔ب ۲۴۲، الرباط) ایک شش ماہی مجلہ شائع کرتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۵ میں "کتاب العدد" کے عنوان کے تحت حیاۃ الصحابہ (مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ) پر تبصرہ تھا۔ کتاب کے ابواب کی تفصیل دیتے ہوئے تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ علماء کا قول ہے کہ قرآن کے بعد پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ آپ کے اصحاب کرام ہیں (ان اعظم معجزۃ للرسول بعد القرآن ھم صحابتہ الکرام)

چنانچہ اصحاب رسول کے حالات پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر حیاۃ الصحابہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ مصنف نے زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے صحابہ کی زندگی کو بطور نمونہ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسی کتاب بن گئی ہے جس کی مثال کسی بھی دوسری کتاب میں نہیں ملتی (ھکذا عالج سیرۃ الرسول وصحابتہ الکرام بطریقۃ لانجدھا فی ای کتاب غیرہ)

تبصرہ نگار نے مزید لکھا ہے کہ ایک عرب شیخ اپنے طالب علموں کو مستقل طور پر اس کتاب کے مطالعہ پر ابھارتے رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ: ان ھذا الکتاب لم یؤلف علی منوالہ فی بابہ یعنی اس موضوع پر اس اسلوب میں اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔

ایک صاحب بڑے پرجوش تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے تمام مسائل کا حل جہاد ہے۔ جہاد سے ان کی مراد قتال تھی۔ میں نے کہا کہ امت کے رہنما اسی قسم کے جہاد میں تو سو سال سے لگے ہوئے ہیں۔ پھر مسائل حل کیوں نہیں ہوئے۔ انھوں نے قرآن سے قتال کی آیتیں پڑھنا شروع کیں۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے قرآن میں صرف قتال اور جہاد کی آیتوں کو پڑھا ہے انھوں نے قرآن کو پڑھا ہی نہیں۔ قرآن اعراض کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال مکی دور کی زندگی ہے۔ قرآن ایڈجسٹمنٹ کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی ایک مثال صلح حدیبیہ ہے۔ قرآن قتال کی بھی تعلیم دیتا ہے جس کی مثال بدر اور احد کے واقعات ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ پہلی دونوں قسم کی تعلیمات بھول جائیں اور صرف قتال اور جہاد کی تعلیمات کو زور و شور کے ساتھ پیش کریں، ان کا یہ پیش کرنا ویسا ہی ہے جیسے بہت سے غیر اسلامی ذہن کے لوگ قرآن کی ایک آیت کو لے لیتے ہیں اور اس سے اپنا مدعا ثابت کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ہمارے جنگجو رہنماؤں کا قرآن کو پانا ایسا ہی ہے جیسے مذکورہ غیر اسلامی لوگوں کا قرآن کو پانا۔

ایک عالی شان ہوٹل تھا ایک بہت بڑے سجے ہوئے کمرہ میں لوگ قیمتی صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ہنس رہے تھے۔ سگرٹ اور مشروبات پی رہے تھے۔ بے فکری کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کسی چیز میں حصہ نہیں لیا۔ بالکل خاموش میں ایک نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے اس

حال میں دیکھ کر پوچھا کہ آپ کیوں اس طرح چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ ان کے بار بار سوال پر میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے لوگوں کا حال دیکھ کر اکثر میرا دل یہ کہنے لگتا ہے کہ : الناس یفرحون لکی لا یفرحوا بعد ذالک ابداً۔ الناس یضحکون لکی لا تیسر لھم الضحک بعد ذالک ابداً۔

ایک موقع پر افریقہ میں قحط اور بھوک کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب جو آجکل کی زبان میں "چین اسموکر" تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک قیمتی سگریٹ سلگا رہے تھے۔ انھوں نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا کہ آج کا اصل مسئلہ بھوک نہیں۔ آج کا اصل مسئلہ اسراف ہے۔ عرب دنیا میں آج جس طرح مسرفانہ طور پر خدا کی دولت خرچ کی جارہی ہے۔ اگر اس کو صحیح ڈھنگ پر خرچ کیا جائے تو ساری دنیا میں بھوک کا مسئلہ حل ہو جائے۔ میں خاموش بیٹھا ہوا لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو مطمئن چہروں کے ساتھ بھوک کے مسئلہ پر بے تکان بول رہے تھے۔ میرے دل نے کہا:

"ہر آدمی دوسرے کی کمیوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اپنی کمیوں سے آخری حد تک بے خبر"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں ایک فیشن بن گیا ہے۔ یہ بھی شاید ایک عالمی ظاہرہ کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں ٹیکنیکل ترقیوں سے پیدا شدہ سنگین مسائل نے بہت سے لوگوں میں یہ ردعمل پیدا کیا ہے کہ وہ "ماضی کی طرف واپسی" کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ انھیں میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کی طرف واپسی کی باتیں کرتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر مذہب میں کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اسلام کی طرف واپسی کی باتیں کرنے لگا ہے۔ مگر یہ سب کچھ بطور فیشن ہے۔ ان میں سے کوئی حقیقی معنوں میں سنجیدہ نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ جو "واپسی" کی باتیں کرتے ہیں ان کا تعلق صرف دوسروں کی واپسی سے ہوتا ہے۔ خود اپنی واپسی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں۔

فاس (Fes) یہاں کا سب سے مشہور تاریخی شہر ہے۔ اس کو ادریس بن عبداللہ نے ۱۷۲ء میں آباد کیا تھا۔ اس وقت یہاں اسلام عمومی طور پر نہیں پھیلا تھا۔ ادریس بن عبداللہ جو سیاسی داروگیر سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ انھوں نے اپنی دعوتی کوششوں سے تقریباً پورے ملک کو مسلمان بنا ڈالا۔

۳۰ نومبر ۱۹۸۴ کو فاس کا سفر ہوا۔ صبح کے وقت کانفرنس کے شرکا خصوصی طیارہ کے ذریعہ کیسا بلانکا سے فاس لے جائے گئے۔ اور اسی دن شام کو کیسا بلانکا واپس آ گئے۔ فاس کا شہر کیسا بلانکا سے بذریعہ ہوائی جہاز پون گھنٹہ کی مسافت پر ہے۔

فاس قدیم زمانہ میں علم کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں دور دور سے طلبہ آتے تھے۔ مشہور ہے

کہ ایک شخص کی عالمانہ باتوں کو سن کر کسی نے اس سے پوچھا : کیا تم نے فاس میں علم حاصل کیا ہے۔ اس نے کہا نہیں علم آدمی کے سر میں ہوتا ہے نہ کہ شہر فاس میں (هل تعلمت فی فاس۔ قال لا۔ العلم فی الراس لا فی الفاس)

جدید فاس موجودہ زمانہ کے شہروں کی طرح ہے۔ مگر قدیم فاس تاریخی آثار سے بھرا ہوا ہے۔ سڑکوں سے گزرتے ہوئے متعدد مسجدیں دکھائی دیں۔ یہاں کی مسجدوں کا طرز بالکل مختلف ہے۔ مینار صرف ایک ہوتا ہے جو ایک کونہ پر بنایا جاتا ہے۔

فاس مکمل طور پر ایک تاریخی شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں قدیم طرز کی عمارتیں۔ شاہانہ نشست گاہیں، اور قلعے اس کی گزری ہوئی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ یہاں کی مشہور جامعۃ القرویین بھی دیکھی۔ یہ بہت بڑے رقبہ میں یونیورسٹی کے انداز پر بنائی گئی تھی۔ یہاں عظیم الشان مدرسہ اور اس کے ساتھ عظیم الشان مسجد ہے۔ قدیم زمانہ میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی گھڑیاں، اصطرلاب وغیرہ آج بھی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ تعمیرات قدیم اسپینی محلات کے طرز کی نظر آئیں۔

ہمارے گائڈ نے جامعۃ القرویین کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس تعلیم گاہ کا معیار اتنا بلند تھا کہ یہاں صرف وہی شخص داخل ہو سکتا تھا جس کو مہارت حاصل ہو (ولا يدخل فی هذا المركز الا من كان له مهارة العلم) یورپ کے آئے ہوئے ایک صاحب سے میں نے ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا:

The glory which was Islam, has now become a tourist attraction.

جو چیز ماضی میں اسلام کی عظمت تھی وہ آج صرف سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن کر رہ گئی ہے۔

ہم نے جمعہ کی نماز یہاں کی قدیم جامع مسجد میں پڑھی۔ اس کا طرز تعمیر بالکل وہی تھا جو اسپین کے الحمراء میں پایا جاتا ہے۔ فاس میں یہودیوں کا بھی ایک محلہ موجود ہے۔ یہ لوگ پہلے قدیم فاس میں تھے اب وہ جدید فاس میں آباد ہو گئے ہیں۔

اس سفر کی ایک "دریافت" روم ایرپورٹ کے ایک اطالوی افسر تھے۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Mr. Marchetti,
Bartolomeo, Via Scarperia 9, 00146 Rome, Italy

انھوں نے جاتے ہوئے اور واپسی میں روم ایرپورٹ پر غیر معمولی تعاون کیا۔ ساری تفصیل بیان کرنا مشکل ہے، صرف دو باتوں کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ دہلی سے روم کے سفر میں ایر انڈیا کی بوئنگ ۷۴۷ کی اکانومی کلاس اگرچہ بڑی حد تک بھری ہوئی تھی۔ مگر ۱۶ سیٹ کے فرسٹ کلاس کیبن میں میں اکیلا مسافر تھا۔ مگر واپسی

میں عجیب صورت پیش آئی۔ میرا رزرویشن روم سے کنفرم نہیں تھا۔ اور آج اتفاق سے گورنمنٹ آف انڈیا کے افسروں کی ایک جماعت اسی جہاز سے سفر کر رہی تھی، اس لئے بظاہر سیٹ حاصل کرنا مشکل تھا۔ مگر مسٹر مار شیٹی دوبارہ مل گئے انھوں نے مجھ کو لاونج میں بٹھا دیا اور میرا ٹکٹ لے کر ایر انڈیا کے دفتر میں گئے اور رزرویشن کنفرم کرا کر لے آئے۔

میری واپسی کی تاریخ کی دہلی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ ان سے میں نے ذکر کیا تو فوراً انھوں نے میرا ٹیلیفون نمبر لیا اور کہا کہ ابھی میں دہلی کو ٹیلکس بھیج دیتا ہوں کہ آپ کے گھر پر اطلاع دے دی جائے کہ آپ اتوار کی صبح کو ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۳۱ سے دہلی پہنچ رہے ہیں۔

مسٹر شیٹی نے جس اخلاق اور ذمہ داری کا ثبوت دیا وہ اس قدر معیاری تھا کہ مجھے تعجب ہوا کہ خود غرضی اور سطحیت کی اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ موصوف کے نام الرسالہ (انگریزی) اعزازی طور پر جاری کر دیا گیا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۸۴ کو کیسابلانکا سے واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ الیتالیا (۸۲۵) پر سفر کرتے ہوئے لندن کے اخبار ڈیلی گراف (۲۹ نومبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر پڑھی کہ آکسفورڈ کے ۳۳ سالہ جان لیمبرٹ (John Lambert) نے اپنی تین لڑکیوں کو قتل کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی کے نام آخری خط میں لکھا تھا کہ تم نے مجھ کو ایک محبت کرنے والے وفادار شوہر سے بدل کر قاتل بنا ڈالا۔ میں ہر چیز کا الزام صرف تم کو دیتا ہوں قاتل پکڑا گیا۔ اس کے بعد اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

It's all to do with my wife going with other men.

روداد سفر

لاہور میں قرآن اکیڈمی (زیر صدارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) کی طرف سے ہر سال بڑے پیمانہ پر قرآنی سیمنار ہوتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مجھے اس کا دعوت نامہ ملا مگر بعض وجوہ سے میں سفر نہ کر سکا۔ اس سال پھر دعوت نامہ آیا تو میں نے طے کر لیا کہ اس بار ان شاء اللہ اس میں شرکت کروں گا۔ اس کے مطابق مارچ ۱۹۸۵ کا آخری ہفتہ لاہور میں گزرا۔

پہلا سفر

پہلی بار میں ۱۹۴۵ میں لاہور گیا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ یہ میری زندگی کے اس دور کی بات ہے جب کہ میں "تلاش حق" کے کٹھن مرحلہ سے گزر رہا تھا۔ میں اپنے ماحول میں ایک سیدھے سادے نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵-۱۸۸۷) مجھ کو "مرزا پھویا" کہتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ ۱۹۴۳ میں میرے ساتھ ایک شدید حادثہ گزرا۔ یہ گویا ایک قسم کا انفجار (explosion) تھا جس نے میری بند شخصیت کو کھول دیا۔

یہ حادثہ بظاہر ایک مادی ناکامی کا واقعہ تھا مگر عملاً وہ میرے لئے روحانی ناکامی کا واقعہ بن گیا۔ اس حادثہ نے میری سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا۔ اچانک میں نے جانا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے اپنے نہ جاننے کو دریافت کیا۔ اس حادثہ نے میری زندگی کو سکون کے دور سے نکال کر اضطراب کے دور میں داخل کر دیا۔

میری کشتی اگرچہ "سمندر" میں ٹوٹی تھی مگر شاید کسی نامعلوم قوت نے میرے اندر پیدا ہونے والے نفسیاتی ہیجان کو استعمال کر کے مجھے تلاش حق کے "جزیرہ" میں ڈال دیا۔ اس زمانہ میں میں نے فانی بدایونی (۱۹۴۰-۱۸۷۹) پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون لکھنؤ کے رسالہ نگار میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا " فانی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں " یہ مضمون فانی سے زیادہ خود مضمون نگار کی اپنی تصویر تھا۔ میں نے تلاش حق میں اپنی سرگردانی کو فانی کے آئینہ میں دیکھ لیا تھا۔

یہ دور تقریباً پانچ سال تک رہا۔ اس وقت میرے اوپر جو حالات گزرے وہ اتنے شدید تھے کہ کئی بار میں نے چاہا کہ میں خودکشی کرلوں۔ دیوانگی کے عالم میں کبھی میں کسی دور دراز بستی میں چلا جاتا اور کبھی کسی جنگل یا پہاڑ کی طرف نکل جاتا۔ ۱۹۴۵ میں لاہور کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اس وقت پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل نہیں تھے۔ میں شاہ گنج میں ایک اکسپریس ٹرین پر سوار ہوگیا۔ اس وقت شاہ گنج سے لاہور کا ریلوے کرایہ غالباً گیارہ روپئے تھا۔ ٹرین نے سیدھا لے جاکر مجھے لاہور میں اتار دیا۔

لاہور اسٹیشن پر اترنے والے تمام مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مگر میں دیوانگی کے عالم میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ کیوں کہ اس وقت لاہور میں کوئی بھی میرا جاننے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پلیٹ فارم خالی ہوگیا تو ایک خالی انجن دھواں اڑاتا ہوا پٹری سے گزرا۔ میں اس کی طرف بڑھا کہ اپنے آپ کو اس کے نیچے ڈال دوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے میرے قدموں کو پکڑ لیا ہے۔ چاہنے کے باوجود میں آخری اقدام سے باز رہا۔

میں ریلوے اسٹیشن کے باہر آیا۔ میں اسٹیشن کی عقبی سڑک پر کھڑا تھا۔ لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ "یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور کہاں جارہے ہیں" میرے دل نے سوال کیا۔ اتنے میں ایک کم عمر خوش پوشش آدمی ایک طرف سے دوسری طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بڑھ کر اس کے پاس پہنچا۔ سلام علیک کے بعد میں نے پوچھا:

آپ کیا کام کرتے ہیں۔

میں کسی بنک میں کام کرتا ہوں۔

آدمی نے مختصر جواب دیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ آدمی کسی بنک میں کلرک تھا۔ مگر اس نے ایسے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا جیسے کہ اس کو کوئی بہت بڑی چیز ملی ہوئی ہو ـــــ جو شخص کم پر راضی ہوجائے اس کو کبھی زیادہ نہیں ملتا۔

انگریزی دور میں یہاں کے ایک صاحب خواجہ محمد بخش مزدور کی حیثیت سے آسٹریلیا گئے تھے۔ وہ واپس آتے تو لوگ ان کو محمد بخش آسٹریلیا کہتے تھے۔ ۱۹۲۵ میں انھوں نے ریلوے اسٹیشن کے

پاس ایک مسجد بنائی جوان کے نام پر آسٹریلیا مسجد (جامع آسٹریلیا) مشہور ہوگئی۔

میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو یہی مسجد میرے سامنے تھی۔چنانچہ میں نے آسٹریلیا مسجد میں اپنا مختصر سامان رکھا اور ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ میں کسی منصوبہ اور معلومات کے بغیر مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ میں میورروڈ پہنچ گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے بورڈ نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کا مکان ہے۔ مکان بالکل اجاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اکیلا کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

خداوند تو کب آئے گا۔ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں

یہ دعائیہ کلمہ میری اس آتشیں کیفیت کو بتا رہا ہے جس کے تحت میں اس زمانہ میں لاہور گیا اور دوسرے مقامات کے سفر کئے۔

طبیعت کچھ تھمی تو مجھ کو پیاس کا احساس ہوا۔ اقبال کے مکان سے ملی ہوئی سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی معمولی طور پر بنی ہوئی مسجد دکھائی دی۔ میں وہاں پہنچا۔ دیکھا تو ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ میں ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ مگر دیر تک چلانے کے بعد بھی پانی نہیں نکل رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص سڑک سے گزرا۔ وہ میری حالت کو محسوس کر کے میری مدد کے لئے آیا۔ اس نے غور سے دیکھا اور پھر بتایا کہ پانی برابر آرہا ہے مگر باہر کی ٹونٹی بند ہے اس لئے سارا پانی پچھلے پائپ سے گزر کر حوض میں چلا جاتا ہے۔ اس نے ٹونٹی کھولی تو فوراً میرے سامنے پانی گرنے لگا۔

یہ میری زندگی کا پہلا "تعمیری" سبق تھا۔ اس واقعہ نے مجھے بتایا کہ اس دنیا میں صرف عمل کافی نہیں۔ عمل کے نتیجہ خیز بننے کے لئے دوسرے بہت سے اسباب کی موافقت بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک ضروری سبب بھی موافقت نہ کر رہا ہو تو سارے عمل کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔ یہ آدمی جس نے میری مدد کی اس کا پورا نام اب یاد نہیں رہا۔ صرف یہ یاد ہے کہ اس کے نام کے آگے قریشی کا لفظ شامل تھا۔ پانی پینے کے بعد قریشی صاحب مجھے اپنے چھوٹے سے مکان پر لے گئے۔ اس کے بعد بقیہ ایام میں نے انھیں کے ساتھ گزارے۔

اس وقت لاہور کی مال روڈ (موجودہ شاہراہ قائد اعظم) پر ٹیلرنگ کی ایک بڑی دکان تھی جس کا نام بی لیلارام اینڈ سنز تھا۔ یہاں کے ٹیلر ماسٹر ایک مسلمان تھے۔ قریشی صاحب نے مجھ کو ان ٹیلر صاحب سے ملایا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا" یہ کسی اچھے خاندان کا لڑکا ہے اور غلطی سے یہاں آگیا ہے۔" انھوں نے اصرار کر کے مجھے واپسی پر آمادہ کیا۔ دو ہفتے کے بعد انھوں نے ٹکٹ خرید کر مجھے ٹرین پر بٹھا دیا اور میں اپنے وطن اعظم گڈھ واپس آگیا۔ جہاں تک یاد ہے واپسی ٹکٹ کا کرایہ میرے پاس نہیں تھا۔ وطن واپس آنے کے بعد میں نے منی آرڈر کے ذریعہ ٹیلر صاحب کی رقم انھیں بھیج دی۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۵ کو میں نے دوبارہ میورو ڈ جاکر اسے دیکھا" جاوید منزل" اب"علامہ اقبال میوزیم" بن چکا ہے۔ مکان کا تعمیری نقشہ وہی پرانا ہے۔ البتہ اس کو از سر نو مزین کیا گیا ہے۔ ایک تختی پر علامہ اقبال کے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ فقرہ بھی تھا:

> ۱۹۳۰ میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے تاریخی خطبہ میں اس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا جو اب پاکستان کی صورت میں قائم ہے۔

جاوید منزل سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد رقبہ کے اعتبار سے اب بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ البتہ اس کو دوبارہ دو منزلہ صورت میں تعمیر کیا گیا ہے۔

میورو ڈ تعمیری لحاظ سے اب بھی تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ ۴۰ سال پہلے تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب یہاں انسان زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ جب کہ ۱۹۴۵ میں وہ ایک سنسان سڑک کی مانند تھی۔

ریلوے اسٹیشن بھی معمولی اضافہ کے ساتھ تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ۱۹۴۵ میں تھا۔ کوئی بڑی تبدیلی مجھے وہاں دکھائی نہیں دی۔

دوسرا سفر

لاہور کے لئے میرا دوسرا سفر فیروز پور کے راستے سے مئی۔ جون ۱۹۷۱ میں ہوا۔ ۱۹۴۵ میں میں نے جو سفر کیا وہ ایک ہی ملک کے ایک حصہ سے اس کے دوسرے حصہ میں جانا تھا۔ اس وقت کسی" سرحد" کا وجود نہ تھا جہاں چیکنگ کی ضرورت پیش آئے۔ مگر ۱۹۷۱ میں تاریخ بدل

چکی تھی۔ اب میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جارہا تھا۔ چنانچہ سرحد پر زبردست چیکنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندستانی چوکی پر نہ جاتے ہوئے کوئی خاص زحمت پیش آئی اور نہ آتے ہوئے۔ مگر پاکستانی چوکی پر ایسی سخت پریشانی پیش آئی کہ میں نے سوچا کہ میرے جیسے آدمی کو پاکستان جانا ہی نہیں چاہئے۔

واپسی میں پاکستانی چوکی پر متعین آدمی کا ظالمانہ رویہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ میں جون کی تیز دھوپ میں کھلے میدان میں کھڑا ہوا تھا۔ خدا اور اسلام کا کوئی بھی حوالہ اس آدمی کے لئے بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ جو میری تمام کتابیں اور اوراق بکھیر کر میز کی دوسری طرف مجھے اس طرح فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا کہ میں کوئی مجرم ہوں۔ اس کا کھلا مطالبہ تھا کہ جو کچھ پیسہ تمہارے پاس ہے وہ سب ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ ہم جانے نہیں دیں گے۔

میں بے بس کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ جاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا کہ پاکستان کی سمت میں ایک خیمہ لگا ہوا ہے جس میں ایک فوجی افسر ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ جاتے ہوئے اتفاقاً میری اس سے کچھ بات چیت ہوگئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ تفتیش کا آدمی مجھ کو چھوڑ نہیں رہا ہے تو میں نے کہا "یہ میجر صاحب مجھ کو جانتے ہیں کہئے تو ان کو بلا دوں" اس جملہ نے جادو کا کام کیا اس کو سنتے ہی فی الفور آدمی کا رویہ بدل گیا۔ اس نے میرے بیگ سے ایک سادہ ڈائری نکالی اور کہا کہ جائیے۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا سے اتنا بھی نہیں ڈرتے جتنا وہ ایک فوجی افسر سے ڈرتے ہیں۔

لاہور پہنچ کر میں آٹو رکشا کے ذریعہ مولانا امین احسن اصلاحی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر ڈرائیور نے کچھ لوگوں سے پوچھا "امین احسن اصلاحی کا گھر کون سا ہے"، مگر لوگ سمجھ نہ سکے۔ کسی نے کہا "امین احسن مودودی" کسی نے کہا "ابوالاعلیٰ اصلاحی"۔ لوگ نہ پوری طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جانتے تھے اور نہ پوری طرح مولانا امین احسن اصلاحی کو۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ جنرل یحییٰ خاں کی حکومت کے تحت ابھی حال میں جماعت اسلامی پاکستان

نے الکشن میں ناکام حصہ لیا تھا۔ لاہور کی دیواروں پر اب بھی ایسے پوسٹر لگے ہوئے تھے جو اگرچہ پھٹ چکے تھے۔ تاہم ان پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے پڑھے جاتے تھے:

انشاء اللہ جیتے گی ، جماعت اسلامی جیتے گی۔

جدید اسلامی تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ وہ لوگ جن کا تعارف ملک کے صرف ۵ فی صد تعلیم یافتہ طبقہ میں ہے وہ الکشنی سیاست میں کودتے ہیں جہاں جاہل عوام کی اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑا عجوبہ یہ ہے کہ ان کا یہ بے معنی اقدام جب انھیں ناکامی سے دوچار کرتا ہے تو وہ فوراً یہ شور کرنے لگتے ہیں کہ الکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ ان کے اندر نہ اتنی عقل ہے کہ سیاسی معاملات کو سمجھیں اور نہ اتنا حوصلہ ہے کہ اپنی شکست کا اعتراف کریں۔

لاہور میں میری ملاقات خاص طور پر مولانا مودودی سے ہوئی وہ کافی کمزور ہو چکے تھے۔ چھڑی ٹیک کر بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ پہلی ملاقات ان کے مطالعہ کے کمرہ میں ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ان کا مطالعہ کا کمرہ ایک ایسا کمرہ ہے جہاں روشنی صرف بجلی کے بلب کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ راقم الحروف کا ذوق اس معاملہ میں یکسر مختلف ہے۔ میں لکھنے پڑھنے کا کام ایسے کمرہ میں کرنا پسند کرتا ہوں جہاں سورج کی روشنی پوری طرح آتی ہو۔ اس میں صرف رات کا استثنا ہے۔ کیوں کہ رات کے وقت مصنوعی روشنی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات ہوئی تو ان کو میں نے الجمعیۃ ویکلی کا ایک شمارہ (۲۷ نومبر ۷۹ء) پیش کیا۔ اس کو لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ " میں اس کو پڑھوں گا۔ آپ کی کوئی چیز ملتی ہے تو میں ضرور اس کو پڑھتا ہوں"۔

الجمعیۃ کے اس شمارہ میں ایک مضمون تھا جس میں مسلم ممالک میں اسلامی احیاء کے امکانات پر گفتگو تھی۔ اگلی ملاقات میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا " آپ جیسے لوگ مسلم ممالک کے بارہ میں کافی خوش فہم رہتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ مسلم ممالک میں اسلامی کام کے مواقع اس سے بھی کم ہیں جتنا غیر مسلم ممالک میں ہیں"۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ اسلامی تحریکوں کی یہ نادانی ہے کہ وہ ملے ہوئے مواقع کا بیجا استعمال کرتی ہیں۔ مسلم ممالک کی موجودہ اسلامی تحریکوں نے اسلام کا ایسا تعارف کرایا ہے گویا کہ اسلام

حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی ایک تحریک ہے۔ اس بنا پر حکمراں طبقہ ان کا مخالف ہو گیا ہے۔ اگر وہ سیاسی ٹکراؤ سے بچ کر کام کریں تو حکمراں طبقہ ان کا تعاون کرے۔ اور زبردست کام ہونے لگے۔

واپسی کے بعد میں نے اپنی کتاب الاسلام کا دوسرا اڈیشن دستی طور پر مولانا مودودی کے لئے بھجوایا تھا۔ یہ کتاب ان کو پہنچ گئی تھی اور اس کے ملنے کی اطلاع بھی مولانا مودودی کے دستخط سے مجھے بذریعہ ڈاک وصول ہو گئی تھی۔ اس خط پر ۱۱ فروری ۷۹ کی تاریخ درج ہے اور حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

محترمی و مکرمی سلام مسنون

آپ کی ارسال کردہ کتاب "الاسلام" مجھے مل گئی ہے۔ میں اس عنایت کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور کی ملاقات میں سب سے زیادہ دلچسپی اس سے ظاہر کی کہ اخبار مسلم (دہلی) اور اخبار الجمعیۃ (دہلی) کے وہ قدیم شمارے انھیں حاصل ہو سکیں جو کہ ان کی ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی فرمائش کے مطابق ہندستان واپس آکر میں نے الجمعیۃ ویکلی میں اس کا اعلان شائع کیا تھا مگر وہ شمارے حاصل نہ ہو سکے۔ الجمعیۃ ویکلی ۲ جولائی ۱۹۷۱ صفحہ ۳ پر ایک چوکھٹے میں یہ اشتہار دیکھا جا سکتا ہے:

مندرجہ ذیل قدیم پرچے بہ قیمت درکار ہیں:

اخبار مسلم ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۳

اخبار الجمعیۃ دسمبر ۱۹۲۴ تا دسمبر ۱۹۲۸

جن صاحب کے پاس مذکورہ فائل برائے فروخت موجود ہو وہ مطلع فرمائیں اور مطلوبہ قیمت بھی تحریر کریں۔

یہ اعلان مولانا مودودی ہی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ اگرچہ عملاً مذکورہ پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔ مولانا مودودی پہلے دن زیادہ تر اخبار مسلم اور اخبار الجمعیۃ کے مذکورہ فائل کے بارہ میں

بات کرتے رہے۔ وہ اگرچہ نہایت کمزور اور مریض تھے، تاہم انھوں نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ملاقات سے پہلے مولانا مودودی کے رفیق خاص (غالباً رحمت الٰہی صاحب) نے کہا تھا کہ مولانا کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ اس لئے ان سے کوئی اختلافی بات نہ چھیڑی جائے۔ وہ ملاقات کے وقت برابر میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب میں باہر نکلا تو میں نے مذکورہ رفیق سے کہا کہ میں بعض امور پر بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے دوبارہ وہی بات کہی کہ موجودہ حالت میں اختلافی امور پر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ کافی اصرار کے بعد وہ اس پر راضی ہوئے کہ میں جو بات کرنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ پیشگی طور پر لکھ کر انھیں دے دوں۔

میں نے وہیں بیٹھ کر ایک کاغذ پر چند سطریں لکھیں۔ اس تحریر کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں۔ مفہوم کے اعتبار سے وہ بات یہ تھی کہ ــــــ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اس سے آپ نے قیاس کیا کہ پاکستان کے لئے مسلم لیگ نے جو مومنٹم پیدا کیا تھا اس کو آپ اپنی تحریک کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے پوری طرح اپنی جماعت کو اس رخ پر ڈال دیا۔ مگر آپ کا یہ اندازہ صحیح نہیں۔ تاریخی اور عقلی طور پر ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کی پیدا کردہ حرکت کو کوئی دوسرا شخص اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے آپ کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ الکشن اور مطالبۂ نظام اسلامی جیسی سیاست کو چھوڑ کر دوبارہ وہی اصلاحی اور تدریجی انداز اختیار کریں جس پر آپ تقسیم سے پہلے عامل تھے۔

میری یہ تحریر مولانا مودودی کے حوالے کر دی گئی۔ اور میں یہ کہہ کر واپس آ گیا کہ کل میں دوبارہ ملاقات کروں گا اور اس موضوع پر براہ راست گفتگو کروں گا۔ اگلے دن میں عصر کی نماز کے وقت اچھرہ (۵۔ اے ذیل دار پارک) پہنچا تو پچھلے دن کے برعکس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ سخت برہم نظر آتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے رفیق خاص کے مشورہ پر عمل کیا اور مولانا کی ناسازی طبع کی بنا پر اختلافی مسئلہ پر گفتگو کئے بغیر واپس چلا آیا۔ عصر اور مغرب کی نمازیں میں نے ان کے ساتھ اچھرہ میں پڑھیں۔

۱۹۷۱ میں جب میں ہندستان سے پاکستان پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں دوسرے

درجہ کے ایک ملک میں آگیا ہوں۔ وہاں کی ہر چیز مجھے ہندستان کے مقابلہ میں معمولی نظر آئی۔ وہاں کی ٹرین، وہاں کی بسیں، وہاں کے پارک، وہاں کے مکانات، سب نمایاں طور پر کمتر دکھائی دئے۔ وہاں کے اخبارات کا حال یہ تھا کہ میں نے ایک پاکستانی تعلیم یافتہ سے کہا کہ میری سزا کے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے کسی مکان میں بند کر کے پابند کر دیا جائے کہ تم پاکستان کے اخبارات پڑھتے رہو۔ معمولی معمولی چیزیں مثلاً دروازہ کے بولٹ اور قلم کی سیاہی بھی چین کی بنی ہوئی نظر آئی۔

تاہم ۱۹۸۵ کے سفر میں محسوس ہوا کہ پچھلے پندرہ سال میں پاکستان نے کافی ترقی کی ہے۔ ہر شعبہ میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر حالات نظر آتے۔

۱۹۷۱ کے سفر کی یادوں میں سے ایک یاد یہ ہے کہ ایک روز رات کا وقت تھا۔ میں اپنے میزبان کے ساتھ ان کے دومنزلہ مکان کی چھت پر کھڑا ہوا تھا۔ چاند کی چاندنی پوری آب و تاب کے ساتھ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش قدرت کے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے میزبان نے گہرے تاثر کے انداز میں کہا:

"یہی چاند تو ہندستان میں بھی چمکتا ہوگا"

کیسی عجیب ہے وہ دنیا جہاں چاند کو ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک تک چمکنے کی اجازت ہو مگر انسان کے لئے حدبندیاں کھڑی ہوئی ہوں۔ چڑیاں آزادانہ طور پر ایک طرف سے دوسری طرف اڑ رہی ہوں مگر انسان ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جانا چاہے تو بے رحم سرحدی قوانین وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوں۔ کتنا خوش قسمت ہے چاند۔ اور کتنا بدقسمت ہے انسان۔

آسٹریلیا کو چھوڑ کر تمام براعظموں (ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ) ہر جگہ مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جب بھی میں کسی دوسرے ملک میں گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہندستان سے مختلف ایک ملک میں آیا ہوں۔ مگر ہندستان سے پاکستان جانا گویا ہندستان سے ہندستان میں جانا ہے۔ دونوں ملکوں میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہندستان اور پاکستان کے ایئر پورٹ پر دونوں ملکوں کے مسافروں کی جتنی تفتیش کی جاتی ہے اتنی تفتیش شاید کسی بھی دوسرے ملک میں آنے جانے والوں کی نہیں کی جاتی۔

تیسرا سفر

لاہور کے لئے میرا تیسرا سفر مارچ ۱۹۸۵ کے آخری ہفتہ میں ہوا۔ ۲۳ مارچ کو دہلی سے لاہور کے لئے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ا ۲۷ سے روانہ ہوا۔ پاکستانی ہوائی کمپنی سے سفر کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ پاکستان ایئرویز کا سفر اکثر پہلوؤں سے دوسرے ہوائی جہازوں جیسا تھا۔ تاہم بعض پہلوؤں سے وہ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ اناونسر کے اعلانات میں السلام علیکم، انشاءاللہ اور خدا حافظ جیسے کلمات سننے کو ملے۔ خاتون اناونسر خالص کتابی اردو بول رہی تھی۔ اسی طرح ہوائی جہاز اور ہوائی اڈہ کے اندراجات میں انگریزی کے ساتھ اردو بھی ہر جگہ لکھی ہوئی نظر آئی۔

اپنے ہوائی سفر میں غالباً پہلی بار مسلمان ہوا باز کا نام سننے میں آیا۔ یہ کیپٹن فاروق تھے۔ انھوں نے ۶۸۰۰ میٹر کی بلندی پر جہاز کو اڑاتے ہوئے ۴۵ منٹ میں اس کو لاہور کے ہوائی اڈہ پر اتارا۔ واپسی میں ۲۸ مارچ کو جہاز کے کپتان مسٹر عبدالقادر تھے۔ لاہور سے دہلی تک پوری پرواز غیر معمولی طور پر ہموار تھی۔ حتی کہ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی سواری میں چل رہے ہیں یا گھر کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔

جہاز کے بیشتر مسافر مسلمان تھے۔ تاہم میرے قریب کی دو نشستوں پر ایک یوروپین جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی عام حالت کے برعکس وہ لوگ اتنا آہستہ بول رہے تھے کہ بمشکل ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ واحد چیز جس سے وہ مجھے اپنے وجود کا احساس دلا رہے تھے وہ ان کے سگریٹ کا دھواں تھا۔ میں سگریٹ کے بارہ میں اتنا زیادہ حساس ہوں کہ ہوا میں اس کی ادنیٰ آمیزش بھی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ تاہم سفر پر نکلنے کے بعد اس سے بچنا ممکن نہیں۔ "نان اسموکنگ زون" میں نشست حاصل کرنا بھی اس مسئلہ کا حل نہیں۔ اس کا حقیقی حل صرف یہ ہے کہ آدمی برداشت کرے یا وہ سفر ہی نہ کرے۔

اڑان کے دوران ہوائی جہاز کے اندر ناشتہ آیا تو عام قاعدہ کے خلاف اس میں صرف چمچہ تھا "چھری کانٹا" نہ تھا۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ اسلامیت تھی یا کفایت شعاری۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۵ کی سہ پہر کو میں پاکستان کے لئے روانہ ہوا تو آج کے دو واقعات کی یاد میرے ذہن میں گھوم رہی تھی۔ آج صبح فجر کی نماز میں نے نظام الدین کی اس مسجد میں پڑھی جس کو عام طور پر کالی مسجد کہا جاتا ہے۔ ایک تبلیغی اجتماع کی وجہ سے آج نمازیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔

نماز کے بعد امام صاحب کھڑے ہوئے۔ انھوں نے مسجد کے لئے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہوئے یہ بتایا

کہ یہ عظیم مسجد سات سو سال پہلے فیروز شاہ تغلق نے بنوائی تھی۔ انگریزوں کے زمانہ میں یہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کے قبضہ میں چلی گئی۔ آزادی کے بعد ہم نے اس کی رہائی کی کوشش شروع کی۔ اس سلسلہ میں گرفتاریاں ہوئیں۔ مقدمہ چلا۔ امام صاحب نے کہا کہ آپ تعجب کریں گے کہ مسجد کے اس مقدمہ میں ہمارے حق میں تین غیر مسلم اصحاب نے گواہی دی۔ ایک ہریجن، ایک بنیا اور ایک برہمن۔ ان لوگوں نے عدالت میں جاکر بیان دیا کہ ہم ۳۰ سال سے مسلمانوں کو یہاں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ اس کی بنیاد پر عدالت نے یہ قدیم شاہی مسجد مسلمانوں کو واگزار کر دی۔ اس کے بعد کئی لاکھ روپے کے خرچ سے اس کی مرمت کرائی گئی اور اس کو اس شاندار صورت میں تبدیل کیا گیا جیسا کہ آپ آج اسے دیکھ رہے ہیں۔

فجر کی نماز پڑھ کر مکان واپس آیا تو آج کے اخبارات موجود تھے۔ ہندستان ٹائمس (۲۳ مارچ ۱۹۸۵) میں مسٹر خشونت سنگھ کا کالم تھا۔ اس میں انھوں نے لندن میں سابق ہندستانی ہائی کمشنر مسٹر سید محمد کی فروری ۱۹۸۵ میں وفات پر ایک لمبا نوٹ لکھا تھا، اس نوٹ میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ پیراگراف بھی تھا:

> The conventional period of mourning prescribed for the deadin Muslim families is forty days. In the case of Valiaveetil Abdul Aziz Syed Mohammad who died last month it will last much longer. Besides his comely wife Thangam, their children and friends amongst whom I count myself, the period of mourning will be our lifetimes. He was a good, able and honest man. Such men are rare. Their going leaves a void in many hearts that remains forever unfilled.

میں ہندستان سے پاکستان جا رہا تھا اور میرے ذہن میں یہ سوال تھا کہ جس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتنے گہرے تعلقات تھے کہ بے شمار ناخوشگواریوں کے باوجود آج بھی وہ اتنی گہرائی کے ساتھ باقی ہیں، اس ملک کو دو قومی بنیاد پر تقسیم کرایا گیا تو آخر کس لئے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہوا تھا جس میں قرار دادِ پاکستان منظور کی گئی تھی۔ اس تاریخی نسبت کی بنا پر پاکستان کی نئی منتخب پارلی منٹ (مجلس شوریٰ) کا افتتاحی اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ کو رکھا گیا۔ ۲۳ مارچ کی شام کو جب میں لاہور پہنچا تو ٹیلیویژن پر جنرل محمد ضیاء الحق کی تقریر آ رہی تھی۔ صدر پاکستان نے اپنی افتتاحی تقریر کا آغاز علامہ اقبال کے اس شعر سے کیا:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

انھوں نے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے جس میں ۳۲۴ ممبران شریک تھے اور جو پاکستان کے نو کروڑ باشندوں کے نمائندہ تھے کہا کہ جوں ہی نئی حکومت نے امور مملکت پر اپنی گرفت مستحکم کر لی تو مارشل لا کی چھتری فوری طور پر لپیٹ دی جائے گی۔ کیوں کہ ارکان اسمبلی اور سینیٹ کی شکل میں اتنے سارے مسیحا اکھٹا ہو گئے ہیں تو یقیناً مریض بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا اور مارشل لا کی کڑوی گولی کو ترک کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ نفاذ اسلام کی رفتار کو تیز کرنا، اور عام آدمی کے روزمرہ کے مسائل ارکان شوریٰ کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ عوام کی توقعات پر پوری اتریں گی اور قوم کو اتحاد، استحکام اور خوشحالی کی طرف لے جائیں گی۔

اس تقریر کا ایک دلچسپ حصہ یہ تھا کہ "صدر ضیاالحق نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایوان کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اس پر غور کرے کہ بیشتر ارکان اسمبلی قانونی حد سے کہیں زیادہ خرچ کر کے ایوان میں پہنچے ہیں"۔ (نوائے وقت لاہور، ۲۴ مارچ ۱۹۸۵)

پاکستان میں مارچ ۱۹۸۵ میں قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مارشل لا حکومت کے تحت الکشن کمیشن نے یہ ہدایت نامہ جاری کیا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے امیدواروں کو ۲۵ ہزار روپے اور قومی اسمبلی کے امیدواروں کو ۴۰ ہزار روپے تک انتخابی مہم پر صرف کرنے کی اجازت ہوگی (جنگ ۹ فروری ۸۵) مگر عملاً جو ہوا وہ یہ تھا کہ مبصرین کے اندازے کے مطابق قومی اسمبلی کے امیدوار نے اوسطاً دو لاکھ سے پانچ لاکھ روپے انتخابی مہم پر صرف کئے۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی کے امیدوار نے اوسطاً ایک لاکھ سے پانچ لاکھ روپے انتخابی مہم پر صرف کیا (امروز ۳ مارچ ۱۹۸۵) ایک اندازہ کے مطابق ملک بھر میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے چار ہزار امیدواروں نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور انتخابی مہم پر مجموعی اعتبار سے چالیس کروڑ روپے خرچ کئے۔ اخبار حریت (۹ فروری ۱۹۸۵) کی ایک خبر میں بتایا گیا کہ کراچی کے حلقہ نمبر ۱۸۹ میں قومی اسمبلی کے ایک مضبوط امیدوار کو پیشکش کی گئی کہ اگر وہ امیدواری سے دست بردار ہو جائیں تو انھیں پندرہ لاکھ روپئے کی ادائگی کی جائے گی۔

پاکستان کے الکشن کے دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک یہ ہے کہ "دین دار" افراد نے آپس میں سخت مقابلہ کیا جس کی وجہ سے دین پسند ووٹ بٹ کر ان کی طاقت کمزور ہو گئی۔ مثال کے طور پر کراچی کے حلقہ نمبر ۱۹ میں محمود اعظم فاروقی اور شاہ بلیغ الدین کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ اسی طرح لاہور میں مولانا ابوالاعلیٰ

مودودی کے صاحبزادہ اور جماعت اسلامی کے ایک رکن کے درمیان مقابلہ ہوا۔

پاکستان کے لوگوں کو بعض چیزیں قدرتی نعمت کے طور پر حاصل ہیں۔ یہاں کا جغرافیہ (خاص طور پر پنجاب کا) صحت اور زرعی پیداوار کے لئے نہایت موزوں ہے۔ سوئی گیس نے ان کے لئے ایندھن کے مسئلہ کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔ یہاں آدمی کو سلنڈر حاصل کرنے کے مشکل مراحل سے گزرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پانی کے پائپ کی طرح گھروں میں کوکنگ گیس کے پائپ لگے ہوئے ہیں۔ جتنا چاہے استعمال کیجئے اور میٹر کے مطابق قیمت ادا کر دیجئے۔

ایک بار میں نے کچھ لوگوں سے پوچھا کہ سنا ہے کہ یہاں کوکنگ گیس کی افراط کی وجہ سے لوگ اپنے چولھے کو بالکل بند نہیں کرتے بلکہ کھانا پکانے کے بعد گیس کو کم کر کے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ دوسرے وقت انھیں دیا سلائی یا لائٹر جلانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔ ایک صاحب نے تصدیق کی۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ سارے لوگ ایسا نہیں کرتے۔ اور اس میں بہت کم گیس جلتی ہے۔ بس ذرا سی چراغ کی لو کی طرح۔ یہ حال اس قوم کا ہے جس کے پیغمبر نے یہ تعلیم دی تھی کہ پانی میں بھی اسراف نہ کرو خواہ تم بہتے ہوئے دریا کے کنارے کیوں نہ ہو (ولو کنت عند نھر جار)

بعض پاکستانی حضرات نے بتایا کہ حکومت کی اطلاع کے مطابق یہاں پورے ملک میں ۵۵ ہزار مسجدیں ہیں۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ "میں نے خود کتنی مسجدیں دیکھی ہیں کہ وہ بند پڑی رہتی ہیں۔ پانچ وقت میں سے ایک وقت بھی وہاں نماز نہیں ہوتی"۔ میں نے سوچا کہ غیر ملک کا محکمہ آثار قدیمہ اگر کسی مسجد کو بند کر دے تو فوراً اسلام خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ اور خود اپنے ملک میں مسلمان اگر مسجد کو بند رکھیں تو اس سے اسلام کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔

اخبار میں ایک خبر یہ پڑھی کہ ۲۳ مارچ کو چنیوٹ میں نماز استسقا ادا کی گئی۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہاں کے ایک معمر بزرگ نے کہا کہ پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس موسم میں قلت مطر پیش آیا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ پہلے جب استسقا کی نماز ہوتی تھی تو عوام امنڈ پڑتے تھے۔ اب تو بہت کم لوگ استسقا کی نماز میں آتے ہیں"۔ یہ حال صرف پاکستان کا نہیں۔ آج تمام مسلم دنیا کا یہی حال ہو رہا ہے۔

یہاں گھروں اور دفتروں میں عام طور پر دو تصویریں ضرور ہوتی ہیں۔ مسٹر جناح اور علامہ اقبال۔

میرے ایک سوال کے جواب میں ایک صاحب نے کہا کہ اقبال نے نہ صرف پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ بلکہ ان کی شاعری نے بالواسطہ طور پر اس کا ذہن بنایا۔ ایک انگریزی اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔ اس میں تین تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر علامہ اقبال کی تصویر۔ اس کے نیچے مسٹر جناح کی۔ اس کے نیچے لیاقت علی خاں کی۔ تینوں تصویروں کے سامنے بالترتیب یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

He thought
He fought
He Sacrificed

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ پاکستان میں اسلام کی کون سی خصوصیت نسبتاً زیادہ زندہ ہے۔ انھوں نے فوراً کہا ''عید میلاد النبی'' ہر سال یہاں کے مسلمان اتنی دھوم سے اور ایسے عجیب عجیب طریقے سے میلاد النبی کا جشن مناتے ہیں جس کو صرف دیکھ کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کروروں روپئے خرچ کئے جاتے ہیں۔ جشن اور دھوم اور ہنگاموں والا اسلام آج دنیا بھر کے مسلمانوں پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ وہ خاموشی والا اسلام جانتے ہی نہیں۔

۲۵ مارچ کو مولانا مظفر حسین ندوی مظفر آبادی (۶۲ سال) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات سنائے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ کئی برس تک دہلی میں کاشف العلوم میں مقیم رہے ھیں۔ ۱۹۴۲ میں وہ دیوبند گئے۔ وہاں وہ مولانا حسین احمد مدنی کے درس حدیث میں شریک ہوئے۔ بخاری کا درس ہو رہا تھا۔ درس ختم ہوا تو ایک طالب علم نے سوال کیا کہ ــــــ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے۔ اس جماعت کا مقصد اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ آپ کی رائے اس جماعت کے بارہ میں کیا ہے۔ مولانا مدنی نے جواب دیا:

> کانگرس اور جمعیۃ علماء ہند کو چھوڑ کر جو کوئی بھی جماعت ہندستان میں بنے گی وہ اس ملک میں انگریزوں کے قدم مضبوط کرنے والی ثابت ہوگی۔

میں نے مولانا مظفر حسین ندوی سے پوچھا کہ اس جملہ سے مولانا مدنی کا مقصد کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس سے جو بات سمجھی وہ یہ تھی کہ دوسری بنیادوں پر جماعت بنانے سے مسلمانوں کی توجہ بٹ جائے گی اور انگریزوں کے خلاف جو سیاسی جدوجہد جاری ہے وہ کمزور پڑ جائے گی۔

پاکستان میں اگرچہ مارشل لا نافذ ہے۔ مگر یہاں کا مارشل لا دوسرے ملکوں کے مارشل لا سے کافی

مختلف نظر آتا ہے۔ مارشل لا کے باوجود لوگوں میں کوئی خوف وہراس نہیں۔ مجلسوں اور اخباروں میں کھلے عام ہر طرح کے تبصرے ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر نوائے وقت (جو یہاں کا آزاد اخبار سمجھا جاتا ہے) اس کی اشاعت ۲۵ مارچ کی پہلی سرخی یہ تھی:

سول حکومت اور مارشل لا ایک ساتھ نہیں چل سکتے

اندر کے صفحے میں ایڈیٹوریل کا عنوان تھا "نئے دور کا آغاز، جمہوریت یا مارشل لائی جمہوریت" اخبارات میں صدر ضیار الحق سے زیادہ نمایاں تصویریں عورتوں اور کھلاڑیوں کی نظر آئیں۔

پاکستان میں ایک عجیب طبقہ ابھر رہا ہے جس کا نام ہے "نوجوان شاعرات" ایک خاتون کالم نگار نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ پاکستان کی حساس طبع خواتین میں روز بروز شاعری کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ خواتین کی اکثریت جو شاعری سے اپنا دل بہلانے کا کام لیتی ہے، چند غزلیں یا نظمیں لکھنے کے بعد ان کو کتابی شکل میں چھپوانے میں بہت جلد بازی کرتی ہے"۔

مولانا عبد الغفار حسن صاحب فیصل آباد کی جامعہ تعلیمات میں حدیث کے استاذ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس مدرسہ میں منطق کا جزء بہت کم رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک عالم کا قول نقل کیا کہ طالب علم اگر ذکی ہے تو اس کو منطق کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ غبی ہے تو وہ منطق کو سمجھے گا نہیں۔

دوسرے اکثر شہروں کی طرح لاہور بھی دو لاہور کا نام ہے۔ ایک قدیم لاہور۔ یہاں تنگ سڑکیں پرانے مکانات، ٹریفک کی بھیڑ کا وہی منظر ہے جس کی مثال پرانی دہلی میں نظر آتی ہے۔ دوسرا نیا لاہور۔ یہاں چوڑی سڑکیں ہیں۔ سرسبز پارک ہیں۔ جدید وضع کے کھلے ہوئے مکانات پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی شخص پرانے لاہور میں آئے اور یہیں سے واپس چلا جائے تو وہ یہ تاثر لے گا کہ لاہور نے پچھلے سو سال کے اندر کوئی خاص ترقی نہیں کی لیکن اگر کوئی نئے لاہور کو دیکھے تو وہ یہ یاد لے کر یہاں سے لوٹے گا کہ لاہور جدید دنیا کا ایک اعلیٰ ترقی یافتہ شہر ہے۔ مشاہدہ کے فرق سے رائیں کس طرح بدل جاتی ہیں۔

آزاد ہندستان سیکولرزم کے نام پر وجود میں آیا۔ چنانچہ یہاں کے لیڈر ہمیشہ سیکولرزم کی بات کرتے ہیں خواہ وہ سیکولرزم سے بالکل دور ہوں۔ یہی حال پاکستان کا ایک اور شکل میں ہوا ہے۔

پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں ہر کام اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ سوشلزم کے حامی اس کو اسلامی سوشلزم کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ عورتوں کو گھر سے نکلنے کی تحریک بھی

اسلامی حریت کے عنوان پر چلائی جاتی ہے۔ ایک تاجر اخبار میں اپنا اشتہار دیتا ہے تو اس کا عنوان ہوتا ہے۔ "الحمدللہ ایک اور امتیاز" حتٰی کہ فلمی لوگ بھی اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ اسلام کا لیبل لگائیں۔ روزنامہ نوائے وقت (۲۶ مارچ ۱۹۸۵) میں نئی فلم "ایک دلہن" کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اشتہار کا مضمون ان الفاظ سے شروع ہوتا تھا:

"انشاء اللہ ماہ اپریل میں نمائش کے لئے پیش کی جائے گی۔"

لاہور کی سڑکوں پر جگہ جگہ ایسے بورڈ نظر آئے جن پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا "نماز قائم کرو" "اتحاد میں برکت ہے" وغیرہ۔ تاہم پاکستان کے اخبارات میں سب سے زیادہ نمایاں مقام فلم اور کھیل کو حاصل ہے۔ نوائے وقت (۲۶ مارچ) میں ترکی کی فلم ایکٹریس نازاں کا انٹرویو تھا۔ اس کا ایک حصہ یہ تھا:

"فیشن میں ترکی پر یورپی تہذیب کا زیادہ اثر ہے۔ وہاں خواتین جدید فیشن کے ملبوسات بہت شوق سے زیب تن کرتی ہیں۔ پیرس اور لندن میں جوں ہی کوئی نیا فیشن ایجاد ہوتا ہے ترکی میں اس کی فوری طور پر کاپی کر لی جاتی ہے۔"

عجیب بات ہے کہ پاکستان میں بے شمار اسلامی جماعتیں اور اسلامی تنظیمیں ہیں۔ مگر غالباً کوئی ایک جماعت یا تنظیم ایسی نہیں ہے جس کے پروگرام میں یہاں کے غیر مسلموں تک اسلام پہنچانا شامل ہو۔ پاکستان میں ہندو اور عیسائی قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے تو انھوں نے بے پناہ ہنگامے کئے۔ مگر غیر مسلموں کو اسلام کی رحمت میں داخل کرنے کے لئے کوئی بھی قابل ذکر کوشش اب تک پاکستان میں وجود میں نہ آسکی۔ حالانکہ اسی ملک میں عیسائی زبردست تبلیغی کوشش میں مصروف ہیں۔

یہی حال آج ساری دنیا کے مسلمانوں کا ہے۔ وہ لوگوں کو جہنم میں ڈالنے کے لئے تو بہت بے قرار ہیں۔ مگر لوگوں کو جنت میں پہنچانے کے لئے ان کے اندر کوئی تڑپ نہیں پائی جاتی۔

پاکستان کے نامزد وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مذہبی آدمی ہیں۔ وہ پیر پگاڑا کے مرید ہیں۔ وہ اپنے پیر کے مکان یا دفتر میں جاتے ہیں تو بغیر جوتوں کے داخل ہوتے ہیں۔ واپسی میں وہ کبھی بھی اپنی پیٹھ کے رخ واپس نہیں آتے۔ چنانچہ یہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ پیر پگاڑا پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں کس طرح شرکت کریں۔ کیونکہ اگر پیر پگاڑا

پارلی منٹ کے اجلاس میں موجود ہوں تو وزیر اعظم محمد خان جونیجو اس بات پر آمادہ نہ ہوں گے کہ وہ اپنے روحانی پیشوا سے بلند مقام پر بیٹھیں۔

پیر پگاڑا کے لاکھوں مریدوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے پیر صاحب کی موجودگی میں کوئی بھی شخص اس عزت کا مستحق نہیں کہ وہ ان سے اونچی نشست پر بیٹھے۔ اس قسم کا ایک واقعہ سابق صدر ایوب خاں کے ساتھ سانگھڑ (سندھ) کے ایک استقبالیہ میں پیش آچکا ہے۔ صدر ایوب خاں اسٹیج پر پیر پگاڑا سے تقریباً دو انچ اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ جب پیر پگاڑا کے مریدوں کو معلوم ہوا تو وہ ہزاروں کی تعداد میں کھڑے ہوگئے اور احتجاج کرنے لگے۔ بعد کو جب صدر ایوب خاں کو صورت حال کا علم ہوا تو وہ فوری طور پر مریدوں کے جذبات کے احترام میں اپنی کرسی سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد مریدین خوش ہوگئے۔ انہوں نے ایوب خاں زندہ باد کے نعرے لگائے۔

وزیر اعظم جونیجو کی اہلیہ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ پردہ میں رہتی ہیں۔ نوائے وقت (۲۶ مارچ) کی ایک خبر میں بتایا گیا تھا کہ وزیر اعظم نے اسلام آباد میں اپنی ہونے والی سرکاری رہائش گاہ کا معائنہ کیا۔" وزیر اعظم نے تزئین و آرائش میں کچھ تبدیلیوں کے احکام بھی جاری کئے۔ بالخصوص نماز اور تلاوت قرآن پاک کے لئے ایک جگہ مخصوص کرنے کی ہدایت کی۔"

۲۵ مارچ ۱۹۸۵ کو جماعت اسلامی پاکستان کے مرکز "منصورہ" کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ مجموعی طور پر بارہ ایکڑ کے رقبہ میں واقع ہے۔ وسیع چہار دیواری کے اندر مسجد، اسکول، اسلامک ریسرچ سنٹر، اسپتال لائبریری، دارالاشاعت، تنظیمی دفاتر، رہائش گاہ وغیرہ بنی ہوئی ہیں۔ درخت اور سبزہ بھی کافی نظر آئے۔ تاہم انتظام کے اعتبار سے وہ عام اداروں سے بہتر محسوس نہیں ہوا۔

جناب نعیم صدیقی صاحب اور دوسرے صاحبان سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ نعیم صدیقی صاحب (۶۹ سال) سے میں نے کہا کہ اپنی زندگی کی کوئی خاص دریافت بتائیے۔ انھوں نے جو بات بتائی وہ میں نے اسی وقت ان سے کاغذ پر لکھوالی۔ موصوف کی دریافت ان کے الفاظ میں یہ تھی:

میرے نزدیک جوہر دین یہ ہے ـــــ دل پاک، دیدہ پاک، ذہن پاک

جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ نوائے وقت (۲۴ مارچ ۱۹۸۵) میں میں نے سینٹ کے رکن اور جماعت اسلامی پاکستان کے سکریٹری جنرل قاضی حسین احمد صاحب کا

بیان پڑھا تھا جس کی سرخی یہ تھی :

جماعت اسلامی پیش کش ہونے پر بھی حکومت میں شامل نہیں ہوگی۔

میں نے میاں طفیل محمد صاحب سے اس بیان کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ایسا فیصلہ کیوں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے ہم نے تجربہ کرکے دیکھ لیا۔ موجودہ حالات میں شرکتِ حکومت کا کوئی فائدہ نہیں۔

جماعت اسلامی نے پاکستان کی مرکزی اسمبلی کے لئے ۶۱ امیدوار کھڑے کئے تھے۔ ان میں رکن اور متفق کو ملاکر صرف آٹھ کامیاب ہوئے۔ میں نے کہا کہ اس سے پہلے آپ حضرات اپنی انتخابی شکست کا ذمہ دار دھاندلی کو بتاتے تھے۔ اس بار خود آپ کی پسندیدہ حکومت نے الکشن کرایا ہے اور آپ کو الکشن لڑنے کا سب سے زیادہ موقع ملا ہے پھر آپ کو شکست کیوں ہوئی۔ میاں طفیل محمد نے بڑا عجیب جواب دیا۔ انھوں نے یہ تسلیم نہیں کیا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو موجودہ الکشن میں شکست ہوئی ہے۔

مسلمانوں کی پرفخر نفسیات نے انھیں اس عجیب وغریب خوش قسمتی سے ہمکنار کیا ہے کہ وہ اپنی شکست کو بھی اپنی فتح کے خانہ میں ڈال سکیں۔

کچھ لوگ سندھ سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ میری کتابوں کا سندھی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ سندھ میں تیزی سے کمیونزم کا سیلاب آ رہا ہے۔ ان کو اولاً پنجابیوں سے بیزاری ہوئی اور اس کے بعد وہ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ پنجاب سے بیزاری کی ایک مثال انھوں نے یہ دی کہ پی آئی اے (پاکستان انٹرنیشنل ایرویز) کو وہ پنجاب انٹرنیشنل ایرویز کہتے ہیں۔ کمیونزم اور الحاد کی کاٹ کے لئے وہ میری کتابوں کو سندھی زبان میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ میرے اندازہ کے مطابق یہ مسئلہ عقیدہ کا نہیں بلکہ مفادات کا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مختلف اسباب سے وہ پنجابیوں سے پیچھے ہوگئے۔ فوائد کی تقسیم میں انھیں کم حصہ ملا اور پنجابیوں کو زیادہ۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر ردعمل پیدا ہوا۔ اپنے ردعمل کے اظہار کے لئے انھیں اسلام کا نعرہ زیادہ مفید مطلب نظر نہیں آیا۔ چنانچہ کمیونزم کو اپنے لئے زیادہ مفید مطلب سمجھ کر انھوں نے کمیونزم کا نعرہ اختیار کرلیا۔ انھوں نے میرے اس نقطہ نظر کی تصدیق کی۔

لاہور میں بہت سے لوگوں نے آٹو گراف لئے۔ ایک آٹو گراف مجھے یاد ہے۔ میں نے اپنی دستخط کے ساتھ انھیں حسب ذیل جملہ لکھ کر دیا:

زندگی اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس کو مطلوب اعلیٰ سے کمتر کسی چیز میں ضائع کیا جائے۔

لاہور کے قرآنی محاضرات کا عنوان تھا: تصور فرائض دینی۔ مختلف علما نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق مختلف قسم کے خیالات پیش کئے۔ میں نے ۴۵ منٹ کی تقریر میں یہ دکھانے کی کوشش کی کہ دینی دعوت کا نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔

۲۴ مارچ کو شام کی نشست میں میں نے ایک مقالہ پڑھ کر سنایا جس کا عنوان تھا "دلائل قرآن" لوگوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ اور متعدد لوگوں نے اس کی فوٹو کاپی کرا کر اس کی نقل حاصل کی۔

۲۵ مارچ کی شام کو جناب کرامت اللہ شیخ کی رہائش گاہ پر ایک نشست ہوئی۔ اس میں کچھ پروفیسر اور ڈاکٹر حضرات شریک ہوئے۔ گفتگو کے انداز میں اسلامی موضوعات پر باتیں ہوئیں۔ یہ نشست تقریباً دو گھنٹہ تک جاری رہی۔

۲۶ مارچ کی صبح کو مولانا وصی مظہر ندوی اور الانصار المسلمون کے دوسرے ذمہ دار ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ دیر تک ملی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔

مختلف ملاقاتوں کے درمیان مجھ کو ایک تجربہ یہ ہوا کہ ہر آدمی اپنے ذہن کو کسی نہ کسی شخصیت سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ وہ ہمیشہ اسی کی نسبت سے سوچتا ہے۔ مثلاً ایک بار میں نے ایک بات کہی۔ ایک صاحب نے فوراً کہا "ہاں حضرت تھانوی نے بھی یہی بات اس طرح فرمائی تھی"۔ حالانکہ انھوں نے جو ملفوظ نقل کیا اس کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح ایک بار میں نے کوئی بات کہی تو ایک صاحب فوراً بولے "جی ہاں۔ یہی بات مولانا مودودی نے فلاں موقع پر کہی تھی"۔ حالانکہ جو بات انھوں نے نقل کی وہ ایک اور ہی بات تھی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ صرف شخصیتوں کو پہچانتے ہیں۔ وہ حقیقتوں کو نہیں جانتے۔ کسی حقیقت کو وہ اس وقت تک سمجھ نہیں پاتے جب تک وہ اس کو اپنی محبوب شخصیت کے ساتھ وابستہ نہ کر لیں۔ ایسے لوگ کبھی حقیقت کو نہیں پاتے۔ ان کے لئے وہ لذت مقدر نہیں جو اس دنیا میں صرف اس شخص کا حصہ ہے جو حقیقت کو براہ راست دریافت کرے۔

ایک طبقہ وہ بھی ہے جو رسول کے معاملہ میں غلو کرتا ہے۔ وہ رسول کو اتنا بڑھانا چاہتا ہے کہ رسول

کا درجہ خدا سے بڑھ جائے یا کم ازکم وہ اس کے ہم پلہ ہو جائے۔ اس طبقہ میں جو نادان لوگ ہیں وہ یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ:

اللہ کے پلہ میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمد سے

اور جو لوگ نسبتاً سنجیدہ ہیں وہ دوسرے الفاظ میں سوچتے ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ نے فرمایا: شان کے اعتبار سے قرآن کا درجہ پہلا ہے اور رسول اللہ کا درجہ دوسرا۔ مگر ایمان کے اعتبار سے رسول اللہ کا درجہ پہلا ہے اور قرآن کا درجہ دوسرا۔ کیونکہ قرآن کو ہم رسول اللہ کے کہنے کی وجہ سے مانتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں بے فائدہ لفظ بازی ہیں۔ حقیقت دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

۲۳ مارچ سے ۲۸ مارچ تک یہ پروگرام رہا کہ روزانہ دن کے اوقات میں تنظیم اسلامی کے اجتماعات ہوتے۔ ان میں وہ تمام افراد تنظیم شریک ہوتے تھے جو ملک کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد محاضرات قرآنی کا سلسلہ شروع ہوتا۔ ان محاضرات کا عنوان تھا: تصور فرائض دینی۔ مختلف طبقہ کے علماء کو اس موقع پر دعوت دی گئی تھی کہ وہ مذکورہ موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ لوگوں کو اس کی بھی پوری آزادی تھی کہ وہ تنظیم اسلامی اور انجمن خدام القرآن کے نظریات یا پروگرام پر کھلی تنقید کریں۔

راقم الحروف ہر روز محاضرات قرآن کی نشستوں میں شریک ہوا۔ میرا احساس ہے کہ اصل موضوع پر بہت کم اظہار خیال ہوسکا۔ زیادہ تر لوگوں کی تقریریں واعظانہ انداز میں تھیں۔ تاہم بعض ایسے افراد بھی تھے جنھوں نے اصل موضوع کا پابند رہ کر اظہار خیال کیا۔

لاہور کی بادشاہی مسجد دیکھی جو اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ دہلی کی شاہجہانی مسجد سے بڑی ہے۔ دونوں کا طرز تعمیر اگرچہ ایک ہے۔ مگر دہلی کی مسجد میں جو غیر معمولی تناسب ہے وہ لاہور کی مسجد میں نظر نہ آیا۔ البتہ لاہور کی مسجد میں صفائی اور دیکھ بھال وغیرہ کا انتظام بہت زیادہ ہے۔

مسجد کے اندر کئی کمروں میں تاریخی تبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عمامہ، آپ کا عصا، اور جبہ اور موئے مبارک وغیرہ۔ بعد کے بزرگوں کے تبرکات بھی موجود ہیں۔ مجموعی طور پر تبرکات کی تعداد تقریباً ۳۰ ہے۔ ۱۸۵۳ میں لارڈ لارنس کے حکم سے ان تبرکات کی تاریخ لکھی گئی تھی۔ اس کے لکھنے والے سید نور الدین اور سید محمد لطیف تھے۔ انھوں نے تبرکات لاہور نامی کتاب میں تحقیق

کرکے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ تبرکات کس طرح مختلف ہاتھوں میں ہوتے ہوتے یہاں پہنچے۔ یہ تبرکات اپنے آخری مرحلہ میں انگریزی حکومت کی طرف سے انجمن اسلام لاہور کو دئے گئے۔

مسجد کے ایک حصہ میں قرآن کا ایک خاص نسخہ نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ سنہرے تاروں سے لکھا گیا ہے۔ عطا محمد مزارات پر چڑھائی جانے والی چادریں تیار کرتے تھے۔ ان کا مکان آتش بازی کے ایک کارخانہ کے اوپر تھا۔ کارخانہ میں آگ لگنے سے ان کا مکان اور بیوی بچے سب ہلاک ہوگئے۔ اس کے بعد روحانی سکون حاصل کرنے کے لئے عطا محمد کے ذہن میں آیا کہ وہ سنہری تاروں سے قرآن پاک تیار کریں۔ مختلف لوگوں کے تعاون سے انھوں نے دس سال میں یہ قرآن تیار کیا۔ یہ قرآن ۱۳۲۸ صفحات پر ہے۔ اس کی ۳۰ موٹی موٹی جلدیں ہیں۔ وہ ۱۹۷۷ میں اس مسجد میں رکھا گیا۔

مسجد سے متصل سکھوں کی ایک بڑی عمارت ہے۔ اس کے اندر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا مقبرہ اور گوردوارہ ہے۔ ہم اس کے اندر داخل ہوئے اور درشن سنگھ سے ملے جو یہاں "سیوا دار" کی حیثیت سے مقیم ہیں۔ جب ہم ان کے کمرہ میں داخل ہوئے تو وہ ٹیلیفون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔

پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اردو زبان کی ایک بڑی کمی یہ تھی کہ اس کا ٹائپ نہیں تھا۔ مگر دور جدید میں کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کو حل کر دیا۔ برطانیہ کی ایک کمپنی نے کمپیوٹر کے ذریعہ اردو ٹائپ سٹنگ کی مشین ایجاد کی ہے۔ یہ مشین کافی مہنگی ہونے کی وجہ سے ابھی عام نہ ہوسکی۔ پاکستان میں کچھ اخبارات (مثلاً جنگ، نوائے وقت) اسی مشین کے ذریعہ چھپتے ہیں۔

تاہم اس کے حروف میں وہ خوبصورتی نہیں جو ہاتھ کی کتابت میں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ مشین کی خرابی نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ کمپنی کے ذمہ داروں نے حروف تیار کرنے کا کام آرٹسٹ سے کرایا جب کہ یہ کام انھیں خطاط سے کرانا چاہئے تھا۔ انگریزی میں یہ کام چونکہ آرٹسٹ ہی انجام دیتے ہیں اس لئے انھوں نے اردو کے لئے بھی آرٹسٹ کا انتخاب کیا۔ معلوم ہوا کہ کمپنی کے لوگ دوبارہ خطاط کے ذریعہ نئے حروف تیار کرانا چاہتے ہیں۔

لاہور میں ایک میواتی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میواتی قوم کی نصف تعداد پاکستان میں ہے اور نصف تعداد ہندستان میں۔

ان کو حکومت پاکستان سے شکایت تھی۔ انھوں نے کہا کہ میواتی لوگ جب ۱۹۴۷ میں پاکستان

میں داخل ہوئے تو انھوں نے یہاں کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کی پوری آبادی کو ایک جگہ بسایا جائے۔ مگر یہ مطالبہ منظور نہیں کیا گیا۔ چنانچہ یہ تمام میواتی مختلف علاقوں میں منتشر ہیں۔

میوات کے لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں۔ وہ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ حکومت نے ایسا کیوں کیا۔ اصل یہ ہے کہ میواتی قوم نے اپنے آپ کو ایک لڑاکا قوم کی حیثیت سے متعارف کیا ہے۔ انھوں نے دہلی کے مسلم سلاطین کی ماتحتی قبول نہیں کی۔ اسی طرح انگریزوں کے دور میں بھی وہ برابر بغاوت کرتے رہے۔ ایسی حالت میں حکومت پاکستان کا یہ سوچنا بالکل درست تھا کہ ان کو مجموعہ کی شکل میں بسانا ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ وہ یہاں بھی شورش برپا کرتے رہیں گے۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کے بارہ میں حضرت مسیح نے فرمایا کہ ـــــ انھیں دوسرے کی آنکھ کا تنکا دکھائی دیتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (فیصل آباد) کا ٹیلی فون آیا کہ وہ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فیصل آباد کے سفر سے معذوری ظاہر کی۔ چنانچہ وہ خود لاہور تشریف لائے۔ ان سے موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کے موضوع پر گفتگو رہی۔ اس مجلس میں روزنامہ وفاق کے اڈیٹر جناب مصطفی صادق صاحب اور بعض دوسرے حضرات بھی موجود تھے۔

ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میری رائے اس سے بالکل مختلف ہے جو عام طور پر آپ نے سنا ہوگا۔ لوگ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق ، ہمیشہ ظلم و ستم کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ مگر یہ یا تو تحریف (distortion) ہوتی ہے یا تعمیم (generalization) یعنی یا تو کسی واقعہ کو بگاڑ کر غلط شکل میں پیش کیا جاتا ہے یا کسی اتفاقی واقعہ کو عمومی حالت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنا نقطۂ نظر نہایت تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس کا نام ہے "حل یہاں ہے"۔

پاکستان کے لئے روانگی سے چند دن پہلے میں نے ایک اخبار میں ایک بیان پڑھا تھا۔ یہ پاکستان کی سابق مجلس شوریٰ کی خاتون رکن بشریٰ رحمان کا بیان تھا۔ اس بیان میں انھوں نے ہندستانی مسلمانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا :

ہندستان کے مسلمان ثقافتی شدھی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی

حالت اتنی زیادہ خراب ہے کہ مسلمانوں کو وہاں باعزت روزگار حاصل کرنے کے لئے ہندو نام رکھنے پڑتے ہیں۔ ان کو ہندوؤں جیسی وضع قطع اختیار کرنی پڑتی ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس طرح کے جھوٹے بیانات دینے میں بہت سے مذہبی رہنما بھی عام لیڈروں سے پیچھے نہیں ہیں۔ مثلاً مولانا مودودی نے ایک بار ہندستان کے مسلمانوں کو اسرائیل کے عربوں کے مشابہ بتایا۔ میں جب اس کو پڑھتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کس خانہ میں ڈالوں۔ کیوں کہ اس قسم کے تبصرہ سے قائل کی سنجیدگی مشتبہ ہو رہی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۵۹ میں عرب دنیا کا سفر کیا تھا۔ ان کے ہمراہ ان کے رفیق خاص محمد عاصم صاحب بھی تھے جنھوں نے واپسی کے بعد "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے اس سفر کی تفصیلی روداد شائع کی۔ یہ روداد ۱۹۶۲ میں لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور محمد عاصم صاحب نومبر ۱۹۵۹ میں سمندری جہاز کے ذریعہ کراچی سے بحرین پہنچے۔ یہاں کی روداد کا ایک حصہ کتاب میں ان الفاظ میں درج ہے:

> (بحرین میں) مولانا مودودی لوگوں کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت موثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی تو شاید وہ اتنی موثر نہ ہوتی۔ بعض لوگوں نے پاکستان کے موجودہ سیاسی مسائل کے متعلق بھی سوالات کئے لیکن مولانا نے ان کا جواب نہیں دیا اور فرمایا کہ میں پاکستانی سیاسیات کو کراچی کے ساحل پر بطور امانت رکھ آیا ہوں۔ اور جب واپس جاؤں گا تو اسے وصول کرلوں گا۔ اس لئے آپ لوگ اس کے متعلق مجھ سے سوالات نہ کریں (صفحہ ۳۳)

حیران کن بات یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خود اپنے ملک کے بارہ میں تو جانتے تھے کہ اس کی بابت باہر انھیں خاموش رہنا ہے۔ مگر یہی بات وہ ہندستان کے نازک تر مسئلہ کے بارہ میں نہیں جانتے تھے۔ کیسا عجیب تھا ان کا جاننا اور کیسا عجیب تھا ان کا نہ جاننا۔

ایک سفر

نومبر ۱۹۸۵ میں کرۂ ارض کے اس حصہ کا سفر ہوا جس کی بابت خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں کہا تھا :

کولمبس کو دنیا نئی تو نے بخشی

یہ سفر امریکہ کے دو شہروں، نیویارک اور نیوجرسی کے لیے تھا۔ نیویارک کے لیے میرا پہلا سفر اپریل ۱۹۸۳ میں ہوا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسرا سفر موجودہ سفر تھا۔ یہ سفر ایک عالمی مذاہب کانفرنس کے دعوت نامہ پر ہوا۔

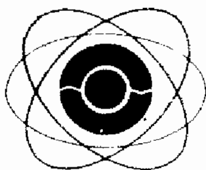
مذاہب کی پارلیمنٹ (World's Parliament of Religions) کے نام سے ایک کانفرنس امریکہ کے شہر شکاگو میں ۱۸۹۳ میں ہوئی تھی۔ اس تاریخی کانفرنس کی یاد میں امریکہ میں زیادہ وسیع پیمانہ پر ایک بین اقوامی کانفرنس ہوئی جس میں ساری دنیا سے مختلف مذاہب کے نمائندے بلائے گئے۔ اس کانفرنس کا مقصد روحانی اتحاد (Spiritual Unity) اور عالمی امن بتایا گیا تھا اس کو انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن (نیویارک) نے منظم کیا تھا۔ انٹرنیشنل ریلیجس فاونڈیشن کے ایک ذمہ دار پروفیسر ہیوسٹن اسمتھ (Huston Smith) ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں بھی اس سے پہلے آئے تھے جس کا ذکر الرسالہ مارچ ۱۹۸۵ کے خبرنامہ میں شائع ہو چکا ہے۔

مجھ کو اس کانفرنس میں اسلام کے نمائندہ کے طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس دعوت نامہ کے مطابق میں اس کانفرنس میں شریک ہوا اور وہاں اپنا مقالہ پیش کیا جس کا عنوان تھا :

The Concept of Morality in Islam

یہ مقالہ ان شاء اللہ الرسالہ (انگریزی) میں شائع کر دیا جائے گا۔ کانفرنس کی طرف سے جو دعوت نامہ موصول ہوا اس میں درج تھا کہ آپ اپنے بچوں میں سے کسی کو لانا چاہیں تو اپنے ساتھ لا سکتے ہیں چنانچہ ڈاکٹر ثانی اثنین بھی میرے ساتھ اس سفر میں شریک تھے۔

اس کانفرنس کا نام اس کے ذمہ داروں نے (Assembly of the World's Religions)



Assembly of the World's Religions

A Project of the International Religious Foundation, Inc.

c/o Unification Theological Seminary
10 Dock Road
Barrytown
NY 12507
(914) 758-8838/39
Telex: 4991393 NWERA
Cable IRFINC

May 3, 1985

Maulana Wahiduddin Khan
C-29, Nizamuddin West
New Delhi - 110 013
India

Dear Mr. Khan

This letter is to invite you to attend an Assembly of the World's Religions, which will occur at the American Great Gorge Conference Center, McAfee, New Jersey (near New York City) on Friday, November 15th to Thursday, November 21st, 1985.

The Assembly of the World's Religions, 1985, is the first in a major series of events in world ecumenism, to be followed in 1989 by a seco gathering. These events are to be preparatory meetings for a major Assembly to take place in 1993, in commemoration of the 100th anniversary of the 1893 World's Parliament of Religions that was held in conjunction with the Columbian Exposition in Chicago, Illinois, U.S.A. (see enclosed brochure for more details).

The Assembly is sponsored by the International Religious Foundation; Inc. (I.R.F.) established by the Unification Church (see last page of enclosed brochure). The Assembly grows organically out of two I.R.F. projects: the annual international conference on "God: The Contempora Discussion" initiated by New ERA (the New Ecumenical Research Association) and the "Youth Seminar on World Religions".

The theme of the 1985 Assembly is, "The Recovery of our Classical Spiritual Heritage", emphasizing the worldwide phenomena of a return roots and the retrieval of traditional values. The Assembly seeks, through an integrated program of prayer, meditation, study, dialogue, film, art and ritual, to discern patterns of unity and understanding among the world's religious traditions. It seeks to provide a new environment for global religious exchange in order to foster international harmony, social justice and authentic human development.

This event will bring together approximately 600-700 spiritual teache scholars, scientists, lay leaders, artists and youth. The Assembly's program of plenary speakers will feature spiritual leaders from the world's traditions, including Venerable Samdhong Rinpoche, His holine Swami Chidananda, Professor Wande Abimbola and others. The Assembly strive to reflect a balanced representation of the religious traditio genders, cultures and regions of our world. Participants will select membership in one of 12 working themes, which will then be subdivided into smaller groups of 20-25 contributors. The 12 themes of the 1985 Assembly will be:

1. Interreligious Dialogue
2. Family Life and Learning
3. Spiritual Journey and the Formation of Persons
4. Social, Political and Economic Systems
5. Images of God, Woman, and Man
6. Stewardship of Creation and the Fate of the Earth
7. Spiritual Disciplines and Practices
8. Poverty and Human Rights
9. Communication, Language, Symbol and Art
10. Science and Technology
11. The Encounter with Secularity
12. Morality, Ethics and Values

یعنی عالمی مذاہب کی اسمبلی رکھا تھا۔ ہندستان سے اس "اسمبلی" میں کئی درجن افراد شریک ہوئے جو ہندو ازم، جین ازم، بدھزم، سکھ ازم وغیرہ مذاہب سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندستان سے شریک ہونے والے دوسرے مسلمان ڈاکٹر سید اوصاف علی (ڈائرکٹر اسلامک انسٹی ٹیوٹ، تغلق آباد نئی دہلی) تھے۔ وہ اسمبلی کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ اس اعتبار سے غالباً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی کہ اس میں دنیا بھر کے تمام چھوٹے بڑے مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے۔

۱۳ نومبر ۱۹۸۵ کو ہم دہلی ایرپورٹ میں داخل ہوئے اور اگلے دن ۱۴ نومبر کو آگے کے لیے روانہ ہوئے۔ ایرپورٹ پر اتنا زیادہ وقت کیسے لگا۔ اس کا سبب ہوائی جہاز کا وقت تھا۔ دہلی سے ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت رات کو بارہ بج کر ۴۵ منٹ پر تھا۔ انگریزی کیلنڈر کے مطابق ۱۲ بجے رات کو ایک تاریخ ختم ہوتی ہے اور ۱۲ بجے رات کے فوراً بعد اگلی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر اگرچہ ہم صرف تھوڑی دیر رہے۔ مگر اسی تھوڑی دیر میں کیلنڈر کی ایک پوری تاریخ بدل چکی تھی ——— زندگی ایک عجیب سفر ہے۔ اس میں کبھی ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک پہونچنے کے لیے "۲۴ گھنٹے" لگ جاتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک تاریخ سے دوسری تاریخ تک کا سفر صرف چند لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔

ہندستان سے امریکہ کا سفر بہت لمبا سفر ہے۔ ہوائی جہاز سے تقریباً ۲۰ گھنٹے۔ مزید یہ کہ ہوائی حادثات کی تاریخ میں ۱۹۸۵ سب سے زیادہ برا سال رہا ہے۔ اس سال اگست ۱۹۸۵ تک کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۲ ہوائی حادثات ہوئے۔ ان میں مجموعی طور ۱۶۹۸ مسافر ہلاک ہوئے۔ پچھلے ۲۰ سال کے اندر ہوائی حادثات میں مرنے والوں کا اوسط سالانہ ۹۰۰ تھا۔ اس لحاظ سے ۱۹۸۵ کا اوسط تقریباً تین گنا زیادہ ہے۔ ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو اٹلانٹک کے اوپر ایر انڈیا کا حادثہ خاص اسی راستہ میں ہوا تھا جس میں ۳۲۹ آدمی ہلاک ہو گیے۔ اگرچہ عام حادثات میں لوگوں کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ مگر ہیگ پروٹوکول کے مطابق ہوائی حادثہ میں ہلاک ہونے والے ہر مسافر کے پس ماندگان کو ۲۰ ہزار ڈالر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

ان حالات میں جب میں دہلی میں ایر انڈیا کی فلائٹ ۱۰۴ پر بیٹھا تو ایسا محسوس ہوا گویا میں ایک پر خطر سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ دل میں تھوڑی دیر کے لیے دہشت کا احساس ہوا۔ پھر مجھے

جان شیڈ (John Shedd) کا قول یاد آیا کہ جہاز بندرگاہ پر محفوظ ہوتا ہے مگر جہاز اس لیے نہیں کہ وہ بندرگاہ پر کھڑا رہے :

A ship in harbour is safe, but that is not what ships are for.

یہ جہاز بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑا جہاز ہوتا ہے۔ اس کے اندر آپ ایک سرے پر کھڑے ہوں تو آپ دوسرے سرے کے مسافر کو پہچان نہیں سکتے۔ ایسے ایک جہاز کی قیمت تقریباً پچاس کرور روپے ہوتی ہے۔ اس قسم کے جہاز زیادہ تر امریکہ میں بنائے جاتے ہیں۔ جہاز سازی کی صنعت میں امریکہ آج سب سے آگے ہے۔ کسی جہاز پر خواہ ایر انڈیا لکھا ہوا ہو یا ایر پاکستان، سعودی ایر لکھا ہوا ہو یا ایرانی ایر بہر حال وہ امریکی کارخانہ کا بنا ہوا ہوگا۔

ہماری پہلی منزل بمبئی تھی۔ جاتے ہوئے یہ جہاز دہلی، بمبئی۔ لندن۔ نیویارک کے راستے سے جاتا ہے اور واپسی میں نیویارک لندن۔ دہلی واپس آتا ہے۔ ہمارا یہ سفر ایک لحاظ سے "بمبئی" سے "بمبئی" کے لیے تھا۔ ہندستان میں جو حیثیت بمبئی کی ہے۔ امریکہ کے اعتبار سے وہی حیثیت وہاں نیویارک کی ہے۔ نیویارک گویا زیادہ بڑا بمبئی ہے۔ چند سو سال پہلے نیویارک اور بمبئی دونوں یکساں طور پر سمندر کے کنارے کی دو معمولی بستیاں تھیں۔ مگر آج دونوں میں ترقی کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق ہو چکا ہے۔ بمبئی اگر ایک ملک کا اقتصادی مرکز ہے تو نیویارک ساری دنیا کا اقتصادی مرکز۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو آدمی ایک ساتھ سفر شروع کرتے ہیں۔ مگر بعد کے حالات ایک کو آگے کر دیتے ہیں اور دوسرے کو پیچھے۔

۱۴ نومبر کی صبح کو ہوائی جہاز دبئی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ دبئی کا ہوائی اڈہ بہت منظم اور شاندار ہے۔ سب سے پہلے ہم کو مسجد کی تلاش ہوئی۔ اوپر کی منزل پر پہونچے تو وہاں ایک کنارے چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ اسی کے ساتھ نہایت صاف ستھرا حمام بھی تھا۔ ہم نے وضو کر کے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

مسجد سے باہر نکلے تو خیال آیا کہ دبئی اور شارجہ میں کچھ لوگوں کو ٹیلیفون کیا جائے۔ دبئی میں مقامی ٹیلیفون کرنے کی کوئی قیمت نہیں۔ مقامی کال یہاں فری ہے۔ چنانچہ ہم نے دبئی کے ایک صاحب (شیخ علی الہاشمی) کا نمبر ملایا۔ نمبر فوراً مل گیا اور بغیر کسی اختلال کے گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد ایک

ٹیلی فون شارجہ (شکیل احمد چیف انجینیر) کو کرنا تھا۔ شارجہ ٹیلی فون کرنے کے لیے مشین میں ایک درہم ڈالنا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس یہاں کا "درہم" موجود نہ تھا۔ شرطہ کے ایک عرب نوجوان (محمد یوسف عبداللہ) نے ہماری مشکل کو محسوس کیا۔ انھوں نے فوراً اپنی جیب سے ایک درہم نکالا اور مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ لیجیے۔ قاعدہ ہے کہ تین منٹ کے بعد ٹیلی فون پر روشن حروف میں لکھ اٹھتا ہے کہ مزید رقم ڈالیے ہم بات کر رہے تھے تو استاذ محمد یوسف عبداللہ دوسرا درہم ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے تھے کہ جیسے ہی نشان ظاہر ہو فوراً دوسرا درہم مقررہ سوراخ میں ڈال دیں۔ مگر ابھی نشان ظاہر نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے احتیاطاً دوسرا درہم بطور خود ڈال دیا۔

یہ دبئی کا حال تھا۔ دوسری طرف دہلی کا حال یہ ہے کہ ہم نے دہلی ایرپورٹ سے گھر پر ٹیلی فون کرنا چاہا۔ دہلی میں مقامی ٹیلی فون کے لیے پچاس پیسے کا سکہ ڈالنا ہوتا ہے، ہمارے پاس روپیہ تھا، پچاس پیسے کا سکہ نہیں تھا۔ ایرپورٹ کے کئی لوگوں اور دکانداروں سے کہا کہ وہ روپیہ لے کر پچاس پیسے کے دو سکے دیدیں مگر کسی نے کوئی دل چسپی نہ لی۔ بمشکل پچاس پیسہ کا سکہ حاصل کیا تو اب ٹیلی فون کے نظام کا حال یہ تھا کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود سلسلہ قائم نہیں ہوا اور بات نہ ہو سکی۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک ہی دنیا کے دو حصوں میں پایا جا رہا ہے۔

ہوائی کمپنیاں فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے خصوصی رعایتیں دیتی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ رعایتیں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً امریکہ کی ہوائی کمپنی (PAN AM) نے امریکی ہوائی اڈہ پر اترنے والے مسافروں کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ مخصوص قریبی مقامات پر انھیں ہیلی کاپٹر سے پہونچاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایرانڈیا کی ان فلائٹ میگزین (نمسکار) نومبر۔ دسمبر ۱۹۸۵ میں ایک صفحہ پر ایرانڈیا کے فرسٹ کلاس کا باتصویر اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں دکھایا گیا تھا کہ ایرانڈیا اپنے فرسٹ کلاس مسافروں کے لیے کیا خاص خاص سہولتیں مہیا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک چیز اس کے الفاظ میں یہ تھی :

A selection of the finest wines and liquor (p. 52)

یعنی بہترین اقسام کی منتخب شرابوں کی فراہمی۔ آزادی سے پہلے ہندستان کے مجاہدین آزادی شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ عربی مدارس کے مسلم طلبہ کی جماعت دہلی آتی تھی کہ یہاں شراب کی

دکانوں پر پکٹنگ کرے۔ یہ لوگ شراب کے خلاف مذہبی اور اخلاقی دلائل استعمال کرتے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عمل کا کوئی بھی تعلق شراب کے مذہبی مسئلہ سے نہ تھا۔ اس کا مقصد صرف انگریزی حکومت کو لوگوں کی نظر میں برا دکھانا اور اس کے خلاف عوامی نفرت پیدا کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی حکومت کے خاتمہ کے بعد اگرچہ ملک میں شراب کا رواج پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے مگر اب کوئی اس کے خلاف پکٹنگ کرنے والا نہیں۔ اس طرح کے سیاسی ذہن کے تحت جو تحریک چلائی جائے وہ صرف سماج کی برائیوں میں اضافہ پر ختم ہوتی ہے۔ خواہ اس کو کتنے ہی خوبصورت عنوان کے تحت شروع کیا گیا ہو۔

دبئی سے سات گھنٹہ مسلسل پرواز کرنے کے بعد ہمارا جہاز لندن پہونچا۔ یہ سفر بہت زیادہ اُکتا دینے والا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر ایک ہزار سال پہلے کوئی شخص کہتا کہ وہ عرب سے انگلستان تک کا سفر سات گھنٹہ میں کرا دے گا تو لوگ اس کو عجوبہ سمجھتے اور جب وہ واقعۃً لوگوں کو سواری میں بٹھا کر سات گھنٹہ میں عرب سے انگلستان پہونچا دیتا تو لوگوں کو یہ مدت اتنی کم معلوم ہوتی کہ وہ کہتے کہ ابھی ہم سواری پر بیٹھے تھے اور ابھی اتر گئے۔ مگر آج تیز رفتار سواری کے دور میں سات گھنٹہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے ــــ انسان اکثر اضافی اصطلاحوں میں سوچتا ہے۔ مگر اکثر وہ غلطی سے سمجھ لیتا ہے کہ وہ حقیقی اصطلاحوں میں سوچ رہا ہے۔

لندن ایرپورٹ پر ایک گھنٹہ گزرا۔ یہاں کا ہوائی اڈہ بہت بڑا ہے۔ ہوائی اڈہ پر اندراجات انگریزی کے بعد عربی زبان میں نظر آئے۔ ہوائی اڈہ پر ایسا معلوم ہوا گویا یہاں انگریزی کے بعد دوسری زبان عربی ہے۔ یہاں ٹیلی فون کا نظام نہایت معیاری ہے۔ آپ ایرپورٹ پر لگی ہوئی مشین میں رقم ڈال کر ملک کے کسی بھی حصہ میں براہ راست ٹیلی فون کر سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک صاحب نے اسی طرح برمنگھم سے بات کی۔ لندن اور دہلی کے درمیان ڈائرکٹ ڈائلنگ ہے۔ چنانچہ ہم نے ایرپورٹ پر ٹیلی فون کر کے دہلی سے بات کی۔ صرف ایک بار ڈائل کرنے میں لائن مل گئی۔ آواز اتنی صاف تھی گویا کہ بالکل قریب سے بات ہو رہی ہو۔ اس کے مقابلہ میں دہلی میں ٹیلی فون کا حال یہ ہے کہ ایک مرتبہ انگریزی اخبار میں لطیفہ شائع ہوا تھا۔ ایک شخص نے دہلی فون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "دہلی کے نصف باشندے کنکشن کا انتظار کر رہے ہیں اور بقیہ نصف ڈائل ٹون کا :

While half the people in the Capital are waiting for their telephone connections, the remainder are waiting for the dial tone.

لندن سے جہاز روانہ ہوا تو اعلان ہوا کہ لندن سے نیویارک تک کی دوری سات گھنٹہ میں پوری کی جائے گی۔ سات گھنٹہ کا لفظ حوصلہ شکن تھا۔ کیوں کہ دبئی سے لندن تک کے سات گھنٹے بہت اکتا دینے والے ثابت ہوئے تھے۔ مگر حیرت انگیز طور پر یہ سفر بہت آسانی سے طے ہوگیا۔ "ہم نیویارک پہونچنے والے ہیں" کا اعلان سنائی دیا تو ایسا محسوس ہوا گویا سات گھنٹے صرف سات منٹ میں پورے ہو گیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دبئی سے لندن تک کا وقت زیادہ تر جاگنے میں گزرا تھا۔ مگر جہاز جب لندن سے چلا تو ہمیں نیند آگئی اور تقریباً پورا سفر نیند کی حالت میں طے ہوا۔ یہاں تک کہ نیند اس وقت کھلی جب کہ جہاز کے اناؤنسر نے اعلان کیا کہ "اپنی بیٹ باندھ لیں" نیند بھی کیسی عجیب نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے راحت و سکون کے لیے بنائی ہے۔

نیویارک کے جے ایف کے ایرپورٹ میں داخل ہوئے تو وہاں دیوار پر ہر زبان میں "ویلکم" لکھا ہوا تھا۔ سواگتم، خوش آمدید اور مرحبا کے الفاظ بھی لکھے ہوئے نظر آئے۔ اس طرح گویا نیویارک کا ایرپورٹ بزبان حال اعلان کر رہا تھا کہ آپ ایک انٹرنیشنل ایرپورٹ پر پہونچ گیے ہیں۔

ایرپورٹ پر "اسمبلی آف دی ورلڈز ریلیجنز" کے نمائندے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا بینر لیے ہوئے موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں نیویارک سے نیوجرسی کا سفر شروع ہوا۔ نیوجرسی اور نیویارک کے درمیان تقریباً پچاس میل کا فاصلہ ہے۔ نیوجرسی اگرچہ ایک الگ علاقہ ہے تاہم وہ "عظیم تر نیویارک" کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

نیوجرسی میں ایک بہت بڑا ہوٹل ہے جو آٹھ سو ایکڑ رقبہ میں قائم ہے۔ یہ رزورٹ (resort) کے انداز میں پہاڑیوں اور سرسبز درختوں کے ماحول میں بنایا گیا ہے۔ بڑی بڑی کانفرنسیں اکثر اسی ہوٹل میں ہوتی ہیں۔ موجودہ کانفرنس کے لیے دنیا بھر سے ہر مذہب کے نمائندے بلائے گیے تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تقریباً سات سو تھی۔ کانفرنس کے دوران ایک ہفتہ کے لیے پورا ہوٹل رزرو کر لیا گیا تھا۔ میرا قیام یہاں کمرہ نمبر ۶۲۲ میں تھا۔ ہوٹل کا نام و پتہ یہ ہے:

Americana Great Gorge Resort
Route 517, Mc Afee, New Jersey 07428 U.S.A.

کانفرنس کے منتظمین نے شرکار کے لیے ہر قسم کا بہترین انتظام کیا تھا۔ مگر چوں کہ یہ ایک مذہبی

کانفرنس تھی، کانفرنس کی گائڈبک میں یہ الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے:

Alcoholic beverages will not be provided

یعنی کانفرنس کے ذمہ داروں کی طرف سے شرکا کے لیے شراب نہیں مہیا کی جائے گی۔

۱۵۰۰ء تک امریکہ ایک بالکل ناقابل ذکر علاقہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت تک امریکنوں کے پاس پہیہ دار گاڑیاں بھی نہیں تھیں۔ ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء میں کرسٹوفر کولمبس کی کشتی اتفاقاً امریکہ کے ساحل پر پہونچی۔ کولمبس ایک اسپینی باشندہ تھا اور ایک عرب ملاح کے ساتھ اٹلانٹک میں سفر کر رہا تھا کہ وہ امریکہ کی سرزمین میں پہونچ گیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے یورپی باشندے امریکہ آنا شروع ہوئے ۱۵۶۵ء میں اسپینیوں نے شمالی امریکہ میں پہلا قلعہ بنایا۔ اس وقت جو لوگ یورپ سے امریکہ آئے ان کو قدیم امریکی باشندوں نے آسمانی لوگ (Men from the sky) کا نام دیا۔

۱۶۰۷ء میں برطانی لوگ اٹلانٹک کو پار کرکے امریکہ پہونچے۔ انھوں نے ورجینیا میں اپنی پہلی آبادی قائم کی۔ اس وقت امریکہ کی زمین اتنی کم قیمت رکھتی تھی کہ منہاٹن کے باشندوں نے صرف ۲۴ ڈالر میں منہاٹن کا پورا جزیرہ ڈچ کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ فرانسیسیوں نے یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ ابتداءً امریکہ مختلف یورپی قوموں کی شکارگاہ رہا۔ جس میں برطانی قوم کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اگست ۱۷۷۶ کی جنگ کے بعد برطانیہ نے نیویارک پر قبضہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد مزید علاقے اس کے قبضہ میں آتے رہے۔ آزادی کے بعد ۱۷۸۷ میں امریکہ کا پہلا دستور بنا۔

۱۷۹۰ میں پہلی بار امریکہ کی مردم شماری ہوئی اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی کل آبادی تقریباً چار ملین تھی۔ امریکہ قدرتی ذخیروں سے مالامال ہے۔ چنانچہ اس کی دریافت کے بعد مختلف ملکوں کے لوگ کثرت سے آکر امریکہ میں بسنے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۰ تک اس کی آبادی ۱۰۶ ملین تک پہونچ گئی۔ ان میں آٹھ ملین صرف انگریز تھے۔

یہ امریکہ کے لیے ایک ایڈوانٹج بن گیا۔ کیوں کہ اس طرح سے جو افراد آئے وہ سب حوصلہ مند اور اعلیٰ صلاحیت کے لوگ تھے۔ چنانچہ امریکہ نے تیزی سے ترقی شروع کی۔ ۱۹۱۴ کی جنگ عظیم میں امریکہ نے عالمی صنعتی طاقت کی حیثیت حاصل کر لی۔ اور دوسری جنگ عظیم نے امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔

امریکہ میں مذہب کے اعتبار سے آبادی کی تقسیم حسب ذیل ہے ـــــ پروٹسٹنٹ ۵۵ فی صد۔ رومن کیتھولک ۳۷ فی صد۔ یہودی ۴ فیصد۔ آرتھوڈاکس ایسٹرن چرچ ۳ فی صد۔ بقیہ ایک فیصد۔ آبادی کے لحاظ سے امریکہ کا سب سے بڑا شہر نیویارک ہے۔

امریکہ کا اصل دین تجارت ہے۔ صدر کالوین کولج (Calvin Coolidge) نے کہا تھا کہ امریکہ کا کام تجارت کرنا ہے :

(The business of America is business)

مگر ہندستان کے بنیا اور امریکہ کے بنیا میں یہ فرق ہے کہ ہندستان کا بنیا صرف بنیا ہے اور امریکہ کا بنیا سائنٹفک بنیا۔ اس وقت امریکہ کی سب سے بڑی تجارت اس کے جدید ترین ہتھیار ہیں۔ ۱۹۸۴ میں امریکہ نے ۸۰۰ ملین ڈالر کا ہتھیار ایشیائی ملکوں کے ہاتھ فروخت کیا۔

امریکہ کی دل چسپی زیادہ تر بھاری صنعتوں میں ہے۔ مگر جاپان کے تجربہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ "چھوٹی" صنعتیں بھی "بھاری" صنعتوں کو شکست دے سکتی ہیں۔ مثلاً امریکہ بڑی بڑی قیمتی کاروں کے بنانے میں اجارہ داری حاصل کیے ہوئے تھا۔ جاپان نے چھوٹی کم خرچ کاریں بنانی شروع کیں۔ جاپان کو اس معاملے میں اتنی زبردست کامیابی حاصل ہوئی کہ آج امریکہ کی سڑکیں جاپانی کاروں سے بھری ہوئی ہیں۔ کوئی قوم خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کے اندر کوئی گوشہ خالی رہتا ہے۔ اس خالی گوشہ سے داخل ہو کر آپ اس کے اوپر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہربرٹ ہوور (Herbert Hoover) نے ۱۹۲۸ میں کہا تھا کہ بہت جلد ہم خدا کی مدد سے امریکہ سے غریبی کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر اس کے بعد ۱۹۲۹ اور ۱۹۳۲ کے درمیان زبردست تجارتی بحران (depression) آیا۔ اس میں پانچ ہزار بینک بند ہو گئے۔ کارخانوں کا مال بکنا موقوف ہو گیا۔ امریکہ کی ایک تہائی آبادی کا یہ حال ہوا کہ وہ بے روزگاری کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ اقتصادی بحران قوت خریداری نہ ہونے سے پیدا ہوا تھا نہ کہ سامانِ خریداری نہ ہونے کی وجہ سے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ وہ عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوئی جو اس سے پہلے دنیا میں کبھی نہیں آئی تھی :

People went hungry while fruit, vegetables and grain were in abundance. Houses were unheated while coal piled up in mountains.

لوگ بھوکے تھے، جب کہ پھل اور سبزی اور غلّہ افراط کے ساتھ پایا جا رہا تھا۔ مکانات ٹھنڈے پڑے ہوئے تھے جب کہ پہاڑوں میں کوئلہ کا ڈھیر موجود تھا۔

آج بظاہر امریکہ میں خوش حالی ہے۔ مگر یہ خوش حالی سراسر مصنوعی ہے۔ امریکی آبادی کا پچاس فی صد سے زیادہ حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ یہاں ہر آدمی کے پاس بینک کا کریڈٹ کارڈ ہوتا ہے۔ اس سے وہ کوئی بھی چیز ادھار لے سکتا ہے ــــــ کار، ٹیلی وزن، مکان وغیرہ وغیرہ۔ اس سہولت کی وجہ سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی بڑھائے۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی حقیقی آمدنی سے آگے بڑھ کر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ قرض پر گھر بناتا ہے جو اکثر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ وہ گھر کے اندر ہر قسم کے تعیش کے سامان جمع کرتا ہے۔ یہ تمام قرضے سودی قرضے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کا بیشتر حصہ بینکوں کا مقروض ہے۔ وہ ساری عمر ان کے سود ادا کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی حال میں مر جاتا ہے۔

خود امریکی حکومت کا حال اس سے مختلف نہیں۔ ڈالر کی برتری قائم رکھنے کے لیے امریکی حکومت ڈالر پر بہت بڑھی ہوئی شرح سود دیتی ہے تاکہ لوگ اس کے بینکوں میں اپنا ڈالر جمع کریں۔ چنانچہ زیادہ سود کا لالچ دے کر امریکہ دنیا بھر کا ڈالر اپنے یہاں جمع کر لیتا ہے۔ اس طرح امریکی اقتصادیات میں زبردست کثرت نظر آتی ہے مگر یہ کثرت سراسر مصنوعی ہے۔ اگر دنیا بھر کے لوگ امریکی بینکوں سے اپنا ڈالر واپس لے لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہو جائے گا۔

۱۵ نومبر کو جمعہ کا دن تھا۔ ہوٹل کے ایک مخصوص کمرہ میں اجتماع کے مسلم شرکار اکٹھا ہوئے اور جمعہ کی نماز ادا کی۔ دکتور عصفوری (Dr. Z. Asfoury) نے نماز پڑھائی۔ وہ مصری ہیں اور لندن میں رہتے ہیں۔ انھوں نے فرش پر کھڑے ہو کر صرف ایک خطبہ دیا۔ درمیان میں بیٹھے نہیں۔ خطبہ میں عربی زبان کی اہمیت پر زور تھا۔ انھوں نے کہا کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو صرف ایک زبان (عربی زبان) اختیار کر لینا چاہیے۔ ایک خطبہ کے بعد انھوں نے نماز پڑھائی تو اس میں پہلی رکعت میں قُلْ هُوَ اللّٰه کی تلاوت کی اور دوسری رکعت میں الم نشرح کی۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی۔

ہندستان میں کوئی شخص اس طرح نماز پڑھائے تو تمام نمازی کہہ اٹھیں گے کہ نماز نہیں ہوئی، اس کو دہراؤ۔ مگر یہاں کوئی شخص کچھ نہ بولا۔ نماز ادا کرنے کے بعد کچھ لوگ سنتوں میں مشغول ہو گیے،

اور کچھ لوگ خاموشی سے باہر چلے گیے۔

۱۵ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ جدید طرز کے وسیع ہال میں ۸۵ ملکوں کے آٹھ سو سے زیادہ افراد موجود تھے جو روئے زمین کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے مذاہب کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۸۹۳ میں (World's Parliament of Religions) عالمی مذاہب کانفرنس شکاگو میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان سے سوامی ویویکانند بحری سفر کرکے بڑی دشواریوں کے ساتھ شکاگو پہونچے تھے۔ وہ اس کانفرنس میں مدعو نہ تھے۔ محض ذاتی شوق سے وہاں گیے تھے۔ چنانچہ ان کو بڑی مشکل سے اس میں داخل ہونے اور تقریر کرنے کی اجازت ملی۔ انھوں نے اپنی تقریر کا آغاز اس لفظ سے کیا تھا کہ امریکہ کے بہنوں اور بھائیو :

Sisters and brothers of America

نوے سال پہلے سوامی دیویکانند کا یہ انداز واقعہ کے مطابق تھا۔ کیوں کہ ۱۸۹۳ کی کانفرنس میں زیادہ تر امریکہ کے لوگ شامل تھے۔ مگر موجودہ کانفرنس کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ موجودہ کانفرنس " امریکی بہنوں اور بھائیوں " کی کانفرنس نہ تھی بلکہ وہ پورے کرۂ ارض کے تمام مذاہب کے نمائندوں کی کانفرنس تھی۔ چنانچہ اس کے صدر نے جب " اسمبلی " کا افتتاح کیا تو اس نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی :

Sisters and brothers, from south and north, from east and west

اس کانفرنس میں اول سے آخر تک صرف ایک زبان استعمال ہوئی اور وہ انگریزی تھی۔ لوگوں کے عقائد، ان کے حلیے اور ان کے لباس ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر سب ایک ہی زبان (انگریزی) بولتے تھے۔ اگرچہ لوگوں کے لہجہ میں کافی فرق تھا۔ مثلاً کوئی entity کو انٹاسٹی کہتا تھا۔ کوئی your کو یوار۔ کوئی values کو فیلوز۔ کوئی modern کو ماڈرن۔ کوئی those کو زوز وغیرہ۔

انگریزی کا یہ استعمال انگریزی تہذیب کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔ اولاً برطانیہ عظمیٰ نے انگریزی کو عالمی زبان بنایا۔ بیسویں صدی میں جب برطانیہ عظمیٰ نے عالمی طاقت کی حیثیت کھودی تو امریکہ اس کی جگہ زیادہ بڑے پیمانہ پر عالمی طاقت بن چکا تھا۔ انگریزی زبان کا یہ عمومی استعمال بر بنائے واقعہ

تھا نہ کہ بر بنائے تعصب ۔ اگر ہم اس کو تعصب سمجھیں تو اس کے خلاف احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرتے رہیں گے ۔ اس کے برعکس اگر ہم اس کو ایک واقعہ سمجھیں تو انگریزی زبان کی یہ توسیع ہم کو ایک نعمت معلوم ہو گی ۔ اس سے ہمارے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ کیوں کہ اس کی وجہ سے تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ کسی ایک زبان کے ذریعہ دنیا بھر کے تمام انسانوں کو خطاب کیا جا سکے ۔

پوری کانفرنس میں غالباً صرف ایک شخص تھا جو انگریزی زبان سے واقف نہ تھا۔ یہ افریقہ کے قبائلی مذہب کا پیشوا تھا۔ وہ اپنے مخصوص لباس میں آیا تھا۔ وہ اپنے کندھے پر برابر ایک خاص طرح کا کوڑا رکھے رہتا تھا۔ وہ اپنی مقامی زبان میں بولتا تھا اور ایک شخص اس کی گفتگو کا ترجمہ انگریزی زبان میں کرتا تھا۔ اس کے لیے ترجمان کا یہ استثنائی انتظام غالباً اس لیے کیا گیا تھا تاکہ مذاہب کی فہرست نامکمل نہ رہ جائے ۔

اس کانفرنس کی منصوبہ بندی دو سال پہلے سے ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس کی ایک ایک بات پہلے سے طے شدہ تھی۔ اجتماع کے بارہ میں چھوٹی بڑی تمام تفصیلات کاغذ پر مرتب کر کے مدعو حضرات کو بھیج دی گئی تھیں۔ ہر شخص کو پیشگی طور پر معلوم تھا کہ کس روز اس کو نیویارک پہونچنا ہے ۔ کس روز وہاں سے روانہ ہونا ہے اور اس درمیان میں اس کو کن کن کارروائیوں میں حصہ لینا ہے ۔ اس سلسلہ میں منتظمین کی طرف سے اتنے خطوط اور کاغذات موصول ہوئے کہ ان کا ایک پورا فائل بن گیا۔ راقم الحروف کو اس کا دعوت نامہ چھ ماہ پہلے مل چکا تھا۔ میں نے بہت سی مسلم کانفرنسوں میں شرکت کی ہے مگر اتنا نظم اور اتنی مکمل منصوبہ بندی مجھے کسی مسلم کانفرنس میں نظر نہ آئی ۔

اگرچہ شرکاء، خاص طور پر مشرقی ممالک کے شرکاء نظم کی پوری پابندی کا ثبوت نہ دے سکے ۔ مثال کے طور پر جن لوگوں سے مقالہ تیار کرنے کی فرمائش کی گئی تھی ان سے کہا گیا تھا کہ مقالہ کو جدید الکٹرانک ٹائپ رائٹر پر دونوں طرف برابر سطروں (Both side aligned) میں ٹائپ کر کے بھیجیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے اپنا مقالہ عین اسی قاعدہ کے مطابق ٹائپ کرا کر پیش کیا۔ مگر وہاں میں نے دیکھا کہ بہت کم لوگوں نے اس کی پابندی کی تھی ۔ زیادہ تر مقالے عام طرز کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کرائے گئے تھے جو ایک طرف برابر ہوتے ہیں اور دوسری طرف غیر برابر ۔

TITLES: WRITTEN CONTRIBUTIONS

Assembly of the World's Religions

Theme Group 12A

"Morality, Ethics and Values"

Rev. Dr. Oyinloye Samuel Abogunrin	COVENANT IN THE ETHICAL SYSTEM OF THE YORUBA
Dr. Anis Ahmad	'ADL AS A MAJOR OBJECTIVE OF ETHICS, MORALITY AND LAW IN ISLAM
Dr. Gianni Ambrosio	SOCIAL CHANGE AND MORAL QUESTIONS
Dr. Elizabeth Amoah	MODERATOR
Dr. Shlomo Biderman	IS JEWISH ETHICS POSSIBLE?
Father Laurent Bilgho	TRADITIONAL VALUES IN THE RELIGION OF MOSSI TRIBE "THE MOAAGA FAMILY"
Dr. Pal - Khn Chon	WON BUDDHIST VIEW ON EQUALITY
Dr. Abdullah Ciptoprawiro	ETHICS AS A MEANS TOWARDS SELF-REALIZATION AND PERFECTION
Mr. John Dickson	OBSERVER
Dasho Rigzin Dorji	MORALITY, ETHICS AND VALUES
Venerable Sonam Gyaltsen	COMPASSION AND BODHICITTA IN TIBETAN BUDDHISM
Dr. Erik Hoogcarspel	THE ETHICAL FOUNDATION OF INTERRELIGIOUS COMMUNICATION
Chief Ogundiya Iroko	OGUN AND YORUBA TRADITIONAL VALUES
Maulana Wahiduddin Khan	THE CONCEPT OF MORALITY IN ISLAM
Mr. Zillur Rahman Mollah	RELIGION AND MORALITY WITH SPECIAL REFERENCE TO ISLAM
Professor Adrian T. Peperzak	"VALUES" IN RELIGION AND MORALITY
Dr. Ramon C. Reyes	MORAL REFLEXION AS HERMENEUTICAL: FROM THE TELEOLOGICAL TO THE HISTORICAL
Dr. Abdulaziz A. Sachedina	THE IMPORTANCE OF LEADERSHIP IN NURTURING THE GOOD SOCIETY: THE ISLAMIC PRESCRIPTION
Mr. Nimal Samarasundera	BUDDHIST ETHICS FOR WORLD PEACE
Pandit Chintaman Gowkarran Sharma	MORALITY, MORALS AND ETHICS
Professor Fernando Tola	ETHICS OF THE BHAGAVAD-GITA FOR THE MODERN WORLD
Reverend Levi Chris Williams	RELIGION AND BIOETHICS

نیویارک کی اس "اسمبلی" میں تمام مذاہب کے نمائندے ایک ہوٹل میں مقیم تھے۔ وہ ایک ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ بے تکلف ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھے۔ ایک ہال میں جمع ہوکر ایک دوسرے کی باتیں سنتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ کہیں مناظرہ کی فضا پیدا نہیں ہو رہی تھی اور نہ کہیں متعصبانہ سلوک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہاں میں نے اسلام کے سوا دوسرے مذاہب کے لوگوں سے باتیں کیں۔ مگر کبھی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ کبھی کوئی ناخوش گوار صورت حال سامنے نہیں آئی۔

یہ بالکل ایک نئی چیز ہے۔ یہ صرف دور جدید میں ممکن ہوا ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ سنجیدہ ذہن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہوں، اور کسی اشتعال کے بغیر ایک دوسرے کی باتیں سنیں۔ قدیم زمانہ میں اس طرح کی مذہبی یک جائی ممکن نہ تھی۔ اس صورت حال نے ہمارے لیے دین کے تعارف کا بالکل نیا امکان کھول دیا ہے، ایک ایسا امکان جو اس سے پہلے کبھی پایا نہ جاتا تھا۔

۵ نومبر کی شام کو صرف افتتاح کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد پروگرام کی ترتیب یہ تھی کہ ہر روز بڑے ہال میں ایک عام اجتماع ہوتا جس میں مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات پیش کرتے۔ اس کے بعد حلقہ وار اجتماعات ہوتے۔ تمام لوگ بارہ موضوعات کے تحت بارہ حلقوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ہر حلقہ روزانہ اپنے اپنے موضوع پر بحث کرتا اور کسی متفقہ رائے تک پہونچنے کی کوشش کرتا۔ میرا تعلق (Theme Group 12-A) سے تھا۔

اس اجتماع میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں افریقہ کے قبائلی مذہب کے نمائندے بھی تھے جو بتوں کو پوجتے ہیں اور ان کے پیشوا اپنے عجیب وغریب عقائد کے تحت اپنے چہرہ کو گرم لوہے سے اس طرح داغتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے ان کے چہرے پر اس کا نشان پڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں ایسے مذاہب کے نمائندے بھی تھے جن کے پیشوا انتہائی جدید طرز پر رہتے ہیں۔ وہ رولس رائس کاروں پر سفر کرتے ہیں۔ اور ان کے پاس ان کے ذاتی ہوائی جہاز ہیں۔ اس کانفرنس میں بُت پرست بھی تھے اور خدا پرست بھی۔ ان میں روح کو پوجنے والے بھی تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو خدا جیسی کسی چیز کو سرے سے نہیں مانتے۔

چنانچہ اس اجتماع میں ایک طرف خدا اور مذہب کی باتیں سننے میں آتی تھیں اور دوسری طرف خدا اور مذہب کے خلاف باتیں بھی۔ ان میں سے چند جملے یہ ہیں :

The God of the theologians is dead.
I am a Buddhist, there is no God for me.
Life is nothing but a chemical process.
There is no other God than Truth.
Religious people are God-centered people.
I have no belief in God, but I do profess faith in the spirit of Man.
Man, ethically, is an end in himself.
The main aim of religion is peace and happiness.

اسلامی نقطۂ نظر سے اگر اس کانفرنس کا خلاصہ کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ بیشتر مذاہب کے نمائندوں نے یہ کہا کہ مذہب کا مقصد شخصیت کی تعمیر کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کے نمائندوں نے تقریباً متفقہ طور پر اسلام کی امتیازی صفت یہ بیان کی کہ اسلام صرف فرد کا دین نہیں، وہ پورے اجتماعی نظام میں مکمل انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں۔ کیوں کہ میرے نزدیک اسلام کا اصل نشانہ فرد ہے نہ کہ اجتماع۔ اجتماعی تغیر اس کا بالواسطہ جزء ہے نہ کہ براہ راست۔ تاہم میں نے اس سے اعراض کیا کہ کانفرنس میں دیگر مذاہب کے نمائندوں کے سامنے مسلمانوں سے اختلافی بحث کرنے لگوں۔ البتہ الگ سے ان کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنے کی کوشش کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی مذکورہ تعبیر درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی تعمیر ہی خود اسلام کا مقصد بھی ہے جس طرح وہ دوسرے مذاہب کا مقصد بتایا جاتا ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو فرق ہے وہ کامل اور ناقص کا نہیں بلکہ مستند اور غیر مستند کا ہے۔ اسلام دینِ خداوندی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے جب کہ دوسرے مذاہب دینِ خداوندی کا بگڑا ہوا اڈیشن۔ اصل مقصد کے اعتبار سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں۔ مگر مقصد کے حصول کے لیے آج صرف اسلام ہی قابل اعتبار ماخذ ہے نہ کہ دوسرے مذاہب۔ دوسرے مذاہب اپنی اعتباریت کھو چکے ہیں۔

تحریف و تغیر کی وجہ سے دوسرے مذاہب میں اصل حقیقت بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ مثلاً ہندوازم انسانی شخصیت کی تعمیر معرفت خویش (Self realization) میں بتاتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تعمیر کا راز معرفت خدا (God realization) میں پوشیدہ ہے۔ عیسائیت کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو ابن اللہ کی حیثیت سے پالے جب کہ اسلام کے نزدیک انسانی شخصیت کی تکمیل اس میں ہے کہ آدمی رسول کو خدا کے پیغام رساں کی حیثیت سے پا سکے۔ بدھزم اخلاقی احساس پیدا کرنے کا سرچشمہ موجودہ دنیا

میں تلاش کرتا ہے جب کہ اسلام کے نزدیک انسان کے اندر اخلاقی احساس پیدا کرنے کا ذریعہ آخرت کی جواب دہی کا یقین ہے۔ بعض مذاہب کے نزدیک انسانی شخصیت اس طرح بنتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کو سچا سمجھے جب کہ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے اور اسی ایک سچائی کو دریافت کرکے وہ اپنی ذات کو ارتقار کی طرف لے جاسکتا ہے۔ بعض مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ فرد موت وحیات کے بلسے مراحل سے گزر کر اپنی انتہا کو پہونچتا ہے، جب کہ اسلام کا نقطۂ نظریہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں کے عمل کی بنیاد پر آدمی موت کے بعد اپنا اچھا یا بُرا انجام پاتا ہے۔

دوسرے مذاہب میں تحریف کی وجہ سے خدا کی بات کچھ سے کچھ ہو گئی۔ جب کہ اسلام میں خدا کی بات اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں محفوظ ہے۔ انسان پورے اعتماد کے ساتھ اسلام کو اختیار کر سکتا ہے جب کہ دوسرے مذاہب کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کتاب کے صحیح اور مستند اڈیشن کی موجودگی میں اس کے ایسے نسخوں کو اپنے علم کا ماخذ بنایا جائے جس میں زمانہ کی دستبرد سے بے شمار غلطیاں ہو گئی ہوں۔

۱۸ نومبر کو ہم لوگ قافلہ کی صورت میں نیوجرسی سے نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ آج کا دن نیویارک کے اہم مقامات کو دیکھنے کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ ایک شخص جس نے نیویارک نہ دیکھا ہو اس کے ذہن میں نیویارک کی عظمت کا افسانوی تصور ہوتا ہے ـــــ تاریخ کی سب سے اونچی عمارتوں کا شہر، جدید صنعتی تمدن کا سب سے بڑا مرکز، وغیرہ۔ مگر جب ہم نے نیویارک پہونچ کر اس کو دیکھا تو اس کی عظمت کا طلسم ٹوٹ گیا وہ اس سے کم نظر آیا جتنا وہ خیالی طور پر محسوس ہوتا تھا۔ نیویارک صرف نیویارک تھا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

نیویارک میں ہم نے اقوام متحدہ (United Nations) کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھا جان ڈی راکفلر نے نیویارک میں سمندر کے کنارے سترہ ایکڑ کی قیمتی زمین اقوام متحدہ کے لیے وقف کردی۔ اس پر اقوام متحدہ کے صدر دفاتر کی عمارتیں بنائی گئیں۔ سترہ ایکڑ کا یہ علاقہ ایک آزاد علاقہ ہے۔ یہ صرف اس کے سکریٹری جنرل کے حکم کے تابع ہے۔

اقوام متحدہ کی بلند و بالا عمارتوں میں گھومتے ہوئے ہم اس کے ایک ہال میں پہونچے۔ یہاں اس وقت ٹرسٹی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ وسیع ہال میں نیچے اوپر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مگر مقرر

اور دفتری کارکنوں کے سوا تقریباً سب کی سب خالی تھیں ، اسٹیج پر ایک مقرر تقریر کر رہا تھا جس کی ہلکی آواز خالی ہال میں گونج رہی تھی۔ وہاں سننے والے اتنے کم تھے کہ بے شمار کرسیوں کے درمیان انھیں تلاش کرنا پڑتا تھا کہ کچھ سننے والے ہیں بھی یا نہیں۔ اس کے بعد ہم اقوام متحدہ کے سب سے بڑے ہال میں پہونچے جو جنرل اسمبلی کے اجلاس کے لیے خاص ہے۔ آج یہاں نمیبیا کے مسئلہ پر اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک شخص اسٹیج پر بیٹھا ہوا انگریزی میں تقریر کر رہا تھا۔ جس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ امریکی وزیر خارجہ جارج شلز بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ مگر یہاں بھی یہ حال تھا کہ جنرل اسمبلی کے ۱۶۰ ممبر ممالک کی تعداد کے بقدر بھی سامعین موجود نہ تھے۔ سننے والے اتنے کم تھے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام کرسیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔

اقوام متحدہ کی وسیع عمارتوں کے باہر ایک بہت بڑا اسٹیچو لگا ہوا ہے۔ یہ ایک طاقت ور آدمی ہے جس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھوڑا۔ وہ پوری طاقت سے بھاری ہتھوڑے کو تلوار پر مار رہا ہے۔ آرٹ کا یہ نمونہ سوویت روس نے ۱۹۵۹ میں اقوام متحدہ کو بطور عطیہ دیا تھا۔ اس پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں :

We shall beat our swords into plowshares

ہم اپنی تلواروں کو توڑ کر ان کے ہل بنائیں گے۔

۲۴ جون ۱۹۴۵ کو پچاس ملکوں نے مل کر اقوام متحدہ کو قائم کیا تھا۔ اب اس کے ممبر ملکوں کی تعداد ۱۶۰ ہو چکی ہے۔ ابتدائی عہد نامہ کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے برباد شدہ دنیا کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ دنیا کو امن، تحفظ، ترقی اور باہمی احترام کا ماحول دیا جائے۔ اور قوموں کا ایک عالمی نظام (International order) قائم کیا جائے۔ مگر اقوام متحدہ پر چالیس سال گزر گیے اور اب تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس مدت میں قوموں کے درمیان پیدا ہونے والے سیکڑوں مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کو بھی اس نے حل نہیں کیا۔ آج اقوام متحدہ قوموں کی امیدوں کا مزار ہے نہ کہ قوموں کی امیدوں کی تکمیل کا قلعہ۔ اقوام متحدہ کی رونق اب صرف ان لوگوں کے ذریعہ ہے جو اس کو دیکھنے کے لیے ہر روز بڑی تعداد میں آتے ہیں اور جن کی اکثریت اسکول کے بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر یہ دیکھنے والے لوگ نہ آئیں تو شاید اقوام متحدہ کے ادارہ میں قبرستان کا سناٹا

نظر آئے ـــــــ تصویر میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا آسان ہے اور عملی واقعہ میں تلوار کو توڑ کر ہل بنانا کتنا مشکل۔

نیویارک کی غیر معمولی وسعت کے لحاظ سے اس کی اندرونی سڑکیں تنگ نظر آئیں۔ دونوں طرف انتہائی اونچی عمارتوں کی قطار کے درمیان اس کی سڑکیں گلیوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ نیویارک اپنی انتہائی اونچی عمارتوں کے لیے مشہور ہے۔ یہ عمارتیں ضرورت کی پیداوار ہیں۔ لوگوں کے لیے افقی اضافہ (Horizontal growth) کا موقع نہ تھا اس لیے انھوں نے (Vertical growth) عمودی اضافہ کا عمارتی طریقہ اختیار کر لیا۔ تاہم یہ طریقہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ نیویارک کی زمین بیشتر چٹانی ہے۔ دہلی کی جامع مسجد ایک چٹان پر بنائی گئی ہے۔ یہی معاملہ نیویارک کا ہے۔ نیویارک کی زمین کی سطح اگر چٹانی نہ ہوتی تو یہاں اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کرنا ممکن نہ ہوتا۔

نیویارک کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ اس کی تعمیر میں ۶۰ ہزار ٹن لوہا استعمال ہوا ہے۔ اس میں ۱۸۶۰ سیڑھیاں ہیں۔ تاہم لفٹ کے ذریعہ آدمی صرف تین منٹ میں ۱۰۲ منزل پر پہونچ جاتا ہے۔ البتہ اس کے لیے اسے تین لفٹ بدلنی پڑتی ہے۔ ایک زمانہ میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ دنیا کی سب سے اونچی بلڈنگ سمجھی جاتی تھی۔ مگر اب اس سے بھی زیادہ اونچی بلڈنگیں تیار ہو گئی ہیں۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی عمارت ۱۱۰ منزلہ ہے۔ شکاگو کے سیرس ٹاور (Sears Tower) کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ وغیرہ۔

نیویارک کی اونچی بلڈنگوں کے بارے میں بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ مثلاً ایک لطیفہ ہے کہ ایک آدمی ایک اونچی بلڈنگ میں آیا۔ اس کو اوپر جانا تھا۔ جب وہ بلڈنگ کی لفٹ کے پاس پہونچا تو وہاں یہ نوٹس لگا ہوا تھا:

Complaints department on the 45th floor.
Lift out of order; please use the stairs.

شکایت کا شعبہ ۴۵ ویں منزل پر ہے۔ لفٹ کام نہیں کر رہی ہے۔ براہ کرم سیڑھیاں استعمال کریں

۱۸ نومبر کی شام کو "اسمبلی" کی ایک نشست نیویارک شہر میں ہوئی۔ یہ نشست میٹروپولیٹن

باپٹسٹ چرچ میں تھی۔ یہاں اچاریہ سوشیل منی کمار اور ڈاکٹر جوزف پیگ وغیرہ کی تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے دوران زبردست تالیاں بجتی رہیں۔ کارروائی کے آخر میں "قرأت" کا پروگرام تھا۔ انگریزی انجیل کا ایک حصہ نہایت تجوید کے ساتھ پڑھا گیا۔ انجیل کی یہ قرأت جس شخص نے کی اس کا تعارف ساری دنیا میں انجیل کے بہترین قاری (Best Gospel singer of the world) کی حیثیت سے کرایا گیا۔ پہلے ایک شخص نے قرأت کی۔ اس کے بعد چار آدمیوں نے مل کر انجیل کا ایک حصہ کورَس کی شکل میں پڑھا۔

اسمبلی کے اجتماع (امریکانا ہوٹل) میں ہر مذہب کے نمائندے روزانہ اپنے مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کرتے تھے۔ ۱۹ نومبر کو منی سوشیل کمار نے جین مذہب کی مقدس کتاب کی تلاوت کی۔ اسی طرح بدھ ازم، ہندو ازم، سکھ ازم، یہودیت، زرتشت وغیرہ کی مقدس کتابیں پڑھی گئیں۔ ان قرأتوں کو سن کر میرے ذہن نے ان کا مقابلہ قرآن کی قرأت سے کیا۔ اس مقابلہ میں قرآن کی قرأت اتنی اعلیٰ اور جاذب نظر آئی کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسری تمام کتابوں کے الفاظ انسانی الفاظ ہیں اور قرآن کے الفاظ خدائی الفاظ۔ اس کی وجہ سے قرآن کے الفاظ میں ایک عجیب عظمت اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے جو کسی دوسری مذہبی کتاب میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ساؤنڈ آرٹ (Sound art) کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دنیا کی کوئی بھی کتاب اس معاملہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں ایک موثر دعوتی طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسے ٹیپ تیار کیے جائیں جن میں مختلف مذہبی کتابوں کی قرأت ریکارڈ کی گئی ہو۔ ہر مذہب کی کتاب کی قرأت اسی مذہب کے قاری کے ذریعے کرائی جائے۔ اور پھر اس میں قرآن کی قرأت ایک اچھے قاری سے کرا کر شامل کی جائے۔ یہ کام اگر ویڈیو کیسٹ پر کرایا جائے تو اور بھی اچھا ہے تاکہ سننے والے یہ بھی دیکھیں کہ جس مذہبی کتاب کی قرأت ہے اس کو اسی مذہب کا ایک ماہر آدمی پڑھ رہا ہے۔ اگر اس طرح کے ویڈیو کیسٹ یا ریکارڈ تیار کرائے جائیں اور ان کو جگہ جگہ سنایا جائے تو صرف زبان اور آواز کا تقابل لوگوں کو یہ بتانے کے لیے کافی ہوگا کہ کون سی کتاب انسانی کتاب ہے اور کون سی کتاب خالص خدائی کتاب۔

نیویارک کی ایک سڑک سے ہم رات کے وقت گزر رہے تھے۔ وہاں ایک روشن اشتہار نظر آیا۔ یہ جاپانی کار ٹویوٹا کا اشتہار تھا۔ یہ اشتہار انتہائی کامیاب اور انتہائی خوبصورت انداز میں بنایا گیا تھا۔ نیویارک کی سڑکوں پر امریکی کاروں (بیوک، فورڈ وغیرہ) کے اشتہار بھی نظر آئے مگر وہ جاپانی اشتہار کے مقابلہ میں بہت پھیکے تھے۔ امریکی اشتہار محض اوسط درجہ کے اشتہار تھے جب کہ جاپانی اشتہار آرٹ کا بہترین نمونہ تھا۔

اسی طرح اقوام متحدہ میں ہم نے دیکھا کہ وہاں آنے والے زائرین کی رہنمائی کے لیے بہت سی خاتون گائڈ مقرر ہیں۔ ہماری جماعت کے لیے جو گائڈ متعین کی گئی وہ ایک جاپانی لڑکی تھی۔ وہ اس قدر سرگرم تھی اور اس قدر کامیابی کے ساتھ شستہ انگریزی میں تمام چیزوں کا تعارف کرا رہی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ انسان ہے یا کوئی مشین۔ جاپانی لوگوں کی یہ عام خصوصیت ہے کہ وہ جس کام کو کرتے ہیں اس کو اعلیٰ ترین معیار پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا ہو جائے انھیں کوئی چیز موجودہ دنیا میں کامیاب ہونے سے روک نہیں سکتی۔ خواہ قدرتی عطیات میں وہ سب سے کم ہوں، خواہ بموں کی بارش سے انھیں کھنڈر بنا دیا گیا ہو۔

ہوٹل کی ایک منزل پر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا جس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

Assembly of the World's Religions
BOOK DISPLAY

یہاں نہایت سلیقہ کے ساتھ مختلف مذہبی کتابوں کی نمائش کی گئی تھی۔ اس میں اسلامی مرکز کی اردو، عربی، اور انگریزی مطبوعات بھی رکھی گئی تھیں۔ بعض غیر مسلم صاحبان نے اس نمائش میں اسلامی مرکز کی کتابیں دیکھیں تو اس کے بعد وہ ہم سے ملے اور کتابوں کو حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

افریقہ، امریکہ، یورپ سے آئے ہوئے مسلمانوں کو انگریزی الرسالہ دکھایا گیا۔ انھوں نے اس کو بہت پسند کیا۔ یہ لوگ ان علاقوں میں جو دعوتی کام کر رہے ہیں اس کے لیے انھیں موزوں لٹریچر نہیں ملتا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ ہمارے دعوتی کام میں زبردست مددگار ثابت ہوگا۔

ایک صاحب کینیا سے آئے تھے جو وہاں کی یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں اور

دعوتی کام بھی کرتے ہیں۔ ان کا نام (Badru Dungu Kateregga) ہے۔ انھوں نے انگریزی الرسالہ لیا اور بیٹھے بیٹھے اس کے چند مضامین اسی وقت پڑھ ڈالے اس کے بعد ان کی زبان سے بے اختیار نکلا :

You are doing a wonderful work

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ نیویارک کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا موجودہ نام (Ya-sin Andy Gold) یاسین اینڈی گولڈ ہے۔ وہ پانچ سال سے باقاعدہ مسلمان ہیں اور اب نیو میکسکو میں رہتے ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا تھا۔ اس کو انھوں نے رات کو پڑھ لیا۔ اگلے دن ملاقات ہوئی تو انھوں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں غیر معمولی تاثر کا اظہار کیا۔ ان کا تاثر ان کے اپنے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے :

> I have read two issues of Al-Risala (English) and am very grateful for having been introduced with this publication. The work comes I believe from a place of deep understanding and is written in a way that is particularly appropriate for westerners. Not only is the language itself clear, but the thoughts are phrased in such a way as to be understood by those of us with a western conceptual framework. The articles are very much to the point, the meanings available on a number of levels.

Ya-Sin Andy Gold, Lama Foundation, P.O. Box 240,
San Cristobal, New Mexico 87564, U.S.A.

میں نے الرسالہ انگریزی کے دو شمارے پڑھے۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے ایسی مطبوعات سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ میرا یقین ہے کہ یہ مضامین بہت گہری معرفت سے نکلے ہیں اور وہ اس طرح لکھے گیے ہیں جو خاص طور پر اہل مغرب کے لیے بہت موزوں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان کی زبان بہت صاف ہے بلکہ خیالات اس طرح تحریر کیے گیے ہیں کہ ہمارے جیسے لوگوں کے لیے قابل فہم ہیں جن کا ذہنی سانچہ مغرب میں بنا ہے۔ مضامین بالکل دو ٹوک انداز میں ہیں۔ ان کے معانی میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

یہ ان بہت سے تاثرات میں سے صرف چند ہیں جو اس موقع پر مسلمانوں اور غیر مسلموں

کی طرف سے سامنے آئے۔

اس موقع پر ہر مذہب کو عبادت کے لیے ہال دیے گیے تھے۔ چنانچہ ایک ہال "مسجد" کے لیے بھی تھا۔ کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۸۰ مسلمان شریک تھے۔ ان کی ایک قابلِ لحاظ تعداد نماز کے وقت مسجد میں جمع ہوجاتی۔ ان حضرات نے اپنے اپنے حلقہ میں ہونے والے مباحثہ کی رپورٹ دیتے ہوئے ایک بات مشترک طور پر کہی۔ وہ یہ کہ دوسرے مذاہب پر گفتگو کے وقت لوگ سنجیدہ رہتے ہیں۔ مگر جہاں اسلام کا ذکر آیا وہ جارحانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ خود ہمارے حلقۂ بحث میں بھی یہ صورت پیش آئی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اس کی ذمہ داری دوسروں سے زیادہ خود مسلمانوں پر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اسلام کا تعارف زیادہ تر سیاسی انداز سے کرایا ہے۔ اگر اسلام کا تعارف فطری انداز میں کرایا جائے تو اس قسم کا ردِ عمل اپنے آپ ختم ہوجائے گا۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان پروفیسر نے اسلام کو "ایک کامل ریاستی نظام" کے طور پر پیش کیا۔ اس کے بعد غیر مسلم حاضرین نے فوراً پاکستان، ایران، عراق اور دوسرے ملکوں کی مثالیں دے کر کہنا شروع کیا کہ وہاں ایسا اور ایسا ہو رہا ہے تو کیا اسلام کا ریاستی نظام یہی ہے۔ پھر جب منفی ذہن پیدا ہوا تو اس کے بعد دوسرے غیر متعلق اعتراضات بھی شروع ہوگیے جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کو آخرت کے انداز میں پیش کیا جائے نہ کہ سیاست اور حکومت کے انداز میں، جیسا کہ وہ فی الواقع ہے۔

آدمی ہمیشہ نظریہ کی تصدیق (Verification) چاہتا ہے۔ جب آپ اسلام کا تعارف سیاسی نظام کے انداز میں کرائیں تو قدرتی طور پر وہ اس کی تصدیق کے لیے موجودہ مسلم ملکوں کو دیکھتا ہے۔ اور جب ان ملکوں میں وہ کوئی بہتر نظام نہیں پاتا تو وہ اس کی صداقت کے بارہ میں شک میں پڑجاتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ اسلام کا تعارف فطرت کے انداز میں کرائیں تو آدمی اس کی تصدیق کے لیے انسانی فطرت کو دیکھتا ہے اور یہاں وہ فوراً اس کی تصدیق پالیتا ہے۔ کیوں کہ انسانی فطرت کا خالق خدا ہے اور اس نے اس کو سراسر حق کی بنیاد پر بنایا ہے۔ فطرت کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام خود آدمی کے اپنے دل کی سطح پر بلا تاخیر اپنی تصدیق پارہا ہے۔ جب کہ

سیاسی نظام کے انداز میں پیش کیا ہوا اسلام کہیں بھی اپنی تصدیق نہیں پاتا۔

مسلم شرکاء اور دوسرے مذاہب کے شرکار نے بطور خود بھی کچھ اجتماعات کیے۔ مثلاً مسلمانوں نے عام شرکاء کو دعوت دی کہ وہ مسجد میں آئیں اور اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کے مطابق ۱۹ نومبر کو "مسجد" میں ایک اجتماع ہوا۔ بعض مسلمانوں نے ابتداءً مختصر تقریر کی۔ اس کے بعد سوال و جواب ہوئے۔ مگر محسوس ہوا کہ اس طرح کے اجتماع کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ پیشگی طور پر ذہن بنایا جا چکا ہو۔ مثلاً یہاں اجتماع ہوا تو مسلمانوں نے آپس کے اختلافی مسائل پر بحث شروع کر دی۔ اس کا اثر اچھا نہیں پڑا اور کئی غیر مسلم شرکاء درمیان میں اٹھ کر چلے گئے۔ آپس کے اختلاف پر گفتگو کا مقام آپس کی ملاقاتیں ہیں نہ کہ مشترک اجتماعات۔

ایک بات یہودی نمائندوں کے سلسلہ میں ہے۔ اکثر بنیادی مسائل میں مسلم نقطۂ نظر اور یہودی نقطۂ نظر تقریباً ایک رہتا تھا (مثلاً یہ کہ اخلاق اصولی طور پر ایک خدائی حکم ہے) اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام تحریف کے باوجود آج بھی بائبل اور قرآن میں بہت سے امور میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہودی ہی وہ قوم ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ مذہب جب قوم بن جائے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد قوم برتر حیثیت حاصل کر لیتی ہے اور مذہب اس کا تابع بن کر رہ جاتا ہے۔

عیسائی پادری (Paulos Mar Gregorios) نے ۱۹ نومبر کو (Christian heritage) عیسائی ورثہ پر تقریر کی۔ انھوں نے بتایا کہ "اسمبلی" کے نمائندے ان کے استقبال کے لیے آدھ گھنٹہ تاخیر سے ایرپورٹ پہونچے۔ انھوں نے بتایا کہ جب میں نے ایرپورٹ پر کسی کو نہیں دیکھا تو میں پبلک ٹیلیفون پر گیا کہ اسمبلی کے ذمہ داروں سے ربط قائم کروں اور اپنا بیگ اور سامان باہر چھوڑ دیا۔ ٹیلی فون کرکے واپس آیا تو میں اپنا سامان کھو چکا تھا۔ اس بیگ میں موصوف کی تیار شدہ تقریر بھی شامل تھی۔ یہ بات انھوں نے عام اجتماع میں اپنی تقریر کے آغاز میں کہی۔

یہ واقعہ نیویارک ہوائی اڈہ پر ہوا۔ اسی طرح اور واقعات معلوم ہوئے جس سے اندازہ ہوا کہ امریکہ اب اخلاقی تنزل کی طرف جانا شروع ہو گیا ہے۔ ایک انجینیر پندرہ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۷۰ میں جو مکان ۲۰ ہزار ڈالر میں بہ آسانی مل جاتا تھا۔ اس کو حاصل

کرنے کے لیے اب ڈیڑھ لاکھ ڈالر دینا پڑتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پچھلے دس برسوں میں بہت تیزی سے امریکہ میں افراط زر (inflation) ہوا ہے۔ ہر چیز کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ مگر اسی نسبت سے لوگوں کی آمدنیاں نہیں بڑھی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شروع میں جب میں امریکہ آیا تو ہر طرف خوش حالی نظر آتی تھی۔ اب وہ خوش حالی نظر نہیں آتی۔ اس مہنگائی سے اخلاقی تنزل آنا شروع ہو گیا ہے۔ چوری، رشوت، مکان کی پگڑی، اس طرح کی چیزیں پہلے عام امریکی زندگی میں مطلق نہیں تھیں۔ مگر اب اس طرح کی مثالیں (اگرچہ بہت کم) سامنے آنا شروع ہو گئی ہیں۔

امریکہ میں افراط زر (مہنگائی) ویٹ نام کی جنگ کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ کے خلائی پروگرام (خلائی ہتھیاروں کے تجربات) نے اس کو بہت بڑھا دیا۔ خلائی پروگرام بے پناہ مہنگے ہوتے ہیں۔ حتی کہ امریکہ بھی اپنی ساری دولت کے باوجود ان کا تحمل نہیں کر سکتا۔ اس کی قیمت اس کو بڑھتی ہوئی مہنگائی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ خلائی پروگرام کی مہنگائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ ایک اسپیس اسٹیشن بنا رہا ہے جو ۱۹۹۰ میں مکمل ہوگا۔ اس خلائی اسٹیشن پر امریکی حکومت کو گیارہ بلین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے۔ یہ اسٹیشن زمین سے ۲۳ ہزار میل اوپر قائم ہوگا۔ اسٹار وارس پروگرام میں صرف ریسرچ پر ۲۶ بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔

ایک یہودی نوجوان (Shlomo Biderman) اسرائیل سے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ یہودی مذہب میں سب سے زیادہ زور توحید پر ہے اور سب سے زیادہ غلط چیز بت پرستی ہے۔ حتی کہ یہودی کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ جو شخص بُت پرستی کے خلاف ہو وہ یہودی ہے:

One who is against idolatory is a Jew

یہ بات صحیح ہے کہ یہودی قوم میں پتھر کے بتوں کو پوجنے کا رواج نہیں۔ مگر یہودی نے یہودی نسل کو جو مقام دیا ہے وہ خود ایک قسم کی بُت پرستی ہے۔ وہ پتھر کے بت نہ پوجنے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر عین اسی وقت وہ قوم کے بُت کو پوج رہے ہیں۔ یہی تضاد مختلف شکلوں میں خود مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بتوں اور قبروں کو نہ پوجنے والے بھی غیر اللہ کے پرستار ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اس واقعہ کی خبر نہیں۔

مسٹر ایرک (Erik Hoogearspel) نیدر لینڈ سے آئے تھے۔ وہ عیسائی خاندان میں پیدا

ہوئے۔ اس کے بعد ذاتی مطالعہ سے بدھسٹ ہوگیے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بدھ لوگ خدا کو نہیں مانتے کیا آپ بھی خدا کو نہیں مانتے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ میں خدا کو نہیں مانتا۔ میں نے کہا کیوں۔ انھوں نے کہا اس لیے کہ خدا کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے کہا کہ اگر خدا کے وجود کا عقلی ثبوت نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حقیقۃً بھی خدا کا وجود نہیں۔ اس کی وجہ ہماری کمیاں (limitations) ہیں۔ ہم اپنی کمیوں کی وجہ سے کسی بھی چیز کو عقلی طور پر ثابت نہیں کر سکتے۔ پھر جس طرح دوسری چیزیں قرینہ کی بنیاد پر مانی جاتی ہے اسی طرح خدا کو بھی قرائن کی بنیاد پر ماننے میں کیا رکاوٹ ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ منطقی دلیل سے وہ قائل نہیں ہو رہے ہیں تو میں نے کہا کہ میں اپنے بارہ میں کہہ سکتا ہوں کہ خدا میری ذاتی دریافت ہے۔ میں اپنی دریافت (realization) کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے خدا کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔ جب میں نے اس طرح یقین کی زبان میں کہا تو میں نے دیکھا کہ وہ نرم ہوگیے۔ اس کے بعد ان کا زور کلام ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاید بیشتر انسانوں کا حال یہ ہے کہ وہ استدلال سے زیادہ یقین سے متاثر ہوتے ہیں۔

نیوجرسی اور نیویارک میں کافی مسلمان آباد ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے ملاقات ہوئی انھوں نے زور دیا کہ آپ کانفرنس سے فراغت کے بعد مزید کم از کم ایک مہینہ ہمارے پاس ٹھہریے یہاں ہم مختلف مقامات پر لوگوں کو جمع کریں گے جن کے سامنے آپ اپنا دینی پیغام رکھ سکیں۔ مگر میرے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے ان لوگوں سے معذرت کر دی۔ تاہم جناب مرزا فرید بیگ صاحب (نیوکلیر انجینیر) کے اصرار پر مجھے ایک دن مزید ٹھہرنا پڑا۔ مرزا فرید بیگ نہایت صالح اور ذہین نوجوان ہیں۔ دینی امور کے سختی سے پابند ہیں۔ چہرے پر نمایاں داڑھی بھی موجود ہے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ لینڈنگ (نیوجرسی) کے لیے روانہ ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ سفر کرنے کے بعد ہم فرید بیگ صاحب کے مکان پر پہونچے۔ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی گاڑی گیرج کے سامنے پہونچی گیرج کا دروازہ اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورا دروازہ اٹھ گیا اور گاڑی اندر داخل ہوگئی۔ دروازہ کا یہ کھلنا ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ ہوا۔ یہ دروازہ شٹر کی مانند بنایا جاتا ہے تاکہ وہ لپٹا جا سکے۔

دروازہ سے ملا ہوا ایک خاص طرح کا موٹر ہوتا ہے۔ یہ موٹر وائرلیس لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتا ہے مرزا فرید بیگ کے ہاتھ میں سگریٹ لائٹر کی مانند ایک چیز تھی۔ انھوں نے اس کو میرے ہاتھ میں دیا۔ اس سے کوئی تار وغیرہ وابستہ نہ تھا۔ میں نے اس کا بٹن دبایا تو دروازہ اپنے آپ شٹر کی مانند اوپر اٹھنا شروع ہوگیا یہاں تک کہ پورا دروازہ اوپر چلا گیا۔ پھر میں نے دوبارہ بٹن دبایا تو دروازہ نیچے آنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح بند ہوگیا۔

اس کو آج کل کی زبان میں ریموٹ کنٹرول سسٹم کہتے ہیں اور اس قسم کا ریموٹ کنٹرول امریکی زندگی میں عام ہوچکا ہے۔ آپ اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مشینی ڈبہ لے کر اس کے ذریعہ سے ٹیلی وزن کھول اور بند کرسکتے ہیں۔ ٹیلی فون کو ہاتھ سے چھوئے بغیر ربط قائم کرسکتے ہیں۔ گھر کی روشنی کو دور سے جلا یا بجھا سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

۲۰ نومبر کو ہوٹل چھوڑتے وقت ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کانفرنس کے ذمہ داروں نے ہمارے ہر قسم کے خرچ کی ذمہ داری لی تھی۔ مگر ٹیلی فون کے خرچ کی ذمہ داری خود ہمارے اوپر تھی۔ ہم کو ہوٹل سے دہلی میں اور خود امریکہ میں کچھ ٹیلی فون کرنے پڑے۔ روانگی کے وقت جب ہوٹل کے دفتر سے حساب مانگا گیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کا حساب ادا شدہ ہے۔ ان سے بار بار کہا گیا کہ ہم نے تو ادا نہیں کیا پھر وہ کیسے ادا ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں، ہمارا کمپیوٹر یہی بتاتا ہے کہ آپ کا حساب ادا ہوگیا ہے۔ ہمارے اصرار پر انھوں نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا اور ایک کاغذ چھپ کر سامنے آگیا جس میں ہمارے نام کے ساتھ تقریباً چودہ ڈالر کا بل تھا اور وہ پورا ادا شدہ تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم نے یہ رقم ادا نہیں کی ہے اس لیے آپ کمپیوٹر کے اس حساب کے باوجود ہم سے یہ رقم لے لیں مگر وہ لینے پر راضی نہیں ہوئے۔ ایسا کیوں کر ہوا، یہ ایک معمہ تھا جس کا کوئی جواب نہ ہمارے پاس تھا اور نہ ہوٹل والوں کے پاس۔ کمپیوٹر کا یہ کاغذ ہمارے پاس موجود ہے۔

مرزا فرید بیگ صاحب کے ساتھ ایک دن گزار کر ہم ۲۱ نومبر ۱۹۸۵ کی شام کو ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بوٹن (Boonton) کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ یہ مسجد بہت خوبصورت اور دو منزلہ ہے۔ ایرپورٹ پہونچے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہمارے پاس کتابوں کا ایک بنڈل تھا۔ اس کو پلاسٹک کی رسی سے باندھا گیا تھا۔ ہم کینڈی ایرپورٹ

میں داخل ہوئے تو چیکنگ کے ذمہ داروں نے اس کو کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ میں بہت گھبرایا کہ اگر انھوں نے رسی کاٹ ڈالی تو یہاں ایرپورٹ پر دوسری رسی باندھنے کے لیے کہاں ملے گی۔ ہم نے ان کو منع کیا مگر وہ نہیں مانے۔ انھوں نے کہا، آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم اس کو کاٹنے کے بعد دوبارہ ٹیپ کردیں گے۔ چنانچہ انھوں نے رسی کاٹ کر پھینک دی اور اس کو دیکھنے کے بعد دوبارہ اوپر سے کافی مقدار میں ٹیپ لگاکر پہلے سے زیادہ بہتر پیک کردیا۔

مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کا واقعہ یکم مارچ ۱۹۸۴ کو میرے ساتھ ایک مسلم ملک کے ایرپورٹ پر پیش آیا تھا۔ وہاں بھی ہمارے پاس کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ تھا۔ چیکنگ کے عملہ نے اس کی رسیاں کاٹنے کے لیے قینچی نکالی۔ ہم نے بہت کہا کہ اس میں صرف دینی کتابیں ہیں اور کچھ نہیں۔ ہم نے یہ بھی کہا کہ آپ نے رسیاں کاٹ دیں تو اس کو دوبارہ باندھنا ہمارے لیے سخت مشکل ہوگا۔ مگر انھوں نے کچھ نہیں سنا اور ساری رسیاں کاٹ ڈالیں۔ اس کے بعد انھوں نے نہ پیکٹ میں دوبارہ ٹیپ لگایا اور نہ کسی دوسرے طریقے سے ہماری مدد کی۔ بڑی مشکل سے ہم نے رسیوں کو جوڑ جوڑ کر پیکٹ کو دوبارہ باندھا۔ کتنا فرق ہے ایک قوم اور دوسری قوم میں۔

امریکہ میں ہندستان اور پاکستان جیسے ملکوں کے بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہاں کی شہریت بھی لے لی ہے۔ تاہم ان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو یہاں کے سماج میں پوری طرح ضم ہوگیے ہوں۔

یہ لوگ بڑے عجیب عجیب مسائل سے دوچار ہیں۔ مثلاً اپنے ملکوں میں وہ عادی ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے بچوں کی نگرانی کریں۔ حتی کہ وہ انھیں تنبیہ کرسکیں۔ مگر یہاں وہ اس سلسلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ یہاں کا ایک باپ اپنے بچے کو تنبیہ نہیں کرسکتا۔ اگر وہ تنبیہ کرے تو بچے کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے باپ کے خلاف پولیس کو بلاسکے۔ یہاں پولیس کا ایک خاص دستہ مقرر ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ بچوں کو ستائے جانے سے بچائے۔ اس کو یہاں کی زبان میں "چائلڈ ابیوز" کہتے ہیں۔ اس کا ایک مخصوص ٹیلی فون نمبر ہے۔ کوئی بچہ اس نمبر پر رنگ کرکے فوراً اس کو اپنی مدد کے لیے بلاسکتا ہے۔ ایسے واقعات معلوم ہوئے کہ باپ نے بگڑ کر بچے کو مارنا چاہا تو بچے نے فوراً کہا:

Don't touch me. I will call Child Abuse

یعنی مجھ کو چھونا مت ورنہ میں بچوں کی پولیس کو ٹیلی فون کر دوں گا ۔

اس سفر میں آمد و رفت کو ملا کر دس دن گزرے ۔ میرا یہ سفر گویا ساری دنیا کی طرف سفر تھا۔ اس سفر میں میں نے تقریباً دنیا کی ہر قوم کو دیکھا اور تقریباً ہر عقیدہ کے لوگوں کا تجربہ کیا۔ میرا آخری تاثر یہ تھا کہ موجودہ دنیا میں ہر چیز ہے مگر وہی ایک چیز نہیں جس کو انسانی فطرت سب سے زیادہ چاہتی ہے یعنی خدا کا سچا مذہب۔ مذہب کے جو اڈیشن مذہب کے نمائندوں کے پاس ہیں اور جس کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ سب کے سب بگڑے ہوئے مذہب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی فطرت سے مطابقت نہیں کر پاتے ۔

انسان ایک خدا چاہتا ہے اور مشرکانہ مذاہب اس کو کئی خداؤں کی عبادت کی طرف بلا رہے ہیں ۔ انسان سادہ مذہب چاہتا ہے اور عیسائیت اس کو فلسفیانہ موشگافیوں والا مذہب دے رہی ہے ۔ انسان اصولی مذہب چاہتا ہے اور یہودیت کے پاس انسان کو دینے کے لیے صرف نسلی مذہب ہے ۔ انسان ایک برتر خدا کی تلاش میں ہے اور ہندوازم اس کو یقین دلا رہا ہے کہ تم خود اپنی ذات میں خدا ہو۔ انسان روحانی سطح پر خدا کو پانا چاہتا ہے اور مادی مذاہب اس کو سیاست اور حکومت کی سطح پر مذہب کا نسخہ پیش کر رہے ہیں ۔

یہاں مسلمان جدید انسان کو رہنمائی دے سکتے تھے ۔ کیوں کہ ان کے پاس سچا خدائی مذہب بالکل محفوظ حالت میں موجود ہے ۔ مگر یہاں بھی یہ مشکل ہے کہ اصل اسلام تو صرف کتاب میں ہے ۔ اور مسلمان عملاً جس مذہب کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ ان کی اپنی تعبیرات ہیں جو انھوں نے اصل خدائی دین میں تصرف کرکے بنائی ہیں ۔ اصل اسلام تو بلاشبہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے مگر جس تعبیری اسلام کی مسلمان آج نمائندگی کر رہے ہیں وہ انسانی فطرت کے مطابق نہیں ۔ اس لیے خود اسلام اور انسانی فطرت کے درمیان بھی عملاً وہی عدم مطابقت پیدا ہو گئی ہے ۔ جو دوسرے مذاہب اور انسانی فطرت کے درمیان پائی جاتی ہے ۔

آج سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اسلام کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کے حقیقی روپ میں انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے ۔ اس کے بعد ساری انسانیت خدا کی رحمتوں کے سایہ میں آجائے گی ۔

وما ذالک علی اللہ بعزیز ۔

۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو سورج نہیں دکھائی دیا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے کمرہ کے ایک طرف لگے ہوئے شیشہ سے باہر دیکھا تو ہر چیز سفید ہو رہی تھی۔ سڑکوں اور پارکوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے حد سفید قسم کے روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر سے گر رہے ہیں اور سڑکوں اور پارکوں پر ان کا صاف وشفاف فرش بچھا ہوا ہے درخت بھی ان سے ڈھکے ہوئے نظر آتے تھے۔ معلوم ہوا کہ برف گر رہی ہے۔ تاہم یہ وہ برف نہ تھی جس کے لیے ہمارے یہاں برف یا اولہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ اسنو (snow) تھی۔ چوں کہ ہندستان جیسے ملکوں میں اسنو نہیں گرتی اس لیے اردو زبان میں اس کے لیے کوئی لفظ بھی موجود نہیں۔ اس قسم کی اسنو میں نے پہلی بار روم میں اکتوبر ۱۹۷۶ میں دیکھی تھی اور دوسری بار ۱۶ نومبر ۱۹۸۵ کو نیو جرسی میں دیکھی۔

یہ اسنو سرد ملکوں کے لیے ایک عجیب نعمت ہے۔ یہاں کے کسان اسنو کے موسم سے کچھ پہلے زمین میں بیج بو دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا انکھوا نکل آتا ہے۔ انکھوا نکلنے کے بعد جب اسنو گرتی ہے تو ان کے اوپر اس کی تہ جم جاتی ہے۔ اسنو چوں کہ روئی کی طرح بالکل نرم ہوتی ہے اس لیے وہ انکھوا کو نقصان نہیں پہونچاتی اس کے بعد اسنو دھیرے دھیرے پگھلنا شروع ہوتی ہے اور فصل کو آہستہ آہستہ پانی پہونچاتی ہے۔ یہ ایک عجیب قسم کی قدرتی آبپاشی ہے جو سرد ملکوں کے کسانوں کے لیے منّ وسلویٰ کی نعمت سے کم نہیں۔

ایک ہندستانی بزرگ امریکہ گئے۔ وہاں ایک روز انھوں نے ایک امریکی سے پوچھا : کیا آپ کے یہاں ملاوٹ کا دودھ (Adulterated Milk) بھی ملتا ہے۔ یہ سن کر امریکی کچھ دیر چپ رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا : ہاں، ہمارے یہاں بعض اسٹور ملاوٹ کا دودھ بھی تیار کرتے ہیں۔ وہ قدرتی دودھ میں بعض وٹامن کا اضافہ کرتے ہیں تاکہ اس کی غذائیت کو بڑھا سکیں۔

مذکورہ عمل کو انگریزی میں adulteration نہیں کہا جاتا۔ اس کو enrichment کہتے ہیں۔ مگر امریکی ذہن چوں کہ اس تصور سے خالی تھا کہ دودھ میں پانی ملا دیا جائے اس لیے اس نے اڈلٹریشن کے لفظ کو enrichment کے معنی میں لیا۔ کتنا فرق ہے ہندستان کے تاجر اور امریکہ کے تاجر میں۔

ڈاکٹر خورشید احمد صاحب سے ۱۷ نومبر کو تفصیلی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو اپنے مشن کا تسلسل جاری رکھنے کے لیے افراد تیار کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے سیرت سے متعلق ایک بات کہی جو انھیں کے اپنے الفاظ میں یہ تھی :

" حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر کارنامہ عظیم ہے۔ لیکن ایک پہلو جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے

وہ یہ ہے کہ آپ نے صرف دور رسالت مآب ہی نہ دیا، جو ایک معیاری اور مثالی دور ہے۔ بلکہ ایسے انسان تیار کیے کہ خلافتِ راشدہ کا ادارہ وجود میں آیا جس کے بارہ میں خود آپ ہی نے فرمایا کہ علیکم بسنّتی وسنّۃ الخلفاء الراشدین۔ اس طرح آپ نے ایک تاریخی عمل کا آغاز کیا جس نے مسلم تاریخ میں تسلسل (continuity) قائم کیا۔ اور آپ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایک ایسا گروہ چھوڑا جس کے ذریعہ اسلام کی دولت اور حضور کی سنّت دنیا کے گوشے گوشے تک پہونچ سکی۔"

ترکی کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ استانبول یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ میں نے کہا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کمال اتاترک ایک یہودی تھا۔ انھوں نے کہا کہ نسلی اعتبار سے تو یہ بات صحیح نہیں۔ مگر وہ ہمارے لیے عیسائیوں اور یہودیوں سے بھی زیادہ برا تھا۔ اس نے ترک قوم کو ذبح کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیسے ذبح کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس نے ہمارا رشتہ ہماری تاریخ سے کاٹ دیا۔ اور کسی قوم کے لیے اس سے بڑا کوئی ذبیحہ نہیں۔

ایک مغربی ملک کے ایک پروفیسر نے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بہت سی مشکلات ہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کون سی قوم ہے جس کو مشکلات درپیش نہیں۔ میں نے کہا یہ صحیح ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کو بعض مشکلات درپیش ہیں۔ مگر مشکل زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ آپ کسی حال میں اس سے بچ نہیں سکتے صرف صورت کا فرق ہے۔ بنگلہ دیش اور پاکستان کو دیکھئے، ایران اور عراق کو دیکھئے۔ سعودی عرب اور لیبیا کو دیکھئے۔ سب کے درمیان مشکلات و مسائل ہیں۔ حالاں کہ یہ سب اسلامی ملک ہیں۔ مشکلات و مسائل کا تعلق مسلم اور غیر مسلم سے نہیں۔ جہاں صرف مسلمان ہی مسلمان ہوں وہاں مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مسائل اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک موجودہ دنیا کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ انھوں نے میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، آپ صحیح کہتے ہیں:

We have to learn to live with problems
instead of protesting against them.

ایک سردار جی کناڈا سے آئے تھے۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے کناڈا میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے قرآن کے کئی ترجمے دیکھے مگر کسی سے تسلّی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ صرف ترجمہ پڑھنا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ کمنٹری بھی۔ انھوں نے کہا کہ کمنٹری ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ وہ چوں کہ اردو زبان بخوبی

جانتے تھے، ان کو تذکیر القرآن (جلد اول) پیش کی گئی وہ بہت خوش ہوئے ۔

ایک صاحب جو اپنے سفید فام حلیہ سے کسی مغربی ملک کے باشندہ معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے ملاقات کے وقت کہا :

What is your tradition?

اس جملہ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ آپ کی روایت کیا ہے۔ مگر اردو استعمال کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں دین اور مذہب کے بارہ میں تصور یہ ہے کہ وہ ایک معاشرتی رواج ہے۔ اس کا ماخذ انسانی سماج ہے نہ کہ خدائی الہام۔ اسی کے مطابق تمام اصطلاحات بنی ہیں۔ اب مذہب کے بارے میں اس طرح کے الفاظ بولے جاتے ہیں :

Islamic heritage, Islamic tradition (اسلامی روایت، اسلامی ورثہ) اس طرح جدید انسان مذہب کو مان کر بھی مذہب کی نفی کر رہا ہے۔ مذہب اسی وقت مذہب ہے جب کہ وہ ایک خدائی حکم ہو۔ مذہب کو اگر سماجی ورثہ یا معاشرتی رواج قرار دیدیا جائے تو اس کی ساری اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو نیویارک کی ایک بڑی فرم میں نیوکلیر انجینیر ہیں۔ ان کو انگریزی الرسالہ دیا گیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ آپ کا الرسالہ مجھ کو پسند آیا۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ نے لکھنے کی یہ ٹکنیک کہاں سیکھی۔ میں نے پوچھا کہ کون سی ٹکنک۔ انھوں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے اور ایک ایک صفحہ کے مضامین کی ٹکنیک۔ انھوں نے بتایا کہ ہم لوگ اپنی فیلڈ میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی ڈاکومنٹ تیار کریں تو ہمیشہ کم سے کم الفاظ میں لکھیں تاکہ ہمارے اوپر کے لوگ کم سے کم وقت میں اس کو پڑھ سکیں۔

میں نے کہا کہ مجھ کو یہ ٹکنیک میرے دعوتی درد نے سکھائی۔ میں اس بات کی تڑپ رکھتا ہوں کہ آج کے انسان تک حق کا پیغام پہونچاؤں۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ آج کا انسان اتنا مصروف ہے کہ وہ لمبا مضمون پڑھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے میں چھوٹے چھوٹے مضامین میں اپنی بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آج کا انسان ان کو پڑھ سکے۔ اگر میں لمبے لمبے مضامین لکھوں تو آج کا انسان ان کو دیکھ کر رکھ دے گا اور میرا لکھنا بیکار ہو گا۔

امریکہ میں ایک طرف مادہ پرستی اپنے شباب پر ہے۔ دوسری طرف یہاں روحانیت کے مبلغین کی بھی کمی نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر ملاقات آرٹورو شمٹ (Artoro Schmidt) کی تھی

وہ ایک امریکی مبلغ ہیں۔ امریکہ میں ایک ادارہ ہے جس کا نام ہے :

International Temperance Association

یہ ادارہ شراب نوشی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے خلاف ہے۔ موصوف اس سلسلہ میں بہت سے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ ہندستان بھی جا چکے ہیں ان سے بہت دیر تک اس موضوع پر گفتگو ہوئی۔

آخر میں میں نے کہا کہ آپ لوگ شراب نوشی کے خلاف جو مہم چلا رہے ہیں اس کا محرک مذہب ہے یا طبی تحقیقات۔ انھوں نے کہا کہ دونوں۔ میں نے کہا کہ بائبل میں تو شراب کو جائز کرنے والی آیتیں موجود ہیں۔ پھر آپ بائبل کے حوالے سے کس طرح اس کے عدم جواز کو ثابت کریں گے۔

انھوں نے کہا کہ بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ کی بابت آپ کا کہنا صحیح ہے۔ مگر قدیم عبرانی بائبل سے شراب کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ قدیم عبرانی نسخہ میں اس سلسلہ میں دو الفاظ آتے ہیں۔

زازن (Yayin) یہ لفظ قدیم عبرانی میں انگور کا رس مع الکوہل کے لیے بولا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ شکار (Shekar) ہے۔ یعنی انگور کا وہ تازہ رس جو بغیر الکوہل کے ہو بائبل کے موجودہ انگریزی ترجمہ میں یہ غلطی کی گئی ہے کہ مذکورہ دونوں لفظوں کے لیے ایک ہی لفظ Wine استعمال کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اصل عبرانی میں دو لفظ تھا۔ قدیم عبرانی متن کے مطابق انگور کا سادہ رس جائز ہے اور انگور کا وہ رس جو خمیر کے بعد نشہ آور ہو جائے، جائز نہیں۔

یہ لوگ بہت دلچسپ انداز میں شراب کے خلاف پرچار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک لکچر میں انھوں نے شراب نوشی کے خلاف دلائل دیے۔ آخر میں انھوں نے حاضرین کے سامنے دو برتن رکھے۔ ایک برتن میں پانی تھا اور دوسرے برتن میں شراب۔ اس کے بعد حسب پروگرام ایک گدھا لکچر ہال کے اندر داخل کیا گیا۔ اب لکچرر نے اپنے سامعین سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ گدھا دونوں میں سے کس برتن سے پیئے گا۔ سامنے کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے کہا۔ "پانی کے برتن سے" لکچرر نے کہا بہت اچھا جناب۔ اب آپ یہ بتائیں گے کہ کیوں ایسا ہے کہ وہ شراب کے مقابلہ میں پانی کو ترجیح دیتا ہے۔ آدمی نے جواب دیا ـــــ کیوں کہ وہ ایک گدھا ہے :

Because he's an ass.

یہاں دنیا بھر کے بہت سے لوگوں سے ملاقات اور تبادلۂ خیال ہوا پروفیسر ہوسٹن اسمتھ

(Prof. Huston Smith) سے بھی ملاقات ہوئی وہ ۱۹۸۵ میں ہمارے مرکز (نئی دہلی) میں آئے تھے۔ وہ موجودہ کانفرنس کی پلاننگ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

امریکہ کے بارے میں کچھ مزید باتیں حسب ذیل ہیں:

ایک امریکی ایجنسی نے ۱۹۸۴ کے آغاز میں ایک رپورٹ تیار کی تھی۔ یہ رپورٹ ہندستانی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۲۶ فروری ۱۹۸۴) میں بھی حسب ذیل عنوان کے ساتھ شائع ہوئی تھی:

Indians in US best educated minority

اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں رہنے والے ہندستانی وہاں کی سب سے بہتر تعلیم یافتہ جماعت ہیں۔ اور اس بنا پر وہ امریکہ کے سب سے زیادہ خوش حال گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً نصف ملین ہندستانی بستے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ہندستانی امریکی (Indian Americans) کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر خود امریکی لوگ انھیں ایشیائی امریکی (Asian Americans) کہتے ہیں۔

یہ ہندستانی امریکی اکثر اعلیٰ لیاقت کے لوگ ہیں۔ وہ ڈاکٹر، پروفیسر، وکیل، انجینیر، اکاؤنٹنٹ اور سائنٹسٹ ہیں۔ بعض نے یہاں اپنا ذاتی بزنس شروع کر رکھا ہے۔ ان میں ایک تعداد وہ ہے جو کروڑ پتی ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن کے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز ہے:

Some even own aircraft for their private use.

رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ہندستانی امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۲۴۹۹۳ ڈالر سالانہ ہے۔ جب کہ خود امریکیوں کی اوسط خاندانی آمدنی ۱۹۹۱۷ ڈالر سالانہ ہے:

The median family income of the Indian American community is $ 24,993 per year while the average for the all U.S. median family income is only $ 19,917.

امریکہ کی اصل آبادی میں برتر لیاقت کے لوگ بھی ہیں اور کم تر لیاقت کے لوگ بھی۔ مگر ہندستان سے جو لوگ امریکہ جاتے ہیں وہ سب منتخب لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی برتر قابلیت کے بل پر وہاں جانے کا حوصلہ کرتے ہیں اور اسی بنا پر وہاں کے مقابلوں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہندستان جیسے ملک کی اقلیتوں کے لیے اس میں بڑا سبق ہے۔ یہاں اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو

سفارش اور جانب داری کے تحت بھی جگہیں مل جاتی ہیں اس لیے اکثریتی فرقہ سے ہر قسم کے لوگ دفتروں اور اداروں میں بھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان لیا جاتا ہے تو وہ اپنی ممتاز لیاقت کی بنا پر لیا جاتا ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا قدرتی انتخاب ہے۔ اس طرح اقلیت کے ٹاپ کے لوگ اوپر آتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب کہ اکثریت کی نمائندگی اس کے مخلوط افراد کر رہے ہوں گے اور اقلیت کی نمائندگی اس کے ٹاپ کے افراد۔

عام شہرت کے مطابق امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش حال ملک ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی خوشحالی حقیقی سے زیادہ مصنوعی ہے۔ امریکہ کی خوشحالی کا راز قرض ہے۔ امریکہ دنیا میں سب سے زیادہ سود دیتا ہے۔ چنانچہ دنیا بھر میں لوگ امریکہ کے بنکوں اور تجارتی اداروں میں اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۵ کے آخر میں امریکہ کے اوپر بیرونی قرضوں کی مقدار تقریباً پانچ سو بلین ڈالر ہے اس قرض میں امریکہ کو ہر سال تقریباً پچاس بلین ڈالر سود ادا کرنا پڑتا ہے۔

زیادہ شرح سود کا براہ راست فائدہ امریکہ کو یہ ملا کہ اس کی کرنسی (ڈالر) کی اہمیت بڑھ گئی۔ آج کرنسی کی دنیا میں ڈالر کو "شہنشاہ" کا مقام حاصل ہے۔ آپ ہندستانی سکہ لے کر باہر کی دنیا میں جائیں تو اس کی حیثیت وہی ہوگی جو شیخ سعدی نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

امیرزادۂ ناداں بہ شہر روا ماند   کہ در دیار غریبش بہ ہیچ نستاند

لیکن اگر آپ کے پاس ڈالر ہے تو دنیا کے ہر حصہ میں خالص سونے کی مانند آپ اس کی قیمت پا سکتے ہیں۔

اس سودی معاشیات کا سب سے بڑا نقصان ہتھیاروں کی بڑھتی ہوئی تجارت ہے۔ امریکہ کو جب ہر سال پچاس بلین ڈالر سود ادا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی جمع شدہ رقم کو زیادہ سے زیادہ نفع بخش تجارت میں لگائے۔ موجودہ زمانہ میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت جنگی ہتھیار ہے۔ چنانچہ امریکہ بالقصد ساری دنیا میں جنگ کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے تاکہ اس کی جنگی صنعت کے مستقل خریدار حاصل رہیں یہاں باقاعدہ ایسے جرائد شائع ہوتے ہیں جن میں ہتھیاروں کی ہلاکت خیزی کی تفصیل درج ہوتی ہیں۔ کہ اگر آپ ہم سے فلاں ہتھیار خریدیں تو اس کے ذریعہ آپ اتنی زیادہ تباہی برپا کر سکتے ہیں۔ اسلحہ کی اس تجارت کی کم از کم جزئی ذمہ داری سودی معاشیات پر ہے۔ امریکہ اگر ہتھیاروں کی صنعت کو مسلسل نہ بڑھائے تو وہ اپنے اوپر بڑھے ہوئے عالمی سود کو ادا کرنے کے قابل نہ رہے گا۔

امریکہ میں جرائم کے بارے میں ایک رپورٹ یہ ہے :

One in three families in the U.S. were victims of a crime and a U.S. citizen was murdered every half hour last year, according to a survey carried out by the U.S. department of justice. In 1983, 36 million 900 thousand crimes were committed in the country, reports *Public-Pool* from Montreal.

امریکہ میں جدید ترقیاں اپنے کمال کو پہونچ رہی ہیں اس کے باوجود وہاں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جرائم کا مادی ترقیات سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ لوگ غلط طور پر یہ کہتے ہیں کہ جرائم غریبی کے ساتھ جنم لیتے ہیں۔ اگر تمام لوگ خوش حال ہو جائیں تو جرائم اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ مگر جدید دنیا کا تجربہ اس کے خلاف ثبوت پیش کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جرائم کا سبب انسان کی آزادی ہے۔ انسان چوں کہ موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے اس لیے وہ جہاں موقع پاتا ہے اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے جس کا دوسرا نام جرم ہے۔

انسان کو جرم سے باز رکھنے کی ایک ہی صورت ہے اور یہ کہ اس کو ایسا نظریہ دیا جائے جو اس سے اس کی آزادئی عمل چھین لے۔ جو اس کو پابند زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔ جو اس سے کہے کہ تمہاری آزادی ناحق کو چھوڑنے اور حق کو اختیار کرنے کے لیے ہے نہ کہ من مانی کارروائی کرنے کے لیے ——— ایسا نظریہ خدا کے آگے جوابدہی (accountability) کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

ایک ہندستانی ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد امریکہ گیا۔ وہاں اس نے کافی دولت کمائی۔ اس کی ہندستانی بیوی سے اس کے یہاں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۹ میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی لڑکیاں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اپنی لڑکیوں کی خاطر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ لڑکیاں یونیورسٹی میں پہونچیں تو حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اس کی بڑی لڑکی نے اپنی آزاد مرضی سے ایک امریکی لڑکے سے شادی کر لی۔ تاہم صرف تین ماہ بعد اس سے طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد لڑکی نے باپ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ باہر رہنے لگی۔ چھوٹی لڑکی نے بھی ایک امریکی لڑکے سے اپنی ذاتی پسند کے تحت شادی کر لی۔ مگر اس سے بھی ایک سال کے اندر علاحدگی ہو گئی۔ یہ لڑکی بھی باپ سے الگ ہو کر باہر نیویارک میں رہنے لگی۔

باپ کو اس کا بے حد رنج تھا۔ اس نے بیوی بھی کھوئی اور آخر میں دونوں لڑکی بھی کھو دی۔ اس نے ایک روز اپنی ایک لڑکی سے کہا کہ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ لڑکی نے فوراً جواب دیا کہ

آپ یہاں لمبی مدت سے رہ رہے ہیں۔ آپ کو خود یہ بات جاننا چاہیے :

You have lived here long enough and you should understand.

ان تلخ تجربات کے بعد آدمی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے امریکہ میں اپنا بزنس فروخت کر دیا اور دہلی واپس آ گیا۔ دہلی میں اس کے پاس بہت بڑا مکان ہے۔ اس کے پاس دو شوفر ہیں۔ چار مالی ہیں اور دوسرے بہت سے گھریلو ملازم ہیں۔ مگر وہ آدمی تنہا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ شراب پی کر اپنا غم بھلاتا رہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۰ اگست ۱۹۸۵ صفحہ ۸)

امریکی بزنس کس طرح چلتی ہے، اس کی ایک دلچسپ مثال کوکاکولا ہے۔ آج ۱۳۵ ملکوں میں اس کے ۱۹۰ ملین بوتل روزانہ فروخت ہوتے ہیں۔ کوکاکولا کے اجزا ر ۱۸۸۶ میں پمبرٹن (John S. Pemberton) نے دریافت کیے تھے۔ اس وقت سے آج تک اس کا فارمولا ایک راز ہے جس کو صرف کمپنی کے چند ڈائرکٹر جانتے ہیں۔ کوکاکولا کے کارخانے ساری دنیا میں ہیں۔ مگر اس کا اصل جزء آج بھی صرف امریکہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کا راز باقی رہے۔ اس سے پہلے یہ راز صرف چند دماغوں میں تھا اب وہ کاغذ پر لکھ کر بینک میں مقفل کر دیا گیا ہے۔ اس مقفل بکس کو صرف کمپنی کے ڈائرکٹر ہی کھول سکتے ہیں۔

ہندستان میں کوکاکولا کے ۲۲ کارخانے تھے۔ وہ ہندستان کا سب سے زیادہ مقبول مشروب (Soft drink) تھا۔ ۱۹۷۷ میں جنتا حکومت نے چاہا کہ اس کو (Indianise) کرے۔ اس مقصد کے لیے کمپنی کو اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو بتانا پڑتا۔ کمپنی نے اپنا فارمولا راز میں رکھنے کی یہ قیمت ادا کی کہ یک لخت ہندستان میں اپنا بزنس ختم کر دیا۔ مگر اپنا فارمولا ہندستانی حکومت کو بتانے پر راضی نہیں ہوئی۔

امریکہ میں پروسس کی ہوئی شکر جتنی تیار ہوتی ہے اس کا دس فی صد صرف کوکاکولا کمپنی خریدتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوکاکولا میں کافین (Caffeine) کا ایک جزء ڈالا جاتا ہے۔ یہ ایک بے حد تلخ چیز ہے۔ اس کی تلخی کو گھٹانے کے لیے اس میں سب سے زیادہ جو چیز ڈالی جاتی ہے وہ شکر ہے۔

۱۹۵۴ میں مراکو میں یہ افواہ اڑ گئی کہ کوکاکولا میں خنزیر کے خون کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہاں کافی شور ہوا اور مسلمانوں نے کوکاکولا پینا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد کمپنی والوں نے سلطان مراکو کے صاحبزادے کو آمادہ کیا۔ انھوں نے مجمع عام میں لوگوں کے سامنے کوکاکولا پی کر اس کی تردید کی۔ اس

طرح یہ فضا ختم ہوئی۔

امریکی قانون کے مطابق کسی تیار شدہ خوراک کے اجزا کا اعلان ضروری ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۹ میں کوکا کولا کمپنی کے خلاف حکومت نے مقدمہ قائم کیا اور چاہا کہ عدالتی طور پر اس کو مجبور کرے کہ وہ اس کے اجزا کا اعلان کرے۔ کمپنی نے مقدمہ کی پیروی کی یہاں تک کہ وہ جیت گئی۔ اس کے وکیلوں نے یہ ثابت کیا کہ شناختی معیار (Standard of identity) کو باقی رکھنے کے لیے کوکا کولا کے فارمولا کا راز میں رہنا ضروری ہے۔

خارجی دنیا میں اپنی حیثیت کو بڑھانے اور اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے امریکہ جتنا خرچ کرتا ہے اتنا شاید ساری تاریخ میں کبھی کسی قوم نے نہیں کیا۔ مگر امریکہ کی خارجہ پالیسی اس نسبت سے کامیاب پالیسی نہیں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔

ترکی سوویت روس کی سرحد پر واقع ہے۔ اس اعتبار سے امریکہ کے لیے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ترکی سے تعلقات بڑھائے اور یہاں اس نے اپنے ۲۰ سے زیادہ فوجی اڈے قائم کر لیے۔ ان اڈوں کا خاص مقصد روس کی جنگی تیاریوں کی نگرانی کرنا تھا۔ مگر ۱۹۷۴ میں ترکی اور یونان میں کش مکش پیدا ہوئی۔ ترکی نے قبرص میں آباد ترک باشندوں کی حفاظت کے لیے قبرص میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ اس وقت ترکی کی امیدوں کے خلاف امریکہ نے یونان کا ساتھ دیا۔ حتی کہ اس نازک وقت میں ترکی کو اسلحہ بھیجنے پر پابندی لگا دی جس کا راستہ اس سے پہلے اس کے لیے آزادانہ طور پر کھلا ہوا تھا (ریڈرس ڈائجسٹ مئی ۱۹۷۶)

اس نازک موقع پر امریکہ کا ساتھ چھوڑنا ترکی کے لیے بہت تلخ تجربہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک میں امریکہ کے تمام فوجی اڈے بند کر دیئے۔ ۳۰ سالہ تعلق یک لخت ختم ہوگیا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ولیم گریفتھ (William E. Griffith) نے لکھا ہے کہ اگر روسی یہ سب کرنا چاہتے تو وہ بھی اس سے زیادہ کامیابی کی امید نہیں کر سکتے تھے۔

If the Russians had set out to accomplish all this,
they could not have hoped for more success.

تاہم یہ حادثہ خود ترکی کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔ ترکی اب تک اپنا رشتہ مغربی دنیا سے جوڑتا

تھا۔ اس تلخ تجربہ نے اس کی خوش گمانیوں کا غبارہ توڑ دیا۔ اس کے بعد اس کی توجہات مسلم دنیا کی طرف مُڑ گئیں۔ ترکی کے صدر نے اس کے بعد سے بے شمار مرتبہ عرب دنیا کے دورے کیے ہیں۔ عرب لوگ کثرت سے ترکی جانے لگے ہیں۔ عربوں کو ترکی میں ایسی رعایتیں دی گئی ہیں جو اس سے پہلے انھیں حاصل نہ تھیں۔ مثلاً ایک قانون میں تبدیلی کرکے اس کی گنجائش پیدا کی گئی کہ عرب ترک شہروں میں جائداد خرید سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

مسلم دنیا سے اس تعلق کے بالواسطہ نتیجہ کے طور پر ترکی میں اسلام اور اسلامی تحریک کو نئے مواقع مل گئے جو کمال اتاترک اور عصمت انونو نے ختم کر رکھے تھے۔ جدید ترکی میں دوبارہ اسلام زندہ ہو رہا ہے اور یہ نتیجہ ہے امریکہ کی اس سیاست کا جو اس نے ۱۹۷۴ میں قبرص کے معاملہ میں اختیار کی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۸۵ کو میں دہلی واپس پہونچا۔

ایک سفر

دسمبر ۱۹۸۵ میں بماکو (افریقہ) میں ایک اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر راقم الحروف نے ہندستان کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس سفر کا راستہ تھا: دہلی۔ روم۔ دکار۔ بماکو، دوسرے لفظوں میں ایشیا سے یورپ اور پھر یورپ سے افریقہ۔ کانفرنس کے بعد بماکو۔ پیرس۔ لندن۔ کویت۔ دبئی۔ دہلی کے راستہ سے واپسی ہوئی۔

بہت سے لوگوں کے لیے سفر ایک تفریح ہوتا ہے۔ مگر میرے لیے سفر ایک مصیبت ہے۔ چنانچہ میں گھر سے بادلِ ناخواستہ ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ دلی ایرپورٹ پر پہونچ کر مجھے اس قدر وحشت ہونے لگی کہ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ واپس چلو، مجھے سفر پر نہیں جانا ہے۔ میرے قدم کسی طرح آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ مگر ساتھی کے اصرار اور دینی مصلحت کے خیال سے مجھے آگے جانا پڑا۔

میرے مزاج میں فطرت پسندی اتنی زیادہ ہے کہ مجھے ہر مشینی سفر سے وحشت ہوتی ہے۔ اگر پیدل سفر کرنا ممکن ہو تو یقیناً میں پیدل سفر کروں۔ مگر ظاہر ہے کہ ایشیا سے یورپ، اور یورپ سے افریقہ اور امریکہ کا سفر پیدل طے نہیں کیا جا سکتا۔

میری یہ کیفیت بھی عجیب ہے۔ جن دنیوی چیزوں کو پاکر عام لوگ خوش ہوتے ہیں ان کو پاکر میں ایسا غمزدہ ہوتا ہوں جیسے وہ چیز مجھے کاٹ رہی ہو۔ ۴ دسمبر ۱۹۸۵ کی رات کو پالم ایرپورٹ پر مسافروں کا ہجوم تھا۔ لوگ خوش و خرم چہروں کے ساتھ تیزی سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مگر میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میرے ہاتھ میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ میرے لیے روم (اٹلی) اور دکار (سینیگال) میں ہوٹل کے کمرے رزرو تھے۔ بماکو (افریقہ) پہونچ کر مجھے فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ مگر میرا حال یہ تھا کہ جیسے قدم اٹھ نہ رہے ہوں۔ آخر جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ میرے دل کو ایک لمحہ کا سکون بھی حاصل نہ تھا۔

اللہ اپنے اس بندے پر رحم فرمائے جس کا حال یہ ہے کہ جہاں لوگ ہنستے ہیں وہاں اسے رونا آتا ہے۔ جہاں لوگ اپنے کو پایا ہوا سمجھتے ہیں وہاں اس کو ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیوی کامیابی پر قانع نہ ہونے والے آدمی کی اندرونی حالت اتنی مختلف ہوتی ہے کہ اس کو وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو دنیوی کامیابی پر قانع ہو گئے ہوں۔

صبح کے ناشتہ کے وقت جہاز کے اندر ایر انڈیا کا مینو کارڈ دیا گیا۔ اس پر لکھا ہوا تھا :

Indian hospitality across five continents

(ہندستانی میز بانی پانچ برّاعظموں کے درمیان) مطلب یہ ہے کہ ایر انڈیا کی سروس پانچوں برّاعظموں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مسافر دنیا کے جس براعظم میں بھی جائے وہ ایر انڈیا کو اپنے لیے بہترین میزبان کے طور پر پائے گا۔ میں ناشتہ سے فارغ ہو کر ٹائلٹ جانے کے لیے اٹھا تو جہاز کے عملہ کے ایک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا :

You enjoyed your breakfast, Sir.

(جناب، کیا آپ اپنے ناشتہ سے محظوظ ہوئے) ظاہر ہے کہ یہ سب تجارتی اخلاق کی باتیں ہیں۔ تاجر اپنی تجارت کے لیے کتنے خوبصورت الفاظ پالیتا ہے۔ دین کی دعوت کو بھی قرآن میں ایک تجارت کہا گیا ہے۔ مگر دین کے داعی اپنے مدعو کے لیے موجودہ زمانہ میں خوبصورت الفاظ نہ پاسکے۔ ان کے پاس اپنے مدعو کو صرف متوحش کرنے والے الفاظ ہیں نہ کہ اس کو مانوس کرنے والے الفاظ۔

دہلی سے روم کا فاصلہ ۶۰۰۰ کیلو میٹر ہے۔ یہ دوری آٹھ گھنٹے میں طے ہوئی۔ ہم ۴ دسمبر کی صبح کو روم کے ہوائی اڈہ پر اترے۔ روم سے اگلا جہاز شام کو تھا۔ چنانچہ یہاں ایر انڈیا کی طرف سے ہمارے لیے ایک دن کے قیام کا انتظام تھا۔ یہاں میں ہوٹل (Holiday Inn) کے کمرہ نمبر ۲۲۰ میں ٹھہرا۔ یہاں میں نے تین نمازیں پڑھیں ۔ فجر، ظہر، عصر۔

روم اٹلی کا دار السلطنت ہے۔ یہ دنیا کے انتہائی قدیم شہروں میں سے ہے۔ اس کا آغاز غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں ہوا۔ اس وقت یہاں صرف چند معمولی مکانات تھے۔ اس کے بعد رومیوں کی ترقی کے ساتھ روم کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم شہر بن گیا۔ رومی اس کو ابدی شہر (Eternal City) کہتے تھے۔ روم کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے یورپ میں ایک ہزار سال تک تہذیب کے مقدر پر حکومت کی ہے :

> For well over a millenium Rome controlled the destiny of all civilization known to European man, then fell into dissolution and disrepair. (15/1066)

روم کا ایر پورٹ کافی بڑا ہے۔ اس کو دیکھ کر روم کے بارے میں شاندار تصور ذہن میں آتا ہے۔ مگر حقیقت میں روم اتنا شاندار نہیں۔ جب شہر میں داخل ہوں تو اس کی آبادیاں دوسرے درجہ کے شہر کا منظر پیش کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روم اب ایک زوال یافتہ شہر ہے جہاں زندگی کے ہر جزء پر تنزل کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مشہور

رومی سیاست داں مارکس سسرو (Marcus Tillius Cicero) نے دو ہزار سال پہلے کہا تھا کہ بجٹ متوازن ہونا چاہیے ، ورنہ حکومت دیوالیہ ہو جائے گی ۔ مگر آج روم کی حکومت پر ۳۰۰ کرور روپئے سے زیادہ کا قرض ہے ۔ اس قرض پر اس کو روزانہ تقریباً ایک کرور روپیہ کا سود ادا کرنا پڑتا ہے ۔

تعلیم ، واٹر سپلائی ، اسپتال ، ڈاک ، ہر چیز کا نظام غیر معیاری ہے ۔ ہم کو نیویارک سے دہلی کے لیے ٹیلی فون منٹوں میں مل گیا تھا ۔ یہاں سے ہم نے دہلی ٹیلی فون کرنا چاہا مگر کافی کوشش کے بعد بھی سلسلہ نہیں ملا ۔ روم میں بجلی کے بارے میں ایک میگزین میں یہ لطیفہ پڑھا کہ روم میں بجلی نہ اے سی ہے اور نہ ڈی سی ۔ وہ ایم سی ہے ۔ یعنی خراب کرنٹ :

It is neither AC nor DC,
but MC Malfunctioning Current

اسی طرح ایک اور لطیفہ پڑھنے میں آیا کہ روم کے ایک شخص کے نام ۷۹ ٹیلی فون کالوں کا بل آگیا جب کہ درخواست کے باوجود ابھی تک اس کے یہاں ٹیلی فون بھی نہیں لگا تھا ۔

روم میں جرائم بھی کافی ہوتے ہیں ۔ ایک فرانسیسی سیاح ایک مقام پر اپنی موٹر کار روک کر اترا ۔ پولس نے اس کو ہدایت کی کہ وہ کار کے دروازے اچھی طرح بند کر دے ۔ اس نے ایسا ہی کیا ۔ مگر جب وہ سیر کر کے واپس آیا تو اس کی کار کے سات سوٹ کیس چوری ہو چکے تھے ۔ اس کے بعد وہ قریب کے پولس دفتر میں رپورٹ درج کرانے گیا ۔ جب وہ واپس آیا تو اس کی کار بھی غائب تھی ۔

ایک سیاح نے بتایا کہ روم میں اس کا ایک مسئلہ پیدا ہوا تو ایک مقامی باشندے نے اس سے کہا :

Don't get upset. Rome is Rome. The key
word, my friend , is PAZIMENZA (patience)

پریشان نہ ہو میرے دوست ، کلیدی لفظ صرف ایک ہے ، اور وہ ہے برداشت ۔

روم کی ایک خاص چیز ویٹیکن سٹی ہے ۔ یعنی مسیحی پیشوا کا شہر ۔ ویٹیکن سٹی رقبہ کے اعتبار سے ایک مربع میل سے بھی کم ہے ۔ یہ دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ بے حد چھوٹا ہونے کے باوجود وہ خود اٹلی سے بھی زیادہ ذی اثر ہے ۔ وہ رومن کیتھولک چرچ کا عالمی مرکز ہے ۔ ویٹیکن اٹلی کے اندر ہونے کے باوجود مکمل طور پر خود مختار ہے ۔ مگر یہ خود مختاری اس کو اس قیمت پر ملی ہے کہ اس نے اپنے اختیارات کو غیر سیاسی دائرہ میں محدود کر لیا ۔

ویٹیکن سٹی کا اپنا ٹیلی فون سسٹم ہے۔ اپنا پوسٹ آفس ہے۔ اپنا طاقت ور ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اپنی پولس ہے۔ اپنا بینکنگ نظام ہے۔ اپنی کرنسی ہے۔ اس کے باشندے ایک ہزار سے بھی کم ہیں مگر ان کا اپنا علحدہ پاسپورٹ ہوتا ہے۔ یہ زیادہ تر چرچ کے عہدیدار اور کارکن مرد اور عورتیں ہیں۔ ویٹیکن میں بہت سے چرچ ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین چرچ چوتھی صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ یہاں تقریباً ہر چیز باہر سے آتی ہے۔ مثلاً کھانا، پانی، بجلی، گیس وغیرہ۔ یہاں کوئی انکم ٹیکس نہیں ہے۔

ویٹیکن سٹی کی آزاد اور خود مختار حیثیت مسولینی کی حکومت کے زمانے میں ۱۹۲۹ میں منظور ہوئی۔ یہاں کی لائبریری اور یہاں کے میوزیم میں بہت سے قیمتی نوادرات موجود ہیں جن کو دیکھنے کے لیے لوگ برابر آتے رہتے ہیں۔ ویٹیکن کا اپنا طاقت ور طالوی اخبار ہے جس کا نام ہے L'Osserva-tore Romano یہاں کا پریس اتنا بڑا ہے کہ وہ ہر زبان میں کتاب چھاپ سکتا ہے۔ جارجیا کی قدیم زبان سے لے کر ہندستان کی تامل تک ہر زبان میں یہاں کتاب چھاپی جا سکتی ہے۔

سب سے پہلے سینٹ پال روم میں آئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ پیٹر بھی روم آئے تھے۔ قرون وسطیٰ میں پوپ عملاً پورے یورپ کا مقتدر اعلیٰ تھا۔ وہ کسی بادشاہ کو معزول کرنے کا حق رکھتا تھا۔ مگر بعد کو بادشاہوں نے بغاوت کی یہاں تک کہ چرچ اور اسٹیٹ کی علحدگی عمل میں آئی۔ بادشاہ سیاست کا حکمراں قرار پایا اور پوپ مذہب کا۔ یورپ میں پوپ کا سیاسی اقتدار باقاعدہ طور پر ۱۸۷۰ میں ختم ہوا۔

ویٹیکن میں ایک اسلامی شعبہ بھی قائم ہے۔ اس شعبہ کے ذمہ دار کا نام و پتہ یہ ہے:

Rev. Fr. Thomas Michel
Secretariats pro Non-Christians
00120 Cittadel Vaticano
Roma; Italy

ویٹیکن پورے معنوں میں ایک "اسٹیٹ" ہے، صرف یہ کہ اس کے پاس باقاعدہ فوج نہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں ۱۰۸ ملکوں سے اس کے سفارتی تعلقات ہیں۔ پچھلے پوپ عام طور پر ویٹیکن سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر موجودہ پوپ بہت متحرک قسم کے آدمی ہیں۔ انھوں نے کثرت سے بیرونی سفر کیے ہیں اور دوسری غیر روایتی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔ انھیں میں سے ایک ہے: ویٹیکن کے دو حریفوں اینگلیکن چرچ اور اسلام سے تعلقات قائم کرنا۔ اگرچہ ایک مبصر کے الفاظ میں پوپ کو پہلے معاملے میں کامیابی ہوئی اور دوسرے معاملہ میں

ناکامی :

He initiated moves for a new relationship with Islam without success, and with the Anglican Church with success.

ہندستان میں عیسائیوں کی تعداد ۲ فی صد ہے ۔ مگر دنیا بھر میں کیتھولک عیسائی تقریباً ایک ارب کی تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔ دنیا بھر کے تمام کیتھولک چرچ براہِ راست طور پر ویٹیکن کے ماتحت ہیں ۔ ان کے تمام معاملات ویٹیکن کی ماتحتی میں انجام پاتے ہیں ۔ چرچوں میں پادریوں کا تقرر ، ان کا معاوضہ ، ان کی ترقی یا عزل سب براہِ راست ویٹیکن کرتا ہے ۔ صرف ہندستان میں گیارہ ہزار (Catholic priests) پادری ہیں اور وہ سب کے سب مکمل طور پر ایک بیرونی ادارہ (ویٹیکن) کے احکام کے تحت عمل کرتے ہیں ۔ ویٹیکن اپنی ساری وسعت کے باوجود ایک انتہائی منظم عالمی ادارہ کے طور پر کام کرتا ہے ۔ اگر مسلمانوں کا ایسا کوئی ادارہ ہو تو غالباً اس کی ہر شاخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا کہ وہاں جس شخص کو مقامی انچارج بنایا جائے گا وہ پہلی فرصت میں یہ منصوبہ بنائے گا کہ قانونی یا غیر قانونی تدبیر کرکے اپنی زیر انتظام شاخ کو ایک الگ ادارہ بنائے اور آزادانہ طور پر خود اس کے اوپر قابض ہو جائے ۔

مسلمانوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ ماتحتی کو قبول نہیں کرتے ۔ اور بلاشبہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے ۔

دہلی اور روم میں وقت کا فرق ساڑھے چار گھنٹہ ہے ۔ دہلی سے ہمارا جہاز دو بجے رات کو روانہ ہوا تھا ۔ جب وہ روم پہونچا تو مقامی وقت کے لحاظ سے صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا ، جب کہ اس وقت دہلی کی گھڑی میں دن کے گیارہ بج رہے تھے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دہلی کی گھڑی کے لحاظ سے ہم ساڑھے چار گھنٹہ پہلے روم پہونچ گئے —— ہندستان سے مغرب کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو حاصل کرتے ہیں اور اگر ہندستان سے مشرق کی طرف سفر کریں تو آپ وقت کو کھو دیتے ہیں ۔

۵ دسمبر کو میں دکار (سینیگال) پہونچا ۔ روم سے دکار کا سفر ایرافریق (Air Afrique) کے ذریعہ ہوا ۔ یہاں تقریباً ۲۰ گھنٹے قیام رہا ۔ ہوائی سفر کا قاعدہ ہے کہ اگر آپ کو کسی مقام پر جہاز بدلنے کے لیے ٹھہرنا ہے اور آگے کی فلائٹ میں آپ کی سیٹ کنفرم ہے تو ہوائی کمپنی اپنے خرچ پر آپ کو ہوٹل میں ٹھہرائے گی ۔ اور ہوائی اڈہ سے ہوٹل آنے جانے کے لیے سواری بھی اپنی طرف سے مہیا کرے گی ۔ اس کے لیے ہوائی اڈہ

پر مستقل ڈسک ہوتے ہیں۔ روم کے ہوائی اڈہ پر یہ ڈسک پیسنجر سروس کے نام سے ہے اور دکار میں ایرافریق اور ایر فرانس کے نام سے۔ آپ یہاں اپنا ٹکٹ دکھا کر کاغذ بنوا لیجیے۔ اس کے بعد ہوٹل کے لوگ بطور خود آپ کا انتظام کریں گے۔ اگر وقت کافی ہو تو سفر کے آغاز سے پہلے ہی بذریعہ ٹیلکس ہوٹل کا رزرویشن ہو جاتا ہے۔

دکار میں میرا قیام ہوٹل میریڈین (Meridien) کے کمرہ نمبر ۴۵۶۹ میں تھا۔ یہ ہوٹل وسیع پہاڑی ماحول میں قائم ہے۔ ہوا نہایت خوش گوار ہے۔ یہاں نماز پڑھتے ہوئے دعا نکلی: خدایا میں نے تیرے آگے ایشیا میں سجدہ کیا تھا۔ پھر میں نے یورپ میں تیرے آگے سجدہ کیا اور اب افریقہ میں تیرے آگے سجدہ کر رہا ہوں۔ تو میری نمازوں کو قبول فرما اور مجھے بخش دے۔

دکار سینیگال کی راجدھانی ہے۔ یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ لوگ یا تو فرانسیسی زبان بولتے ہیں یا مقامی زبان۔ تاہم عربی اور انگریزی بولنے والے بھی بقدر ضرورت مل جاتے ہیں۔ یہاں موریطانیہ کے ایک صاحب ملے۔ وہ وہاں ریڈیو اور ٹیلی وزن کے محکمہ میں کام کرتے ہیں۔ وہ عربی اچھی جانتے تھے اور میری کتاب (الاسلام یتحدّیٰ) سے واقف تھے۔

دکار (Dakar) افریقہ کے چند اہم شہروں میں سے ایک ہے۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس کو ترقی کے کافی مواقع ملے ہیں۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۵۹ تک وہ فرانس کے قبضہ میں رہا۔ ۱۶۷۷ میں پہلی بار فرانسیسی یہاں سمندر کے راستہ سے داخل ہوئے تھے۔ سینیگال میں تقریباً ۹۰ فی صد مسلمان ہیں۔ دکار کی آبادی ایک ملین کے لگ بھگ ہے۔

دکار کا ہوٹل میریڈین عین سمندر کے کنارے ہے اور نہایت وسیع رقبہ میں رزورٹ کے انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس کے ایک طرف دور تک پھیلے ہوئے سرسبز و شاداب مناظر ہیں اور دوسری طرف سمندر کی لہریں موجیں مارتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ گویا ایک طرف جمالِ خداوندی کے مناظر ہیں اور دوسری طرف جلالِ خداوندی کے۔ مگر لوگوں کے چہرے بتاتے ہیں کہ وہ یہاں صرف تفریح کے لیے آتے ہیں۔ انھوں نے یہاں نہ خدا کے جمال کو دیکھا اور نہ اس کے جلال کا مشاہدہ کیا۔

ڈچ نے ۱۶۱۷ء میں یہاں کا ایک چھوٹا جزیرہ خرید کر حاصل کیا تھا۔ اس وقت سے یہاں مغربی تدخل کا آغاز ہوا۔ فرانسیسیوں نے اس جزیرے پر ۱۶۷۷ میں قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد یہاں برطانی آئے۔ بالآخر فرانسیسیوں نے اس کا بڑا حصہ ۱۸۵۷ میں فتح کیا۔ ۱۸۸۵ میں یہاں پہلی ریلوے قائم کی گئی۔ دکار کا صدارتی محل

دنیا کے چند خوبصورت ترین صدارتی محلوں میں سے ہے۔ دکار کا یوف ایرپورٹ (Yof Airport) امریکہ کی مدد سے بنایا گیا ہے۔ یہاں مونگ پھلی کافی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم تک یہاں کی مونگ پھلی تیل تیار کرنے کے لیے فرانس جاتی تھی۔ اب خود ملک میں اس کے کارخانے کھل گیے ہیں۔ دوسری بہت سی صنعتیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں۔ نہر سوئز بند ہونے کے زمانہ میں دکار کی بندرگاہ کی تجارتی سرگرمیاں کافی بڑھ گئی تھیں۔ دکار اپنی قدرتی خوبصورتی کی وجہ سے سیاحوں کا مرکز ہے۔

دکار میں جب ہم مقررہ وقت پر ہوٹل سے ایرپورٹ پہونچے تو معلوم ہوا کہ کسی ٹکنکی سبب (Technical Reason) سے جہاز مزید لیٹ ہو گیا ہے۔ دوبارہ ہم ایک اور ہوٹل میں لے جائے گیے جس کا نام ہوٹل ترنگا (Hotel Sofitel Teranga) تھا۔

ہوٹل کے نام میں " ترنگا " کا لفظ دیکھ کر ہمیں ہندستانی لفظ ترنگا یاد آیا۔ جس کے معنی ہیں تین رنگ والا۔ مگر مقامی زبان میں اس لفظ کا مطلب ہے تکریم۔ ہوٹل ترنگا کا مطلب ہے عزت وتکریم والا ہوٹل۔

دوبارہ جب میں دکار کے ایرپورٹ پر پہونچا تو یہاں گامبیا کے ایک صاحب (احمد ڈرامے) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ آج جب کہ میں یہاں دکار کے ایرپورٹ پر تھا۔ دکار کا ایک آدمی آیا۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ آپ آج یہاں سے گزر رہے ہیں۔ اس نے آپ کی عربی کتابیں اور مجلہ الامۃ (قطر) میں آپ کے بارہ میں مضمون پڑھا تھا۔ میں نے جب بتایا کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ سے ملا ہوں تو وہ بہت حیرت کے ساتھ مجھ سے آپ کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ وہ دیر تک ایرپورٹ پر رہا۔ پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔ واضح ہو کہ ہوائی جہاز لیٹ ہو جانے کی وجہ سے اس وقت میں ہوٹل ترنگا میں تھا۔ یہاں میرا قیام کمرہ نمبر ۲۰۳ میں تھا۔

دکار کے ہوائی اڈہ پر دو امریکی مسلمانوں (سلیم بن غانم، حسن عجرم) سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں اصلاً لبنانی ہیں۔ مگر ان کے آبا امریکہ میں رہنے لگے۔ یہ لوگ اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ اپنی آبائی زبان عربی سے برائے نام واقف ہیں۔

ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) دیا۔ وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ وہ اس کے مضامین پڑھتے جاتے تھے اور "گڈ، گڈ" کہتے جاتے تھے۔ الرسالہ (انگریزی) کی زبان کی انھوں نے خاص طور پر بہت تعریف کی۔

انھوں نے کہا کہ امریکہ میں اسلام کے تعارف کے لیے ہمیں انگریزی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت انگریزی میں جو کتابیں دستیاب ہیں وہ زیادہ تر ان لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو اسلام کو سیاسی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ انداز امریکیوں کو زیادہ اپیل نہیں کرتا۔ ہمیں ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جس میں اسلام کو اس کے فطری اور ابدی انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ میں نے تعارفی سٹ (انگریزی) کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس سے بہت دل چسپی ظاہر کی۔ انشاء اللہ ان کو انگریزی کا تعارفی سٹ بھیج دیا جائے گا۔

ڈکار ایرپورٹ پر کئی غیر مسلم یورپی ملے۔ وہ بماکو جارہے تھے۔ ایک صاحب اٹلی کے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا مضمون جیالوجی ہے۔ وہ ایک پروجکٹ میں مدد کرنے کے لیے اکسپرٹ کے طور پر بماکو جارہے ہیں۔

اکثر افریقی ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مگر یہ ممالک مستقل طور پر اپنی پسماندگی کی قیمت مغربی اقوام کے تدخل کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ اولاً مغربی قوموں نے افریقہ میں سیاسی غلبہ حاصل کیا۔ اس کے بعد جب آزادی کا وقت آیا تو انھوں نے افریقی عوام کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر ان کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم کر دیا۔ اب وہ تکنکی ماہرین اور مسیحی مبلغین کے ذریعہ یہاں نفوذ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے قائدین اس کو ظلم سے تعبیر کریں گے مگر حقیقۃً یہ اپنی پسماندگی کی قیمت ہے جو افریقہ مسلسل ایک یا دوسری صورت میں ادا کر رہا ہے۔

ڈکار سے بماکو کے لیے ایرافریق سے روانگی ہوئی۔ جہاز میں ایرہاسٹس نے کھانے کے لیے پوچھا۔ یہ غالباً افریقہ کی عیسائی خاتون تھی۔ میں نے کہا کہ "ویجیٹیرین"۔ وہ اچھی انگریزی جانتی تھی مگر ویجیٹیرین کا لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیوں کہ یہاں کثرت سے لوگ گوشت کھاتے ہیں، میں نے کئی بار دہرایا تو اس نے حیرت کے ساتھ کہا:

Oh, you are vegetarian!

(اف، آپ سبزی خور ہیں)

ہم ۶ دسمبر کی صبح کو بماکو (Bamako) پہونچے۔ یہاں ہوٹل میں حسب معمول طرح طرح کی چیزیں بک رہی تھیں۔ شرکار اجتماع میں سے ایک صاحب زیور کی الماری کے سامنے کھڑے ہوگئے اور اپنے بچوں کے لیے زیور خریدنے لگے۔ یہ ایک افریقی عالم تھے اور عربی اچھی جانتے تھے۔ ان سے میری کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسے بن جائیے کہ آپ کو صرف آیات اللہ نظر آئیں۔ یہ چیزیں آپ کو دکھائی نہ دیں جو آیات الانسان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ میں بچوں کے لیے لے رہا ہوں ۔ میں نے کہا کہ اپنے بچوں کو بھی ویسا ہی بنائیے جیسا آپ کو بننا ہے وہ ہنس کر کہنے لگے " آپ تو ابو ذر غفاری ہیں، ہم لوگ ایسے کہاں بن سکتے ہیں "

۶ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو ہم ایر افریق کے ذریعہ بماکو پہونچے ۔ بماکو مالی کی راجدھانی ہے ۔ یہ سفر وقفہ کے لحاظ سے میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ طویل تھا ۔ ۳ دسمبر کا دن گزار کر رات کو میں نے عشار کی نماز دہلی میں پڑھی تھی ۔ اس کے بعد برابر سفر میں رہا ۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر کو فجر کی نماز بماکو میں پڑھی ۔ عجیب اتفاق ہے کہ نومبر ۱۹۸۵ کے تیسرے ہفتے میں امریکہ میں تھا ۔ وہاں سے واپسی کے جلد ہی بعد دسمبر کے پہلے ہفتہ میں یورپ سے گزرتے ہوئے افریقہ آنا ہوا ۔ اس تین ہفتہ کے اندر میں نے اپنی نمازیں چار بر اعظموں (امریکہ، ایشیار یورپ، افریقہ) میں ادا کیں ۔ اس طرح گویا خدا کی زمین کے بیشتر حصہ میں خدا کے آگے سجدہ کرنے کی توفیق نصیب ہوئی ۔ اپنی مغفرت کی دعا کے بعد دوسری دعا جو دل سے نکلتی رہی وہ یہ تھی کہ خدایا، بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت کا سامان فرما ۔

مالی کا رقبہ ۱۲۴۰۰۰۰ مربع کیلو میٹر ہے ۔ اس کی آبادی ۱۹۷۰ کی مردم شماری کے مطابق تقریباً ستر لاکھ ہے ۔ بماکو اس کی راجدھانی ہے ۔ یہ ملک ۱۸۹۸ سے لے کر ۱۹۶۰ تک فرانس کے زیر قبضہ رہا ۔ اب وہ آزاد ہے مالی بنیادی طور پر زرعی ملک ہے ۔ اس کا تقریباً نصف حصہ صحرا ہے ۔ یہاں کا سب سے بڑا دریا نائجر ہے ۔ ۹۰ فی صد آبادی زراعت پیشہ ہے ۔ یہاں کی سرکاری زبان ابھی تک فرانسیسی ہے ۔ آبادی میں تقریباً ۸۰ فی صد مسلمان ہیں ۔ عیسائیوں کی تعداد صرف ۲ فی صد ہے ۔ یہاں کے لوگ گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوئے ۔ بماکو کی آبادی تقریباً چھ لاکھ ستر ہزار ہے ۔ تعلیم دس فی صد ہے ۔ مالی میں لوہا پیدا ہوتا ہے ۔ وہ ملک میں ہر جگہ پایا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ باکسائٹ، مینگنیز، فاسفورس وغیرہ پائے جاتے ہیں ۔ سونا بھی ملتا ہے ۔ تاہم ذریعہ آمدنی زیادہ تر زراعت اور مچھلی ہے ۔ مچھلی نائجر دریا سے حاصل کی جاتی ہے ۔ ریل صرف ۴۰۰ میل تک ہے زیادہ تر روڈ سے سفر کیا جاتا ہے ۔ یہاں کی حکومت کا نظام جمہوری ہے ۔ مالی کا انحصار فرانس کی مدد پر رہا ہے اب عرب ملکوں سے بھی اس کو کافی امداد مل رہی ہے ۔ مالی مغربی افریقہ میں واقع ہے ۔ اس کو سمندری کنارہ حاصل نہیں ۔

بماکو میں میرا قیام ہوٹل (Hotel Sofitel L`Amitie) میں تھا ۔ میرے کمرہ کا نمبر ۷۱۲ تھا ۔ میرا مزاج کچھ اس قسم کا ہے کہ " در و دیوار " سے مجھے انس نہیں ہوتا ۔ خواہ وہ تعمیراتی اعتبار سے کتنے ہی

شاندار کیوں نہ ہوں۔ البتہ فطرت کے مناظر ہوں تو ان سے میں فوراً مانوس ہو جاتا ہوں۔ میرے کمرے کے ایک طرف حسب معمول در و دیوار تھے مگر دوسری جانب دور تک سرسبز و شاداب مناظر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں کی سب سے بڑی ندی نائجر سامنے سے گزر رہی تھی اور اس کے چاروں طرف درختوں کی ہریالی نظر آتی تھی۔ دیوار سے دیوار تک لگے ہوئے شیشوں کے ذریعہ میں ہر وقت انھیں دیکھ سکتا تھا۔ یا کمرہ کے باہر بالکنی میں جاکر ان کا ہم نشین بن سکتا تھا۔ خدا کی مخلوقات میں خدا دکھائی دیتا ہے، اگرچہ بہت سے لوگ غلوقات میں صرف مخلوقات ہی کو دیکھ پاتے ہیں۔ ان کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی۔

مالی میں مختلف عرب ملکوں کے تعاون سے بڑے بڑے کام ہو رہے ہیں۔ بماکو میں سعودی عرب کی امداد سے ایک مسجد بنائی گئی ہے جو یہاں کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ ۶ دسمبر کو ہم نے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں پڑھی۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے ہال کی مانند ہے۔ ہال کا اندرونی حصہ ۸۰ اونچے اونچے کھمبوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔ پوری مسجد بالکل جدید انداز میں بنائی گئی ہے۔ جمعہ کے خطبہ کے لیے عام طور پر الگ ممبر ہوتے ہیں جن سے مسجد کے آگے کا ایک حصہ گھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں ممبر کی صورت یہ ہے کہ دیوار کے اوپری حصہ میں اس کے لیے جگہ نکالی گئی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے دیوار میں بہت بڑا طاق بنا دیا جائے جس میں آسانی سے آدمی کھڑا ہو سکے۔ اس "طاق" کے نچلے حصہ میں بالکنی کی مانند تھوڑا سا حصہ آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور اس پر ریلنگ کے انداز میں گھیرا بنا دیا گیا ہے۔

عرب ملکوں کے ذریعہ اس قسم کے بے شمار کام ساری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انتظام ہے جو اس نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیڈروں کے شاندار الفاظ کے باوجود مسلمان زمانہ کے لحاظ سے آج اتنا پیچھے جا چکے تھے کہ اگر "پٹرو ڈالر" کی خدائی طاقت ظاہر نہ ہوئی ہوتی تو مسلمان موجودہ زمانہ میں بین اقوامی اچھوت بن کر رہ جاتے۔

دہلی اور بماکو میں وقت کا فرق ساڑھے چھ گھنٹہ ہے۔ بارہ بجے رات کو جب بماکو کے کیلنڈر میں ایک تاریخ ختم ہو کر دوسری تاریخ شروع ہوتی ہے، اس وقت دہلی میں ابھی کیلنڈر بدلنے کے لیے ساڑھے چھ گھنٹے کی مدت باقی رہتی ہے۔ اگر آپ ایک مقام کی گھڑی دوسرے مقام پر بغیر بدلے ہوئے پہنے رہیں تو آپ مقامی وقت کے لحاظ سے چھ گھنٹہ آگے یا چھ گھنٹہ پیچھے رہیں گے۔

یہاں کناڈا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو ہمارا انگریزی الرسالہ برابر جا رہا ہے۔ ان

سے میں نے انگریزی الرسالہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کے مضامین کے بارہ میں بہت اچھے تاثر کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا :

Very simple, very effective

(بہت سادہ اور بہت اثر انگیز) ایک صاحب کینیا سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ جارہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کم از کم دس آدمی پابندی سے آپ کا انگریزی الرسالہ پڑھتے ہیں۔ ان کو ایک رسالہ کے بعد دوسرے رسالہ کا انتظار رہتا ہے۔ اور یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو انگریزی زبان سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔

یہاں کی اسلامی کانفرنس میں ایک صاحب سوئزرلینڈ سے آئے تھے۔ ان کو بھی انگریزی الرسالہ برابر جارہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے یہاں کئی لوگ اس کو پابندی سے پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس کے زبان و بیان کا پرزور الفاظ میں اعتراف کیا۔ مزید انھوں نے بتایا کہ سوئزرلینڈ میں ایک صاحب انگریزی الرسالہ کے اتنا زیادہ قدرداں ہیں کہ انھوں نے اس کے کئی مضامین کو ٹیپ پر منتقل کیا اور اس کو وہاں کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرایا۔

میں اپنے ساتھ کتابیں نہیں لے گیا تھا۔ میرے ساتھ صرف عربی کتاب (الدین فی مواجہۃ العلم) کے چند نسخے تھے اور انگریزی الرسالہ کی چند کاپیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ جس سے بھی کتاب یا رسالہ کا ذکر آیا وہ بے حد شوق اور احترام کے ساتھ اس کو لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ بوراسٹ اسے مل سکے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار لوگ اسلام کو وقت کے اسلوب میں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر آج اسلامی مرکز کے سوا غالباً کوئی بھی ادارہ نہیں جو اسلام کی تعلیمات کو جدید عصری اسلوب میں پیش کر رہا ہو۔ بعض لوگ اسلام کو سیاسی اسلوب میں پیش کرتے ہیں اور غلطی سے سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کو عصری اسلوب میں پیش کر رہے ہیں۔ حالاں کہ عصری اسلوب سائنٹفک اسلوب کا نام ہے نہ کہ سیاسی اسلوب کا۔

کانفرنس میں ویسٹ انڈیز کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی مادری زبان انگریزی ہے۔ انھوں نے ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم امریکہ میں حاصل کی ہے۔ وہ انگریزی الرسالہ سے واقف نہ تھے۔ ان کو انگریزی الرسالہ کا ایک شمارہ (نومبر ۱۹۸۵) دیا گیا۔ انھوں نے رات کو سونے سے پہلے پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ اس کے بعد بار بار تقاضا کرتے رہے کہ یہ رسالہ میں مستقل طور پر پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے بہ تکرار وعدہ لیا کہ میں انھیں

انگریزی الرسالہ روانہ کروں گا۔

ان سے میں نے انگریزی الرسالہ کے بارے میں ان کا تاثر پوچھا تو انھوں نے کہا :

It is a very impressive and relevant piece
of literature about Islamic realities.

(یہ اسلامی حقیقتوں کے بارہ میں ایک بے حد موثر اور بہت متعلق ادب پارہ ہے) موصوف گیانا کے اسلامک سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔

افریقہ کا مشہور تاریخی شہر تمبکتو (Tumbukto) اسی مالی میں واقع ہے۔ تمبکتو چودھویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک اس علاقہ میں اسلامی تعلیم اور اسلامی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ تمبکتو کی بنیاد غالباً ۱۱۰۰ء میں پڑی۔ ابتداءً اس نے تجارتی مرکز کی حیثیت سے ترقی کی۔ اس کے بعد وہ ثقافتی اور علمی مرکز بن گیا۔ یہاں قدیم زمانہ میں کئی اسلامی یونیورسٹیاں قائم تھیں جن میں علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کے طلبہ آتے تھے۔ تمبکتو کی مرکزی حیثیت ۱۵۹۱ء میں ختم ہوئی جب کہ وہ مراکو کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں بار بار انقلابات آتے رہے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کیا گیا تھا اور کانفرنس کے تمام شرکار اس کے ذریعہ تمبکتو کو دیکھنے کے لیے جانے والے تھے۔ مگر بعض وجوہ سے مجھے جلد دہلی پہونچنا تھا اس لیے میں تمبکتو کے سفر میں شریک نہ ہو سکا اور ۹ دسمبر کی شام کو بماکو سے دہلی کے لیے روانہ ہو گیا۔

۹ دسمبر ۱۹۸۵ کو یہاں کا اسلامی مرکز دیکھا۔ بماکو کا یہ اسلامی مرکز شارع زائد بن سلطان پر واقع ہے۔ وہ ۲۵ ہزار مربع میٹر کے رقبہ میں پانچ ملین ڈالر کے خرچ سے بنایا گیا ہے۔ اس کا فنڈ عرب ملکوں نے ادا کیا ہے۔ یہاں کی مسجد میں میں نے دو رکعت نماز ادا کی۔

کانفرنس کے تمام شرکار اجتماعی طور پر مرکز میں لے جائے گئے تھے۔ یہ مرکز ابھی بن کر تیار ہوا ہے۔ تاہم ابھی اس میں کام نہیں شروع ہوا ہے۔ لوگ گھوم گھوم کر شاندار مرکز کے مختلف حصے دیکھ رہے تھے اور پرجوش طور پر باتیں کر رہے تھے۔ میں خاموش اپنے خیالات میں کھویا ہوا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس دوران ایک افریقی عالم استاذ احمد درامے میرے پاس آئے اور مسکراتے ہوئے میرے بارہ میں کہا :

يُعجبُ الناس بالمباني ويُعجبُ الشيخ بالمعاني

موجودہ زمانہ میں اس طرح کے بڑے بڑے اسلامی مراکز دنیا کے ہر حصہ میں بنائے گئے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ ایک المیہ یہ ہے کہ وہ بالواسطہ یا براہ راست طور پر حکومتوں کے عطیہ سے بنتے ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام پسند طبقہ کا بڑا حصہ اسلام کی سیاسی تفسیر سے متاثر ہے۔ وہ جگہ جگہ مسلم حکومتوں کے خلاف سیاسی انقلاب کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم حکومتوں کی نظر میں معتوب یا کم ازکم مشتبہ ہوگئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی جھوٹی سیاست نہ چلاتے تو یہ تمام مراکز ان کے قبضہ میں ہوتے اور ان سے وہ دعوت اسلامی کا زبردست کام لیتے۔ مگر اپنی سیاست پسندی کی وجہ سے وہ یا تو ان مراکز سے محروم ہیں یا اگر کہیں کوئی مرکز ان کے ہاتھ آگیا ہے تو اس کو اپنے غلط قسم کے سیاسی ذہن کی وجہ سے مفید نہیں بنا پاتے۔

مالی کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے۔ نوآبادیاتی دور میں جن مقامات پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا وہاں کے اعلیٰ طبقوں میں انگریزی زبان رائج ہوگئی۔ اسی طرح جن علاقوں میں فرانس کی حکومت تھی وہاں کے اونچے طبقوں کی زبان فرانسیسی ہوگئی۔ یہ صورت حال اب بھی جاری ہے جب کہ انگریز اور فرانسیسی ان علاقوں سے بہت پہلے سیاسی طور پر واپس جاچکے ہیں۔ یہاں کے عوام علاقائی زبان بولتے ہیں۔ مگر خواص کی زبان ابھی تک انگریزی اور فرانسیسی ہے۔

یہی معاملہ قدیم زمانہ میں عربی زبان کے ساتھ ہوا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب شمالی افریقہ فتح ہوا تو اس کے بعد مسلمان سمندر کو پار کرکے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے صرف حکومت نہیں کی بلکہ ایک شاندار تہذیب کی بنیاد ڈالی جو اس وقت کی عیسائی دنیا سے بہت زیادہ آگے تھی۔ چنانچہ ان علاقوں کے عیسائی کثرت سے عربی لکھنے اور بولنے لگے۔ غیر مسلموں نے اس زمانہ میں عربی زبان اور عربی علوم میں اتنی مہارت پیدا کی کہ ٹامس براؤن (Thomas Brown) جو انگلستان کا ایک عیسائی تھا وہ اسلامی عہد میں سسلی کے اندر قاضی مقرر کیا گیا۔

پھر جب اس علاقہ سے مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک اسپین اور سسلی کا اعلیٰ طبقہ عربی زبان بولتا رہا۔ اور عدالتوں اور دفتروں میں عربی زبان رائج رہی۔ اگرچہ عوام کی علاقائی زبان عبرانی اور لاتینی تھی مگر خواص کی زبان بدستور عربی ہی بنی رہی۔

برٹرینڈ رسل نے سسلی میں مسلم عہد کے بعد عربی زبان اور تہذیب کے غلبہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

Greek and Arabic were still living languages in Sicily. Frederick learnt to speak six languages fluently (including Arabic). He was at home in Arabian philosophy, and had friendly relations with Mohammadans.

A History of Western Philosophy p. 436

بماکو کی اسلامی کانفرنس کا افتتاح ۲ دسمبر ۱۹۸۵ کی شام کو ہوا۔ افتتاح کی تقریب میں مالی کے وزیر خارجہ، وزیر داخلہ، وزیر تعلیم اور دوسرے بہت سے ذمہ دار موجود تھے۔ اس کانفرنس میں تین زبانیں رائج تھیں ـــــ عربی، انگریزی اور فرانسیسی۔ اس میں دنیا کے مختلف حصوں سے نمایندہ افراد شریک ہوئے۔ چنانچہ کویت کے نمایندہ نے تقریر کی تو انھوں نے اپنی تقریر میں یہ الفاظ استعمال کیے :

اتینا من مشارق الارض ومن مغاربها

اس کانفرنس میں حسب ذیل ملکوں کے اہل علم مسلمان شریک تھے : کناڈا، مالی، قبرص، یونان، سعودی عرب، مالدیپ، سوئزر لینڈ، میڈاگاسکر، انگلینڈ، شمالی امریکہ، جنوبی امریکہ، برازیل، سوڈان، کینیا، ہندستان، ترکی، کویت، پاکستان، گیانا، شام، فلپائن، فلسطین، غانا، گامبیا، ہالینڈ، یوگوسلاویہ، افغانستان، کوریا، تیونس، نائجریا، یمن، جاپان۔

کانفرنس میں زیادہ تر دو قسم کے امور پر تقریریں اور مباحثے ہوئے، ایک اسلامی دعوت، دوسرے اسلام یا مسلمانوں پر دوسری قوموں کے حملے۔ تاہم کانفرنس پر دوسرا موضوع زیادہ نمایاں رہا۔ ہر علاقہ کے لوگوں نے اپنے اپنے علاقے کی مشکلات بیان کیں۔ خاص طور پر وہ مشکلات جو صہیونیت، کمیونزم اور جدید استعمار کی طرف سے پیدا کی گئی ہیں۔

دعوت کا موضوع زیادہ تر دفاعی طور پر سامنے آیا۔ موجودہ زمانہ میں مسیحی مبلغین کافی سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں پر کام کر رہے ہیں۔ پوپ نے پچھلے چند برسوں میں چار بار افریقہ کا سفر کیا ہے۔ مسیحی چرچ نے طے کیا ہے کہ مسلمانوں کے بڑے حصہ کو یا تو مسیحی بنا دیا جائے اور اگر وہ مسیحی بننے پر راضی نہ ہوں تو ان کے ذہن کو اس طرح بدل دیا جائے کہ اپنے مذہب میں ان کی فکری جڑیں باقی نہ رہیں۔ وہ نہ مسلمان ہوں اور نہ عیسائی۔

کانفرنس کے شرکار کا عام احساس یہ تھا کہ چرچ کے لوگ جتنے منظم طور پر اپنا دعوتی کام کرتے ہیں اتنے منظم طور پر مسلمان اپنا دعوتی کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اسلامی دعوت کے کام کو زیادہ منظم اور زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

کانفرنس میں اس موضوع پر کافی گفتگو ہوئی کہ افریقہ میں مسیحی مبلغین مسلمانوں کو عیسائی بنارہے ہیں۔ اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ ایک افریقی نمائندے نے بتایا کہ مسلمانوں میں مسیحی تبلیغ کی کامیابی کی اصل وجہ مسلمانوں کا افلاس ہے۔ افریقہ کے بہت سے حصوں میں زندگی بے حد سخت ہے۔ لوگوں کے پاس لباس اور مکان تک نہیں۔ مسیحیت قبول کرکے انھیں یہ سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کچھ کھوچکے ہیں۔ پھر کیا حرج ہے اگر ہم دین کو بھی کھودیں (فقدنا کل شيئ فلا باس اذا فقدنا الدین لان المسألة الأن مسألة البقاء والانقراض من الحیاۃ)

بتایا گیا کہ یہی وجہ ہے کہ مذہب بدلنے کے تمام واقعات صرف دیہاتی علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں افلاس زیادہ ہے۔ شہروں میں کوئی مسلمان مذہب نہیں بدلتا۔ کیوں کہ وہاں مذہب بدلے بغیر آدمی اپنے لیے اسبابِ معاش پالیتا ہے۔ مادی محرک کے تحت عیسائی ہوجانے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ بہت سے لوگ جو مسیحیت قبول کرتے ہیں وہ بعد کو دوبارہ مسلمان ہوجاتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ تبدیلیٔ مذہب کی اصل وجہ مادی افلاس نہیں بلکہ ذہنی افلاس ہے۔ اسلامی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے (کل ھذا ناتج عن فقدان الوعی الاسلامی) ان کا خیال تھا کہ ہم کو سب سے زیادہ افریقی مسلمانوں، خاص طور پر دیہات کے مسلمانوں، کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ یہ لوگ اگر تعلیم یافتہ ہوجائیں تو اپنے آپ اس قسم کے فتنوں سے بچ جائیں گے۔

ایک عرب عالم نے بتایا کہ یورپ کے ایک شخص کو اسلام کا مطالعہ کرایا گیا۔ مطالعہ کے بعد اس نے کہا: اے وہ جس کے پاس سچا دین ہے کاش اس کے پاس مردانِ کار بھی ہوتے (یا لہ من دین لو کان لہ رجال) یہ ایک حقیقت ہے کہ آج آسمان کے نیچے اسلام ہی واحد سچا دین ہے مگر اس کے حامل مسلمان اس قدر بے جان ہوچکے ہیں کہ ان کے بل پر کوئی حقیقی کام کرنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی مثال دیمک زدہ لکڑی کی ہے۔ دیمک زدہ لکڑی سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک مصری عالم نے مسلمانوں کی حالت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے کہا کہ مسلمان اس کے عادی ہوگیے ہیں کہ آج زمین میں دانہ ڈالیں اور کل سے پہلے اس کے پھل کی امید کریں (تعوّد المسلمون ان یبذروا بذرۃ الیوم ویرجون الثمرۃ قبل امس) تاہم انھوں نے کہا کہ ہمیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں اس اندیشہ سے بیٹھ نہیں جانا چاہیے کہ ہمیں ناکامی ہوگی (لایجب ان نصاب بالشلل للحذر خشیۃ

الفضل)

افغانستان کے نمائندہ نے بتایا کہ افغانستان اگرچہ ایک چھوٹی قوم ہے مگر اس کا جذبہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا جہاد صرف افغانستان کو آزاد کرنے پر ختم نہیں ہوگا۔ بلکہ افغانستان کو آزاد کرانے کے بعد ہم سرحد کو پار کرکے آگے بڑھیں گے اور ان مسلمانوں کو بھی آزاد کرائیں گے جو روسی سرحد کے اندر ہیں اور اشتراکی حکومت کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

افسوس کہ یہ بات مجھے خوش نہ کر سکی۔ کیوں کہ جوش کی یہ قسم وہ ہے جو مسئلہ کو صرف بڑھاتی ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں مسئلہ کو ختم کرنے والی نہیں بنتی۔

ایک بار چند آدمیوں کے درمیان دنیائے اسلام کی موجودہ حالت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک عرب عالم نے کہا کہ آج مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کے معاملات کی قیادت جاہلوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ عالموں کے ہاتھ میں (قيادة امور المسلمين في ايدي الجهلة لا في ايدي العلماء)

یہ بات بذات خود صحیح ہے۔ مگر فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کبرنی موت الکبرائی کا معاملہ ہے۔ یعنی حقیقی علم والے لوگ موجود نہیں ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے معاملہ کے ذمہ دار وہ لوگ ہوگئے ہیں جن کے پاس جہالت کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ قیادت کے اعتبار سے علم والے وہ لوگ ہیں جو ایک طرف کتاب وسنت سے بخوبی واقف ہوں، اسی کے ساتھ وہ زمانہ کے تقاضوں کو پوری طرح جانتے ہوں۔

میرا مزاج یہ ہے کہ میں بولتا کم ہوں اور سنتا زیادہ ہوں۔ کانفرنس میں بھی میں ایسا ہی کر رہا تھا۔ ایک صاحب نے کہا کہ آپ دوسروں کے مقابلہ میں کم بولتے ہیں۔ میں نے کہا:

I am trying to be a good listener

(میں کوشش کر رہا ہوں کہ میں اچھا سننے والا بنوں) موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتوں میں صرف تبلیغی جماعت میں یہ مزاج پایا جاتا ہے کہ اس کے افراد یہ جانتے ہیں کہ چپ رہنا اور دوسرے کی بات سننا بھی ایک کام ہے۔ ورنہ ہماری اکثر جماعتوں کے افراد کو صرف یہ معلوم ہے کہ انھیں مسلسل بولنا چاہیے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ چپ رہنا ان کے لیے فرض کے درجہ میں ضروری ہو گیا ہو۔

ایک صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اس وقت ساری دنیا میں تقریباً ۱۰ ملین پناہ گزیں (لاجئین)

ہیں ۔ یعنی وہ لوگ جو ظلم وستم کی وجہ سے اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں (معزز مقرر خود بھی ایک پناہ گزین تھے جو اپنے وطن کو چھوڑ کر اب یورپ کے ایک ملک میں رہتے ہیں) پناہ گزینوں کی اس تعداد میں تقریباً سات ملین مسلمان ہیں ۔ نصف ملین پناہ گزیں اس وقت صرف سوڈان میں موجود ہیں ۔ ایک صاحب نے اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پرجوش انداز میں کہا :

Why they are refugee? Because they are fighting for Islam.

(یہ لوگ کیوں پناہ گزیں ہیں ، اس لیے کہ وہ اسلام کی خاطر لڑ رہے ہیں)

یہ سب سے بڑی غلط فہمی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلمان مبتلا ہیں ۔ وہ دنیا بھر میں اپنے قومی مقاصد کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں اور اس کو جہاد کہتے ہیں ۔ مزید یہ کہ یہ لڑائیاں بھی بے فائدہ لڑائیاں ہیں ، کیوں کہ وہ حقیقی تیاری کے بغیر لڑی جا رہی ہیں ۔ اس قسم کی جھوٹی لڑائیوں کو اسلامی جہاد کہنا میرے نزدیک اسلامی جہاد کے لفظ کی سخت ناقدری کرنا ہے ۔

ایک ادارہ کے ذمہ دار نے بتایا کہ ان کے ادارہ میں ایک معمر خاتون آئیں اور کہا کہ میں حج پر جانا چاہتی ہوں ۔ مگر میرے پاس سفر خرچ کی رقم نہیں ہے ۔ آپ لوگ میرے لیے سفر خرچ کا انتظام کر دیں تاکہ میں حج کے لیے جا سکوں ۔ خاتون سے کہا گیا کہ جب آپ کے پاس سفر خرچ نہیں ہے تو شرعی طور پر آپ کے اوپر حج فرض بھی نہیں ہے ، پھر آپ کیوں اس کے لیے سوال کر رہی ہیں ۔ خاتون نے جواب دیا :

میں سترہ سال سے برابر ہر سال حج کے لیے جا رہی ہوں ، پھر اس سال میں کیوں اس سے محروم رہوں ۔ جب اسلام اپنی حقیقی شکل میں باقی نہ رہے تو اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ۔

اسلام کا اصل ہتھیار دعوت ہے ۔ یہی اس کی سب سے بڑی قوت ہے ۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان اگرچہ دعوت کو بالکل بھول گئے ہیں ۔ تاہم اسلام اپنے زور پر برابر لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا رہا ہے ۔ ہالینڈ کے بارہ میں ایک تقریر میں وہاں کے مسلمانوں کے حالات بتائے گئے ۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو تفصیلات پیش کیں ان میں یہ بھی تھا کہ ہالینڈ کے شہر اوترخت (Utrecht) میں ایک اجتماع ہوا ۔ اس اجتماع میں یورپ اور امریکہ کے کئی مسلمان شریک ہوئے ۔ اجتماع کے دوران ایک نشست ہوئی جس میں مسیحی چرچ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی ۔ اس سلسلہ میں مقرر نے جو کچھ کہا اس میں یہ الفاظ بھی تھے :

وقد شارکت الکنیسة فی حوارجری فی هذا الملتقی حول العلاقة بین المسیحیة

والاسلام ۔ وقد اعلن احد المهندسين البلجيكيين اسلامہ فی ھذا الملتقیٰ
اس اجتماع کے دوران مسیحی چرچ نے بھی ایک نشست میں شرکت کی ۔ اس میں مسیحیت اور اسلام کے تعلق کے بارہ میں ڈائیلاگ ہوا ۔ اس موقع پر بلجیم کے ایک عیسائی انجینیر نے اسلام قبول کرلیا ۔ انھوں نے مزید بتایا کہ اجتماع کے بعد ہالینڈ کے ایک گاؤں میں بہت سے عیسائی اسلام میں داخل ہوگیے ۔

اسلام کی دعوت اسلام کی سب سے بڑی قوت ہے ۔ مگر اسلام کے عَلَم بردار اس کی اسی قوت کو موجودہ زمانہ میں سب سے کم استعمال کررہے ہیں ۔

افریقہ کے ایک صاحب نے بتایا کہ ممباسا کے ایک عیسائی نے اسلام قبول کرلیا ۔ اس کے بعد اس نے سواحلی زبان میں ایک کتاب لکھی ۔ اس کتاب کا نام ہے : میں نے مسیحیت کو کیوں چھوڑا ۔

اس کتاب میں مذکورہ نومسلم نے بتایا کہ انجیل کے مطابق مسیح نے فرمایا کہ میں یہود کے لیے آیا ہوں ۔ اس کے برعکس محمدؐ نے فرمایا کہ میں ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں ـــــ اسلام عالمی اپیل کے لیے اپنے اندر کس قدر زیادہ سامان رکھتا ہے ۔ مگر مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے قومی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں ۔ وہ اسلام کے عالمی اظہار کے لیے موجودہ زمانہ میں کچھ نہ کرسکے ۔

بماکو سے واپسی میں ایک فرانسیسی انجینیر سے ایرپورٹ پر ملاقات ہوئی اس نے اپنا نام بانار (Barnar) بتایا ۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک گفتگو رہی ۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ میں بائبل پڑھتا ہوں اور اس پر عقیدہ رکھتا ہوں مگر میں چرچ نہیں جاتا ۔ میں نے پھر پوچھا کہ کیوں ، اس نے کہا کہ ، اس لیے کہ بائبل اور چرچ میں تضاد پایا جاتا ہے ۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجیے ۔ اس نے کہا : مثلاً بائبل میں بُت بنانا سختی سے منع کیا گیا ہے مگر چرچ میں آپ جائیں تو وہاں آپ دیکھیں گے کہ بت بنابناکر رکھے ہوئے ہیں ۔ حضرت مسیح کی ابنیت کے بارہ میں اس نے کہا کہ مسیح حقیقی معنوں میں خدا کے بیٹے نہیں تھے ۔ "بیٹے" کے لفظ کو میں تمثیلی مانتا ہوں نہ کہ حقیقی ۔ اس طرح کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں ۔

امریکہ سے آنے والے ایک صاحب نے بتایا کہ ۸۵ - ۱۹۸۴ میں ایتھوپیا میں قحط کا مسئلہ پیدا ہوا تو امریکی حکومت نے ابتداءً اس میں کوئی دل چسپی نہ لی ۔ مگر بعد کو یہ مسئلہ اخبارات میں بہت زیادہ نمایاں ہوا ۔ مختلف ملکوں نے اس مد میں بڑی بڑی رقمیں دیں ۔ اس کے بعد یہ مسئلہ امریکہ کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا کیوں کہ امریکہ عالمی قیادت کا دعویدار ہے اور اتنے بڑے انسانی مسئلہ میں حصہ نہ لینا اس کی قیادت کو

نقصان پہونچانے کا سبب بنتا۔

چنانچہ امریکی وزیر خارجہ جارج بش نے ایتھوپیا کی امداد کے لیے کام کرنے والی بعض انجمنوں کے ذمہ داروں کو بلایا جس میں مسلمان بھی شامل تھے۔ جارج بش نے ایتھوپیا کے قحط زدگان کی امداد کے لیے امریکی حکومت کی طرف سے ایک بلین ڈالر کا چیک اس طرح لکھا کہ اس کی پوری کارروائی ٹیلی وزن پر نشر کی جا رہی تھی اور پریس کے ۲۰ نمائندے وہاں موجود تھے تاکہ امریکہ کی اس فیاضی کو کل صبح کے اخبارات کی سرخی بنا سکیں۔

بہت سے کام آدمی کرتا ہے جو بظاہر خیر اور اصلاح کے کام معلوم ہوتے ہیں مگر یہ سارا کام محض اپنی قیادت کو باقی رکھنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ قیادتی مصلحت کے سوا اس سے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

ایک عرب عالم نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر دردمندانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنا کام ہمیشہ چوٹی سے شروع کرتے ہیں (مع الاسف ، المسلمون یبدؤن من القمة) یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی کام تکمیل کے مرحلہ تک نہیں پہونچتا۔ کام کی تکمیل کی لازمی شرط یہ ہے کہ وہ نیچے سے شروع کیا جائے نہ کہ اوپر سے ـــــــ افسوس کہ یہ کمزوری آج دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

کانفرنس کے بعد واپسی پیرس اور لندن کے راستہ سے ہوئی۔ بماکو سے روانہ ہو کر ۱۰ دسمبر ۱۹۸۵ کو میں پیرس پہونچا۔ پیرس سے آگے کے لیے میرا رزرویشن کنفرم نہیں تھا۔ کھڑکی پر متعین خاتون کو میری سیٹ کے لیے آدھ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا پڑا۔ ٹیلی فون، ٹیلکس اور کمپیوٹر میں وہ بہت دیر تک مشغول رہی۔ مزید یہ کہ پیرس سے دہلی براہ راست فلائٹ نہ ملنے کی وجہ سے راستہ بدلنا پڑا۔ اس کی وجہ سے اس کو بار بار حساب کتاب کرنا پڑا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ نہ اکتائی اور نہ اس کے اندر جھنجلاہٹ پیدا ہوئی۔ بالآخر اس نے برٹش ایرویز کی لندن سے دہلی کی فلائٹ پر میرے لیے جگہ حاصل کرلی۔ اس سارے کام میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں بھاگ کر برٹش ایرویز کے جہاز تک پہونچا۔ جب میں جہاز کے اندر داخل ہوا تو اچانک یاد آیا کہ میں اپنا کتابوں کا بنڈل مذکورہ کھڑکی پر چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے جہاز کے عملہ سے کہا۔ انھوں نے کہا کہ آپ اپنی سیٹ پر بیٹھیے۔ ہم ابھی آپ کا پیکٹ منگاتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جہاز کے اندر سے ٹیلی فون پر مذکورہ خاتون سے کہا۔ اس نے فوراً میرا پیکٹ بھیجا۔ پیکٹ مجھ کو جہاز کے اندر عین اس وقت مل گیا جب کہ جہاز روانہ ہونے والا تھا۔

اس پورے واقعہ کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ سب کچھ اتنے معیار اور اتنی مستعدی کے ساتھ ہوا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا کو جس چیز کی ضرورت

ہے وہ "بہتر نظام" نہیں ہے بلکہ روح کی غذا ہے جس سے آج کا انسان محروم ہے۔ اسلام کو روح کی غذا کی حیثیت سے پیش کرنا ہی آج دعوتِ اسلامی کا اصل کام ہے۔

پیرس سے لندن تک ایر فرانس کے ذریعہ سفر ہوا۔ لندن سے دہلی کے لیے برٹش ایرویز کے ذریعہ روانگی ہوئی جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہنامہ تھا۔ اس کا نام انھوں نے اونچی زندگی (Highlife) رکھا ہے۔ اسی طرح اس کے صفحہ ۱۳۸ پر سیکو گھڑی کا اشتہار تھا۔ اس میں گھڑی کی تصویر کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

Man invented time. Seiko perfected it.

(انسان نے وقت ایجاد کیا۔ سیکو نے اس کو معیاری حیثیت دی) آدمی کو جب کسی کام سے دل چسپی ہو تو وہ اسی طرح اپنی بات کہنے کے لیے خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ بڑے الفاظ بولنا ہمیشہ صرف اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ آدمی جس معاملہ میں بول رہا تھا اس معاملہ سے اس کو کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔

برٹش ایرویز کے اندر جب مسافروں کو لاؤڈ اسپیکر پر ہدایات دی گئیں تو سب سے پہلے عرب خاتون کی زبان سے عربی میں اعلان کیا گیا۔ اسی طرح مختلف اعلانات عربی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ٹائیلٹ میں حسب ذیل اعلان اس طرح لکھا ہوا تھا کہ انگریزی کی لائن نیچے تھی اور عربی کی لائن اوپر:

الرجاء عدم رمی المناشف المستعملة فی المرحاض

جہاز کے اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ہمارے عملہ میں انگریزی، جرمن، فرنچ، اسپینی، عربی، اردو اور پنجابی جاننے والے لوگ موجود ہیں۔ آپ کسی بھی ضرورت کے لیے ان سے اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں۔ یہ اعلان سن کر میں نے سوچا کہ برٹش ایرویز کو بین اقوامی سطح پر اپنی تجارت چلانا ہے اس لیے اس نے اپنے عملہ میں ہر زبان کے آدمیوں کا انتظام کیا ہے۔ مگر عالمی اسلامی دعوت کا جذبہ اتنا موثر نہ ہو سکا کہ ہمارے کسی اسلامی ادارہ کے اندر ہر زبان کے جاننے والے فراہم کیے جائیں تاکہ ہر زبان کے جاننے والے ان سے اسلام کا تعارف حاصل کر سکیں۔ شاید دنیوی محرک انسان کے لیے اُخروی محرک سے زیادہ طاقت ور ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اسلام صرف ایک قوم کے لیے آیا تھا تو تمام مسلمان اس سے لڑ جائیں گے۔ مگر عملاً تمام مسلمان اسلام کو ایک قوم کی چیز بنائے ہوئے ہیں۔

۱۱ دسمبر ۱۹۸۵ کی صبح کو میں دہلی واپس پہونچا۔

ایک سفر

مذہبی آزادی کی عالمی کونسل (The World Council on Religious Liberty)
کا صدر دفتر نیویارک (امریکہ) میں ہے۔ اس کے زیر اہتمام ۱۳۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۶ کو جنیوا (سوئزر لینڈ) میں ایک بین اقوامی کانفرنس ہونے والی تھی۔ اس کا ابتدائی دعوت نامہ (مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۸۶) مجھے پہلے ملا تھا۔ مگر اس وقت جنیوا کا سفر کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں اس دعوت نامہ کو قبول نہ کر سکا اور معذرت نامہ لکھ کر بھیج دیا۔

میں اپنی مشغولیتوں میں اس کانفرنس کو بھول چکا تھا کہ نومبر کے تیسرے ہفتہ میں رات کے وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ رسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ ادارہ کے ذمہ دار نیویارک سے بول رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بعض اسباب سے کانفرنس کی تاریخیں ملتوی ہو گئی تھیں۔ اب یہ کانفرنس ۷۔ ۹ دسمبر ۱۹۸۶ کو جنیوا میں ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس میں شرکت کر سکتے ہیں۔ ان کو بتایا گیا کہ اس کا جواب ہم آپ کو چند دن کے بعد دے سکیں گے۔ چنانچہ ۱۷ نومبر کو دوبارہ ان کا ٹیلی فون آیا تو میں نے شرکت کے لیے رضامندی دیدی۔ اس کے بعد نیویارک سے بار بار ان کے ٹیلی فون آتے رہے۔ چوں کہ وقت کم تھا، وہ کانفرنس کی تمام تفصیلات ٹیلی فون پر بتاتے رہے۔

ان کا ٹیلی فون اکثر نصف شب کو آتا تھا۔ وہ خود اگرچہ دن کے "۱۲ بجے" ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر وہ ہم کو رات کے "۱۲ بجے" وصول ہوتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں سے یہاں تک ٹیلی فون کے پہونچنے میں ۱۲ گھنٹہ لگتا تھا۔ ٹیلی فون تو دنیا کے کسی بھی حصہ میں ایک سکنڈ سے بھی کم مدت میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت امریکہ میں نصف دن (دوپہر) کا وقت ہوتا ہے، اس وقت ہندستان میں نصف شب کا وقت ہوتا ہے۔ وہ اپنے لحاظ سے دن کے "۱۲ بجے" ٹیلی فون کرتے تھے۔ مگر دہلی میں ہم کو ان کا ٹیلی فون رات کے "۱۲ بجے" ملتا تھا۔ ایک ملک اور دوسرے ملک میں وقت کا یہ فرق دراصل زمین کی محوری گردش کے سبب سے پیدا ہوتا ہے۔

دعوت نامہ کی اطلاع تو ٹیلی فون پر مل گئی۔ اب دوسرا مسئلہ سوئزرلینڈ ایمبیسی سے ویزا حاصل کرنے کا تھا۔ مگر ان کا اصول یہ ہے کہ وہ ویزا صرف اس وقت دیتے ہیں جب کہ آدمی کے پاس تحریری دعوت نامہ اور ہوائی جہاز کا ٹکٹ موجود ہو۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ دعوت نامہ اور ٹکٹ معمول کی ڈاک سے روانہ کیا جائے۔ موجودہ تیز رفتار دنیا میں اس کا حل بھی تلاش کر لیا گیا ہے۔

چنانچہ انھوں نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ پی ٹی اے (Prepaid Ticket Advice) کے ذریعہ بھیجا جو کمپیوٹر پر اگلے دن آگیا۔ اور فوری خطوط کے لیے موجودہ زمانہ میں ایک نظام قائم کیا گیا ہے جس کو کورئے سروس (Courier Service) کہا جاتا ہے۔ اس میں خطوط یا ٹکٹ محکمہ ڈاک کے حوالے کرنے کے بجائے براہ راست ہوائی جہاز کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں اور منزل پر اس کی ایجنسیاں پیکٹ کو وصول کر کے مکتوب الیہ کے دفتر میں دستی طور پر پہونچا دیتی ہیں۔ اس طرح نیویارک سے چلا ہوا خط ہم کو تین دن کے اندر ۲۵ نومبر کو دہلی میں وصول ہو گیا۔

دعوت نامہ کے ساتھ مجھ کو "جنرل انفارمیشن" کے جو کاغذات ملے تھے اس میں درج تھا:

Participants holding U.S. passports do not need a visa.

یعنی کانفرنس کے جو شرکا امریکہ کا پاسپورٹ رکھتے ہوں ان کے لیے ویزا کی ضرورت نہیں۔ "ہندستان" جیسے ملک کے لوگ جب باہر نکلتے ہیں تو ان کو ایک عجیب قسم کے بین اقوامی امتیاز کا تجربہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا کی قومیں دو قسم کے طبقات میں بٹ گئی ہیں۔ ایک دینے والی، اور دوسری لینے والی۔ دینے والی قوم کے افراد جب کسی غیر ملک میں جاتے ہیں تو ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لینے والی قوم کا فرد جب کسی غیر ملک میں جاتا ہے تو اس کو توحش کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اول الذکر کے لیے نسبتاً نرم قوانین ہیں اور ثانی الذکر کے لیے نسبتاً سخت قوانین۔ یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ ہندستان، اپنے بے شمار وسائل کے باوجود، ابھی تک دوسری قسم کے ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ جنیوا سے واپسی کے وقت ۱۰ دسمبر کو پیش آیا۔ روانگی کے وقت میں نے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل (جنیوا) کے رسپشن پر پوچھا کہ کیا یہاں سے جانے والے مسافروں پر کوئی ایرپورٹ ٹیکس ہے۔ رسپشن کے آدمی نے مسکرا کر جواب دیا:

No Airport tax here, that's only in India.

اگرچہ ایسا نہیں کہ ایرپورٹ ٹیکس صرف ہندستان میں ہو، مگر رسپشنسٹ نے جس معنی میں یہ بات کہی وہ صرف اس برصغیر کی خصوصیت ہے جس کا مجموعی نام ہندستان رہا ہے۔

دعوت نامہ کے ساتھ "جنرل انفاریشن" کے جو کاغذات آئے تھے۔ ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک ہدایت ان الفاظ میں درج تھی:

Please remember to bring a warm coat as you
know Geneva in December can be rather cold.

یعنی براہ کرم ایک گرم کوٹ لانا یاد رکھیے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ جنیوا دسمبر میں کافی ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اس بات کی آگاہی تھی کہ آپ "گرم ملک" سے نکل کر "سرد ملک" میں جا رہے ہیں۔ اس ہدایت کو میں نے پڑھا تو مجھے یاد آیا کہ اسی قسم کی اس سے سخت تر آگاہی وہ ہے جو ہر روز موت کے ذریعہ دی جا رہی ہے۔ موت ہر انسان کو خاموش زبان میں بتاتی ہے کہ تم بہت جلد "اپنی دنیا" سے نکل کر "خدا کی دنیا" میں داخل ہونے والے ہو۔ پہلے انتباہ پر ہر آدمی چوکنا ہو جاتا ہے، مگر دوسرے انتباہ پر کوئی چوکنا ہونے والا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں آدمی گرم ملک اور سرد ملک دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ جب کہ دوسری صورت کا معاملہ یہ ہے کہ اپنی دنیا تو ہر آدمی کو براہ راست دکھائی دے رہی ہے، اور خدا کی دنیا کسی کو براہ راست دکھائی نہیں دیتی۔

ایک مسلمان سے اس سفر کا ذکر ہوا۔ انھوں نے کہا کہ "آپ جنوا جا رہے ہیں۔ جنوا میں تو مسلمانوں نے ایک زمانہ میں حکومت کی ہے" میں نے کہا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے حال میں ایک کتاب میں اس کو پڑھا ہے۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر افضل اقبال (سابق پاکستانی سفیر) کی کتاب لائے

جس کا نام ہے (Islamization of Pakistan) اس کتاب میں فاطمی حکمرانوں کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۰ پر یہ فقرہ تھا :

Sicily for a time acknowledged the Fatimid sovereignty extended over Genoa.

(سسلی نے ایک وقت میں فاطمیوں کا اقتدار تسلیم کیا جو جنوا تک پھیلا ہوا تھا) میں نے کتاب کو دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ ڈاکٹر افضل اقبال نے جنوا (Genoa) کا ذکر کیا ہے۔ یہ جنوبی اٹلی کا ایک شہر ہے۔ جب کہ میرا سفر جنیوا (Geneva) کے لیے ہو رہا ہے جو سوئزرلینڈ میں واقع ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سسلی اور جنوبی اٹلی پر ایک زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت رہی ہے۔ مگر سوئزرلینڈ میں کبھی ان کی باقاعدہ حکومت قائم نہیں ہوئی ــــــ لفظی اشتراک سے بعض اوقات بڑی عجیب غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دہلی سے سفر کا آغاز برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۰ سے ہوا۔ یہ جہاز ہانگ کانگ سے آتا ہے اور دہلی ہوتے ہوئے لندن جاتا ہے۔ "ہم ایک لمبی پرواز پر روانہ ہو رہے ہیں۔ ۹ گھنٹہ کے بعد ہم لندن ایرپورٹ پر اتریں گے" اس اعلان کے ساتھ، دسمبر ۱۹۸۶ کی صبح کو ۳ بجے ہمارا جہاز فضا میں بلند ہوا۔ اس سفر کا بیشتر حصہ سونے میں گزرا، اس لیے سفر کی تکان کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ نیند بھی اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب نعمت ہے۔ جو لوگ پاگل ہوتے ہیں، اکثر اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ دنیا میں اگر سب کچھ ہو، صرف نیند اس سے اٹھالی جائے تو تمام انسان اپنا ذہنی توازن کھو دیں اور پوری دنیا ایک بہت بڑا پاگل خانہ بن کر رہ جائے۔

لندن ایرپورٹ سے اگلی فلائٹ پکڑنے کے لیے ٹرمنل نمبر ا پر جانا تھا۔ میں ایرپورٹ کی گاڑی سے روانہ ہوا تو وہاں میرے ساتھ چار آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ کسی مختلف زبان میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ کون سی زبان بول رہے ہیں۔ انھوں نے جو جواب دیا وہ مجھے "جومن" سنائی دیا۔ پہلی بار میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے دہرایا تو میں سمجھا کہ وہ جرمنی کے رہنے والے ہیں اور جرمن زبان بول رہے

رہے ہیں ۔

اسی کا نام لہجہ کا فرق ہے ۔ ہر گروہ کا لہجہ الگ الگ ہوتا ہے ۔ اس لیے الفاظ کی ادائگی میں ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہوجاتا ہے ۔ اسی ایک لفظ کو کوئی جرمن کہتا ہے ، کوئی جومن ، کوئی جمن ۔ مگر معنوی اعتبار سے سب کی مراد ایک ہوتی ہے ۔ اسی کی روشنی میں اس حدیث کا مطلب سمجھا جاسکتا ہے جس میں آیا ہے کہ قرآن سات حرفوں میں اترا ہے ۔ یہاں "سات" سے مراد تعدد ہے ۔ یعنی الفاظ کی ادائگی (لہجہ) کے اعتبار سے قرأت قرآن کے کئی طریقے ہیں ۔

یہ حدیث دراصل اسلام کی عالم گیریت کو بتاتی ہے ۔ اس ارشاد سے رسول اللہؐ کا مطلب یہ تھا کہ اسلام صرف مذہبی پیشواؤں (کلرجی) کا مذہب نہ ہوگا اور نہ وہ کسی ایک قوم میں محدود رہے گا ۔ وہ عمومی سطح پر پھیلے گا اور مختلف قبیلے اور قومیں اس کو قبول کریں گی ۔ اس لیے بالکل قدرتی بات ہے کہ لہجات کے اختلاف کی وجہ سے اس کی ادائگی کے کئی طریقے ہوجائیں ۔

لندن سے جنیوا کا سفر برٹش ایرویز کی فلائٹ نمبر ۶۲۲ کے ذریعہ ہوا ۔ جہاز میں مشہور ہفتہ وار اکانومسٹ (The Economist) کا شمارہ ۶ دسمبر ۱۹۸۶ پڑھا ۔ اس میں ایک مضمون ایران ۔ عراق کے مسئلہ کے بارہ میں تھا ۔ اڈیٹر نے مختلف وجوہ بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ ایران کا مسئلہ مغرب کے لیے بے حد اہمیت رکھتا ہے ۔ ایران کے مقابلہ میں عراق کی انسانی طاقت صرف ایک تہائی ہے ۔ اس لیے یہ بظاہر ناممکن ہے کہ عراق اس جنگ سے فاتح ہوکر نکلے ۔ مزید یہ کہ جنگ ہمیشہ نہیں رہ سکتی ۔ وہ کبھی نہ کبھی ختم ہوگی ۔ آنے والے وقت کے پیش نظر مغرب کو ضرورت ہے کہ وہ ایران کے بارہ میں اپنی پالیسی پر ٹھنڈے طریقے سے غور کرے :

That is why the west needs to be thinking coolly about an Iran policy.

زندہ لوگ دشمنی کے ساتھ دوستی کرنا بھی جانتے ہیں ۔ جب کہ مردہ لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک رخ پر چل پڑیں تو اس سے پھرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا ۔

جہاز کے اندر برٹش ایرویز کا ماہانہ میگزین ہائی لائف (Highlife) تھا ۔ اس

کے نیچے حسب معمول یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

Your personal copy to take away.

یہ دسمبر ۱۹۸۶ کا پرچہ تھا جو آرٹ پیپر کے ڈیڑھ سو صفحات پر نہایت عمدہ چھپا ہوا تھا۔ مگر وہ مفت دیا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دراصل میگزین نہیں بلکہ ایک قسم کا اشتہار نامہ ہے۔ پورا پرچہ اشتہارات سے بھرا ہوا تھا۔ تاہم انھوں نے پرچہ پر "ہمارا تحفہ" کا لفظ نہیں لکھا، بلکہ "آپ کی اپنی کاپی" لکھا۔ یہ وہ تجارتی زبان ہے جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوئی ہے۔ جدید تجارتی اصول یہ ہے کہ "میں" کو حذف کرکے "آپ" کا استعمال کیا جائے ہر آدمی کو طبعاً اپنی ذات سے دل چسپی ہوتی ہے، دوسرے سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ تجارت کی کامیابی اسی نفسیات کو استعمال کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایک تاجر نے کہا کہ تجارت میں سب سے کم اہم لفظ "میں" ہے اور سب سے زیادہ اہم لفظ "آپ"۔

دنیا کا نقشہ اپنے سامنے رکھیے تو دہلی سے یورپ کی طرف جاتے ہوئے جنیوا پہلے نظر آئے گا اور لندن اس کے بعد۔ گویا دہلی سے لندن جا کر جنیوا آنے کے لیے ہمیں دوبارہ پیچھے کی طرف سفر کرنا پڑا۔

اس کی وجہ "کنکٹنگ فلائٹ" کا مسئلہ ہے۔ دہلی سے جنیوا کے لیے براہ راست پرواز نہیں ہے۔ اگر آپ قریبی راستہ سے دہلی سے جنیوا کے لیے روانہ ہوں تو راستہ میں جہاں آپ جہاز بدلیں گے وہاں سے فوری طور پر آپ کو دوسرا جہاز نہیں ملے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اگلے جہاز کے انتظار میں آپ کو درمیانی ہوائی اڈہ پر لمبی مدت تک پڑے رہنا ہوگا۔ مگر لندن دنیا کا سب سے بڑا ہوائی مرکز ہے۔ یہاں سے ہر جگہ کے لیے کم سے کم وقت میں جہاز مل جاتے ہیں۔ دہلی سے سیدھے راستہ کے ذریعہ جنیوا جانے میں ہمیں زیادہ وقت لگتا۔ جب کہ لندن کے راستہ سے جانے میں نسبتاً کم وقت لگا۔ لینن نے کہا تھا کہ "ہندستان کا وہ راستہ قریب ہے جو لندن ہو کر جاتا ہے" اسی طرح ہمارے لیے جنیوا کا وہ راستہ زیادہ قریب تھا جو لندن ہو کر گیا ــــــ کبھی دور کا راستہ قریب ہوتا ہے، اور قریب کا راستہ دور ہو جاتا ہے۔

لندن میں شہر کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ البتہ ہوائی جہاز میں اڑتے ہوئے پورے

لندن کا منظر صاف دکھائی دیا۔ لندن میں ۱۶۶۶ میں زبردست آگ لگی تھی۔ اس میں لندن کا دو تہائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ ۸۷ گرجا گھر بالکل کھنڈر ہو گیے۔ اس کے بعد بعض ماہرین تعمیر نے یہ نقشہ بنایا کہ لندن کی نئی تعمیر میں اس کی سڑکیں زیادہ چوڑی کر دی جائیں۔ مگر مالکان زمین کو معاوضہ دینے کے لیے اس وقت ضروری رقم حکومت کے پاس موجود نہ تھی۔ اس لیے اس منصوبہ پر صرف جزئی عمل ہو سکا۔ تاہم گرجا گھروں کی نئی تعمیر پر اہل لندن نے زبردست طاقت خرچ کی۔ سینٹ پال کے عظیم گرجا گھر کی تعمیر ثانی میں پورے ۳۵ سال لگ گیے۔ وہ ۱۷۱۱ میں دوبارہ بن کر مکمل ہوا۔ تاہم یہ تین سو سال پہلے کی بات ہے۔ آج کے لندن میں گرجا (چرچ) کے مقابلہ میں دوسری چیزیں زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہیں۔

تازہ اطلاعات کے مطابق برطانیہ میں ۱۷۵۰۰ سکھ آباد ہیں اور پورے ملک میں ان کے تقریباً ۱۵۰ گوردوارے ہیں۔ ہندو مذہب کو ماننے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۵۰ ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ برطانیہ میں انھوں نے بھی تقریباً ۱۵۰ مندر بنائے ہیں۔ ہندو مراکز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائگی کے علاوہ سماجی اور تہذیبی خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

برطانیہ میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۵ لاکھ ہے جس میں زیادہ تعداد پاکستان اور بنگلہ دیش کے باشندوں کی ہے۔ لندن ایرپورٹ کی ایک ملازم خاتون مجھے "مسلمان" صورت دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس نے اپنا نام ماریہ بیگ بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ اصلاً پرتگالی ہے۔ اس نے اسلام قبول کر کے مسٹر بیگ سے نکاح کر لیا ہے۔ مسٹر بیگ پاکستانی ہیں۔ اور لندن میں بحیثیت انجینیر کام کرتے ہیں۔ برطانیہ میں تقریباً ایک ہزار مسجدیں ہیں۔ لندن میں بہت بڑا اسلامک سینٹر اور مسجد ہے۔ اس کی شاندار تصویر الدعوۃ (ریاض) ۸ دسمبر ۱۹۸۶ کے ٹائٹل کے آخری صفحہ پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۷ دسمبر کی دوپہر کو ہم جنیوا اتر گیے۔ یہاں ایرپورٹ پر ایک عجیب قصہ پیش آیا۔ توقع کے مطابق وہاں کانفرنس کے منتظمین کو ڈبلو سی آر ایل (WCRL) کا کارڈ لے کر موجود رہنا چاہیے تھا تاکہ میں فوراً انھیں پالوں اور وہ ہوٹل تک میری رہنمائی کر سکیں۔ مگر جب میں ایرپورٹ سے باہر آیا تو وہاں اس قسم کی کوئی علامت مجھے نظر نہ آئی۔ کچھ دیر کے لیے میں عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ ایک صاحب سے ذکر کیا تو انھوں نے ایرپورٹ سے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کو ٹیلی فون کیا۔

ہوٹل والوں نے بتایا کہ یہاں سے کئی آدمی ریسیو کرنے کے لیے جا چکے ہیں۔ آپ دوبارہ انھیں ایرپورٹ پر تلاش کریں۔ اس کے بعد مزید چل کر دیکھا تو وہ وہاں کارڈ لیے ہوے میرے انتظار میں موجود تھے۔

قصہ یہ تھا کہ وہ لوگ دوسرے گیٹ پر تھے اور میں ایک اور گیٹ سے باہر آیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک مقام پر اپنے مطلوب کو نہ پاکر مایوس ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ تلاش کرے تو وہ پائے گا کہ اس کا مطلوب دوسرے مقام پر خود اس کے انتظار میں کھڑا ہوا ہے۔

جنیوا میں میرا قیام انٹر کانٹی نِنٹل ہوٹل میں تھا۔ میرے کمرہ کا نمبر ۵۲۱ تھا۔ ہوٹل میں جو پبلسٹی لٹریچر رکھا ہوا تھا، اس میں کافی لٹریچر عربی میں بھی نظر آیا " سویسرا " نام کی ایک مکمل گائڈ بک عربی زبان میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ مختلف کاغذات پر عربی زبان میں اندراجات نظر آئے۔ مثلاً ایک دو ورقہ میں ہوٹل کا تعارف کرایا گیا تھا۔ اس میں لکھا ہوا تھا: اکثر من ۸۰ فندق فخم حول العالم (ساری دنیا میں ہمارے ۸۰ سے زیادہ بڑے ہوٹل ہیں) کمرہ کے باتھ روم میں پلاسٹک کی ایک تھیلی میں نہانے کی ٹوپی (Shower cap) رکھی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر مختلف زبانوں میں اندراجات تھے، اسی کے ساتھ اس پر عربی میں غطاء للرأس بھی لکھا ہوا تھا۔ کمرہ میں لمبے شیشے کی کھڑکی پر عربی میں لکھا ہوا تھا:

یرجی قفل النافذة عند تشغیل تکییف الهواء مع الشکر

براہ کرم ایرکنڈیشنر چلانے کے وقت کھڑکی کو بند رکھیں۔ جنیوا میں عرب لوگ کافی آتے ہیں۔ یہ عربیت اسی کی بنا پر ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں ایک بہت عمدہ چھپا ہوا جرنل تھا۔ جس میں تصویروں کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ اس ہوٹل کو کس قسم کے لوگوں کی میزبانی کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ان شخصیتوں میں وزیر اعظم ہندستان راجیو گاندھی، صدر انڈونیشیا جنرل سوہارتو، سلطان بن عبد العزیز (سعودی عرب) اور دوسری بہت سی ممتاز شخصیتوں کے نام شامل تھے۔

یہ ہوٹل مختلف طریقوں سے اپنے اعلیٰ میزبانوں کو متاثر کرتا ہے۔ مثلاً اس کے ایک باتصویر نوٹ میں بتایا گیا تھا کہ جرمنی کا ایک ممتاز شخص (Udo Lattek) اپنی پارٹی کے ساتھ

اس ہوٹل میں ٹھہرا۔ اتفاق سے انہیں تاریخوں میں اس آدمی کی برتھ ڈے تھی۔ ہوٹل والوں نے عین اس تاریخ کو اچانک برتھ ڈے کا کیک اس کو پیش کرکے اسے حیرت میں ڈال دیا :

The Management surprised him with a birthday cake.

تاجر اپنی تجارت میں اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ وہ یک طرفہ اخلاقیات کے ذریعہ اپنے گاہک کے دل کو جیت لے ۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دعوت حق کا بھی ہے ۔ حق کے داعی کو بھی یک طرفہ عمل کے ذریعہ مدعو کے دل کو جیتنا پڑتا ہے ۔ اس کے بغیر کسی کے اندر وہ گہرا تاثر پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک آدمی کو اپنے راستہ کی تبدیلی پر مجبور کر دے ۔

" سوئزرلینڈ " کے نام سے غالباً سب سے پہلے میں اس وقت واقف ہوا جب کہ ابھی میری کم عمری کا زمانہ تھا اور میرے گھر والوں نے مجھے ایک آٹومیٹک گھڑی پہننے کے لیے دی ۔ اس پر سوئس گھڑی (Swiss Watch) لکھا ہوا تھا۔ اس سے میرے ذہن پر یہ تصور قائم ہوا کہ سوئزرلینڈ گھڑیوں کا ایک ملک ہے ۔ مگر بعد کی معلومات نے صرف جزئی طور پر اس کی تصدیق کی ۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سوئزرلینڈ اسی درجہ میں گھڑیوں کا ملک ہے جس درجہ میں عرب اونٹوں یا کھجوروں کا ملک ۔

میری یہ گھڑی کنجی دیئے بغیر اپنے آپ چلتی تھی ۔ اپنی کم عمری کی بنا پر اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ وہ شاید نبض کی حرکت سے چلتی ہے ۔ یہ غلط فہمی اس وقت رفع ہوئی جب کہ کچھ عرصہ بعد گھڑی بند ہو گئی ۔ اس وقت میں نے اس کو ایک گھڑی ساز کو صفائی کیلئے دیا ۔ اس نے کھول کر دکھایا کہ گھڑی کے اندر ایک خاص طرح کا پہیہ نما پرزہ ہے جو ایک تہائی کے بقدر کٹا ہوا ہے ۔ یہ پہیہ ہاتھ کی حرکت سے برابر گھومتا رہتا ہے اور گھڑی کو کوک دیتا رہتا ہے ۔ اس پرزہ کو روٹر (Rotor) کہا جاتا ہے ۔ یہ آٹومیٹک گھڑی کی قدیم تکنیک تھی ۔ اب نئے قسم کی آٹومیٹک گھڑیاں بازار میں ملنے لگی ہیں۔ کم عمری کے اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیدیا کہ کسی چیز کے بارہ میں محض قیاس سے کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے ۔ صحیح رائے وہ ہے جو مکمل معلومات کی بنیاد پر قائم کی جائے ۔

سوئزرلینڈ کے ایک شہر لی لاکل (Le Locle) کے چوراہہ پر ایک نوجوان کا اسٹیچو لگا ہوا ہے ۔ یہ ڈینیل جین ریچرڈ (Daniel Jean-Richard) کا اسٹیچو ہے ۔ وہ ۱۶۷۲ میں پیدا ہوا ۱۷۴۱ میں اس کی وفات ہوئی ۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار گھوڑے کا ایک انگریز تاجر ادھر سے گزرا

اس نے مذکورہ نوجوان کے والد کو اپنی ٹوٹی ہوئی گھڑی مرمت کے لیے دی۔ نوجوان نے منت سماجت کر کے یہ گھڑی اس سے مانگ لی۔ اس چھوٹی سی مشین سے اس کو اتنی دل چسپی ہوئی کہ وہ ایسی ہی ایک نئی مشین بنانے میں لگ گیا۔ ۱۸ مہینے کی لگاتار محنت کے بعد اس نے ویسی ہی ایک نئی گھڑی بنالی۔ اس طرح ۱۷۰۵ میں باقاعدہ طور پر سوئزرلینڈ میں گھڑی کی صنعت قائم ہوئی۔ یعنی عین اس وقت جب کہ ہندستان میں اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت (۱۷۰۷-۱۶۵۸) کا آخری زمانہ تھا۔ مذکورہ نوجوان اگرچہ "ترقی یافتہ سوئزرلینڈ" کو دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا، مگر ایک شخص کی قربانی اور ہوش مندی نے پوری قوم کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔

اب اسی معاملہ میں اس کے برعکس مثال لیجئے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند (Discovery of India) میں لکھا ہے کہ ہندستان کے مغل امرا بہ کثرت گھڑیاں استعمال کرتے تھے۔ پرتگالی، اور بعد میں انگریز ہندستان میں یہ گھڑیاں لاتے تھے۔ گھڑیوں کا استعمال مغل امرا کے تکلفات میں شامل تھا۔ تاہم اس وقت کے ہندستان میں نہ کسی نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ کمانی کی گھڑیاں (Spring clocks) جو یورپی تاجر ہندستان میں لاکر فروخت کرتے ہیں، وہ کیسے بنتی ہیں نہ ایسی گھڑیاں کبھی یہاں بنائی گئیں۔ مغل دور کے ہندستان میں میکانکی رجحان (Mechanical bent) کی یہ کمی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ (صفحہ ۲۶۱)

سوئزرلینڈ ارباب سرمایہ کی پناہ گاہ ہے۔ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں کھاتہ کھولنے کے لیے وہ پابندیاں نہیں ہیں جو دوسرے ملکوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں ہر آدمی کھاتہ کھول سکتا ہے، خواہ وہ سوئزرلینڈ کا شہری ہو یا نہ ہو۔ مزید یہ کہ یہاں خفیہ کھاتے کھولنے کے نہایت وسیع امکانات ہیں۔ یہاں کے بینکوں میں ایسے کھاتے کھولنے کی سہولت ہے جن سے مطلوبہ رقم صرف خفیہ نمبر یا لفظ بتا کر نکالی جا سکتی ہے۔ ان خفیہ کھاتوں کا علم بینک کے اسٹاف کے دو افراد کو ہوتا ہے۔ دو افراد اس لیے تاکہ اگر ایک شخص موجود نہ ہو تو دوسرا شخص فوراً اس کی تعمیل کر سکے۔

اس نظام نے دنیا بھر کے ارباب دولت (بادشاہوں، سیاسی لیڈروں، صنعت کاروں وغیرہ) کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں بھاری رقم کے خفیہ کھاتے کھول سکیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ سوئزرلینڈ کے بینکوں میں جمع شدہ ہندستانی باشندوں کی رقوم تقریباً

ساڑھے تیرہ ارب روپے تک پہونچ چکی ہیں۔

سوئزرلینڈ کے خفیہ کھاتے ناجائز دولت جمع کرنے کا محفوظ ترین ذریعہ بن گیے ہیں۔ ان کھاتوں کے ذریعہ جاسوسوں اور تخریب کاروں کو رقمیں فراہم کی جاتی ہیں۔ اخبارات میں یہ خبر آئی تھی کہ ۱۹۸۵ میں ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں ۱۲ ملین ڈالر جمع کیے اور اس کے ذریعہ سے خفیہ طور پر امریکی ہتھیار خریدا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امریکی ہتھیار اسرائیل کے راستہ سے ایران پہونچے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۳ نومبر ۱۹۸۶، صفحہ ۱۶)

ہمارے جہاز میں دوسرے اخبارات ورسائل کے ساتھ امریکہ کا ٹائم میگزین بھی موجود تھا۔ ٹائم نے پچھلے ۷اسال میں "۴۷ کور اسٹوری" چھاپی ہے۔ اس کی اشاعت ۸ دسمبر ۱۹۸۶ میں اس کی ۴۷ ویں کور اسٹوری تھی۔ یہ ایران کے لیے امریکی ہتھیار کی سپلائی کے بارہ میں تھی اور اس کا عنوان تھا:

A scandal involving arms for Iran

ٹائم کی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایران نے سوئزرلینڈ کے بینکوں میں خفیہ کھاتے کھول رکھے ہیں۔ ان کے ذریعہ وہ مغربی ملکوں سے بھاری قیمت دے کر ہتھیار خریدتا ہے۔ ٹائم کے مطابق، اس دوران اسرائیل نے ایران کے ہاتھ ۴۲ ملین ڈالر کے امریکی ہتھیار فروخت کیے۔ یہ ہتھیار امریکہ کی اصل قیمت کے لحاظ سے ۱۲ ملین ڈالر کے تھے۔ اس طرح اسرائیل نے تقریباً ۲۵۰ فی صد زیادہ قیمت وصول کی۔ اسرائیل نے اصل رقم (Exact amount) امریکہ (سی آئی اے) کو ادا کی اور باقی رقم خود رکھ لی:

Israel sold Iran $ 12 million worth of weapons at a price that included a mark-up as high as 250%, or $ 42 million (p 20).

جنیوا کی جس عمارت میں ایران نے ہتھیاروں کا یہ معاملہ کیا، اس کی تصویر ٹائم (۱۵ دسمبر ۱۹۸۶) صفحہ ۱۳ پر دیکھی جاسکتی ہے۔

ایران کے اپنے اعلان کے مطابق امریکہ اور اسرائیل دونوں عالم اسلام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ان عظیم تر دشمنوں سے امام خمینی کا اتحاد ہوجاتا ہے، مگر عراق کے صدام حسین سے ان کا

اتحاد نہیں ہو سکتا، جب کہ وہ خود صلح کی اور اتحاد کی پیش کش کر رہا ہو۔ کیسا عجیب ہے وہ اسلام جو موجودہ زمانہ کے مجاہدین اسلام کے حصہ میں آیا ہے۔

۱۹۸۲ میں سوئزرلینڈ کے ۲۷۵ بینکوں میں جو رقم جمع تھی، وہ ہندستانی سکہ میں 305,000 کرور روپئے ہوتی ہے (ریڈرز ڈائجسٹ، فروری ۱۹۸۴)

سوئزرلینڈ کا ایک طبقہ بینکوں میں خفیہ کھاتے رکھنے کے خلاف ہے۔ کیوں کہ اس سے ظالم حکمراں اور غلط ذرائع سے دولت حاصل کرنے والے دوسرے لوگ اپنی دولت کو چھپا کر دوبارہ اس کو باعزت طور پر استعمال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ایک سوشل ڈیموکریٹ نے بینک رازداری کو ختم کرنے کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ کالا دھن ہمارے بینکوں کے علی بابا کے کھوہ میں غائب ہو جاتا ہے اور پھر وہ جائز دولت بن کر باہر آتا ہے تاکہ اس کو حسب منشا استعمال کیا جا سکے :

Black money disappears into the Ali Baba caves of our banks and emerges respectably white and ready for investment.

سوئزرلینڈ یورپ کا ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہے۔ اس کو ساحل سمندر بھی حاصل نہیں۔ مگر سوئزرلینڈ کو اس کی کمیوں نے عمل کا مزید حوصلہ دیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، خام مواد سے محرومی نے سوئزرلینڈ کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے اپنی محنت سے اپنے یہاں نہایت اعلیٰ اور معیاری صنعتی بنیاد تعمیر کر لی۔ حتی کہ وہ یوروپ میں فی کس سب سے زیادہ آمدنی کا ملک بن گیا :

Undismayed by a lack of raw material, the Swiss have constructed a high-quality, high-technology industrial base for Europe's highest per capita income.

سوئزرلینڈ میں چار زبانیں (جرمن، فرنچ، اٹالین، رومانش) رائج ہیں۔ یہاں غیر ملکی کارکنوں کی تعداد نصف ملین ہے (کل تعداد کا ۱۷ فی صد) سوئزرلینڈ کی کل آبادی تقریباً ۶۳ لاکھ ۵۰ ہزار ہے۔ صد فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

جنیوا زیادہ بڑا شہر نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو پیدل چل کر اس کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچ سکتے ہیں۔ بظاہر دیکھنے میں بھی وہ بہت زیادہ عظیم نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کی تاریخ نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اکثر بین اقوامی اہمیت کے

واقعات جنیوا میں پیش آئے۔

جنیوا، سری نگر کی مانند پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع ہموار میدان میں آباد ہے۔ وہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے یوروپ کا ایک ممتاز شہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ ۱۱۰ مربع میل (۲۸۰ کلومیٹر) ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۲۰۳ ہزار ہے۔ جنیوا کی معاشی اور تہذیبی اہمیت اپنے رقبہ سے بہت زیادہ ہے۔ سولھویں صدی تک جنیوا تنزل کا شکار رہا۔ اس کے بعد ۱۵۳۰ سے اٹلی، جرمنی، فرانس وغیرہ ملکوں کے نکلے ہوئے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے۔ اس سے جنیوا کو نیا خون (New blood) ملا اور اس کی ترقیاں شروع ہوئیں۔ ان لوگوں نے غیر معمولی محنت سے یہاں گھڑی سازی، پرنٹنگ اور دوسرے صنعتی میدانوں میں ملک کو آگے بڑھایا ———

ہر قوم کی ترقی کے لیے " نیا خون " درکار ہوتا ہے، خواہ یہ نیا خون اندر سے حاصل ہو یا باہر سے۔

عیسائیت میں ریفارمیشن کی تحریک نے جنیوا میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ اس شہر کو پروٹسٹنٹ روم (Protestant Rome) کہا جانے لگا۔ جنیوا کی مقامی آبادی میں پروٹسٹنٹ لوگ کسی قدر زیادہ ہیں۔ مگر مجموعی آبادی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک تقریباً نصف نصف ہیں۔ جنیوا میں میں نے بعض پروٹسٹنٹ چرچ اندر سے دیکھے۔ وہ کیتھولک چرچ کے برعکس، بالکل سادہ تھے۔ جیسے مسلمانوں کی مسجدیں سادہ ہوتی ہیں۔

جنیوا کو ایک بین اقوامی شہر (International city) کہا جاتا ہے۔ یہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ بین اقوامی اداروں کے صدر دفتر ہیں۔ اور اکثر بین اقوامی اداروں کی شاخیں موجود ہیں۔ جنیوا کو بین اقوامی حیثیت دینے میں اس کا بھی دخل ہے کہ یہاں تقریباً ۳۵ فی صد بیرونی افراد آباد ہیں۔ اس واقعہ نے جنیوا کو ایک قسم کی عالمی حیثیت دیدی ہے۔ فرانس کے سیاست داں ٹالی رینڈ (Talleyrand) نے کہا تھا کہ دنیا میں پانچ براعظم ہیں اور پھر جنیوا ہے:

There are five continents, and then there is Geneva.

جنیوا میں دور جدید کے بعض انتہائی بڑے مفکر پیدا ہوئے۔ مثلاً روسو اور والٹیر۔ اس بنا پر جنیوا کو یہ حیثیت بھی حاصل ہوئی کہ وہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

دور اول میں مسلمان جب اسپین کے راستہ سے یورپ میں داخل ہوئے تو وہ بیش قدمی

کرتے ہوئے سوئزرلینڈ تک پہونچ گیے۔ اسپین اور سسلی اور جنوبی اٹلی اور جنوبی فرانس میں انھوں نے باقاعدہ حکومتیں قائم کریں۔ تاہم سوئزرلینڈ میں اس قسم کی کوئی حکومت قائم نہ ہو سکی۔

سوئزرلینڈ میں عرب مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں قدیم عربی کتابوں میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ معلومات ان کتابوں میں ہیں جو عیسائی حضرات نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں لکھی ہیں۔ امیر شکیب ارسلان (۱۹۴۶ - ۱۸۶۹) جرمن اور فرانسیسی زبان جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا۔ نیز انھوں نے ان یورپی علاقوں کے سفر کیے۔ اس کے بعد انھوں نے اس موضوع پر تین سو صفحات کی ایک کتاب (۱۳۵۲ھ) عربی زبان میں لکھی ہے جس کا نام یہ ہے :

تاریخ غزوات العرب فی فرنسا وسویسرا وایطالیا وجزائر البحر المتوسط

امیر شکیب ارسلان کی اس کتاب میں دوسری معلومات کے علاوہ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے اس میں ایک جرمن کتاب کا خلاصہ شامل کر دیا ہے جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا جرمن نام یہ ہے :

Der einfall der Sarazenenen in die Schweiz,
Von dr Ferdinand Keller

سوئس انسائکلوپیڈیا *(Dictionnaire historique et biographique de la Suisse)* میں سراسین (Saracen) کے باب کے تحت بھی عربوں کے سوئزرلینڈ میں داخلہ کی بابت کافی معلومات درج ہیں۔ سوئزرلینڈ میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۳۰۰۰۰۰ ہے۔

امیر شکیب ارسلان نے اپنی تحقیق کے دوران خود سوئزرلینڈ کا سفر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ سوئزرلینڈ کے شہر سیون (Sion) گیے۔ وہاں سے دریافت کرتے ہوئے وہ ایک گاؤں میں پہونچے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں ایک بوڑھے واقف کار شخص نے انھیں بتایا کہ ہم سنتے آئے ہیں کہ اس گاؤں کے تمام باشندے یا کم از کم ان میں سے کچھ عرب نسل سے ہیں (ان اهالی هذه القرية اوبعضهم علی الاقل هم من اصل عربی، صفحہ ۲۷۹) اس نے مزید بتایا کہ اس طرح کی اور بستیاں بھی سوئزرلینڈ میں پائی جاتی ہیں۔ سوئزرلینڈ کے بعض مقامات کے نام اب بھی عربی انداز

پر ہیں۔ مثلاً علی العین (Allalin) اور الماجل (Almagell) وغیرہ۔

مغربی مورخین نے اپنی کتابوں میں عربوں کے سوئزرلینڈ میں داخلہ کی یہ تصویر پیش کی ہے کہ وہ یہاں لوٹ مار کرنے آتے تھے۔ چنانچہ خود امیر شکیب ارسلان نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس طرح کے عنوانات قائم کیے ہیں ——— نزول العرب فی بروفانس وغاراتھم من ھنالک علی سافوای وبییمونت، سویسرة، غارات العرب علی سویسرة فی اواسط القرن العاشر۔

پروفیسر ہٹی نے اپنی کتاب (تاریخ عرب) میں سوئزرلینڈ میں قدیم مسلمانوں کے داخلہ کے بارہ میں ایک پیراگراف لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اغالبہ اپنی پیش قدمی کے دوران صرف اٹلی کے ساحل تک نہیں رکے۔ ۸۶۹ء میں انھوں نے مالٹا کو فتح کرلیا۔ اٹلی اور اسپین سے ان کے حملے دسویں صدی میں الپائن کے دروں کے ذریعہ وسط یورپ تک پہونچے تھے۔ الپ کے علاقہ میں متعدد عمارتیں اور دیواریں ہیں جن کو سیاحوں کی گائڈ بک قدیم مسلمانوں کے حملوں سے منسوب کرتی ہیں۔ سوئزرلینڈ میں کچھ جگہوں کے نام عرب اصل سے تعلق رکھنے والے نظر آتے ہیں، مثلاً گابی اور الگابی جو بظاہر الجابی (محصل) کی بدلی ہوئی صورت ہے:

> The Aghlabids did not limit their operations to the Italian coasts. In 869 they captured Malta. From Italy and Spain piratical raids in the tenth century extended through the Alpine passes into mid-Europe. In the Alps are a number of castles and walls which tourists' guides attribute to the invasion of the Saracens. Certain Swiss place-names, such as Gaby and Algaby (al-jabi?, tax collector) which appear in Baedeker's Switzerland, may possibly be of Arabic origin.
> Philip K. Hitti, *History of The Arabs*,
> Macmillan, London, 1968, p. 605

مسلمان اغالبہ اور فاطمیہ کے دور میں سوئزرلینڈ میں داخل ہوئے۔ مگر یہاں ان کی کبھی حکومت قائم نہ ہوسکی۔ اگرچہ بعض مسلم مصنفین نے یہاں قیام حکومت کا دعوی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب تعارف اسلام *(An Introduction to Islam)* میں لکھا ہے کہ عباسی دور میں تیونس کے گورنر کو دعوت دی گئی کہ وہ سسلی کی خانہ جنگی میں مداخلت کرے۔ اس کے بعد تیونس کے مسلم گورنر نے جزیرہ سسلی پر قبضہ کرلیا۔ مزید وہ اٹلی کے بڑے حصہ پر بھی قابض ہوگیا۔ حتی کہ مسلمان

پیش قدمی کرتے ہوئے روم کی دیواروں تک پہونچ گیے۔ اس زمانہ میں فرانس کا جنوبی حصہ اور اسی کے ساتھ سوئزرلینڈ کا قابلِ لحاظ حصہ بھی مسلم سلطنت میں شامل کرلیا گیا:

The south of France was annexed as also a considerable part of Switzerland (p. 246).

مگر سوئزرلینڈ کے بارہ میں یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔

دسمبر ۱۹۳۱ میں ایک سفر کے دوران مہاتما گاندھی جنیوا آئے تھے۔ انھوں نے وکٹری ہال (Victory Hall) میں ایک تقریر کی۔ اس کا موضوع تھا: سچائی خدا ہے (Truth is God) اس کا ذکر کرتے ہوئے لوئی فشر نے لکھا ہے کہ لامذہب قسم کے لوگ گھنٹوں تک ان پر سوالات کی بوچھار کرتے رہے۔ مگر مہاتما گاندھی نے کامل سکون کے ساتھ ان کا جواب دیا، ان کے چہرہ کی ایک رگ بھی حرکت میں نہیں آئی:

He was heckled for hours by atheists and others. He answered them in perfect calm, not a muscle of his face twitching.
Louis Ficher, *The Life of Mahatma Gandhi*
Harper Row, New York, 1983, p. 293

موجودہ زمانہ کے بے شمار مسلم لیڈروں میں سے کسی ایک کے یہاں بھی برداشت کی یہ مثال نہیں ملتی، یہی وجہ ہے کہ کسی ایک مسلم لیڈر نے بھی وہ کامیابی حاصل نہیں کی جو مہاتما گاندھی نے موجودہ زمانہ میں حاصل کی۔

سوئزرلینڈ کی ایک مشہور گھڑی ہے جس کا نام رولکس (Rolex) ہے۔ اس کا اشتہار ایک میگزین میں نظر سے گزرا۔ اشتہار میں گھڑی کے ساتھ ایک فلم پروڈیوسر (Placido Domingo) کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ گھڑی میرے لیے بہترین ہے۔ کیوں کہ میرے طریقہ کے برعکس اس کو کبھی آرام کی ضرورت نہیں:

Because, unlike me, Rolex never needs a rest.

گھڑی ایک بہت چھوٹی چیز ہے، مگر وہ ایک بہت بڑی چیز کی یاد دلاتی ہے۔ اور وہ خدا کا عظیم الشان نظام ہے۔ زمین ہر لمحہ گھومتی ہے، وہ کبھی آرام نہیں کرتی۔ اسی طرح اس دنیا کی تمام

چیزیں ہر آن متحرک ہیں تاکہ وہ انسان کی ضروریات پوری کریں۔ انسان جب سوتا ہے اس وقت بھی کائنات کا کارخانہ اس کے لیے چلتا رہتا ہے اور جب جاگتا ہے اس وقت بھی۔ انسان کو خبر ہو یا نہ ہو وہ اپنے آپ مسلسل حرکت میں ہے تاکہ انسان کی تمام ضرورتیں فراہم کرے۔ کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس نے اس عجیب "کائناتی گھڑی" کو بنا کر کھڑا کر دیا۔

کانفرنس میں مختلف ملکوں کے تقریباً ۴۰ آدمی شریک ہوئے۔ ہر مذہب کے نمائندہ نے اپنے مذہب میں مذہبی آزادی کی اہمیت بتائی۔ پھر مختلف ملکوں میں مذہبی آزادی کی عملی صورت حال پر اظہار خیال ہوا۔ اس کے بعد یورپ، ایشیا، افریقہ، امریکہ کے الگ الگ گروپ بنائے گئے۔ ہر گروپ نے اپنے اپنے براعظم کے اعتبار سے مذہبی آزادی کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا۔ اس تبادلہ خیال کا خلاصہ ایک مختصر رپورٹ کی صورت میں کانفرنس کے عام اجتماع میں پیش کیا گیا۔

موجودہ زمانہ ایک اعتبار سے اجتماعات اور کانفرنسوں کا زمانہ ہے۔ دنیا بھر میں ہر روز مختلف قسم کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں مسلمانوں کی دینی شخصیتوں کو بھی مدعو کیا جاتا ہے مگر مسلمانوں کی دینی شخصیتیں عام طور پر صرف مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حتیٰ کہ بیرونی ملکوں میں ان کے اسفار بھی صرف وہاں کے بسنے والے مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

راقم الحروف کے ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس کو مسلمانوں کے علاوہ بار بار غیر مسلم صاحبان کے اجتماعات میں شرکت اور خطاب کے مواقع ملے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ اجتماعات یہ ہیں:

۱۔	آل مذاہب کانفرنس	بجنور	نومبر ۱۹۵۹
۲۔	وشو دھرم سمیلن	الٰہ آباد	مئی ۱۹۶۰
۳۔	ورلڈ فیلوشپ آف ریلیجنز	نئی دہلی	فروری ۱۹۶۵
۴۔	انٹرنیشنل سیمینار آن ریلجن	نئی دہلی	دسمبر ۱۹۷۳
۵۔	مسلم کرسچین ڈائیلاگ	طرابلس (لیبیا)	فروری ۱۹۷۶
۶۔	اسمبلی آف دی ورلڈ ریلیجنز	نیویارک (امریکہ)	نومبر ۱۹۸۵
۷۔	کونسل فار دی ورلڈ ریلیجنز	بنگلور	جون ۱۹۸۶
۸۔	ورلڈ کونسل آن ریلجس لبرٹی	جنیوا (سوئزرلینڈ)	دسمبر ۱۹۸۶

یہ کانفرنسیں وہ ہیں جو خاص طور پر مختلف مذاہب کے تحت منعقد کی گئیں۔ وہ اجتماعات ان کے علاوہ ہیں جو اصلاً مسلمانوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں اور ان میں غیر مسلم بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں بھی مجھے بار بار اسلام کی عمومی دعوت پیش کرنے کا موقع ملا ہے، مگر اس فہرست میں ان کا ذکر نہیں۔

جنیوا کی کانفرنس (۷ - ۹ دسمبر ۱۹۸۶) کے موقع پر میں نے جو انگریزی مقالہ پیش کیا، منتظمین کی طرف سے اس کی فوٹو کاپی کر کے تمام لوگوں کے درمیان اس کو تقسیم کیا گیا۔ اس مقالہ کا عنوان تھا :

Religious Liberty in Islam

یہ تقریباً آدھ گھنٹہ کا مقالہ تھا۔ اس میں میں نے قرآن اور حدیث اور اسلامی تاریخ کے حوالوں سے دکھایا کہ اسلام اگرچہ اس کا قائل نہیں کہ سچائی کئی ہے یا کئی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے نزدیک سچائی صرف ایک ہے۔ اس کے باوجود اسلام اس کا قائل نہیں کہ سچائی کو منوانے کے لیے جبر کیا جائے۔ سچائی کو بزور منوانا سچائی کی توہین ہے۔ اس دنیا میں لین دین کا اصول رائج ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنے لیے فکر کی آزادی چاہتے ہوں تو ہمیں دوسروں کو بھی فکر کی آزادی دینی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ سچائی وہ ہے جو آدمی کو بطور دریافت ملے اور دریافت کے طور پر سچائی کسی آدمی کو اسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ آزادانہ طور پر سوچے اور آزادانہ طور پر ایک نتیجہ تک پہونچے۔

مزید میں نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اسلام ساتویں صدی میں آیا جب کہ عام طور پر ساری دنیا میں مذہبی جبر کا رواج تھا۔ مگر اسلام نے زمانی رواج کے سراسر خلاف مذہبی آزادی کا اعلان کیا۔ اس سلسلہ میں میں نے مختلف تاریخی حوالے نقل کیے۔ مثلاً ایک مستشرق نے لکھا ہے کہ اسلام نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں اپنے ماتحت غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی دی۔ یہ بات ساتویں صدی کی تاریخ میں انتہائی انوکھی تھی :

They were allowed the free and undisturbed exercise of their religion — so striking in the history of the seventh century.

اس کانفرنس میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے۔ تاہم عیسائی حضرات کی تعداد زیادہ تھی جو امریکی اور یورپی علاقوں سے آئے تھے۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ متعدد لوگ بڑے بڑے

اداروں کے ذمہ دارانہ مناصب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ذاتی ملاقاتیں رہیں۔ یہ ذاتی ملاقاتیں زیادہ تر کھانے اور ناشتہ کی میز پر ہوتی تھیں۔ ان کی اکثریت کا یہ حال تھا کہ جب وہ میرے بارہ میں معلوم کرتے کہ میں "اسلامک سنٹر" کا صدر ہوں تو وہ غیر معمولی دل چسپی کے ساتھ اسلام کے بارہ میں باتیں کرنے لگتے۔ بیشتر لوگوں نے اس تاثر کا اظہار کیا کہ ہم اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اسلام کے بارہ میں ہم کو اپنی زبان میں کتابیں نہیں ملتیں۔

ڈاکٹر گوریری (Dr Claudio J. Guerrieri) ارجنٹینا سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے حال میں عالمی مذاہب پر ۲۰۵۰ کتابیں منگائی ہیں مگر ان میں ایک لفظ بھی اسلام پر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ اسلام کے بارہ میں اس بلیک آوٹ کا کون ذمہ دار ہے۔

اس کانفرنس میں میں تنہا مسلمان تھا جو کسی ملک سے اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اسی طرح شرکار کانفرنس میں ایک ہندو تھے۔ ان کا نام ڈاکٹر موہن کانت گوتم تھا۔ ان کی پیدائش ہندستان (کاس گنج) میں ہوئی۔ مگر پچھلے ۲۰ سال سے وہ باہر رہتے ہیں۔ آج کل وہ ندرلینڈ میں ساوتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے مجھ سے گفتگو کے دوران کہا کہ اگرچہ میں ایک ہندو ہوں۔ مگر مجھے اسلام کے مطالعہ سے بہت دل چسپی ہے۔ انھوں نے اسلام پر چند کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے انھیں اسلامی مرکز کی چند مطبوعات پیش کیں۔ بدھزم کے نمائندہ پھنتسوگ ونگیال (لندن) تھے۔ ان کو بھی انگریزی مطبوعات دی گئیں۔

مسز سوسن ٹیلر (Dr Susan Taylor) ایک تعلیم یافتہ معمر خاتون تھیں۔ وہ امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) سے آئی تھیں۔ وہ اگرچہ ایک عیسائی مذہبی ادارہ کی عہدیدار ہیں۔ تاہم انھوں نے اسلام کے مطالعہ کے لیے اپنی گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے بھی یہی شکایت کی کہ اسلام پر مطالعہ کے لیے انگریزی میں کتابیں نہیں ملتیں۔ ان کو بھی اسلامی مرکز کی چند انگریزی مطبوعات پیش کی گئیں۔

اگلے صفحہ پر کانفرنس کے پروگرام میں باضابطہ طور پر حصہ لینے والوں کی فہرست کا عکس دیا جارہا ہے۔ یہ فہرست خود کانفرنس کی طرف سے شائع کرکے تقسیم کی گئی تھی۔ اس فہرست میں ڈاکٹر جوزف پیج کا نام اٹھارویں نمبر پر ہے، حالاں کہ وہ ڈبلوسی آر ایل کے صدر ہیں جس کی طرف سے یہ کانفرنس کی گئی تھی۔ ہندستان جیسے ملکوں میں اس قسم کی ترتیب ناممکن ہے۔

WORLD COUNCIL ON RELIGIOUS LIBERTY (WCRL)

HOTEL INTERCONTINENTAL GENEVE
Geneva, Switzerland
December 7-9, 1986

PROGRAM PARTICIPANTS

Ms. Berdina Auma: Director of Public Affairs, All Africa Conference of Churches, Nairobi, Kenya

Mr. Adepoju Akomolafe: Vice President, Christian Council of Nigeria, Logos, Nigeria

Dr. Petro Bilaniuk: Professor, Faculty of Theology, University of St. Michael's College, Toronto, Ontario; and Honorary Canon of the Ukranian Catholic Church

Rabbi Daniel Cohan-Sherbok: Professor, Faculty of Humanities, University of Kent, Canterbury, England

Msgr. Freddie Delgado: Member and Former Coordinator of the Human Rights Commission of El Salvador and Former Secretary of the Episcopal Conference, 1973-82, El Salvador

Dr. Frances Dessart: Pasteur; Professor, Director, Eglise Evangelique International, Nanur, Belgium

Rev. Oka Fau'olo: General Secretary, Samoa Council of Churches, Aspia, Western Samoa

Rev. Kenneth M.J. Fernando: Director, Ecumenical Institute for Study and Dialogue, Colombo, Sri Lanka

Mr. Vincent Foote: Director Baptist Laity, Greensboro, NC

Dr. Claudio J. Guerrieri: Plastic Surgeon and Religious Activist, Buenos Aires, Argentina

Bro. Andrew Gonzalez: President, De La Salle University, Manila, Phillipnes

Dr. Mark N. Gretason: Dean, Central School of Religion, Worcester, United Kingdom

Honorable Horst Keilau: Chief, Prevention of Discrimination Branch, Center for Human Rights, Geneva, Switzerland

Dr. Wahiduddin Khan: President, The Islamic Center, New Delhi, India

Dr. Oscar McLaughlin: Pastor St. Francis AME Zion Church, Port Chester, New York (USA): Member Board of Trustees, Shaw Divinity School, Raleigh, N.C. (USA)

Dr. L.M. Msibi: Founding Director, Ma-African House, Johannesburg, South Africa

Honorable Robert G. Mueller: Assistant Secretary General, United Nations, New York, N.Y.

Dr. Joseph C. Paige: President, WCRL; Executive Vice President, Shaw Divinity School, Raleigh, North Carolina (USA)

Dr Gioufranco Rossi: Secretary General, International Association for the Defense of Religious Liberty, Bern, Switzerland

Dr. Don Sills: President, Coalition for Religious Freedom, Washington, D.C.

Dr. Christian J.G. Vonck: Professor and Executive Director, Faculty of Comparative Religion, Antwerpen, Belgium

Mr. Phuntsog Wangyal: Representative of Dalai Lama, London, United Kingdom

Dr. Auguste-Raynold Werner. Accredited Representative to the United Nations for International Association for Religious Fredom (IARF) and International Progress Organization (IPO), Geneva

تنظیم (WCRL) کے صدر ڈاکٹر جوزف بیج نے بتایا کہ پچھلے ایک سال (ستمبر ۱۹۸۵) سے ہم اس مشن کے لیے کام کررہے ہیں۔ ہم نے اس دوران میں بہت کچھ کہاہے اور شائع کیا ہے۔ مگر ہم کو سب سے زیادہ خط اور تار اور ٹیلی فون جس چیز پر ملے وہ صرف ایک چھوٹا سا جملہ تھا۔ یہ جملہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

Atheistic communism is the number one enemy of religious liberty.

(بے خدا اشتراکیت مذہبی آزادی کی دشمن نمبر ایک ہے) یہ نفسیات تمام قوموں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور خود مسلمانوں میں بھی۔ کسی دشمن کے خطرہ کی گھنٹی بجائیے تو سب سے زیادہ بھیڑ آپ کے گرد جمع ہوجائے گی۔ اور جس پیغام میں اس قسم کے خارجی خطرے کی گھنٹی نہ بجائی جائے، اس کو ہمیشہ بہت کم مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی لیڈر کی مقبولیت کا پیمانہ وہ بھیڑ نہیں ہے جو مذہبی خطرہ یا قومی خطرہ کا الارم بجاکر جمع کی گئی ہو، اس کا پیمانہ صرف وہ مجمع ہے جو مثبت پیغام کے نتیجہ میں اس کے گرد جمع ہوا ہو۔ بار بار یہ منظر سامنے آیا ہے کہ "خطرہ" کی نفسیات کو جگانے کے نتیجہ میں ایک لیڈر کے گرد بھیڑ جمع ہوئی۔ مگر جیسے ہی اس نے انھیں کوئی ایسا پیغام دینا چاہا جس میں خود اپنے آپ کو بدلنے کا تقاضا ہو تو تمام بھیڑ اس طرح منتشر ہوجائے گی جیسے وہ کبھی جمع ہی نہیں ہوئی تھی۔

ایک امریکی مقرر ڈاکٹر ڈونال سِل (Dr Donal Sills) نے کہا کہ امریکہ کے چرچ اس وقت تجارت کا ذریعہ (American churches are a source of business) ہیں۔ یہی بات نائجیریا کے اینگلیکن چرچ کے ایک ذمہ دار آرکومولا (Adepoju Akomolafe) نے بھی کہی۔ امریکہ کے مسیحی چرچ کے بارہ میں خود مسیحی مقررین کی زبان سے یہ بات سن کر تھوڑی دیر کے لیے مجھے تعجب ہوا۔ مگر پھر میں نے یہ سوچا کہ یہ تو وہی بات ہے جو آج تمام مذاہب کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ حتی کہ خود مسلمانوں کے لیے بھی اب ان کا دین ایک تجارت بن گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر پیسہ حاصل کرے اور کسی کی تجارت یہ ہے کہ وہ دین کے نام پر شہرت اور قیادت کے مقام پر پہونچے۔

ارباب عہدہ سے ذاتی طور پر ملاقات کرنے میں مجھے ہمیشہ تکلف ہوتا ہے۔ اس بنا پر میں ڈاکٹر پیج (Dr Joseph Paige) سے ذاتی ملاقات نہ کر سکا تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے خود اس کی صورت پیدا کر دی۔ وہ اچانک اٹھ کر آئے اور میرے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیے۔ انھوں نے میرے ساتھ کئی تصویریں کھنچوائیں۔ اس دوران ان سے گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے سامنے کانفرنس کے زیر بحث موضوع پر اسلام کا تصور پیش کیا۔ اور انھیں انگریزی الرسالہ کے دو شمارے دیئے۔ اگلے دن میں نے دیکھا کہ وہ الرسالہ (انگریزی) ایک صاحب کو دکھا رہے ہیں۔ وہ اس کو اہتمام کے ساتھ اپنی فائل میں رکھے ہوئے تھے۔

اجتماعی مواقع پر ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر مقرر کی زبان اور سامعین کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہو تو تقریر کو سامعین کے لیے کس طرح قابل فہم بنایا جائے۔ پہلے زمانہ میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ مقرر کے ساتھ ایک اور آدمی بطور ترجمان کھڑا ہو اور وہ مقرر کی تقریر کو سامعین کی زبان میں بیان کرے۔ اس کے بعد ان آلات کا زمانہ آیا جن کو عام طور پر ہڈسٹ (Head set) کہا جاتا ہے۔ اس میں تار کے ذریعہ مقرر کے الفاظ ترجمان تک پہونچائے جاتے تھے۔ اور دوبارہ تار کے ذریعہ ترجمان کی آواز سامعین تک پہونچتی تھی۔

اب الکٹرانکس کے دور میں مزید ترقی یافتہ طریقے وجود میں آگیے ہیں۔ اب ایسے ہڈسٹ بنائے گیے ہیں جن کے لیے تار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تار کے بغیر کام کرتے ہیں۔ اعلیٰ معیار کی کانفرنسوں میں اب یہی ہڈسٹ استعمال ہوتے ہیں۔ جنیوا کی کانفرنس میں بھی اسی کا انتظام تھا۔ مثلاً مقرر اگر فرانسیسی یا اسپینی زبان میں بول رہا ہو تب بھی عین اسی وقت چھوٹے سے ہڈسٹ کے ذریعہ اس کو انگریزی میں سنا جا سکتا تھا۔ سامع کی نسبت سے مقرر کے الفاظ ناقابل فہم بولی کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ہڈسٹ کے استعمال سے وہ سننے والوں کے لیے قابل فہم بن جاتے تھے۔

اس قسم کی چیزیں آج عام ہو چکی ہیں۔ لوگ ان کو "سائنس کا معجزہ" کہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کا معجزہ ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ میں جب اس قسم کی کسی سائنسی چیز کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی آیت (واعطاکم من کلّ ما سألتموہ) کی تفسیر ہے۔ وہ براہ راست خداوند عالم کا عطیہ ہے نہ کہ حقیقۃً انسانی سائنس کا عطیہ۔

مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کی طرف سے اکثر یہ الفاظ سننے پڑتے ہیں کہ تمہارے یہاں تو ستّر سے زیادہ فرقے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں اس سے بھی زیادہ فرقے ہیں۔ امریکہ کے ونسنٹ فوٹ (Vincent Foote) ایک باپٹسٹ (Baptist) تھے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں ۲۵۰ قسم کے باپٹسٹ ہیں۔ اور مجموعی طور پر عیسائیوں میں تین ہزار فرقے ہیں۔ ابھی حال میں (۳۵ سال پہلے) ایک نیا عیسائی فرقہ بنا ہے۔ اس کا صدر دفتر امریکہ (واشنگٹن ڈی سی) میں ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Church of Scientology International

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذاہب میں اصل فرق فرقے کی کثرت کا نہیں ہے بلکہ جھگڑے کی کثرت کا ہے۔ مسلمان بات بات پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اس لیے کم فرقہ ہونے کے باوجود وہ کثرت فرقہ کے لیے مشہور ہیں۔ جب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ زیادہ فرقے ہونے کے باوجود اس طرح آپس میں نہیں لڑتے، اس لیے ان کا باہمی اختلاف دوسروں کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

کناڈا کے ایک پادری (Petro Bilaniuk) نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اشتراکی روس میں کس طرح مذہبی تشدد ہو رہا ہے۔ انھوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں کافی تفصیلات بتائیں۔ مگر یہ تمام تفصیلات صرف عیسائی مذہب اور عیسائی فرقہ پر تشدد کے بارہ میں تھیں۔ ان کی تقریر کے مطابق گویا اشتراکی روس میں مسلمانوں کا کوئی وجود نہیں اور نہ ان پر کوئی تشدد ہوا ہے۔

بظاہر یہ یک رُخا جائزہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر ٹھیک یہی طریقہ خود مسلمان بھی اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی کتابیں اور مضامین اشتراکی روس کے بارہ میں پڑھیے تو ان میں عام طور پر صرف اس تشدد کا ذکر ملے گا جو اشتراکی انقلاب کے بعد وہاں کے مسلم فرقہ پر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی نظر میں اصل مسئلہ اپنی قوم کا ہے نہ کہ انسانی اصول کا۔ انھیں حقیقۃً قومی شکایت ہے نہ کہ اصولی شکایت۔

ڈاکٹر لیک (Dr Daniel Lack) نے کہا:

Religious rights are less fundamental than the other rights, like economic rights.

(مذہبی حقوق دوسرے حقوق سے کم بنیادی ہیں، مثلاً معاشی حقوق سے) یہ سن کر مجھے ایک لمحہ کے لیے

جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا کہ جدید انسان اگر مذہب کو مانتا بھی ہے تو اس کو کم درجہ دینے کے بعد مانتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عملی طور پر مسلمانوں کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سرگرمیوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے یہاں بھی دین دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔ اور دوسری دوسری چیزوں نے نمبر ایک کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ حتی کہ بہت سی تحریکیں جو بظاہر دین کے نام پر اٹھیں ان کی تہ میں بھی حقیقتہً سیاسی اور معاشی اور قومی محرک زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا اور دینی محرک کم۔

اس طرح کی کانفرنسوں میں عمدہ الفاظ بولنے والے تو بہت ملتے ہیں۔ مگر ایسا کوئی شخص شاذونادر ہی نظر آتا ہے جو واقعتہً درد اور فکر کا حامل ہو۔ ایک صاحب کے چہرے پر دردمندی کے آثار دیکھ کر مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ان کا نام پھنتسوگ ونگیال (Phuntsog Wangyal) تھا۔ مگر ان سے گفتگو کے بعد میرا حسن ظن باقی نہ رہ سکا۔ وہ بدھسٹ تھے اور سرے سے خدا کو مانتے نہ تھے۔ ان کی دردمندی کا راز یہ تھا کہ وہ تبتی ہیں۔ تبت میں چین کے داخلہ کے بعد انھیں تبت چھوڑنا پڑا۔ آج کل وہ لندن میں رہتے ہیں۔ وہ برطانی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اب تک انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک "رفیوجی" سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ساری دنیا میں کہیں ان کا کوئی وطن نہیں۔ ان کا درد "رفیوجی" ہونے کے احساس پر مبنی تھا نہ کہ اللہ کے سامنے جواب دہی کے احساس پر۔

مسٹر ونگیال سے میں نے پوچھا : آپ لوگ کیا دلائی لاما کو خدا یا خدا کا اوتار (God-incarnate) سمجھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام طور پر بدھوں کا یہی خیال ہے۔ وہ ان کو زندہ بدھا (Living Buddha) مانتے ہیں۔ مگر میں ایسا خیال نہیں کرتا۔ میرے نزدیک وہ ایک اچھے انسان ہیں اور بس۔ مسٹر ونگیال کے اس جواب کے بعد میں نے سوچا کہ دوسرے مذاہب میں بگاڑ کی وجہ سے ایسے عقیدے شامل ہو گئے ہیں جن کو جاہل عوام تو مان سکتے ہیں، مگر ان کا کوئی شخص جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے علمی ذہن کے ساتھ ان عقائد کی موافقت نہیں پاتا، اس لیے وہ ان کو "معتدل" بنا کر مانتا ہے۔ مگر اسلام چوں کہ ہر قسم کی تبدیلی سے پاک ہے۔ اس لیے اسلام کا ماننے والا جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ اپنے دینی عقائد کو

"معتدل" بنائے۔ اس کا علم اور اس کا عقیدہ دونوں اسے یکساں سطح کی چیز معلوم ہوتے ہیں — اسلام کو انسانی تحریفات سے محفوظ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔

اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات اور الرسالہ (انگریزی) کے کچھ شمارے میرے ساتھ تھے۔ یہ کتابیں اور الرسالہ انگریزی کانفرنس کے اکثر شرکا رکو دیے گئے۔ لوگوں نے کافی دل چسپی کے ساتھ ان کو لیا اور مزید انگریزی لٹریچر کی خواہش ظاہر کی۔

جنیوا ہوٹل میں جن اصحاب سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ایک ممتاز شخص ڈاکٹر احمد مختار مبو تھے۔ وہ افریقی ہیں اور اقوام متحدہ کے مشہور ادارہ یونسکو کے ڈائرکٹر جنرل ہیں۔ ان کا دفتر پیرس میں ہے۔ وہ ایک اور کانفرنس کے سلسلہ میں جنیوا آئے تھے اور ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل میں مقیم تھے:

Dr Amadou-Mahtar M'Bow, Director General UNESCO
7, Place de Fontenenoy, 75700 Paris (Tel. 45681310–45681311)

یہ نہایت سنجیدہ بزرگ تھے۔ قرآن (بغیر ترجمہ) ان کے ساتھ تھا۔ مگر وہ عربی سے واقف نہ تھے۔ اسلامیات پر بھی ان کا باقاعدہ مطالعہ نہیں ہے۔ ان کو میں نے الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) مطالعہ کے لیے دیا۔ اگلے دن دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں نے پیغمبر انقلاب (انگریزی) پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک ممتاز (excellent) کتاب ہے۔ انھوں نے کہا کہ کتاب ختم کرنے کے بعد میں اپنے مفصل تاثرات آپ کو لکھوں گا۔

کناڈا کے ایک پروفیسر ڈاکٹر برائنٹ سے ملاقات ہوئی۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے:

Dr M. Darrol Bryant, University of Waterloo
5 Park Ave. W., Elmira, Ontario, Canada N3B 1K9
Phones – Home: 519–669–5321, Office: 519–884–4400

ڈاکٹر برائنٹ کو الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے گئے۔ انھوں نے ان کو پڑھ کر ان سے غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا۔ میں نے الرسالہ کی انگریزی زبان کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ اس کی زبان بہت اچھی اور بہت واضح ہے۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر ہندستانی لوگ جو انگریزی لکھتے ہیں اس کو مغربی لوگ پڑھ نہیں پاتے۔ مگر الرسالہ کو میں نے نہایت دل چسپی کے ساتھ پڑھا۔

اس کی زبان ایسی تھی کہ اس کو سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ اتنی اچھی انگریزی آپ خود لکھتے ہیں یا کوئی اور ہے جو اس کو لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کو فرشتے (angels) لکھتے ہیں۔ یہ سن کر وہ دیر تک ہنستے رہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ امریکہ اور کناڈا میں پچھلے برسوں میں مذہب کا مطالعہ کرنے کا رجحان بڑھا ہے اور اسلام کا مطالعہ کرنے کا بھی۔ مگر وہاں کا عام باشندہ ابھی تک اسلام کے بارہ میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں کا ایک عام آدمی اسلام کے نام سے صرف "خمینی" کو جانتا ہے اور خمینی کی تصویر جو امریکہ میں ہے اس کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی باتوں سے میں نے یہ تاثر لیا کہ اسلام کے تعارف پر اگر ایسی انگریزی کتابیں شائع کی جائیں جن کی زبان واقعی انگریزی ہو، وہ "انڈین انگلش" نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ کتابیں جدید اسلوب میں تیار کی گئی ہوں تو مغرب کے لوگ ان کو نہایت شوق کے ساتھ لیں گے اور ان کا باقاعدہ مطالعہ کریں گے۔

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصہ سے سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں اور اب یہیں کی شہریت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر شدید غم کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی حالت حیرت ناک حد تک درد اور کرب کی کہانی بن گئی ہے۔ وہ لوگ جو اس لیے پیدا کیے گئے تھے کہ وہ زمین پر خیر امت ہوں، وہ آج آخری بربادی کے گڑھے میں پہونچ گئے ہیں۔ وہ آج اپنے دشمنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ آج ایک مسلمان اپنے بھائی کے مقابلے میں اپنے دشمن پر زیادہ بھروسہ کرتا ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے :

Those who were created to be the best nation on earth have descended to a bottomless pit, now they are subjected to their enemies to the extent that a Muslim has more trust in the enemy than in his brother.

میں نے کہا کہ مسلمانوں کا یہ انجام اس لیے ہے کہ انھوں نے مسلمان کی حیثیت سے اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ فرض منصبی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ دعوت الی اللہ ہے۔ یعنی خدا کے سچے دین کو تمام اقوام عالم تک پہونچانا۔ یہ طرز فکر ان کے لیے بالکل نیا تھا۔ اب تک ان کا ذہن یہ تھا کہ مسلمان جدید ترقیاتی شعبوں میں پچھڑ گیے ہیں اور ان شعبوں میں آگے بڑھ کر وہ اقوام عالم کے ہم سطح

ہوسکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلمان "خیرامت" اسی اعتبار سے ہیں کہ وہ خدا کے دین کی پیغام بری کریں۔ اس لیے ان کی ترقی اور سربلندی تمام تر اسی عمل پر موقوف ہے۔ اس عمل کو اختیار کرکے وہ "سب سے اعلیٰ" قوم بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اس عمل کو چھوڑ دیں تو وہ سب سے بری قوم بن جائیں گے۔ اس کے بعد ان پر یرمیاہ نبی کے وہ الفاظ صادق آئیں گے جو بائبل میں اس طرح نقل کیے گئے ہیں :

Reprobate silver shall men call them, because the Lord hath rejected them (Jeremiah 6:30).

جنیوا میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ عرب رہتے ہیں۔ انھوں نے میری عربی کتاب (الاسلام یتحدیٰ) پڑھی تھی اور اس سلسلہ میں ان کا ایک خط مجھے دہلی کے پتہ پر ملا تھا۔ یہاں ان سے ملاقات کا خیال ہوا۔ مگر ان کا ٹیلی فون نمبر میرے پاس موجود نہ تھا۔ کمرہ میں رکھی ہوئی ٹیلی فون ڈائرکٹری پر نظر پڑی تو میں نے سوچا کہ شاید اس میں ان کا نام ہو۔ ڈائرکٹری دیکھنا شروع کیا تو اس میں ان کا نام موجود تھا۔ چنانچہ اس کے مطابق میں نے اپنے کمرہ سے ٹیلی فون کیا تو وہ مل گیے۔ اولاً ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد وہ ہوٹل تشریف لائے تو زیادہ تفصیل کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ان کا نام و پتہ یہ ہے :

Yahya Basálamah, Grange-Levrier 2,
1220 Les Avanchets, Geneva. Tel. (022) 960625

ان کو الرسالہ (انگریزی) اور پیغمبر انقلاب (انگریزی) وغیرہ کتابیں دی گئیں۔ وہ تبلیغی جماعت سے واقف تھے۔ مگر انھیں تبلیغی جماعت پر بعض پہلوؤں سے اعتراض تھا۔ میرے پاس تبلیغی تحریک کا انگریزی ترجمہ تبلیغ موومنٹ (*Tabligh Movement*) موجود تھا، وہ میں نے انھیں دیا۔ عربی ان کی مادری زبان ہے۔ مگر وہ انگریزی زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔

جناب یحییٰ باسلامہ سے یہ ملاقات ٹیلی فون کے ذریعہ ممکن ہوئی۔ ان کے علاوہ جنیوا میں مقیم کئی اور صاحبان سے ملاقات کی صورت بھی ٹیلی فون ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ ٹیلی فون بھی کیسی عجیب نعمت ہے۔ حسب ذیل تین نمبروں پر بٹن دبا کر میں ایک منٹ کے اندر دہلی سے بات کرسکتا تھا :

0091 – 11 – 611128

مگر موجودہ زمانہ میں کثرت استعمال نے اس نعمت کی حیثیت پر غفلت کا پردہ ڈال دیا ہے۔ بے شمار

لوگ رات دن ٹیلی فون استعمال کرتے ہیں مگر شاید ہی اس زمین پر وہ انسان موجود ہو جس کا یہ حال ہو کہ جب وہ ٹیلی فون کا نمبر ڈائل کرے اور دور دراز مقام کے آدمی سے اس کی اس طرح بات ہونے لگے جیسے کہ وہ اس کے بالکل قریب موجود ہے تو احساس نعمت سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ انسان سے ربط قائم کرتے ہوئے اس کی روح خدا سے مربوط ہو جائے۔

جنیوا کی ملاقاتوں میں سے ایک یادگار ملاقات ڈاکٹر عبدالحکیم طیبی کی تھی۔ وہ ایک افغانی ہیں۔ افغانستان میں روس کے داخلہ سے پہلے وہ وہاں اعلیٰ سرکاری عہدہ پر تھے۔ وہ افغانستان کی طرف سے تقریباً دس ملکوں میں سفیر رہ چکے ہیں۔ آخر وقت میں وہ اقوام متحدہ میں افغانستان کے نمائندہ تھے اور نیو یارک میں مقیم تھے۔ افغانستان میں جب انقلاب آیا اور روسی فوجیں وہاں داخل ہو گئیں تو ۱۹۷۷ میں انھوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا اور جنیوا چلے آئے۔ یہاں انھوں نے ایک کافی بڑا ادارہ قائم کیا ہے۔ وہ افغانستان کی تحریک مجاہدین کے ممتاز نمائندوں میں سے ہیں اور جنیوا سے ایک ماہانہ مجلہ نکالتے ہیں جس کا نام جمال الدین افغانی کے قدیم مجلہ کے نام پر "العروۃ الوثقیٰ" رکھا گیا ہے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۲) نے ۱۸۸۴ میں پیرس سے ایک عربی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کے نام سے نکالا تھا۔ مگر چند شماروں کے بعد وہ بند ہو گیا۔ اب ڈاکٹر طیبی اسی نام سے عربی اور انگریزی میں ایک ماہنامہ جنیوا سے نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابیں عربی اور انگریزی میں شائع کی ہیں:

Dr Abdul Hakim Tabibi, 81, Rue De Lyon, Ch.
1203, Geneva. Tel. (022) 442268, (022) 983911

ڈاکٹر طیبی نے اصرار کیا کہ میں جنیوا میں مزید قیام کروں اور ان کے "گیسٹ ہاؤس" میں ٹھہروں۔ اس طرح مجھے مزید تفصیل سے سوئزر لینڈ کو جاننے کا موقع مل جاتا نیز دعوتی کام کے مزید مواقع ملتے۔ مگر میرے لیے زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہ تھا۔ اس لیے میں ان کی پیش کش کو قبول نہ کر سکا۔ ڈاکٹر طیبی کی لائبریری کے لیے میں نے اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات پیش کیں۔ ان میں "تبلیغ موومنٹ" کا ایک نسخہ بھی شامل تھا۔

یہاں کی ملاقاتوں میں سے ایک دل چسپ ملاقات وہ تھی جو مسٹر مک کی

سے ہوئی :

Richard Mc Kee, U.S. Mission, 11, route de Pregeny
1292 Chambesy, Geneva, Switzerland.

مسٹر مک کی امریکی ہیں اور امریکی سفارت خانہ میں مشیر کی حیثیت سے متعین ہیں۔ گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ وہ عربی زبان جانتے ہیں۔ ان سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور ہر بار ان سے عربی میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھیں مجھ سے کچھ کہنا ہوتا تو خالص عربی انداز میں "حضرتکم" کے لفظ سے خطاب کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی عرب بول رہا ہے۔ ایک بار تقریباً آدھ گھنٹے کی گفتگو میں وہ بے تکلف اپنے خیالات کا اظہار عربی میں کرتے رہے۔ ان کو دینے کے لیے میرے پاس عربی کی کوئی کتاب نہ تھی۔ البتہ میں نے انھیں الرسالہ انگریزی کے چند شمارے دیے۔

۸ دسمبر کی شام کو میں ہوٹل کے ایک مقام سے گزر رہا تھا کہ ایک سفید فام امریکی خاتون نے مجھے مخاطب کیا۔ میری ٹوپی اور میرے حلیہ سے اس نے مجھے ایک مذہبی اور روحانی شخصیت سمجھا اور اسی انداز میں گفتگو شروع کی۔ اس نے نہایت سنجیدہ انداز میں اپنے خیالات پیش کیے۔ وہ امریکہ کی نئی نسل کی نمائندہ تھی۔ اس نے بتایا کہ سچائی کی تلاش میں وہ اپنے کئی امریکی ساتھیوں کے ہمراہ مختلف ملکوں کا سفر کر چکی ہے۔ اس نے کہا کہ میری نسل روحانی اصول کو جاننے کی تلاش میں ہے۔ ہم نے جان لیا ہے کہ زندگی کے لیے مادیت سے زیادہ کچھ درکار ہے۔ چنانچہ ہم نے مایوسانہ طور پر سچائی کی تلاش کی (مگر سچائی ہم کو نہیں ملی) :

My generation was on a quest to understand spiritual law. We knew there was more to life than materialism. So, we searched desperately for the Truth.
Miss Renee Elaine Thompson, 3906 Ernst St.,
Omaha, Nebraska 68112, U.S.A.

گفتگو کے آخر میں میں نے خاتون کو الرسالہ (انگریزی) کے چند شمارے اور بعض انگریزی کتابیں دیں۔ انھوں نے بہت دل چسپی کے ساتھ لیا اور شدت شوق میں اسی وقت پڑھنے لگیں۔ یہ واقعہ شاید میرے اس پورے سفر کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ تھا۔ اس واقعہ میں مجھے جدید انسان کی روح تڑپتی ہوئی نظر آئی۔

کتابوں میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں کچھ لوگ تھے جن کو حنفار کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے جاہلی دین پر مطمئن نہ تھے۔ ان کی فطرت سچے دین کی تلاش میں تھی۔ زید بن عمرو یہ کہتے ہوئے مرگیے کہ خدایا، اگر میں جانتا کی تیری پسندیدہ عبادت کیا ہے تو اسی طرح میں تیری عبادت کرتا، مگر میں اس کو نہیں جانتا۔ ایک مرتبہ اس طرح کے کچھ لوگ جمع ہوئے۔ انھوں نے آپس میں کہا: جان لو کہ خدا کی قسم، تمہاری قوم کسی چیز پر نہیں ہے۔ انھوں نے دین ابراہیم کو بگاڑ دیا ہے۔ پس نکلو اور سچے دین کو تلاش کرو۔ چنانچہ وہ لوگ مختلف ملکوں کی طرف نکل پڑے (سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن کثیر، جلد اوّل)

جنیوا کے مذکورہ تجربہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عرب کے حنفار کی طرح دور جدید میں دوبارہ حنفار کی ایک نسل پیدا ہو گئی ہے جو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ خدایا، مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میں تیری عبادت کروں۔ اگر میں جانتا تو میں اسی طرح تیری عبادت کرتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جدید انسان کی رہنمائی کا انتظام فرمائے، اور بلاشبہہ وہی انتظام فرمانے والا ہے۔

اس دوران میری ملاقات ایک امریکی سیاح سے ہوئی۔ وہ پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں ان سے میں نے پوچھا کہ آپ دنیا کے بہت سے ملکوں میں گیے ہیں، آپ کو سب سے زیادہ کون سا ملک پسند آیا۔ انھوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا۔ بے حد صاف، بے حد مستعد (Very neat, very efficient) پھر میں نے انڈیا کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ میں نے انڈیا کا سفر کیا ہے۔ انڈیا کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔ مگر وہاں بیوروکریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ سوئزرلینڈ میں بھی قواعد وضوابط بہت زیادہ ہیں۔ مگر سوئزرلینڈ کے کسی سرکاری دفتر میں آپ ایک کام کے لیے جائیں تو ایک آدمی کی میز پر پہونچ کر آپ کا سارا کام ۱۰ منٹ میں پورا ہو جائے گا۔ جب کہ انڈیا میں میں دوبار گیا ہوں۔ وہاں کے کسی سرکاری دفتر میں جائیے تو ہر آدمی آپ کو دوسرے آدمی کے پاس بھیجے گا۔ آپ ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور دوسرے آدمی سے تیسرے آدمی کے پاس جاتے رہیں گے پھر بھی یقینی نہیں ہے کہ آپ کا کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے۔

جنیوا ایک بے حد صاف ستھرا شہر ہے۔ یہاں کے بارے میں ایک دل چسپ لطیفہ معلوم ہوا۔

ایک صاحب ڈپلومیٹ تھے وہ اپنے خاندان کے ساتھ یہاں شہر کے باہر پکنک کے لیے گیے۔ وہاں ان لوگوں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ڈبہ اور کاغذ کی قسم کی بچی ہوئی چیزیں چھوڑ کر قریب کی کسی جگہ ٹہلنے چلے گیے۔ البتہ ان کی کار وہیں پاس کھڑی ہوئی تھی جس پر ڈپلومیٹک نشان لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ لوگ ٹہل کر اپنے مقام پر دوبارہ واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی کار کی ونڈ اسکرین پر ایک کاغذ چپکا ہوا ہے جس کے اوپر یہ الفاظ تحریر ہیں :

Having a diplomatic licence does not give you
permission to litter the countryside.

۹ دسمبر کو دوپہر بعد جنیوا شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک مقامی گائڈ کی رہنمائی میں ہم چند آدمی نکلے۔ گاڑی ہم کو سارے شہر میں گھماتی رہی۔ ایک مقام پر اتر کر وہاں کا بڑا چرچ دیکھا۔

جنیوا اگرچہ نسبتاً چھوٹا شہر ہے۔ مگر وہ غیر معمولی طور پر صاف اور خوبصورت ہے۔ اگرچہ شہر کا پرانا حصہ اتنا صاف نظر نہیں آیا جتنا اس کا نیا حصہ صاف تھا۔ تاہم دونوں میں فرق بہت کم تھا۔ ایک مقام پر مسجد بھی دیکھی۔ یہ مسجد کافی وسیع ہے اور جدید انداز میں تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا افتتاح حال میں شاہ فہد نے کیا ہے۔ یہ خوبصورت مسجد جنیوا کے معیار کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اور شہر کے مرکزی علاقہ میں واقع ہے۔

جنیوا میں میں نے اپنے ہوٹل کے کمرہ سے کچھ مقامی ٹیلی فون کیے تھے۔ بظاہر اس ٹیلی فون کا علم یا تو مجھ کو تھا یا شہر کے اس آدمی کو جس سے میں نے ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ مگر ہوٹل سے روانگی کے وقت جب میں ہوٹل کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے اس کے دفتر میں گیا تو وہاں ٹیلی فون کی تعداد اور اس کی رقم نہایت صحت کے ساتھ ایک کاغذ پر درج شدہ موجود تھی۔ یہ کمپیوٹر کا کرشمہ ہے۔ بڑے ہوٹلوں میں ہر کمرہ کمپیوٹر سے مربوط رہتا ہے اور کمپیوٹر آٹومیٹک طور پر ہر چیز کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ یہی معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں آدمی ایک عمل کرتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں جو اس کے عمل کو جانے۔ مگر خدا کے مخفی فرشتے ہر جگہ تیسرے فریق کی حیثیت سے موجود ہیں اور اس کے ہر قول و عمل کو نہایت صحت کے ساتھ ریکارڈ کر رہے ہیں۔ آدمی جیسے ہی موجودہ دنیا کو چھوڑے گا، خدا کے یہ

ملکوتی کمپیوٹر اس کی مکمل چارج شیٹ اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

مغربی دنیا میں شراب اس قدر عام ہے کہ عملاً شراب اور پانی میں کوئی فرق باقی نہیں۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں ایک چھوٹی الماری تھی جس کے اوپر لکھا ہوا تھا (Mini Bar) میں نے اس کو کھولا تو الماری کے تمام خانے مختلف قسم کے شراب کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے ــــــ جدید میڈیکل سائنس نے شراب کا مضر ہونا ثابت کر دیا ہے۔ مگر جو چیز انسان کی عادت بن جائے اس کو چھوڑنا انسان کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔

۱۰ دسمبر کی صبح کو جنیوا سے واپسی ہوئی۔ جنیوا کا ہوائی اڈہ بے حد صاف اور منظم تھا۔ ٹائلٹ سے لے کر نشانات راہ تک ہر چیز اتنی نفیس حالت میں تھی جو مجھے کسی اور ہوائی اڈے پر نظر نہیں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی استعمالی ایرپورٹ نہیں ہے بلکہ نمونہ کا ایرپورٹ ہے جو بنا کر نمائش کے لیے رکھ دیا گیا ہے۔ ہندستان کے مقابلہ میں سوئزرلینڈ کے وسائل بہت کم ہیں۔ مگر محدود وسائل کے دانش مندانہ استعمال نے اس کو ہندستان سے زیادہ خوبصورت ملک بنا دیا ہے۔

دہلی کا جہاز پکڑنے کے لیے ہمیں فرینکفرٹ آنا تھا۔ جنیوا سے فرینکفرٹ کا سفر لفتھانزا کی فلائٹ نمبر ۲۴۹ کے ذریعہ ہوا۔ یہ جرمن کمپنی کا جہاز تھا اور جرمنی کی ترقی کا پوری طرح نمائندہ تھا۔ اس وقت فضا میں گہرا بادل اور کہر چھایا ہوا تھا۔ آگے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے باوجود جہاز نے اپنا سفر اس طرح طے کیا جیسے اس کے پائلٹ کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہو۔ اس قسم کا سفر موجودہ زمانہ میں وائرلیس کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ ہوائی اڈہ پر خاص طرح کے رڈار ہوتے ہیں جو مسلسل ناقابل مشاہدہ لہریں پھینکتے رہتے ہیں۔ یہ لہریں ہوائی جہاز سے ٹکراتی ہیں اور اس کی اس طرح رہنمائی کرتی ہیں جیسے کوئی آنکھ والا کسی اندھے کا ہاتھ پکڑ کر اس کا سفر طے کرا رہا ہو۔ مادی اعتبار سے آج کا انسان اندھیرے میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا ہے، مگر روحانی اعتبار سے وہ اجالے میں سفر کرنے کے قابل بھی نہ ہو سکا۔

فرینکفرٹ مغربی جرمنی کا ایک اہم صنعتی شہر ہے۔ اس کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح میں آباد کیا تھا۔ تاہم اس کو زیادہ شہرت نویں صدی عیسوی میں حاصل ہوئی جب کہ جرمن بادشاہوں

نے اس کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔ موجودہ زمانہ میں بین اقوامی تجارتی نمائشوں کی وجہ سے فرینکفرٹ نے کافی شہرت حاصل کی ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۴ میں اس پر زبردست بمباری ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں فرینکفرٹ بالکل تباہ ہو گیا۔ مگر اس بربادی میں ترقی کا نیا امکان نکل آیا۔ اس نے جرمنوں کو موقع دیا کہ وہ اپنے قدیم شہر کو دوبارہ جدید طرز پر آباد کریں۔ موجودہ منظم اور پر رونق شہر جنگ کے بعد اس کے کھنڈروں سے برآمد ہوا ہے۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے (Goethe) فرینکفرٹ میں ہی ۲۸ اگست ۱۷۴۹ کو پیدا ہوا تھا۔ اس کا پیدائشی مکان تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ مگر وہ بھی دوسری عالمی جنگ میں جل کر تباہ ہو گیا۔ جرمنوں نے اس کو دوبارہ اس کے سابقہ نمونہ پر بنا دیا ہے۔

فرینکفرٹ میں جرمنی کا سب سے بڑا ایرپورٹ ہے۔ لندن اور پیرس کے بعد فرینکفرٹ کو یورپ میں تیسرے سب سے بڑے ایرپورٹ کی حیثیت حاصل ہے۔ سالانہ ایک کرور سے زیادہ مسافر یہاں کے ایرپورٹ سے گزرتے ہیں۔ فرینکفرٹ میں نوے ہزار سے زیادہ بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے لوگ آباد ہیں۔ ان میں تقریباً ۱۶ فی صد ترک ہیں۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے لفتھانسا کی فلائٹ نمبر ۶۶۶ کے ذریعہ سفر ہوا۔ یہ آٹھ گھنٹہ کی طویل پرواز تھی۔ تاہم سفر بآسانی طے ہو گیا۔ ہندستان کے اندر انڈین ایرلائنز سے سفر کرتے ہوئے کئی بار میرے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ ایرپورٹ پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ فلائٹ روک دی گئی ہے۔ کیوں کہ آگے جس ہوائی اڈہ پر اس کو اترنا ہے وہاں کہر کی وجہ سے رویت (visibility) کم ہے۔ مغربی ملکوں میں اگر یہ چیز رکاوٹ بنے تو وہاں روزانہ ہی فلائٹ روکی جاتی رہیں۔ کیوں کہ وہاں تو اکثر فضا میں کہر چھایا ہوا ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں رڈار (Radar) اور کمپیوٹر کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے۔ جنیوا اور فرینکفرٹ دونوں جگہ ایسا ہوا کہ ہمارا جہاز وہاں پہونچا تو فضا کے اوپر گہرا کہر چھایا ہوا تھا۔ مگر جہاز کو لینڈ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

اس مسئلہ کا حل اس نظام کے ذریعہ نکال لیا گیا ہے۔ جس کو آج کل فی الفور نظام

(On the line system) کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں جہاز کو صحیح مقام پر اتارنے کا کام انسانی آنکھ کے بجائے مشینی آنکھ کرتی ہے۔ ہوائی اڈہ پر لگا ہوا رڈار لہریں پھینکتا ہے۔ یہ لہریں ہوائی جہاز سے ٹکرا کر لوٹتی ہیں تو رڈار سے متصل کمپیوٹر ان کا تجزیہ کرکے جان لیتا ہے کہ ہوائی جہاز کا رُخ، اس کی بلندی وغیرہ کیا ہے۔ اس تجزیہ کے مطابق وہ وائرلیس پر جہاز کے مشینی نظام کو رہنمائی دیتا ہے کہ وہ اپنے رخ اور بلندی میں کیا تبدیلی کرے کہ وہ صحیح مقام پر صحیح رُخ سے اتر سکے۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جس کا ہر جزء ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصہ میں انجام پاتا رہتا ہے، اسی لیے اس کو مائیکرو سکنڈ (Micro second) کہا جاتا ہے۔

ایک الکٹرانک انجینیر نے کہا: آٹومیشن کا بیسک کانسپٹ بے خطا نظام (Error-free system) کو وجود میں لانا ہے۔ ایک انسان لازماً غلطی کرتا ہے۔ لیکن مشین کی صورت میں غلطی کا امکان بہت زیادہ کم ہو جاتا ہے:

A man is bound to make error, but by machine,
this probability gets very much reduced.

فرینکفرٹ میں ایک ہندستانی مسٹر ورما سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھوپال کے رہنے والے ہیں اور شکاگو (امریکہ) میں تجارت کرتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ ہندستان میں اور امریکہ میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں کوئی کام کرنا بے حد آسان ہے اور ہندستان میں کام کرنا بے حد مشکل۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ہندستان میں ایک انڈسٹری لگائی ہے۔ مگر اس کو لگانے کے لیے دفتری لڑائی میں مجھے دس سال بیت گیے۔ جب کہ ان کے بیان کے مطابق ان کے وزیروں تک سے تعلقات تھے۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں عام آدمی کو بھی وہی مواقع حاصل ہیں جو خواص کو۔ جب کہ ہندستان میں رشوت اور بیورو کریسی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت امریکہ میں ہندستانی لوگ بہت بڑے بڑے کام کر رہے ہیں۔ یہ سب ہندستان واپس آسکتے ہیں اور اپنے دیش کو ترقی دے سکتے ہیں۔ مگر جو شخص واپس آتا ہے وہ اتنی مشکلوں میں پھنس جاتا ہے کہ اس کے سارے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی قصے سنائے۔

میں نے سوچا کہ مغرب اور ہندستان کے درمیان یہ فرق ہے کہ مغرب کی مثال زندہ جسم کی ہے اور ہندستان کی مثال مردہ جسم کی۔ ہندستان گویا جگسا پزل کے ٹکڑوں کے ذریعہ بننے والا جسم ہے۔ زندہ جسم ایک مربوط کل ہوتا ہے۔ اس کا ہر حصہ اس طرح عمل کرتا ہے کہ وہ دوسرے کے حصہ کا کام بھی کر سکے۔ اس کے برعکس ہندستان کے افراد جگسا پزل کے الگ الگ ٹکڑوں کی مانند ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف اپنی خبر ہے، کسی کو بھی نہ تو دوسرے کے وجود کی خبر ہے اور نہ وہ اس کے سلسلہ میں اپنی کوئی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہی وہ فرق ہے جس نے مغرب کے عام انسان کی زندگی کو عافیت کی زندگی بنا دیا ہے اور ہندستان کے عام انسان کی زندگی کو بے عافیت کی زندگی۔

اس سفر میں مجھے مغرب کے تین بڑے مراکز میں جانے کا اتفاق ہوا۔ لندن (انگلینڈ) جنیوا (سوئزرلینڈ) اور فرینکفرٹ (جرمنی) سفر کے خاتمہ پر جنیوا سے میں ۱۰ دسمبر ۱۹۸۶ کو صبح سات بجے روانہ ہوا۔ واپسی کے سفر میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۵ گھنٹے لگے۔ اس لحاظ سے مجھے ۱۰ بجے رات تک دہلی پہونچ جانا چاہئے تھا۔ مگر میں دہلی پہونچا تو یہاں کی گھڑیوں میں رات کے ۲½ بج رہے تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ہندستان اور سوئزرلینڈ کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔

ایک سفر

ایک عالمی اسلامی کانفرنس (۱۵ ستمبر تا ۲۰ ستمبر ۱۹۸۶) میں شرکت کے لیے افریقہ کا سفر ہوا۔ یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ واقعات سے بھرا ہوا (eventful) سفر تھا۔ اگر اس کی تمام باتیں لکھی جائیں تو شاید پورا الرسالہ بھر جائے گا تاہم میں اس کی مختصر روداد بیان کروں گا۔ ۱۴ ستمبر کی شام کو دہلی کے نئے ہوائی اڈہ (اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ) پہونچا۔ جدید طرز کا یہ ایرپورٹ دو ہزار ہیکٹیر رقبہ میں بنایا گیا ہے۔ اس کا اضافہ شدہ بجٹ ۱۰۰ کرور روپیہ تھا۔ اگرچہ اس کی آخری تکمیل ابھی باقی ہے۔ تاہم اس کا رسمی افتتاح یکم مئی ۱۹۸۶ کو کیا گیا ہے۔

اب پالم کا قدیم ہوائی اڈہ ملک کی اندرونی پروازوں کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ نیا ہوائی اڈہ جب آخری طور پر مکمل ہوگا تو وہ سالانہ ۳۵ ملین مسافروں کو چڑھا اور اتار سکے گا۔ یہاں بیک وقت ایک سو ہوائی جہازوں کے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ہوگی۔ نئے ہوائی اڈہ کی بلڈنگ اور اس کا نظام جدید بین اقوامی معیار پر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ یہاں بیک وقت ۱۴ جہاز اتر سکتے ہیں یا روانہ ہو سکتے ہیں۔ پانی کے معقول انتظام کے لیے ۲۴ ٹیوب ویل لگائے گئے ہیں۔ سامان منتقل کرنے کی پٹی (conveyer belt) کو جدید طرز کا بنایا گیا ہے تاکہ مسافروں کو اپنا سامان لینے کے لیے کم سے کم انتظار کرنا پڑے۔ قدیم ہوائی اڈہ پر صرف ۲۲ کاونٹر تھے۔ یہاں ۸۰ کسٹم کاونٹر بنائے گئے ہیں۔ ٹیلی فون کی ۵۰۰ لائنیں ہیں جو الکٹرانک سسٹم پر قائم ہیں۔ یہاں مشینی زینہ (escalator) لگایا گیا ہے۔ ہوائی جہاز پر چڑھنے اور ہوائی جہاز سے اترنے کے لیے اس سے پہلے قدیم طرز کی سیڑھی (tarmac) ہوتی تھی۔ اب جدید طرز کے معلق پل (aero-bridge) بنائے گئے ہیں جو جہاز کے دروازہ سے جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔ تاہم کھلی سیڑھی سے چڑھنے اترنے میں جو رومانی منظر ہوتا ہے وہ بند قسم کے ایرو برج سے چڑھنے اور اترنے میں موجود نہیں۔ نیز کارکردگی کے اعتبار سے صورت حال زیادہ اطمینان بخش نہیں۔ مثلاً اندرا گاندھی ایرپورٹ سے ہم نے اپنے دفتر میں ٹیلی فون کرنا چاہا۔ مگر بار بار نمبر ملانے کے باوجود ایسا ہوا کہ دوسری طرف سے "ہلو" کی آواز آتی تھی۔ مگر ہماری آواز نہیں

بالکل سنائی نہیں دیتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کافی کوشش کے باوجود گفتگو نہ ہوسکی۔

اس ایرپورٹ پر جو خصوصی اہتمام کیے گیے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایرپورٹ کی دیواروں پر ہندستان کی ہوابازی کی کہانی مصور کی گئی ہے۔ یہ تصویرکشی انتہائی اعلیٰ مصوروں نے کی ہے، مثلاً ایم ایف حسین اور کے کیم راج۔ اس میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندستانی ہوابازی کی کہانی کا آغاز دیومالائی قصوں سے کیا گیا ہے جب کہ دیوتا اپنے پشپ ویمان (Flowercraft) میں سوار ہوکر سفر کرتے تھے اور اس کا آخری منظر اس مرحلہ پر ختم ہوتا ہے جب کہ سٹلائٹ اور کمپیوٹر ہوابازی کے عمل میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ (ٹائمس آف انڈیا ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۵)

ماضی پرستی کے ساتھ مستقبل پسندی کی اسی ذہنیت پر اقبال احمد سہیل مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

آگے ہیں قدم پیچھے ہے نظر جانا ہے کہاں جاتے ہیں کدھر مبہم ہے یہاں خود سمت سفر نیرنگ زمانہ کیا کہیے

اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایرپورٹ پر آرٹ ورک کا کام اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا ہے۔ اس آرٹ ورک کے لیے ابتدائۃً تین لاکھ روپے کی منظوری دی گئی تھی مگر "ماہرین" نے حکومت کو مطلع کیا کہ تین لاکھ روپیہ پیش نظر کام کے لیے بہت ناکافی ہے۔ اس کے بعد حکومت نے زبردست فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے تین ملین (۳۰ لاکھ) روپے اس کے لیے منظور کر دیئے۔

اس ۳۰ لاکھ روپے کے منصوبہ کا ٹھیکہ لینے کے لیے بہت سے امیدوار دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ مگر اس کا ٹھیکہ جس کو ملا وہ مشہور مسلم آرٹسٹ ایم۔ ایف حسین تھے۔ مسٹر حسین کو ٹھیکہ ملنے کی وجہ ان کی فنی مہارت کے علاوہ یہ بھی تھی کہ پہلے انھیں ایرپورٹ کا ایک جزئی کام دیا گیا تھا جس کو انھوں نے وقت سے کافی پہلے مکمل کر دیا (ہندستان ٹائمس ۳ دسمبر ۱۹۸۵)

آدمی اگر کسی اعتبار سے امتیازی کارکردگی کا مقام حاصل کرے تو وہ تعصب اور تنگ نظری سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا اعتراف پاکر رہتا ہے، خواہ وہ ایک فرقہ کا آدمی ہو یا دوسرے فرقہ کا۔

افریقہ کا یہ سفر براستہ کراچی ہوا۔ دہلی سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا. جہاز کے اندر پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۶) دیکھنے کو ملا۔ اس کا نصف حصہ اردو زبان میں تھا اور نصف حصہ انگریزی زبان میں۔ جہاز کے اعلانات کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم

اور قرآن کی آیت (سُبحانَ الّذی سَخّرلَنَا ھٰذا وَمَا کُنّا لہٗ مقرنینَ) سے ہوا۔ درمیانی اعلانات میں بھی ہمیشہ انشاءاللہ کا لفظ شامل رہتا تھا۔ کیپٹن وقار اس کے پائلٹ تھے۔ جہاز کے اندر کا نظام دوسری کئی ہوائی کمپنیوں سے بہتر نظر آیا۔

کراچی سے جہاز بدلنا تھا۔ یہاں دو رات اور ایک دن قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام ایرپورٹ ہوٹل میں تھا۔ یہ ہوٹل پی آئی اے نے اپنے ٹرانزٹ مسافروں کے لیے بنایا ہے۔ وسیع ہوٹل کے اندر ایک چھوٹی سی بغیر چھت کی مسجد بھی موجود تھی۔ وہ شاندار ہوٹل کے اندر غیر شاندار حالت میں نظر آئی۔ تاہم واپسی کے بعد جب میں دوبارہ ۲۳ ستمبر کو اس ہوٹل میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ یہ مسجد دراصل زیر تعمیر تھی۔ چنانچہ واپسی میں وہ اپنی دیوار اور چھت کے ساتھ مکمل کھڑی ہوئی نظر آئی ـــــ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سرسری مشاھدہ کی بنیاد پر ایک رائے قائم کر لیتا ہے جس کی تصدیق بعد کے مشاھدہ سے نہیں ہوتی۔

کراچی ایرپورٹ پر ایرپورٹ کے شایان شان چھوٹی سی خوبصورت مسجد موجود تھی۔ یہاں ہم نے سکون کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی۔

پچھلے پندرہ سال سے ایک عجیب وغریب عمل ساری دنیا میں جاری ہے جس کو فضائی قذاقی (hijacking) کہا جاتا ہے۔ ۱۲ ستمبر کی شام کو میں کراچی ایرپورٹ پر اترا تو اس سے صرف چند دن پہلے (۵ ستمبر ۱۹۸۶) کو پان ایم کی فلائٹ ۷۳ کے ساتھ اسی قسم کا ایک دہشت خیز واقعہ یہاں ہو چکا تھا۔ آج کل ہوائی اڈوں پر مسافروں کی زبردست چیکنگ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کیسے ممکن ہوتا ہے کہ لوگ آتشیں ہتھیار لے کر ہوائی جہازوں کے اندر داخل ہو جائیں، یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی۔ اگر چیکنگ کا موجودہ نظام اس کو روکنے کے لیے ناکافی ہے تو پھر ہزاروں بے قصور مسافروں کو اس سخت عمل سے گزارنے کا جواز کیا ہے جس کو سکیورٹی چک کہا جاتا ہے۔ کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ گنہ گاروں کی سزا بے گناہوں کو دی جائے۔

فضائی قذاقی سے نمٹنا ایک بے حد نازک کام ہے۔ کسی ملک کی مسلح پولس ہوائی جہاز کے اندر داخل ہو کر ان کو چند منٹ میں ہلاک کر سکتی ہے۔ مگر نزاکت یہ ہے کہ فضائی قذاقوں کے ہاتھ میں خطرناک ہتھیار ہوتے ہیں۔ جب ان پر وار کیا جائے گا تو وہ بھی ضرور اپنا ہتھیار استعمال کریں گے

اور اس دوطرفہ جنگ میں بے گناہ مسافر مارے جائیں گے ، جیساکہ کراچی کے ہوائی اڈہ پر پان ایم کے جہاز کے ساتھ عملاً پیش آیا۔ اس جہاز میں چار سو مسافر تھے ان میں سے ڈیڑھ درجن آدمی مرگیے اور تقریباً ڈیڑھ سو آدمی زخمی ہوئے ۔ (ٹائم میگزین ۱۵ ستمبر ۱۹۸۶)

چنانچہ فضائی قذاقی سے نمٹنے کے لیے کچھ مسلمہ اصول (Accepted rules) ہیں ۔ جن کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے ——— گفت وشنید کرو ، گفت وشنید کرو ، گفت وشنید کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو ، وقت حاصل کرو :

Negotiate, negotiate, negotiate.
Buy time, buy time, buy time.

مسئلہ جتنا زیادہ نازک ہو ، اتنا ہی زیادہ حکمت کے ساتھ اس سے نپٹنا پڑتا ہے ۔ اگرچہ نادان آدمی نازک مسئلہ اور غیر نازک مسئلہ کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ وہ دونوں سے یکساں انداز سے نپٹنے کی کوشش کرتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف مسائل میں اضافہ کا سبب بنتا ہے ، وہ کسی درجہ میں بھی مسئلہ کو کم نہیں کرتا ۔

کراچی کے ہوٹل میں کھانے کے وقت ایک بار ایک پٹھان ہماری میز کے دوسری طرف آکر بیٹھ گیا ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ سرحد کے رہنے والے ہیں ۔ اور ابوظبی سے آرہے ہیں ۔ میں نے پوچھا کہ آپ ابوظبی میں کیا کام کرتے ہیں ۔ انھوں نے کہا کہ "مزدوری" ۔ اس کے بعد انھوں نے میرے بارہ میں سوالات پوچھنا شروع کیے ۔ جب میں نے بتایا کہ میں ہندستان کا رہنے والا ہوں اور افریقہ جا رہا ہوں ، تو انھوں نے کہا :

افریقہ میں کیا کرتے ہو ، کیا وہاں مزدوری کرتے ہو ۔

اس سوال پر میں خاموش رہا اور ان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ آدمی جس طبقہ کا ہو ، اسی طبقہ کے مطابق اس کا فکر بھی بنتا ہے ۔ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا نہایت نادر خصوصیت ہے ۔ حتی کہ خواص بھی اس معاملہ میں اتنا ہی پیچھے ہیں جتنا کہ عوام ۔

ہوائی جہاز کا سفر بے حد نازک سفر ہے ۔ کسی بھی لمحہ کوئی ہنگامی صورت پیش آسکتی ہے جو واقعات کے رخ کو تبدیل کر دے ۔ ہم کراچی سے روانہ ہوئے ۔ ابتداءً یہ نہایت ہموار پرواز تھی ۔ سات گھنٹہ

کی مسلسل اڑان کے بعد ہم کو منزل پر پہونچنا تھا۔ مگر چند گھنٹے کے بعد خطرے کا الارم بجنے لگا۔ پھر اعلان ہوا کہ بعض "ٹکنکل سبب" کے تحت جہاز درمیان میں اتارا جا رہا ہے۔ دوران پرواز پائلٹ نے عمان ایرپورٹ سے رابطہ قائم کیا اور اس سے اجازت لے کر جہاز کو نیچے اتارنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ عمان کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ جیسے ہی جہاز کے پہیے نے زمین کو چھوا، مسافروں نے خوشی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجائیں۔ کیوں کہ یہ بھی ممکن تھا کہ جہاز ہوائی اڈہ پر اترنے کے بجائے کسی کھڈ میں جا گرے۔

عمان (اردن) میں ہم ساڑھے سات گھنٹہ تک رکے رہے۔ جہاز کے ایک انجن نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ انجینیروں نے مسلسل محنت کر کے اس کو درست کیا، اس کے بعد جہاز دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہوا۔

تقریباً دو سو مسافر عمان کے ہوائی اڈہ پر پہونچا دیے گیے۔ عمان کا ہوائی اڈہ چھوٹا مگر خوبصورت ہے۔ یہاں ہم نے دو نمازیں پڑھیں، ایک ظہر کی اور دوسری عصر کی۔ میں نے دیکھا کہ مسافروں کی اکثریت یا تو باتیں کر رہی ہے یا سگریٹ کا دھواں اڑانے میں مشغول ہے۔ کوئی چپ کی دنیا میں مشغول ہونے والا نظر نہ آیا۔ جن لوگوں کے پاس اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے کچھ نہ ہو وہ بیرونی کلام میں مشغول ہوتے ہیں۔ جن کو اپنے اندر سفر کرنے کے لیے راستہ نہ ملے، وہ باہر کے راستوں پر دوڑتے ہیں۔

عمان کے ساڑھے سات گھنٹے بڑے سخت گزرے۔ بظاہر وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ کھانے پینے کا انتظام بھی موجود تھا۔ آرام دہ نشستیں تھیں جن پر کوئی بیٹھا تھا اور کوئی لیٹا ہوا تھا۔ ضروریات کا تمام سامان مہیا تھا۔ مگر مجھ پر اَلانتظارُ اشدُّ مِنَ الموتْ کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے کہا: خدایا، عاجز انسان خیالی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، پھر آخرت میں وہ حقیقی تکلیف کو کس طرح برداشت کرے گا۔

عمان کے ہوائی اڈہ پر بڑے بڑے فریموں میں تاریخی آثار (الکرک، جرش، عقبہ، موتہ وغیرہ) کی تصویریں کثرت سے لگی ہوئی تھیں۔ موجودہ اردن کی تجارتی یا تمدنی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں۔ مگر تاریخی اعتبار سے وہ زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سیاح کثرت سے تاریخی آثار

کو دیکھنے کے لیے آتے رہتے ہیں۔

عمان اردن کی راجدھانی ہے۔ جون ۱۹۶۷ میں عرب۔ اسرائیل جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے دوسرے علاقوں کے علاوہ، دریائے اردن کا مغربی حصہ اور یروشلم کا اردنی سکٹر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ اسرائیل کے اس زیر قبضہ علاقہ کا رقبہ ۲۲۰۷ مربع میل ہے، یعنی اردن کے پورے رقبہ کا ۶ فی صد۔ اس مقبوضہ علاقہ میں اردن کا تقریباً نصف قابل زراعت حصہ شامل ہے۔ اردن میں ۳۰۰۰ سال قبل مسیح کے آثار پائے جاتے ہیں۔

۱۴ ستمبر کی شام کو ہم طرابلس پہونچے۔ یہاں کے وقت اور ہندستان کے وقت میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق ہے۔ طرابلس کا لفظ ٹریپولی (Tripoli) کی تعریب ہے۔ اور ٹریپولی ٹرائی پولس (Tripolis) سے بنا ہے۔ یہ نام اس کو ابتداءً فینیقیوں نے دیا تھا۔ Tri کا مطلب یونانی اور لاتینی میں تین ہوتا ہے۔ ٹرائی پولس کے معنی تین شہر کے ہیں۔ یہی لفظ بعد کو انگریزی میں ٹریپولی ہوگیا۔ یہ شہر ساتویں صدی قبل مسیح میں فینیقیوں (Phoenicians) نے بسایا تھا۔ اس کے بعد وہ رومیوں کے قبضہ میں آیا۔ انھوں نے بھی یہ نام باقی رکھا۔ فینیقیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ شہر کو تین حصے کی صورت میں آباد کرتے تھے، اور اس بنا پر اس کا نام تین شہر (ٹرائی پولس) رکھتے تھے۔

یہاں میرا قیام فندق باب البحر (کمرہ نمبر ۵۱۹) میں تھا۔ یہ ہوٹل سمندر (میڈیٹرینین) کے عین کنارے بنایا گیا ہے۔ کمرہ کے ایک طرف سمندر کی لہریں حد نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہاں قدرت کی اتھاہ خاموشی کو صرف وہ مشینیں توڑتی تھیں جو صبح سویرے سے اپنے کام میں لگ جاتی تھیں۔ ان کا کام تھا، سمندر کے ساحلی حصہ کو پاٹ کر خشک زمین میں تبدیل کرنا تاکہ وہاں تعمیرات کھڑی کی جاسکیں۔

قدیم ترین زمانہ میں آدمی خشکی پر سفر کرتا تھا، پھر اس نے کشتی اور جہاز بنائے اور سمندروں کے ذریعہ زیادہ آسانی کے ساتھ دور دور کا سفر کیا جانے لگا۔ اب انسان فضا میں مزید تیز رفتاری کے ساتھ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سفر کرتا ہے۔

ان چیزوں کو مورخین انسانی ترقی کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کو آلاء اللہ کے عنوان کے تحت بیان کیا جانا چاہیے۔ یہ دراصل خدا ہے جو انسان کو سفر کراتا ہے۔ خشکی اور سمندر اور

فضا کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص قوانین کا پابند بنایا ہے ۔ اگر یہ قوانین نہ ہوں یا وہ انسان کے ساتھ موافقت نہ کریں تو انسان خشکی میں بھی سفر نہیں کر سکتا ، کجا کہ وہ سمندروں میں تیرے اور فضاؤں میں اڑے ۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے : سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ہٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ ۔

سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر خدا کی عظمت کا بڑا پر رعب احساس ہوتا ہے ۔ پانی کا اتھاہ خزانہ ، ساحل سے ٹکراتی ہوئی موجیں ، حد نظر تک پھیلا ہوا آسمان ۔ یہ چیزیں آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں ۔ اس پر عظمت منظر کو دیکھتے ہوئے میری زبان سے نکلا : بنانے والے نے کیسی عجیب دنیا بنائی ، ایک ایسی دنیا جو دہشت ناک حد تک عجیب ہے ۔

ایک وسیع ہال میں باجماعت نماز کا انتظام تھا ۔ بعض باتیں ایسی ہیں کہ ایک مانوس ماحول میں بار بار اس کو سنا جائے تو آدمی اس کا عادی ہو جاتا ہے ۔ مگر وہی بات ایک غیر مانوس ماحول میں سننے کو ملے تو وہ آدمی کو غیر معمولی طور پر متاثر کرتی ہے ۔ یہ ہال جس کے ایک طرف سمندر کا منظر تھا اور دوسری طرف نمازیوں کے چہرے ۔ اس ماحول میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عربی لہجہ میں فجر کی اذان دی :

اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ، اَشْہَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ، اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ ، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ،

یہ فجر کا اول وقت تھا ۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ ایسے ماحول میں جب یہ پر شکوہ الفاظ گونجے تو دل کی عجیب کیفیت ہوئی ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے مؤذن کی آواز کائنات کی ہم نوا ہو گئی ہے ، جیسے مؤذن عالم گیر سناٹے کو توڑتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے جس کے اعلان کے لیے سارے زمین و آسمان بے قرار ہو رہے تھے ۔

کانفرنس میں ایک مقرر نے نماز سے متعلق حضرت عمرؓ کا واقعہ بیان کیا ۔ اس کے بعد اس نے نہایت پر جوش انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ہوٹل میں ایک ہال کو مسجد کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے ۔ وہاں روزانہ اذان ہوتی ہے ، مگر میں دیکھتا ہوں کہ جب اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو بہت کم لوگ ہیں جو مسجد کی طرف دوڑ کر جاتے ہوں ، مگر خود مقرر صاحب

کا یہ حال تھا کہ پروگرام کے تحت ہونے والی نمازوں (مثلاً مغرب) میں تو وہ مسجد میں نظر آتے تھے۔ مگر اس کے بعد ان کو مسجد میں پانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ کبھی فجر کی جماعت میں شریک ہوئے ہوں، یہاں مغرب کی جماعت میں سب سے زیادہ آدمی ہوتے تھے اور فجر کی جماعت میں سب سے کم۔

اس کانفرنس میں تقریباً ۸۵ ملکوں کے ۴۰۰ علمار اور دانشور شریک ہوئے۔ کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جلسہ نے کہا :

نحن هنا من كل انحاء العالم الاسلامي بل من كل انحاء العالم

یہ کانفرنس دعوت اسلامی کے موضوع پر تھی۔ یہی ایک جذبہ لے کر ہر شخص اس میں شریک ہوا تھا کہ اسلام کی دعوت کو از سر نو زندہ اور غالب کیا جائے۔ مگر یہاں اور دوسرے مواقع پر گفتگو کے بعد میرا تاثر یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا میں مسلمان ایک ہی قسم کے ذہنی انتشار سے دوچار ہیں۔ اور وہ یہ کہ وہ دعوت اسلام اور دفاع اسلام کو الگ الگ کرکے دیکھ نہیں پاتے۔ وہ دعوت کے عنوان پر بولنا شروع کرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی دفاع کے موضوع پر پہونچ جاتے ہیں اور پھر تقریر کی پوری ٹرین دفاع کے موضوع پر چلتی ہے اور اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔

یہاں کئی ایسے لوگ ملے جو الرسالہ (انگریزی) کے قاری تھے۔ ہر ایک نے غیر معمولی الفاظ میں اس کی زبان و بیان کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ ایک امریکی نومسلم سے میں نے الرسالہ (انگریزی) کے بارہ میں ان کا تاثر پوچھا تو وہ بار بار ممتاز ممتاز (Excellent, Excellent) کہتے رہے۔

افریقہ میں جو لوگ الرسالہ (انگریزی) کا افریقی اڈیشن نکال رہے ہیں، ان میں سے ایک صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ افریقہ میں الرسالہ (انگریزی) کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ لوگ بہت شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

میرا مقالہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۶ کی نشست میں تھا۔ یہ مقالہ عربی میں تھا اور اس میں دکھایا گیا تھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آج کے دور میں اپنی نفع بخشی کھودی ہے۔ خدا کا قانون اس دنیا کے لیے یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اپنے آپ کو نفع بخش ثابت کرے اس کو عزت اور استحکام ملے۔ مسلمان جب تک اپنے آپ کو اس قانون کا مصداق ثابت

نہ کریں وہ بلند مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ مقالہ (اسلام دور جدید میں) انشاء اللہ الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔ یہ مقالہ کانفرنس کی طرف سے تین زبانوں میں تقسیم کیا گیا ـــــــــ عربی، انگریزی، فرانسیسی۔

یہ عالمی موتمر ۱۵ ستمبر سے ۲۰ ستمبر تک جاری رہی۔ موتمر کی صورت یہ تھی کہ مختلف اہل علم کو پیشگی طور پر متعین موضوعات بھیج دیئے گئے تھے۔ میرے محاضرہ کا عنوان تھا:

حاجة للمسلمين الى الاخذ باسباب التقدم العلمي والتقني

ہر نشست میں ضروری رسمی کارروائیوں کے بعد محاضر اپنا محاضرہ پیش کرتا۔ اس کے بعد لوگوں کو اظہار خیال کا موقع دیا جاتا۔ آخر میں محاضر لوگوں کے سوالات کا جواب دیتا۔ میرے محاضرہ میں ایک بات یہ کہی گئی تھی کہ توحید اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ توحید کو ماننے ہی کے نتیجہ میں ہمارے اسلاف نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے۔ اس پر ترکی کے ایک پروفیسر نے سوال کیا کہ توحید میں اور سائنسی ترقیوں میں کیا تعلق ہے۔

میں نے کہا کہ توحید محض ایک رسمی عقیدہ نہیں، وہ ایک ذہنی و فکری انقلاب ہے، بلکہ سب سے بڑا فکری انقلاب ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ تمام علمی ترقیاں ذہنی انقلاب ہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہیں۔ ذہنی انقلاب آدمی کی پوری شخصیت کو جگا دیتا ہے۔ اس کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور اسی کے نتیجہ کا نام علمی ترقی ہے۔ ہمارے اسلاف کے لیے توحید ایک عظیم ذہنی انقلاب تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس قابل بنے کہ ہر قسم کی اعلیٰ ترین ترقیاں حاصل کریں۔ مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے توحید محض ایک رسمی عقیدہ ہے اس لیے وہ جدید دنیا میں کوئی بڑا کارنامہ بھی انجام نہ دے سکے۔

محاضرات کے علاوہ دعوت اور احوال مسلمین کے بارے میں مختلف تجویزیں پیش کی گئیں۔ مختلف ملکوں میں اسلامی دعوت کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ اور اس کی روشنی میں پروگرام بنائے گیے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۶ کی نشست میں راقم الحروف کو صدر (رئیس الجلسہ) بنایا گیا۔ ایک عربی مجلہ نے میرا تفصیلی انٹرویو لیا جو اس کی کسی اگلی اشاعت میں شائع ہوگا۔ بعض اور جرائد انٹرویو

جدول الاعمال

الاثنين:

11 / محرم / 1407
15 September 1986

10,00 صباحا . الافتتاح بنشيد الله اكبر
10,05 : القرآن الكريم
10,15 : تقديم من المقرر العام
10,30 : الكلمات
1- كلمات مندوبي المنظمات العالمية
2- كلمة الافتتاح
3- كلمة الوفود
1200 استراحة
01,10 مساء : صلاة الظهر
0404 مساء : صلاة العصر
05,00 مساء : الجلسة المسائية
05,05 مساء : كلمة المقرر العام
05,30 مساء : تقرير الامين العام
06,00 مساء : البحوث

إقامة الدين بالدعوة الى الله وتبليغه كما انزل

أ ـ الدكتور عبد الرزاق اسكندر خان
عضو المجلس العالمي واستاذ بجامعة العلوم الاسلامية بكراتشي / الباكستان

ب ـ الاستاذ محمد شوذهري عضو المكتب التنفيذي لاتحاد المجالس الاسلامية لشرق ووسط وجنوب افريقيا

07,00 ـ استراحة
07,26 ـ صلاة المغرب
07,45 ـ مناقشة البحوث
08,56 ـ صلاة العشاء

الثلاثاء

12 / محرم 1407
16 September 1986

08,00 صباحا بدء الجلسة الصباحية
08,30

اقامة الدين :

أ بممارسة الشورى فى الامور العامة والخاصة
الاستاذ ابراهيم الفويل مقرر عام المجلس العالمي للدعوة الاسلامية

ب : الاسس العقائدية والاخلاقية فى مواجهة الاستغلال
د / حسن سلمان المنتدى الاسلامي ـ باريس

10,00 مناقشة البحثين
11,30 استراحة
12,00

اقامة الدين بالتصدي لما يهدد المسلمين من اخطار .. بالجهاد فى سبيل الله
مبارك قسم الله زائد عضو المجلس العالمي للدعوة الاسلامية والمدير التنفيذي لمنظمة الدعوة الاسلامية ـ الخرطوم

12,30 مناقشة
01,10 صلاة الظهر
الجلسة المسائية

04,40 مساء صلاة العصر
05,00 **اقامة الدين بالاخذ بالتقدم العلمي والتقني**
الدكتور وحيد الدين خان عضو المجلس العالمي للدعوة الاسلامية / ورئيس مركز البحوث والدعوة بالهند

05,30 مناقشة البحث

اقامة الدين بالمحافظة على الشعائر الاسلامية كما انزلها الله وكما اداها رسوله صلى الله عليه وسلم فى السنة العملية
الاستاذ / احمد راجح (استاذ بفرع كلية الدعوة الاسلامية / دمشق

نبذ الخرافات والشعوذة الدخيلة التى لوثت على المسلمين عقيدتهم
الدكتور عبد المنعم خطاب رئيس المركز الاسلامي بمدينة توليدو اوهايو الولايات المتحدة

08,30 مساء مناقشة
08,55 مساء صلاة العشاء

الاربعاء

13/ محرم / 1407
17 September 1986

08,00 صباحا بدء الجلسة الصباحية
08,30 صباحا : عدم التفرق في الدين

أ : الاسلام دين الفطرة .. ومصدره الاسمى القرآن الكريم
الدكتور محمود ايوب استاذ بجامعة تورنتو كندا

نبذ المذاهب التى فرقت المسلمين
الدكتور محمد زكي بدوى عضو المجلس العالمي للدعوة الاسلامية وعميد الكلية الاسلامية بلندن بريطانيا

لینا چاہتے تھے، مگر میں اس کے لیے وقت نہ نکال سکا۔ ٹیلی وژن پر مجھ سے انٹرویو دینے کے لیے کہا گیا، مگر میں ان کی اس فرمائش کو بھی پورا نہ کر سکا۔

مسائل کے مطالعہ میں ایک عام غلطی یہ کی جاتی ہے کہ حقیقی باتوں اور غیر حقیقی باتوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مطالعہ غلط ہو جاتا ہے۔ مثلاً نائجیریا کی خاتون (زینب) نے اپنی پرجوش انگریزی تقریر میں عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک پر سخت احتجاج کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے عورتوں کو گھر میں رکھنے کا ذکر کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ عورتوں کا ختنہ کیا جاتا ہے جو عورتوں کے اوپر سراسر ظلم ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ گھر کا معاملہ عورتوں کے سپرد کرنا ایک صحیح اسلامی تعلیم ہے اور اس کی حکمت تقسیم کار ہے۔ جب کہ عورتوں کا ختنہ سراسر ایک جاہلانہ رواج ہے جو افریقہ کے بعض قبائل میں پایا جاتا ہے، مگر اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح ایک صاحب ساؤتھ افریقہ سے آئے تھے۔ انھوں نے حج کے "مراسم" پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔ انھوں نے حج کے واقعی اور ثابت شدہ مراسم پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسی میں یہ بات بھی شامل کر دی کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حجر اسود پہلے سفید تھا۔ مگر وہ انسانوں کے گناہ سے کالا ہو گیا۔ مگر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حج کے ثابت شدہ مراسم فی الواقع حج کے اجزاء ہیں۔ جب کہ حجر اسود کا سفید سے کالا ہو جانا ایک بے بنیاد کہانی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

میں ۱۹۵۷ سے ۱۹۶۲ تک جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مجھے بہت سی جماعتوں اور تنظیموں کے اجلاس میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے مشترک طور پر ہر جگہ یہ بات پائی ہے کہ لوگ الفاظ پر اس قدر بحث کرتے ہیں جیسے کہ ان کے یہی الفاظ تاریخ بننے والے ہیں۔ جو لفظ وہ اجتماع گاہ میں کاغذ پر لکھدیں گے وہی باہر کی دنیا میں پہونچ کر واقعہ بن جائیں گے۔

مثلاً اس موتمر کے آخری اجلاس میں ایک تجویز پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے تجویز پیش کی کہ ایران۔عراق جنگ کے بارہ میں ایک تجویز پاس ہو اور اس کو دونوں ملکوں کے ذمہ داروں

کے نام روانہ کیا جائے۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں ممالک شہروں میں جنگ کو بند کردیں۔ اس تجویز میں ابتداءً ایقاف الحرب فی المدن (شہروں میں جنگ نہ کرنے) کا لفظ تھا۔ دوسرے شخص نے پرجوش طور پر کہنا شروع کیا کہ نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ یہ جنگ مکمل طور پر بند ہو، اس لیے تجویز میں ایقاف الحرب نہائیاً کا لفظ لکھا جائے۔ اب اس پر بحث چل پڑی کہ یہ لفظ لکھا جائے کہ وہ لفظ لکھا جائے۔ اور کافی دیر تک اس پر تکرار ہوتی رہی۔

یہ طے شدہ ہے کہ اس تجویز کے نتیجہ میں نہ شہروں کی جنگ رکنے والی ہے اور نہ یہ ہونے والا ہے کہ اس کے ایران اور عراق پہونچتے ہی جنگ کا مکمل خاتمہ ہوجائے۔ اس قسم کے واقعات حقائق کے زور پر ایک یا دوسری صورت میں فیصل ہوتے ہیں نہ کہ الفاظ کے زور پر۔

سوڈان کے ایک عالم اسٹیج پر آئے۔ ان کو ایک محاضرہ پر اپنی رائے کا اظہار کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس محاضرہ میں بہت سی غلطیاں کی گئی ہیں۔ میں ان کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔ مگر پروگرام کے مطابق چوں کہ بہت کم وقت دیا گیا ہے، اس لیے میں محاضر کو اس کی صرف ایک غلطی کی طرف متوجہ کروں گا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ محاضر نے اپنے لکچر میں قرآن کی آیت انی جاعل فی الارض خلیفۃ کا ذکر کیا ہے اور اس کی تشریح یہ کی ہے کہ قوم یخلف بعضہم بعضا۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ خلیفہ کا یہ مفہوم غریب مفہوم ہے۔ میں نے تفسیر کی جتنی کتابیں دیکھی ہیں ان میں سے کسی کتاب میں یہ معنی مذکور نہیں:

لم یرد ھذا المعنی فی ای کتاب من کتب التفسیر اطلعت علیہ

یہ اس بات کی ایک دلچسپ مثال ہے کہ اکثر لوگ اپنی بے خبری کو یقین کا قائم مقام بنا لیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیفہ کا مذکورہ مفہوم واضح طور پر تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

ترکی کے نمائندہ استاد اوغلو نے عربی زبان کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا کہ اسلامی کانفرنسوں میں میں نے دیکھا ہے کہ عربی زبان کے بعد جو دوسری زبانیں استعمال ہوتی ہیں وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں ہیں۔ میری تجویز ہے کہ اس صورت حال کو بدلا جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مسلم نسلوں کو ترکی اور اردو زبانیں پڑھائی جائیں جو کروروں مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اس طرح ترکی اور اردو دھیرے دھیرے عربی کے بعد استعمال ہونے والی زبانیں بن جائیں گی۔

بظاہر یہ ایک بہت اچھی تجویز معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک تمنا ہے جو عملاً ممکن نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مادری زبان کے بعد دوسری زبانیں جو آدمی سیکھتا ہے وہ ہمیشہ مادی عوامل کے تحت سیکھتا ہے۔ انگریزی یا فرانسیسی اسلامی کانفرنسوں کی سکنڈ لنگویج اس لیے بنی ہوئی ہے کہ لوگوں کے مادی مصالح انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان زبانوں کو سیکھیں۔ جب تک کوئی ایسا انقلاب نہ آئے جو ترکی اور اردو جیسی زبانوں کو وہی مقام دیدے جو انگریزی زبان کو یا فرانسیسی زبان کو عالمی سطح پر حاصل ہے، اس وقت تک اس قسم کی کسی تجویز کا واقعہ بننا ممکن نہیں۔

مفتی شام (حلب) نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں اپنے پچاس سال کے تجربات (بتجارب خمسین سنة) کی روشنی میں کہتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کی ناکامی کی اصل وجہ اسلامی داعیوں کا عنف (شدت) ہے۔ انھوں نے ہر ملک میں غیر ضروری طور پر مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کیا۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی داعیوں اور مسلم حکمرانوں کے درمیان لامتناہی جنگ چھڑ گئی۔ اگر اسلامی داعیوں نے مسلم حکمرانوں سے ٹکراؤ کی پالیسی اختیار نہ کی ہوتی تو آج اسلامی دعوت کی تاریخ دوسری تاریخ ہوتی۔ یہی بات جمہوریہ یوگنڈا کے نائب صدر الحاج موسیٰ تسکانگونے دوسرے انداز سے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اسلامی دعوت کو ترقی دینا ہے تو ہم کو کبھی بھی مذہب کے ساتھ سیاست کو نہیں ملانا چاہیے۔

دوسری مسلم کانفرنسوں کی طرح یہاں بھی میں نے کسی مقرر کی آواز میں درد کی جھلک نہیں پائی۔ اس میں میرے احساس کے مطابق صرف ایک استثنار تھا۔ اور وہ دکتور محمود ایوب (لبنان) کا تھا۔ وہ دونوں آنکھ سے محروم تھے اور سہارا دے کر اسٹیج پر لائے گیے تھے۔ اس نابینا مقرر کی آواز میں مجھے درد اور سوز محسوس ہوا مگر بینا مقررین میں سے کسی کی آواز میں میں نے درد اور سوز کی کیفیت نہیں پائی۔ یہ درد جو ایک شخص کے اندر حیاتیاتی صدمہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا، کاش یہی درد امت کے رہنماؤں کے اندر امت پر گزرنے والے صدمہ کی بنا پر پیدا ہو جائے تو سارا نقشہ اپنے آپ بدل جائے۔

دکتور محمود ایوب (لبنان) نے عربی میں بولتے ہوئے ایک شخص کے سوال کا حوالہ

دیا جس نے انگریزی زبان میں اپنا سوال پیش کیا تھا، اور پھر اچانک وہ انگریزی میں بولنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ ہیں جو بیک وقت کئی کئی زبانوں میں بول سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسا عجیب وغریب دماغ دیا ہے۔ جس طرح ریڈیو میں ایک بٹن دبا کر آپ ایک زبان کی نشریات سنتے ہیں اور دوسرا بٹن دبائیں تو دوسری زبان کی نشریات آنے لگیں گی، اور تیسرا بٹن دبائیں تو تیسری زبان کی۔ یہی حال زیادہ عجیب تر شکل میں انسانی دماغ کا ہے۔ کیسا عظیم ہوگا وہ خالق جس نے ایسے انسانی دماغ کو بنایا۔

یہ سوچتے ہوئے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوگیے۔ میں نے کہا کہ خدایا، مجھے ان لوگوں میں لکھ لیجیے جنھوں نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا، اس وقت جب کہ انھوں نے اس کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا، اس وقت جب کہ وہ اس کا اعتراف کرنے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔

ہر آدمی چیزوں کو اپنے اپنے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال نائجیریا کی ایک مسلم خاتون (زینب) کی تقریر میں سامنے آئی۔ ان دنوں ٹیلی وزن پر عمر مختار کی مشہور فلم دکھائی گئی تھی۔ خاتون نے کہا کہ میں نے پچھلی رات کو ٹیلی وزن پر عمر مختار فلم دیکھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فلم نہایت شاندار ہے۔ مگر طویل فلم میں سارا کردار صرف مرد ادا کرتے ہیں۔ واحد موقع جب کہ اس فلم میں عورت کو دکھایا گیا ہے، وہ موقع وہ ہے جب کہ عمر مختار کی بیوی کو اطالویوں نے گھر سے نکال کر سولی پر چڑھا دیا۔

اس تاریخی فلم کا ایک حصہ راقم الحروف کے سامنے بھی گذرا تھا۔ خاتون کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ تاہم میرے ذہن میں اس قسم کا خیال بھی نہیں آیا۔ مگر جب ایک آزادی پسند خاتون نے اس کو دیکھا تو اس کو پوری فلم میں سب سے زیادہ قابل لحاظ بات جو نظر آئی وہ یہ تھی کہ اس میں عورت کے کردار کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

فلم عمر مختار اور فلم گاندھی کا موضوع اس اعتبار سے مشترک ہے کہ دونوں ایک ایک ملک کی آزادی کی جدوجہد کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" زیادہ عظیم ہے۔ اس کی وجہ فن کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ خود کہانی کا فرق ہے۔ "گاندھی" ایک ایسے لیڈر کی کہانی کو مصور کرتی ہے جس نے "امن" کی طاقت سے ہندستان

کو آزاد کرایا۔ اس کے مقابلہ میں "عمر مختار" نے اطالویوں کا مقابلہ مسلح انداز سے کیا۔ گاندھی فلم میں اگر "پر امن مارچ" کے مناظر ہیں تو عمر مختار فلم میں دہشت اور خونخواری کے مناظر۔ یہی وہ فرق ہے جس نے "گاندھی" کے مقابلہ میں "عمر مختار" کو دیکھنے والوں کے لیے زیادہ پر شوکت بنا دیا ہے۔

آدمی خواہ بزدل ہو مگر وہ جنگ اور جہاد کی باتوں کو پسند کرتا ہے۔ "عمر مختار" میں اگرچہ فنی کمال بھی اپنے انتہائی درجہ پر ہے، تاہم اس میں اگر عمر مختار کی ماں یا ان کی بیوی کا وہ کردار دکھایا جاتا جب کہ انھوں نے گھر کو سنبھالا اور بچوں کی پرورش کی، تو اس قسم کے مناظر باعتبار حقیقت عظیم ہونے کے باوجود دیکھنے والوں کو عظیم نظر نہ آتے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ مار دھاڑ کی ایک فلم ہے، اور اسی چیز نے اس کو عظیم بنا دیا ہے۔ جنگی مشینوں کی گڑگڑاہٹ گولوں کے دھماکے، آگ اور خون کے ہولناک مناظر، میدان جنگ کا پر ہول نقشہ، فتح وشکست کے جذباتی لمحات اس قسم کی چیزیں اس میں کمال درجہ میں موجود ہیں۔ اور یہی اس کی کامیابی کا اصل راز ہے۔

ایک عرب نوجوان جو برلن (جرمنی) سے آئے تھے، انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم بحیثیت مسلمان امن کو پسند کرتے ہیں۔ مگر ہم کسی کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں:

اننا کمسلمین نحب السّلام ولکنّنا نرفض الاستسلام

بظاہر یہ ایک بڑی اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صرف ایک پر جوش کلمہ ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پرامن وہی شخص رہ سکتا ہے جو اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے۔ اس دنیا میں امن پسندی نام ہے بے امنی کے باوجود پر امن رہنے کا۔ مگر مذکورہ قسم کے پرجوش مقررین اس راز سے واقف نہیں۔

کانفرنس میں مختلف لوگوں نے اپنے اپنے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کی حالت کے بارے میں کتابچے اور رپورٹیں تقسیم کیں۔ ان میں کافی معلومات اور تجربات درج تھے جن کی تفصیل سفرنامہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سرینام کے وفد نے تین صفحہ کی ایک رپورٹ تقسیم کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت

سرینام کی مجموعی آبادی میں بیس فی صد مسلمان ہیں۔ اور پورے ملک میں ایک سو سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں موجود ہیں۔ رپورٹ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

> The immigration of Muslims in Surinam occurred in the 17th century when the African slaves were brought by the European slave traders to work in the fields. Many of these Africans were Muslims and when they arrived, they tried the utmost to keep their faith alive.

سرینام میں مسلمانوں کی مہاجرت ۱۷ ویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ جب کہ یورپ کے بردہ فروش افریقی غلاموں کو لے آئے تاکہ وہ یہاں کے کھیتوں میں کام کر سکیں۔ ان افریقیوں میں اکثر مسلمان تھے اور جب وہ یہاں آئے تو انھوں نے پوری کوشش کی کہ وہ اپنی دینی حیثیت کو باقی رکھ سکیں۔

یہ واقعہ جس کا ذکر یہاں سُرینام کے ذیل میں کیا گیا ہے، یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا میں پیش آیا۔ موجودہ زمانہ میں جب مغربی قومیں ابھریں اور انھوں نے تمام دنیا کو زیر کر لیا تو وہ اپنے مقبوضہ ملکوں (ہندستان، افریقہ وغیرہ) سے لاکھوں انسانوں کو لے گئے تاکہ انھیں اپنے زیر قبضہ علاقوں میں بطور مزدور استعمال کر سکیں۔ اس طرح مسلمان اچانک ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں آسٹریلیا سے لے کر باربیڈوز تک ہر جگہ مسلمانوں کی آبادیاں پائی جاتی ہیں۔

یہی واقعہ اس سے پہلے تاتاریوں کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔ تاتاریوں نے فتح کے بعد کثیر تعداد میں مسلمان عورتوں اور مسلمان مردوں کو غلام بنایا۔ تاہم اس وقت لوگوں کے اندر اسلام زندہ تھا۔ یہ مسلمان مرد اور عورت جہاں پہونچے وہاں انھوں نے تاتاریوں کے درمیان خاموش تبلیغ شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو نسل کے اندر بیشتر تاتاری مسلمان ہو کر اسلام کے پاسبان بن گئے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اگر دعوتی ذہن ہوتا تو وہی واقعہ دوبارہ نئی شکل میں پیش آتا جو تاتاریوں کے زمانے میں پیش آیا۔ جن مغربی قوموں کو اسلام دشمن قرار دے کر ہم ان کے خلاف بے معنی احتجاج میں مشغول ہیں، وہ قومیں آج اسلام کے دائرہ میں داخل ہو کر اسلام کی پاسبان بن چکی ہوتیں۔

۱۸ ستمبر کی شام کو ایک ہندستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن سے روانہ ہوکر یہاں پہونچے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں دوبارہ فساد ہو گیا ہے۔ اور اس فساد کا رخ مسلمانوں کی طرف ہے۔ اگرچہ بعد کی تحقیق نے بتایا کہ یہ خبر صحیح نہ تھی۔

ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کا سارا غصہ ہمیشہ "فسادیوں" کے خلاف ہوتا ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں ان فسادات کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتا ہوں۔ اس لیے میرے تمام احساسات کا رُخ صرف مسلمانوں کی طرف رہتا ہے۔ مجھے مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ حقائق کی دنیا میں حقائق سے بالکل بے پروا ہوکر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

ان فسادات کی جڑ میرے نزدیک یہ ہے کہ مسلمانوں نے ملک کو تقسیم کرایا، مگر وہ تقسیم کے نتائج قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ملک کو "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" میں تقسیم کرنے کا لازمی مطلب یہ تھا کہ مسلمان "ہندو انڈیا" میں اپنے لیے نمبر ۲ کی حیثیت قبول کرنے پر راضی ہیں۔ اگر مسلمانوں نے خود اپنے عمل کے اس نتیجہ کو ۱۹۴۷ کے بعد قبول کرلیا ہوتا تو حالات معمول پر آجاتے اور ملک کی تاریخ فرقہ وارانہ فساد کے بجائے فرقہ وارانہ تعمیر کی تاریخ ہوتی۔ (واضح ہو کہ نمبر ۲ کی حیثیت کا مطلب مسلمانوں کا درجہ گرانا نہیں، بلکہ صرف حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے)

مگر ملک کی جدید تاریخ کا یہ عجیب حادثہ ہے کہ پاکستان کے ایک کرور سے زیادہ ہندوؤں نے پاکستان میں اپنے لیے عین اسی حیثیت کو قبول کرلیا جو نئے حالات کا تقاضا تھا، حالاں کہ انھوں نے تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ مگر ہندستان کے مسلمان ہندستان میں اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق بنانے میں کامیاب نہ ہوسکے، اگرچہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے یک طرفہ طور پر تقسیم کی تحریک چلائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان تقسیم سے پہلے جن خود ساختہ مسائل سے دوچار تھے، تقسیم کے بعد بھی وہ انھیں خود ساختہ مسائل میں مبتلا ہیں۔ حقیقت واقعہ کا اعتراف اس دنیا میں آدمی کے لیے زندگی کے دروازے کھولتا ہے ۔ ہندستانی مسلمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے زندگی کے دروازے بھی اب تک ان کے لیے نہیں کھلے۔

مسلمانوں نے اس ملک میں چالیس قیمتی سال کھودیے ہیں۔ اگر وہ اپنے مزاج کو نہ بدلیں تو وہ اگلے چالیس سال بھی کھودیں گے۔ موجودہ مزاج کے ساتھ مسلمانوں کے لیے اپنے مستقبل کی

کامیاب تعمیر ممکن نہیں۔

بنگلہ دیش کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: مسلم ممالک کا المیہ یہ ہے کہ اس وقت کسی بھی مسلم ملک میں کوئی طاقت ور قائد (ان کے الفاظ میں اسٹرانگ لیڈر) نہیں۔ میں نے کہا کہ بنگلہ دیش کو تو شیخ مجیب الرحمٰن کی شکل میں ایک طاقت ور قائد حاصل تھا۔ پھر اس طاقتور قائد نے اپنے ملک کو کیا دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ وہ طاقت ور قائد تھے مگر انھوں نے ملک کو برباد کیا۔ میں نے کہا کہ اس سے معلوم ہوا کہ قومی تعمیر کے لیے صرف " طاقت ور قائد" کافی نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ آج اصل کمی قائدِ قوی کی نہیں، اصل کمی قائدِ حکیم کی ہے۔ آج ہر مسلم ملک میں ایسے افراد موجود ہیں جن کے پاس طاقت ہے، جن کے پاس وسائل ہیں۔ مگر وہ چیز ان کے پاس نہیں جس کو دانش کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دانش کی کمی نے مسلم ملکوں کو برباد کیا ہے نہ کہ طاقت کی کمی نے۔

ایک بار کھانے کے وقت میری میز کے قریب چند باریش بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی اردو زبان اور موضوع گفت گو سے معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے آئے ہیں اور " دیوبندی مکتبِ فکر" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بزرگ نے پر جوش طور پر کہا کہ " ہندستان میں صرف ۱۷ دن کے اندر بچپن ہزار علما رشہید کر دیے گیے" میں نے پوچھا کہ حضرت، اسلام میں شہادت برائے شہادت ہے کہ شہادت کا کوئی مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ شہادت کا مقصد بالکل واضح ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: اعلاء کلمۃ اللہ۔ میں نے کہا کہ دور اول میں دس سے بھی کم آدمیوں نے شہادت پائی اور اللہ کا کلمہ بلند ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں ۵۵ ہزار بزرگ شہید ہو گیے اور اب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بگڑ گیے۔ میں نے آگے کلام کو جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے اٹھ گیا۔

پاکستان کی پوری آبادی ساڑھے نو کرور ہے۔ ان میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ کرور ہے۔ غیر مسلم ایک کرور اور کچھ لاکھ ہیں۔ کراچی شہر کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے۔ اس میں مہاجرین کی تعداد تقریباً ۴۰ لاکھ ہے۔

ایک صاحب روانڈا (وسط افریقہ) سے آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ روانڈا میں مسلمان

تقریباً ۳ فی صد ہیں۔ اسلام وہاں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کرتے ہیں۔ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اور وہ مذہبی تبلیغ کی مکمل آزادی دیئے ہوئے ہے۔ البتہ اکثر افریقی ملکوں کی طرح وہاں بھی یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی سماجی کام نہیں۔ وہاں کی مسیحی تنظیموں نے کثیر تعداد میں اسکول کالج اور اسپتال کھول رکھے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ نہریں نکالنے اور زراعت کو ترقی دینے میں عوام کی مدد کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان سماجی خدمات کے ان میدانوں میں بالکل صفر کے درجہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی اس کمی کی وجہ سے ان کو عزت کا مرتبہ حاصل نہیں۔ ایک آدمی اگر کوئی کام نہ کرے تو وہ حقیر سمجھ لیا جاتا ہے:

اَلوَاحِدُ اِذَا لَمْ یَعْمَلْ یُحْتَقَر

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو برطانیہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً ہندستانی ہیں اور برطانیہ میں ۲۰ سال سے کسی مسجد کے امام ہیں۔ انھوں نے کہا کہ برطانیہ کے مسلمان پہلے نہایت سکون کے ساتھ رہ رہے تھے۔ مگر جب سے وہاں علما رکرام پہونچے ہیں، مسلمانوں کے آپس کے دینی جھگڑے بہت بڑھ گیے ہیں۔ مسلمان گروہوں گروہوں میں بٹ گیے ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ کی کاٹ میں لگا رہتا ہے اور یہ سب ہمارے علما رکرام کی دین ہے۔

انھوں نے اپنا قصہ بتایا کہ میری مسجد کے نمازیوں میں سے ایک پاکستانی نے میرے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ میں ہندستان کا ایجنٹ ہوں۔ وہ صاحب مسجد کمیٹی کے ممبر تھے۔ ایک بار انھوں نے کمیٹی کے اجلاس کا اعلان کر دیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس اجلاس میں میرے خلاف تجویز پاس کرکے مجھے مسجد کی امامت سے علٰحدہ کر دیا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کمیٹی کے اجلاس کی براہ راست مخالفت نہیں کی۔ بس خاموشی کے ساتھ یہ کیا کہ کوشش کرکے اجلاس کی تاریخ آگے بڑھوادی تاکہ مجھ کو اجلاس سے پہلے ایک جمعہ مل جائے۔

کمیٹی کے ممبران میں پاکستانی افراد کی اکثریت تھی۔ جب کہ نمازیوں میں تقریباً ۵۰ فی صد ہندستانی تھے اور ۵۰ فی صد پاکستانی۔ جمعہ کے دن تمام لوگ جمع ہوئے تو میں نے مفصل تقریر کی اور اس تقریر میں ہندستانی مسلمانوں کی وہ قربانیاں بتائیں جو انھوں نے پاکستان کے قیام کے لیے کی ہیں اور آج بھی وہ اس کی قیمت دیئے چلے جا رہے ہیں۔ ان باتوں کا زبردست اثر ہوا اور

پوری فضا مذکورہ پاکستانی کے خلاف ہوگئی۔ نہ صرف یہ کہ میرے خلاف تجویز ختم ہوگئی بلکہ مذکورہ پاکستانی ممبر کو کمیٹی سے علٰحدہ کر دیا گیا۔

یہی حکمت مسائل کو حل کرنے کا واحد یقینی طریقہ ہے۔ مسئلہ خواہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان، وہ حکمت ہی کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ غیر حکیمانہ طریقہ صرف مسئلہ کی شدت کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ زندگی کے اس راز کو لوگ صرف اپنے ذاتی معاملہ میں یاد رکھتے ہیں، وہ قومی معاملہ میں ہمیشہ اس کو بھول جاتے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے ایک ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ وہ جنوبی افریقہ کے شہری ہیں۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جنوبی افریقہ کے بارہ میں اکثر ظلم و فساد کی خبریں دوسرے ملکوں کے اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ان کو ہمارے وہ رشتہ دار پڑھتے ہیں جو یورپ اور امریکہ وغیرہ میں ہیں۔ وہ ہم کو لکھتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کے حالات اتنے خراب ہیں، وہاں جان و مال محفوظ نہیں، پھر آپ وہاں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ جنوبی افریقہ کو چھوڑ کر ہمارے یہاں آجائیے۔ ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ اخباروں میں چھپتا ہے وہ اخباروں کی اپنی ایجاد ہے، ورنہ جنوبی افریقہ کے حالات ایسے نہیں۔ معمولی کھٹ پٹ ضرور ہوتی ہے تو معمولی کھٹ پٹ کہاں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ ظلم کے واقعات زیادہ تر ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو حکمرانوں کے خلاف متشددانہ تحریک چلاتے ہیں، عام باشندوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

میں نے کہا کہ ٹھیک یہی ہندستان کا معاملہ بھی ہے۔ ہندستان بہت بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ کہیں کوئی جھڑپ یا کھٹ پٹ ہوگئی تو باہر کے اخبار میں چھپتا ہے ــــــ "ہندستان میں فساد"۔ حالاں کہ جو واقعہ ہوتا ہے وہ بھی ہندستان کی لاکھوں بستیوں میں سے ایک بستی میں اور اکثر بستی کے ایک محلہ میں ہوتا ہے۔ اور اخبار والے اس کا عنوان بنا دیتے ہیں "ہندستان میں فساد"۔ اس کی وجہ سے لوگ غیر ضروری طور پر تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہیں

واقعات کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایک واقعہ کو اسی نوعیت کے دوسرے واقعات سے ملا کر دیکھا جائے۔ جو لوگ ہندستان میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کے مظالم کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں

انھیں مسلم ملکوں میں مسلمانوں پر مسلمانوں کے مظالم کو بھی سامنے رکھنا چاہیے ۔ افریقہ کی کانفرنس میں سوڈان کے ایک اسلام پسند بزرگ نے جعفر نمیری کے مظالم بیان کیے اور اس کے لیے "شیطان" کا لفظ استعمال کیا۔ حالاں کہ وہاں ظالم اور مظلوم دونوں مسلمان ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ اور مسابقت کی دنیا ہے ۔ یہاں ہر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھ جانا چاہتا ہے ۔ اس لیے یہاں شکایت اور احتجاج سے کوئی فائدہ نہیں ۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ آدمی صورت حال کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے ۔

۲۱ ستمبر کی شام کو عربوں کی ایک مجلس کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ یہ تمام کے تمام عرب نوجوان تھے ۔ میرے سوا وہاں کوئی ایک بھی اردو جاننے والا نہ تھا ، اس لیے پوری تقریر عربی میں ہوئی اور تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی ۔ ان لوگوں نے میری اس عربی تقریر کو دو کیسٹ پر ریکارڈ کیا۔

اس تقریر میں میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ایمان ایک اکتشاف ہے ۔ اسی اکتشاف سے وہ چیز ابھرتی ہے جس کو دعوت کہا جاتا ہے ۔ عام مسلمانوں کے لیے تقلیدی ایمان بھی کافی ہو سکتا ہے مگر داعی وہی شخص بن سکتا ہے جس کو اکتشاف کے درجہ میں ایمان حاصل ہوا ہو ۔

پھر میں نے موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا جو اسلامی انقلاب کے نام پر اٹھیں میں نے مثالیں دے کر بتایا کہ یہ تمام تحریکیں رد عمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوئیں ان تحریکوں کے قائدین نے دیکھا کہ غیر مسلم اقوام نے ان سے ان کی عظمت چھین لی ہے ۔ اس احساس نے انھیں بھڑکایا اور وہ ان سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گیے ۔ حقیقی داعی وہ ہے جو احساس یافت پر اٹھے ۔ مگر یہ لوگ احساس زیاں پر اٹھے ۔ اس دنیا میں "زیاں" کو بھولنا پڑتا ہے ، اس کے بعد ہی آدمی کو "یافت" کا درجہ حاصل ہوتا ہے ۔ مگر ہمارے رہنما اس حوصلہ مندی کا ثبوت نہ دے سکے ۔ اس لیے وہ احساس محرومی سے اوپر اٹھنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئے ۔

میری تقریر کا آخری خلاصہ یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کی کوئی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ۔ جب کہ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین بے شمار قربانیوں کے باوجود کوئی انقلاب برپا نہ کر سکے ۔ اس کا سبب در اصل وہ فرق ہے جو رسول اللہ اور ان مسلم مفکرین کے درمیان پایا جاتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احساس یافت پر کھڑے ہوئے تھے ۔ اس کے

برعکس موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین احساس محرومی پر کھڑے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایمان ایک عظیم دریافت کے ہم معنی تھا۔ وہ ہر چیز سے زیادہ عظیم تھا۔ گویا کہ آپ لوگوں سے کہہ رہے تھے: اے لوگو، میرے پاس ایک بہت بڑی چیز ہے۔ میرے پاس آؤ تاکہ میں تم کو وہ چیز دوں۔ اس کے برعکس موجودہ مسلم مفکرین کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی بڑی چیز نہیں۔ گویا کہ وہ لوگوں سے کہہ رہے ہیں: اے لوگو، تم نے ہم سے تمام چیزیں چھین لی ہیں۔ تو تم چھینی ہوئی چیزوں کو ہمیں واپس کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت دینے والے کی تھی اور ہمارے رہنماؤں کی حیثیت مانگنے والوں کی۔ اس فرق کے بعد کیسے ممکن تھا کہ ان کے ذریعہ سے وہ چیز ظہور میں آئے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آئی:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حقق ثورۃ عظیمۃ، لا نظیر لها فی التاریخ الانسانی والمفکرون المسلمون المعاصرون عجزوا عن تحقیق ای ثورۃ ولو بعد بذلهم تضحیات عظیمۃ۔ والسبب یرجع الی فرق جوهری بین عمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعمل هؤلاء المفکرین۔ فالنبی قام عمله علی احساس الوجدان، وهم قد قام عملهم علی احساس الخسارۃ والفقدان۔ ان ایمان الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان له کالکشاف عظیم، یفوق کل شئ۔ فکانه کان فی دعوته یقول: ایها الناس، عندی شئ عظیم۔ تعالوا الیّ فاعطیکم منه۔ وهؤلاء المفکرون لیس عندهم ای شئ۔ وکانهم یقولون۔ ایها الناس، انکم سلبتم منا کل شئ فردّوا علینا الاشیاء التی سلبتموها منا۔ فالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کان کالواهب اوکالعاطی وهم کالسائلین۔ فکیف یتأتی لهم ان یحققوا ما حققه الرسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

واپسی میں عجیب قصہ پیش آیا۔ کراچی سے ۲۲ ستمبر کی شام کو دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ کراچی سے دہلی کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ جہاز معمول کے مطابق ۱۰ ہزار میٹر کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ یہاں تک کہ "کرسی کی پیٹی باندھ لیں" کی علامت روشن ہوئی۔ بظاہر اس کا مطلب یہ تھا کہ اب دہلی قریب آ گیا ہے۔ مگر کچھ دیر کے بعد روشنیاں بجھ گئیں۔ اور جہاز بدستور اڑتا رہا، یہاں تک کہ پرواز کی حالت میں دو گھنٹے سے زیادہ گزر گیے۔ ہم اسی تشویش میں مبتلا تھے کہ جہاز کے

ذمہ داروں کی طرف سے اعلان ہوا کہ خراب موسم کی وجہ سے ہم دہلی کے ایرپورٹ پر نہ اتر سکیں گے، اور اب ہم دوبارہ کراچی واپس جا رہے ہیں۔

تقریباً تین گھنٹہ فضا میں رہنے کے بعد جہاز دوبارہ کراچی کے ایرپورٹ پر اتر گیا۔ تمام مسافر لاونج میں بیٹھا دیئے گیے۔ کئی گھنٹے تک انتظار کی غیر یقینی حالت طاری رہی۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ جہاز دوبارہ دہلی کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ تمام مسافر دوبارہ جہاز پر سوار ہوئے۔ مقررہ وقت کے مطابق ہم ۵ بجے شام کو دہلی پہونچ جاتے۔ مگر اس افتاد کی وجہ سے ہم رات کو ۱۲ بجے دہلی پہونچے ـــــــــ جن ہوائی "حادثات" کا ذکر اس سے پہلے اخباروں میں پڑھا تھا وہ اس سفر میں کم از کم جزئی طور پر میرے ساتھ بھی پیش آ گیا۔

۲۳ ستمبر کو پی آئی اے کا جہاز جب درمیان سے واپس ہوا تو اس کو دوبارہ کراچی ایرپورٹ پر اترنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کیوں کہ وہ خود اپنے ملک میں اپنے ایرپورٹ پر اتر رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے ۱۴ ستمبر کو جب ہمارے جہاز کا ایک انجن فیل ہو گیا تھا اور پائلٹ مجبور ہو گیا تھا کہ وہ اس کو زمین پر اتارے تو اس نے فضا سے وائرلیس کے ذریعہ قریب کے کئی ہوائی اڈوں سے رابطہ قائم کیا۔ مگر ہر ہوائی اڈہ اس کو اترنے کی اجازت دینے سے انکار کرتا رہا۔

آخر میں اس نے عمان ایرپورٹ سے بات کی۔ اس نے بھی ابتداءً انکار کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پائلٹ اور عمان ایرپورٹ کے ذمہ داروں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ پائلٹ نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جہاز پر ۲۰۰ مسافر ہیں۔ آخر میں کیسے ایسا کروں کہ ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دوں کہ وہ کسی کھڈ میں جا کر گر جائیں۔ اس گفتگو کے درمیان آدھ گھنٹہ تک جہاز عمان کے چاروں طرف اڑتا رہا۔ آخر کافی کہنے سننے کے بعد عمان ایرپورٹ نے اجازت دی۔ جب ہمارا جہاز ڈگمگاتے ہوئے عمان ایرپورٹ پر اترا تو وہاں مسلح پولیس پورے ایرپورٹ کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔

اس غیر معمولی سلوک کی وجہ فضائی قزاقی ہے۔ ایسی صورت حال میں ایرپورٹ والے پہلا شبہ یہ کرتے ہیں کہ فضائی قزاقوں نے جہاز کو اپنے قبضہ میں لے لیا ہے اور اس کو کسی

غیر متعلق ایرپورٹ پر اترنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ جب فضائی قذاقوں کو ایسا کرنا ہوتا ہے تو وہ جہاز کے پائلٹ کو ہدایت کر دیتے ہیں کہ تم ہمارا نام ہرگز نہ لو، بلکہ یہ کہو کہ انجن کی خرابی یا کسی ٹکنکل سبب سے ہم جہاز کو اتارنے پر مجبور ہو گیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرپورٹ نے ہمارے پائلٹ کے بیان پر یقین نہیں کیا اور اس کو اترنے کی اجازت دینے میں دیر لگائی

یہاں بظاہر مجھ کو ہر طرح کا آرام حاصل تھا، مادی اعتبار سے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر میری روح ہر وقت تڑپتی رہتی تھی۔ اصل یہ ہے کہ دہلی میں اپنے روزمرہ کے کام کے ساتھ میں اتنا زیادہ وابستہ ہو گیا ہوں کہ اس سے باہر نکلتے ہی میرا سکون بالکل چھن جاتا ہے۔ میرا حال اس مچھلی کا سا ہو جاتا ہے جس کو پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دیا گیا ہو۔ چنانچہ بارہ دن کے اس سفر میں شاید ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جب کہ میں نے اپنے اندر سکون و اطمینان محسوس کیا ہو۔ اس پوری مدت میں مسلسل میں شدید کرب میں مبتلا رہا۔ یہ کرب صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ میں ۲۴ ستمبر ۱۹۸۶ کو اپنے دہلی کے ماحول میں دوبارہ واپس آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لیے سب سے بڑی چیز نفسیاتی سکون ہے نہ کہ مادی راحت۔ اگر آدمی نفسیاتی بےچینی میں مبتلا ہو تو مادی راحت کے سامانوں کے انبار کے درمیان بھی وہ اس طرح تڑپے گا جیسے وہ آگ کے انگاروں کے اوپر ڈال دیا گیا ہے ــــــ نفسیاتی بے آرامی ہر مادی آرام کو بے معنی بنا دیتی ہے۔

ایک سفر

۱۲ جون ۱۹۸۷ کو مجھے ایک اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے افریقہ کے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ اتفاق سے آج ہی ایک صاحب کا خط ملا جس میں "سفر نامہ" کے بارہ میں سخت ناراضگی کا اظہار کیا گیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ الرسالہ میں سفر نامہ کی اشاعت بند کر دی جائے کیوں کہ اس میں شخصی تذکرے ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ الرسالہ کا سفر نامہ تو تمام تر سبق اور معلومات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ پھر کیوں بعض افراد سفر نامہ کے بارہ میں مخالفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے میرا ذہن سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶ کی طرف چلا گیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن سے بہت سے لوگوں کو گمراہی ملتی ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت۔ میں نے سوچا کہ قرآن تو خدا کی کتاب ہے، وہ پوری طرح بے عیب اور کامل ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ اس سے بھی بہت سے لوگوں کو صرف گمراہی کا رزق حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ قرآن کی اسی آیت میں موجود ہے۔ قرآن میں مکھی کی مثال دی گئی تو کچھ لوگوں نے کہا کہ قرآن تو خداوند عالم کی کتاب ہے۔ پھر اس میں مکھی اور مچھر جیسی چھوٹی اور معمولی چیزوں کا ذکر کیوں۔

ان لوگوں کی نظر "مکھی" اور "مچھر" کی طرف چلی گئی۔ وہ اس سبق کی طرف نہیں گئی جو مکھی اور مچھر کے تذکرہ میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ خدا کی کتاب میں مکھی اور مچھر کا تذکرہ کیوں۔ یہی معاملہ الرسالہ کے سفر ناموں کا بھی ہے۔ اس میں بعض اوقات "مکھی" اور "مچھر" کے تذکرے ہوتے ہیں۔ اب جن لوگوں کی نگاہ مکھی اور مچھر پر اٹک کر رہ جائے انھیں سفر نامہ بے فائدہ معلوم ہوگا۔ مگر جن لوگوں کی نگاہ مکھی اور مچھر سے گزر کر اس کے سبق تک پہنچ جائے وہ سفر نامہ میں اپنے لئے قلب و دماغ کی غذا پائیں گے۔ اور خدا کے فضل سے ہمارے قارئین میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

یہ سفر براستہ کراچی ہوا۔ دہلی سے پاکستان ایرویز کی فلائٹ نمبر ۲۹۱ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پاکستان کے اردو اخبارات برائے مطالعہ موجود تھے۔ ان اخبارات میں میرٹھ کے فرقہ وارانہ فساد کی خبریں تھیں۔ مگر ان کا عنوان "میرٹھ میں فرقہ وارانہ فساد" نہیں تھا۔ بلکہ ان کا

عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا:

بھارت میں مسلم کشی

بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام

بھارت میں مسلمانوں کے خون کی ہولی

ایک طرف اس قسم کی مبالغہ آمیز بلکہ خلاف واقعہ خبریں تھیں۔ دوسری طرف روزنامہ جنگ (کراچی) ۱۲ جون ۱۹۸۷ کے آخری صفحہ پر مہاجر قومی موومنٹ (MQM) کے لیڈر مسٹر الطاف حسین کا ایک بیان تھا جس میں دوسری باتوں کے ساتھ حسب ذیل الفاظ چھپے ہوئے تھے:

"پاکستان کی جو سیاسی اور مذہبی جماعتیں ہندستانی مسلمانوں کے غم میں گھل رہی ہیں، اگر انھیں واقعی ہندستان کے مظلوم مسلمانوں سے ہمدردی ہے تو وہ سڑکوں پر نکل آئیں اور اس وقت تک کے لئے دھرنا مار کر بیٹھ جائیں جب تک کہ مظلوم مسلمانوں کے لئے پاکستان کی سرحد کھولنے کا مطالبہ تسلیم نہ کرالیں۔ ان مذہبی اور سیاسی جماعتوں کو یہ اعلان کرنا چاہئے کہ ہم آدھا کھانا بھارت کے مظلوم مسلمانوں کو دیں گے اور انھیں یہاں رکھیں گے۔ بھارتی مسلمانوں کے لئے صرف زبانی جمع خرچ کیا جارہا ہے۔"

بظاہر یہ دونوں بیان ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ دونوں ہی کا مقصد اپنے مدمقابل کو ڈسکریڈٹ کرنا ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ایک کا مدمقابل ہندستان کا ہندو ہے اور دوسرے کا مدمقابل خود پاکستان کا غیر مہاجر مسلمان۔

۱۲ جون کی شام کو ۱۰ بجے میں کراچی پہنچا۔ یہاں تقریباً دو رات اور ایک دن قیام رہا۔ یہ قیام جناب فضل الرحمٰن صاحب ایم اے کے مکان پر تھا۔ وہ ایک ذہین اور صاحب مطالعہ آدمی ہیں، ان سے یہاں کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔

آجکل یہاں مہاجر اور غیر مہاجر مسئلہ زوروں پر ہے۔ یہ مسئلہ اس سے زیادہ شدید صورت اختیار کر چکا ہے جس کو ہندستان میں "ہندو مسلم مسئلہ" کہا جاتا ہے۔ اسی تناؤ کا یہ نتیجہ ہے کہ اپریل ۱۹۸۵ میں جب ایک مہاجر لڑکی بشریٰ زیدی ایک غیر مہاجر (پٹھان) کی ٹرک سے دب کر

ہلاک ہوگئی تو کراچی میں مہاجرین نے بگڑ کر پٹھانوں کو مارا اور ان کی گاڑیوں کو جلایا۔ اس کا بدلہ پٹھانوں نے سہراب گوٹھ میں لیا جس کے قریب " علی گڑھ کالونی " کے چھ سو مہاجر جلا دئے گئے یا گولیوں کا نشانہ بنا دئے گئے۔ اس باہمی قتل وخون کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

پاکستان کی تمام بڑی بڑی تحریکوں کی تہ میں یہی مہاجر اور غیر مہاجر کا مسئلہ پایا جاتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں کی تجارتوں پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد یہاں زبردست خلا پیدا ہوا۔ اس کو مہاجرین نے بھرپور طور پر استعمال کیا۔ یہاں تک کہ وہ پاکستان کی صنعت و تجارت کے ۸۰ فی صد حصہ پر قابض ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں مقامی باشندوں میں محرومی کا احساس پیدا ہوا۔ اس معاشی عدم توازن میں توازن پیدا کرنے کی کوشش پہلی بار جنرل ایوب خاں کے دور حکومت میں شروع ہوئی۔ مگر مہاجر طبقہ کے پاس پیسہ تھا۔ چنانچہ مہاجر سرمایہ کے اوپر ایوب خاں کے خلاف شدید تحریک شروع ہوئی۔ ایوب خاں کی بعض " کمزوریوں " کو شوشہ بنا کر ان کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی نظام اسلام تحریک جو ایوب خاں کے خلاف اٹھی، اس کی تہ میں اصلاً اسی مہاجر تحریک کا زور تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک مہاجر تحریک تھی نہ کہ فی الواقع کوئی اسلامی تحریک۔

اس کے بعد مسٹر بھٹو کے خلاف نظام مصطفیٰ کی تحریک بھی اصلاً مہاجر تحریک تھی۔ مسٹر بھٹو مقامی باشندوں (سندھیوں) کے نمائندہ تھے، اور اسلام پسند قیادت مہاجرین کی نمائندہ۔ مسٹر بھٹو کے لئے " سوشلزم " کا نعرہ مفید مطلب تھا، کیوں کہ وہ بڑے بڑے صنعتی اداروں کو نجی ملکیت سے نکالنے کا جواز فراہم کرتا تھا جن پر مہاجر طبقہ قابض تھا۔ اسی طرح دوسرے طبقہ کے لئے اسلام کا نعرہ مفید مطلب تھا۔ کیوں کہ وہ نجی ملکیت کو مقدس قرار دے کر ان کو ان کے مالکوں (مہاجرین) کے قبضہ میں باقی رکھنے کا جواز مہیا کرتا تھا۔ یہ اسلام کے نام پر سراسر غیر اسلامی سیاست تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے منفی نتائج (ایوب اور بھٹو کا زوال) تو رونما ہوئے۔ مگر اس کے ذریعہ کوئی تعمیری مقصد حاصل نہ کیا جا سکا۔

پاکستان میں اس وقت دو مہاجر تحریکیں چل رہی ہیں۔ ایک مہاجر قومی موومنٹ MQM اور دوسری مہاجر اتحاد تحریک۔ اول الذکر زیادہ بڑی سمجھی جاتی ہے۔ ۱۳ جون ۱۹۸۷ کی شام کو مسٹر

طارق جاوید (پیدائش ۱۹۵۷) سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاجر قومی موومنٹ کے وائس چیرمین ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ "آپ کی یہ تحریک قومی تحریک ہے یا اسلامی تحریک"۔ انھوں نے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر کہا "نیشنلسٹ تحریک"۔ ہم لوگوں کو اسلام کی بنیاد پر اکٹھا نہیں کر رہے ہیں، ہم صرف مسائل کی بنیاد پر لوگوں کو اکٹھا کر رہے ہیں۔ کسی نیشنلسٹ تحریک کے لئے زمین ضروری ہے اس لئے ہم نے پانچویں صوبہ (مہاجر صوبہ) کا نعرہ لگایا ہے"۔

مہاجر قومی موومنٹ میں مسٹر الطاف حسین کو "قائد تحریک" کی حیثیت حاصل ہے۔ مسٹر الطاف حسین کراچی یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ انھیں فارمیسی (بی فارما) میں داخلہ نہیں ملا۔ الطاف حسین صاحب نے اس کو مہاجر کے ساتھ امتیاز قرار دیا۔ انھوں نے ۱۱ جون ۱۹۷۸ کو مہاجر اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن (APMSO) کی بنیاد ڈالی اور دھواں دھار تحریک شروع کردی۔ ان کا کہنا تھا کہ مہاجرین کی کوئی تنظیم نہیں۔ مہاجرین کا کوئی علیحدہ تشخص نہیں۔ ان کو ہر جگہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ وغیرہ۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں مہاجرین کے خلاف فضا مزید خراب ہوگئی۔ الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں پر ریوالور اور خنجر سے حملے کئے گئے یہاں تک کہ یہ حال ہوگیا کہ الطاف حسین صاحب کے لئے یونیورسٹی جانا ناممکن ہوگیا۔ اب انھوں نے تعلیم چھوڑ دی اور ۱۷ مارچ ۱۹۸۴ کو مہاجر قومی تحریک MQM کی بنیاد ڈالی۔

مسٹر طارق جاوید نے حالات بتاتے ہوئے کہا: "پاکستان میں زندگی کے ہر شعبہ میں مہاجر کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جارہا ہے۔ کراچی کے اندر کوئی ویکنسی ہوتی ہے تو اس کا اشتہار اخبار میں اس طرح دیا جاتا ہے "کراچی، حیدرآباد اور سکّر کے لوگ درخواست دینے کی زحمت نہ کریں"۔ ان الفاظ کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ مہاجر لوگ درخواست نہ دیں، کیوں کہ ان تینوں شہروں کی زیادہ آبادی مہاجرین پر مشتمل ہے۔ ہر قسم کے ذمہ دارانہ منصب پر پنجابی مسلمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ پنجابی کے سوا کسی اور کو لینا نہیں چاہتے۔ کراچی پولیس کی بھرتی ہوتی ہے تو اس کا اشتہار کراچی کے اخبار میں نہیں دیا جاتا بلکہ لاہور کے اخبار میں دیا جاتا ہے تاکہ مہاجرین اس میں درخواست نہ دے سکیں۔ پاکستان ایئر لائنز میں سب پنجابی بھرے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ

ہے کہ پی آئی اے پنجاب انٹرنیشنل ایرلائنز ہے نہ کہ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز۔ ایک پنجابی اگر ٹرانک رول کی خلاف ورزی کرے تو اس کی چالان نہیں ہوگی۔ اور اگر کوئی مہاجر ٹریفک رول کی غلطی کر جائے تو فوراً اس کی چالان ہو جاتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں ہمارے لئے بقا کا مسئلہ ہے۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۶ کو "علی گڑھ کالونی" اور "قصبہ کالونی" میں ۶ گھنٹہ تک قتل عام ہوتا رہا۔ بچوں کو زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ قریب ہی پولیس چوکی تھی۔ چند کلو میٹر کے فاصلہ پر فوج موجود تھی۔ مگر پولیس یا فوج نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ یہ باقاعدہ پلاننگ سے ہوا ہے۔ پولیس والے شہری لباس میں آئے اور انھوں نے منظم طریقہ پر مہاجرین کو مارا اور جلایا"

مسٹر طارق انور یہ باتیں کہہ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ پاکستان کا مسلم لیڈر بول رہا ہے یا ہندستان کا کوئی مسلم لیڈر۔

میں نے جناب فضل الرحمٰن صاحب سے پوچھا کہ مہاجرین کا مسئلہ ہندستان اور پاکستان دونوں جگہ پیدا ہوا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہندستان میں یہ مسئلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ چنانچہ آج وہاں "شرنارتھی" نام کے کسی علیحدہ فرقہ کا وجود نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں یہ مسئلہ آج بھی موجود ہے۔ بلکہ وہ مزید شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے مہاجرین اب اپنے لئے ایک نئی قومیت (مہاجر قوم) کو منوانا چاہتے ہیں اور ایک نیا صوبہ (مہاجر صوبہ) بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

فضل الرحمٰن صاحب نے کہا کہ ہندستان کے شرنارتھی محض پناہ لینے کے لئے ہندستان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو صرف پناہ گزیں سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس شمالی ہند کے مسلمان مہاجر یہاں آئے تو اس احساس کے ساتھ آئے کہ ہم پاکستان کے خالق ہیں۔ وہ یہاں ہیرو اور فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ ہندستان کے شرنارتھیوں میں برتری کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا انھوں نے ہر اعتبار سے اپنے آپ کو نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا۔ اس کے برعکس یہاں کے مسلم مہاجرین میں مقامی آبادی کے مقابلہ میں برتری کا احساس پایا جاتا تھا۔ جس کا اظہار بار بار مختلف شکلوں میں ہوتا رہا۔ اس کا ردعمل یہ ہوا کہ یہاں کے مقامی باشندوں میں فرزندان

وطن (Sons of the soil) کا نظریہ پیدا ہوا۔ مہاجر کے لئے فخر کی بنیاد تخلیق پاکستان تھی تو مقامی باشندوں نے علاقہ کا قدیم باشندہ ہونے کو فخر کا عنوان بنالیا۔ اس طرح مہاجر اور غیر مہاجر کی کش مکش بڑھتی چلی گئی۔

پاکستان کے مہاجرین کا مسئلہ دراصل اردو بولنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ بھی بنیادی طور پر اردو بولنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ یہ اشتراک صرف زبان کا نہیں، بلکہ نفسیات کا بھی ہے۔ دونوں جگہ کا "اردو طبقہ" ایک ہی قسم کی نفسیات میں مبتلا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پاکستان کے اردو طبقہ کی نفسیات کا اظہار پاکستانی حالات کے اعتبار سے ہوا ہے اور ہندستان کے اردو طبقہ کی نفسیات کا اظہار ہندستانی حالات کے اعتبار سے۔

پاکستان کے مہاجرین کا مسئلہ اس لئے پیدا ہوا کہ وہ وہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلہ میں احساس برتری کا شکار رہے۔ ...یہی چیز ہندستان میں بھی مسلم مسئلہ کو پیدا کرنے کا سبب بنی ہے۔ ہندستان کے جتنے مسلم لیڈر ہیں، خواہ وہ ایک مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے مکتب خیال سے، وہ سب کے سب اس بات میں مشترک ہیں کہ وہ مسلمانوں کے اندر فخر کی نفسیات پیدا کرتے رہے ہیں ــــــ ہم نے اس ملک کے لوگوں پر ایک ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ ہم نے اس ملک کے لوگوں کو تہذیب سکھائی ہے۔ ہم نے اس ملک کو تاج محل کا حسن اور قطب مینار کی بلندی عطا کی۔ اس ملک کے پاس آزادی کے بعد اپنا جھنڈا لہرانے کی بھی کوئی جگہ نہ تھی، ہم نے اس کو لال قلعہ دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو لوگ بھی مسلم خطیبوں اور مسلم لیڈروں کی تقریریں سنتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام قائدین ایک یا دوسرے انداز میں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے ہیں۔ ان باتوں نے مسلمانوں کے اندر اسی طرح برتری کا احساس پیدا کیا جس طرح پاکستان کے مہاجرین میں وہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلہ میں برتری کا احساس پیدا ہوا۔

یہی احساس برتری ہے جس نے دونوں ملکوں کے مسلمانوں (اردو داں مسلمانوں) کے لئے مسائل پیدا کئے ہیں۔ پاکستان میں اس کا اظہار مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہا ہے اور ہندستان میں اس کا اظہار ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا ہے۔ ان مسائل کا کوئی بھی حل اس کے سوا نہیں کہ دونوں ملکوں کے مسلمان اپنا یہ مزاج ختم کریں اور حقیقت پسند بن کر رہنا

سیکھیں۔ اگر وہ حقیقت پسندی پر راضی نہیں ہوئے تو دونوں کے لئے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

"پاکستان بنا کر ہمارے بزرگوں نے ایسی غلطی کی ہے جس کی سزا ہم اب تک بھگت رہے ہیں" چودھری منیر جاوید (پیدائش ۱۹۴۳) نے کہا۔ انھوں نے مہاجرین کے خلاف ان "مظالم" کی تفصیل بیان کی جو علی گڑھ کالونی اور قصبہ کالونی میں ان کے ساتھ کئے گئے۔ میں نے پوچھا کہ یہ معاملہ شروع کہاں سے ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ اکتوبر ۱۹۸۶ میں حیدر آباد (سندھ) میں مہاجر قومی موومنٹ کا جلسہ تھا۔ اس موقع پر کراچی سے ۲۵ ہزار آدمی گئے۔ کراچی سے جانے والی بسوں کا خرچ ۴۰ لاکھ تھا۔

مہاجرین کا یہ قافلہ جب سہراب گوٹ (پٹھانوں کی بستی) کے پاس پہنچا تو انھوں نے پٹھانوں کے خلاف نعرے لگائے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان فائرنگ ہوئی۔ پولیس کے بیان کے مطابق پہلے مہاجر کی طرف سے فائر کیا گیا۔ اس کے بعد پٹھانوں نے جواب میں گولی چلائی۔ مہاجرین کا کہنا ہے کہ پہلے پٹھانوں کی طرف سے گولی آئی۔ اس کے بعد مہاجرین نے فائر کیا۔ اس موقع پر ایک پولیس افسر (ارتضی حسین) کو بھی گولی لگی۔

یہ واقعہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ کا ہے۔ اس وقت سے اب تک مہاجر اور پٹھان کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ دونوں طرف اشتعال ہے اور کوئی بھی چھوٹا سا واقعہ دونوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیتا ہے۔ باقاعدہ گولیاں چلتی ہیں۔ آتش زنی کی جاتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اب تک دونوں طرف سے تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی مارے جا چکے ہیں۔

میں نے یہاں کے ایک تعلیم یافتہ صاحب سے کہا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمان اور مسلمان اس طرح آپس میں لڑ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو زندگی کی علامت ہے۔ زندہ لوگ ہی آپس میں لڑتے ہیں۔ مردہ لوگ کیا لڑیں گے۔" میں نے کہا کہ اسی قسم کا واقعہ جب ہندستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوتا ہے تو آپ اس کو ہندو بربریت کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ اور جب یہی واقعہ پاکستان میں ہو تو اس کو مسلمانوں کی زندگی قرار دے رہے ہیں۔

کراچی میں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو قدیم سندھی ہیں۔ ان سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔

گل حسن تھہیم (پیدائش ۱۹۲۹) جیکب آباد کے رہنے والے ہیں۔ ان سے میں نے سندھ کے ہندوؤں کے بارہ میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ سندھ کے ہندو سندھ کے مسلمانوں سے زیادہ خوش حال ہیں" " ہماری بات گورنمنٹ میں کم سنی جاتی ہے اور ہندوؤں کی بات گورنمنٹ میں زیادہ سنی جاتی ہے"۔ انھوں نے کہا "یہاں کا ہندو ہماری چھاتی پر بیٹھا ہوا ہے اور ہم اس کو چوم رہے ہیں"

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو لوگ مسلمانوں سے زیادہ باشعور ہیں۔ میرٹھ کے فساد کے بعد اس کے ردعمل میں مئی ۱۹۸۷ میں جیکب آباد وغیرہ میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی دکانیں توڑیں۔ مندر جلائے۔ مگر ہندوؤں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس فساد میں ہندوؤں کا تقریباً پانچ کروڑ روپیہ کا نقصان ہوا۔ مگر جس وقت ان کی دکانوں میں آگ لگ رہی تھی وہ اپنے گھروں میں چلے گئے اور دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں نے اور پولیس نے ان کی آگ بجھائی۔ وہ بڑے سیانے لوگ ہیں"

گل حسن تھہیم نے کہا کہ ہماری سندھی زبان میں ایک مثل ہے اور یہاں کے ہندو پوری طرح اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ مثل اس طرح ہے: جا سجتے جاجت نا ہیں ہتھیارن جی اتے بھجن کم وریامن جو (جہاں ہتھیار کام نہ دیں وہاں بھاگ جانا ہی دانش مندی ہے) انھوں نے بتایا کہ اس ہوشیاری کا نتیجہ ہندوؤں کو یہ ملا ہے کہ جیکب آباد کی تجارت آج ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ گورنمنٹ نے زراعت کے لئے "انٹرسٹ فری لون" کی اسکیم چلائی تو اس کا بھی زیادہ فائدہ ہندوؤں کو ملا۔

انھوں نے بتایا کہ جیکب آباد میں تقریباً تمام رائس ملیں ہندوؤں کی ہیں۔ ہندو اس کام کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً وہ برائے نام کسی مسلمان کو اپنی مل میں حصہ دار بنالیں گے اور اس کے بعد اس کا نام "اسماعیل رائس مل" رکھ دیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

۱۴ جون ۱۹۸۷ کی دوپہر کو میں کراچی سے طرابلس پہنچا۔ یہاں میرا قیام الفندق الکبیر کے کمرہ نمبر ۳۰۴ میں تھا۔ ٹیلیوژن پر اعلان کی وجہ سے فوراً ہی بہت سے لوگوں کو اطلاع ہوگئی۔ چنانچہ شہر کے کئی لوگ اسی دن ملنے کے لئے آگئے۔ تقریباً ایک درجن عرب نوجوان بھی جمع ہوگئے۔

عرب نوجوانوں پر عام طور پر سید قطب کے انقلابی فکر کا غلبہ ہے۔ میں نے اسی کو گفتگو کا موضوع بنایا۔ میں نے کہا کہ یہ اسلام کی سراسر غلط تفسیر ہے۔ اور اس تفسیر نے پوری نسل کو برباد

کر کے رکھ دیا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کو سیاسی ٹکراؤ کے ہم معنی بنا دیا۔ جہاں جہاں یہ اسلامی سیاسی فکر بنا، لوگ اپنے حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ اس کے نتیجہ میں حکمرانوں نے انھیں کچلنے کی کوشش کی۔ اب انھوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ مسلم حکمراں اسلام کے دشمن ہیں۔ حالانکہ واقعہ صرف یہ تھا کہ مسلم حکمراں اپنے اقتدار کو چیلنج کرنے والوں کے دشمن تھے۔ یہ لوگ اگر غیر سیاسی انداز میں کام کرتے تو اپنے ملک کے مسلم حکمرانوں کو وہ اپنا معاون پاتے۔ مگر سیاسی انداز میں کام کرنے کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا اور مسلم ملکوں کے تمام بہترین امکانات برباد ہو کر رہ گئے۔

سیاسی قربانیوں سے عملاً قوم کو کچھ نہیں ملتا۔ البتہ سیاسی قربانی دینے والا بعد کی نسلوں کے لئے ہیرو بن جاتا ہے۔ اس انقلابی فکر کے موجودہ حاملین کا حال یہ ہے کہ وہ عملاً دوسروں کی طرح دنیا میں غرق ہو چکے ہیں۔ اب انھیں "سید قطب" کی طرح قربانی نہیں دینا ہے، البتہ "سید قطب" کو گلوریفائی کر کے سیاسی اور مادی فائدہ حاصل کرنا ہے۔

اس اسلامی کانفرنس میں مجموعی طور پر تقریباً چالیس آدمی شریک تھے۔ یہ سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان تھے اور دنیا کے مختلف حصوں سے آئے تھے۔ ان میں اکثریت اسلامی اداروں اور اسلامی تنظیموں کے ذمہ دار حضرات کی تھی۔ تین زبانیں اظہار خیال کا ذریعہ تھیں۔ عربی، انگریزی اور فرانسیسی۔

میں مختلف ملکوں کی اسلامی کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں۔ میرا احساس ہے کہ ہر جگہ لوگوں کی تقریروں کا نمایاں پہلو "دشمنانِ اسلام" کے حملوں پر اپنے ردعمل کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ مخططات ضد الاسلام والمسلمین، محاولات الاعداء، بس اس قسم کے الفاظ ہر ایک کی زبان پر ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اغیار کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرنے سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو اسلام کے سایۂ رحمت میں لانے کی کوشش کریں۔ ان کا جواب یہ تھا: غیر مسلموں کو اسلام کی طرف لانا بھی ایک کام ہے، مگر اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ اجنبی حملوں سے بچایا جائے ——— موجودہ مسلمانوں کے فکر پر دفاعی مسائل اتنے زیادہ غالب ہیں کہ وہ دعوتی باتوں کو سمجھ نہیں پاتے۔ یہی تمام مسلم ملکوں کا حال ہے۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو افریقہ سے آئے تھے۔ ان کے یہاں الرسالہ انگریزی

جاتاہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کو بہت سے لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ہر ماہ اس کے منتظر رہتے ہیں۔ ایک قاری کا تاثر انھوں نے اِن الفاظ میں بتایا :

فقرأت الكثير من الكتب الاسلامية وكانت لدىّ استفسارات حول الاسلام۔ فما وجدت الاجوبة الا بعد فترأتي لمجلة الرسالة الصادرة من نيو دلهي باللغة الانجليزيه

شريف سالم حسين ، ص ب ۱۲۸ مارسبت ، افريقه

ایک اور صاحب سلیمان عمرانی کیلیمیلی سے ملاقات ہوئی۔ وہ دارالسلام (تنزانیہ) سے آئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میں ایران گیا تھا۔ وہاں مجھے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی ملی۔ اس کو میں تین بار پڑھ چکا ہوں۔ اس کتاب پر عربی کی یہ مثل صادق آتی ہے : كل اللحم في جوف الفرا ۔ اس کتاب میں اتنی زیادہ باتیں ہیں کہ آدمی ہر بار پڑھنے میں نئی بات پاتا ہے (من يقرأ كتاب الاسلام يتحدى يستفيد في كل مرة شيئاً جديداً۔ فاذا اقترأ الانسان في المرة الاولى واستفاد شيئاً ففي المرة الثانية يستفيد شيأً آخر، وهكذا دَوَاليك)

Suleimab Amrani Kilemile
P.O. Box 45257, Dar-es-Salam, Tanzania, Africa

محمد راشد الفرحان (کویت) نے ایک بحث میں مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو چاہئے کہ مسجدوں کو سیاست سے الگ رکھیں۔ عرب ممالک میں لوگوں نے مساجد کے اندر سیاسی تقریریں شروع کردیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تمام عرب ممالک میں مساجد نماز کی ادائیگی کے فوراً بعد بند کردی جاتی ہیں۔ حالانکہ مساجد کو ثقافت اسلامی کا مرکز بننا تھا مگر ان کو سیاسی مرکز بنانے کی کوشش میں مسجد کی یہ دینی حیثیت ہم سے چھن گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو چاہئے کہ ہم بقیہ ملکوں میں ان مساجد کو سیاست سے دور رکھیں تاکہ ان کے ساتھ وہ پیش نہ آئے جو عالم عرب کی مساجد کے ساتھ پیش آچکا ہے (حتى لا يصيب لهذه المساجد ما اصاب في العالم العربي)

ویسٹ انڈیز کے ایک صاحب نے بتایا کہ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تصویر ایک دہشت پسند انسان کی تصویر بن گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بار میری ملاقات ایک عیسائی عالم سے ہوئی۔ اس نے ان کی داڑھی اور ٹوپی کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا:

Are you a Muslim ?
Yes.
Then you are a terrorist.

یہاں کے دوران قیام میں کئی بار عربوں کی مجالس کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسلام کے مختلف فکری پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ایک مجلس میں میں نے اس بات کی وضاحت کی کہ موجودہ زمانہ میں جہاد کا غلط مفہوم لے لیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان غیر ضروری طور پر دوسروں سے اور خود اپنے حکمرانوں سے ٹکراؤ کر رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے نہایت قیمتی وسائل اور مواقع برباد ہو رہے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے صلح حدیبیہ کی حکمت کے بارہ میں تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ میری عربی اگرچہ ہندستانی عربی تھی مگر وہ لوگ بے حد غور کے ساتھ سنتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندستانی ہونے کے باوجود آپ کی زبان ہم کو پسند ہے، کیوں کہ وہ محدّد اسلوب میں ہوتی ہے اور پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ صلح حدیبیہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے میں نے کہا:

بعد ما تم صلح الحديبية نزلت سورة الفتح وجاء فيها ويهديك صراطاً مستقيماً فكأنّ هذا الصلح كان هادياً ابديا لكيفية معاملة الاعداء كي تحقق النصر عليهم۔ ثم انظر كيف كان صلح الحديبية۔ كان على شروط قريش۔ فهذا الصلح ما حصل الّا بعد ما رضى صلى الله عليه وسلم على شرط أعدائه بطرف واحد۔ وبتعبير آخر، رضى الرسول صلى الله عليه وسلم بالهزيمة فجاءه الفتح العظيم۔ فهذا هو سر النجاح في هذا العالم، وفي العصر الحاضر نرى جماعات وشخصيات كثيرة قامت من اجل الاسلام ولكنّهم فشلوا في ادراك النجاح حتى بعد مئات السنين۔ والسبب واحد۔ فهم يريدون

ان یتعاملوا مع الاعداء علی شروطهم فلم یتحقق لهم النجاح۔ و لو رضوا علیٰ شرط الطرف الآخر لَتَمَّ لهم النجاح و لتحقق مستقبل جدید للاسلام فی هذا القرن۔

ان لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کئے جن کا جواب میں اپنی عربی میں دیتا رہا۔ مثلاً ایک مجلس میں ایک عرب نے سوال کیا کہ اسم اعظم کیا ہے۔ اس کے جواب میں میں نے کہا:

ان الاسم الاعظم هو بمعنی النعت الاعظم او الحمد الاعظم۔ فهو صفة للمعرفة لاصفة للفظ۔ ان الانسان حین یدرك ربه بعظمته وجلاله فتخرج من اعماق روحه کلمات فیها انوار لعظمة الله تعالیٰ، فذالك هو الاسم الاعظم۔ فلیس هناك لفظ واحد بعینه الذی هو اسم اعظم بصفة مطلقة بل لکل واحد منا لفظ و لکل واحد منا اسم اعظم۔ فالاسم الاعظم هو اسم معنوی لااسم لفظی۔

ایک عرب عالم نے "عبادت" کی سیاسی تشریح کی۔ انھوں نے کہا کہ عبادت کا مطلب تذلل اور خضوع نہیں بلکہ اس کا مطلب خلافت ارضی کے لئے انسان کو تیار کرنا ہے (تهیئة الانسان و اعداده للخلافة فی الارض) اپنے اس نقطۂ نظر کے حق میں انھوں نے لسانیات سے استدلال کیا۔ میں نے کہا:

العلم باللغة العربیة وحده لایکفی۔ و اوضح مثال علی ذالك انه یروی ان عتبة بن ربیعه اتی رسول الله صلی الله علیه وسلم وسأله عن دینه۔ فقرأ علیه الرسول جزءً من القرآن۔ فلما رجع الیٰ قومه اخبرهم انه جاء من محمد و سمعه یقرأ القرآن ولٰکن ما فهمت شیأ مما قاله غیر انه انذرکم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود۔ قالوا ویلك یکلّمك الرجل بالعربیة لاتدری ماقال۔ قال لا والله ما فهمت شیئاً مما قال غیر ذکر الصاعقة۔ ان هذا العربی لم یفهم القرآن رغم انه کان باللغة العربیة۔ لانه کانت عنده العقلیة اللغویة و لم تکن عنده العقلیة الدینیة

فالعقلية اللغوية وحدها لا تكفي۔

اسی طرح کچھ عرب نوجوانوں کے سامنے میں نے حضرت عمرؓ کے ایک قول کی تشریح کی جس سے انھوں نے پوری طرح اتفاق کیا۔ وہ قول یہ ہے: لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنه الذی یعرف خیر الشرین (عقل مند وہ نہیں ہے جو خیر اور شر کو جانے، عقلمند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے خیر کون سا ہے)

میں نے کہا کہ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انتخاب (choice) خیر اور شر کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ ایک شر اور دوسرے شر کے درمیان ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو ایک کم تر شر پر راضی ہونا پڑتا ہے تاکہ وہ اس کو اختیار کرکے خیر کامل تک پہنچ سکے۔

اس کی ایک مثال حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ حدیبیہ کے موقع پر جو انتخاب تھا وہ عمرہ ادا کرنے اور عمرہ ادا نہ کرنے کے درمیان نہیں تھا، بلکہ عمرہ ادا نہ کرنے اور لڑ کر ہلاک ہو جانے کے درمیان تھا۔ آپ نے اس کو اہون سمجھا کہ وقتی طور پر عمرہ کی ادائگی پر اصرار نہ کیا جائے تاکہ آئندہ ہمیشہ کے لئے عمرہ اور حج کی ادائگی کا دروازہ کھل سکے۔

الاخوان المسلمون کے لئے مصر میں اور جماعت اسلامی کے لئے پاکستان میں اسی قسم کے حالات تھے۔ انھیں ابتداءً کم تر شر پر راضی ہونا تھا تاکہ آخر کار وہ خیر برتر تک پہنچ سکیں۔ مگر وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ اگر وہ اس پیغمبرانہ نہج پر کام کرتے تو یقیناً آج مصر اور پاکستان کی تاریخ دوسری ہوتی۔

ایک مرتبہ میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ عرب نوجوان اس فکر کو کتنا سمجھے ہیں۔ چنانچہ میں نے عرب نوجوانوں کی ایک جماعت سے سوال کیا:

هل منكم من يفسّر هذا القول: الذی سیجری علی الکافر فی الآخرة یجری علی المؤمن فی هذه الدنیا (کیا آپ میں سے کوئی ہے جو میرے اس قول کی تشریح کرے: جو کچھ کافر پر آخرت میں گزرے گا وہ مومن پر اسی دنیا میں گزر جاتا ہے)

مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ انھوں نے سوال کی گہرائی کو پوری طرح سمجھ لیا اور بالکل درست طور پر اس کا جواب دیا۔

یہاں عرب نوجوانوں کی کافی بڑی تعداد ہے جو اسلامی مرکز سے بخوبی واقف ہے اور اس دینی فکر سے بہت قریب ہے جو اسلامی مرکز کے تحت سامنے لایا جا رہا ہے۔ چند سفروں میں وہ لوگ مجھ سے زبانی طور پر اس مشن کے بارہ میں سنتے رہے ہیں۔ اور اب خدا کے فضل سے وہ اس مشن سے بہت قریب آچکے ہیں۔

ایک عرب نوجوان جو انجنیئر ہیں، انھوں نے تاثرات بیان کرتے ہوئے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارہ میں یہ الفاظ کہے:

إننا نشعر، إننا كنّا في ظلام، لا نعرف أين نسير. وعندما عرفنا الفكرة وعرفنا صاحب هذه الفكرة شعرنا كأننا خرجنا إلى النور والهداية وكأننا وُلِدنا من جديد. هذا واحد في المأة من الشعور الحقيقي الأصلي، لأننا لا نعرف كيف نعبّر عن هذه الحقيقة التي نجدها في قلوبنا۔

۱۶ جون ۱۹۸۷ کی صبح کو عرب طلبہ کی ایک جماعت میرے کمرہ میں آگئی۔ ان سے مختلف اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ سنت میں ہر قسم کی رہنمائی موجود ہے۔ مگر نقص مطالعہ کی وجہ سے ہم سنت سے رہنمائی حاصل نہیں کر پاتے۔

میں نے کہا کہ مثال کے طور پر ایک حدیث ہے۔ أُمِرتُ بقريةٍ تأكل القرىٰ يقولون يثرب وهي المدينة (مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے) آپ حدیث کی کتابیں پڑھیں تو یہ حدیث آپ کو "فضائل مدینہ" کے باب کے تحت لکھی ہوئی ملے گی۔ چنانچہ پڑھنے والا جب اس کو پڑھتا ہے تو وہ اس کو مدینہ نامی ایک بستی کی فضیلت کے خانہ میں ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ حالانکہ گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس حدیث میں دعوت اسلامی کا منہاج بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "مکہ" میں اگر کام کے مواقع نہ مل رہے ہوں تو "مدینہ" کو اپنے کام کا مرکز بناؤ۔ کیوں کہ مدینہ کے راستہ سے تم مکہ تک بلکہ تمام بستیوں تک پہنچ سکتے ہو۔

اس سلسلہ میں میں نے سید جمال الدین افغانی کی مثال دی۔ جس زمانہ میں وہ پیرس میں

تھے اور العروۃ الوثقی کے نام سے ایک سیاسی اور احتجاجی پرچہ نکال رہے تھے، انھوں نے اپنے شاگرد مفتی محمد عبدہ سے کہا کہ یورپ کے مقابلہ میں امریکہ میں اسلامی دعوت کی کامیابی کے بہت زیادہ مواقع ہیں۔ یورپ چونکہ صلیبی لڑائیوں میں براہ راست شریک تھا، اس کے یہاں اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پائی جاتی ہے۔ مگر امریکی قوم اس قسم کی نفسیات سے خالی ہے۔ اس لئے امریکہ میں اگر تبلیغ کا کام کیا جائے تو ان کے اندر تیزی سے اسلام پھیلے گا۔ شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ پھر کیوں نہ ہم موجودہ سیاسی کام چھوڑ دیں اور امریکہ جاکر دینی تبلیغ کا کام کریں۔ مگر جمال الدین افغانی کو یہ کام چھوٹا کام نظر آیا۔ انھوں نے کہا: انما انت مثبط۔

جمال الدین افغانی کے لئے امریکہ گویا "مدینہ" تھا۔ وہ امریکیوں میں دعوتی کام کر کے بالآخر غیر امریکیوں کو بھی اپنے دائرۂ اثر میں لا سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اس راز کو نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے امریکیوں کو بھی کھویا اور غیر امریکیوں کو بھی۔

اپنے ذوق کے اعتبار سے سفر میرے لئے نہایت وحشت خیز ہوتا ہے۔ میں صرف اس لئے سفر کرتا ہوں کہ سفر کے دوران جو تجربات ہوتے ہیں ان کا حصول کسی اور طریقہ سے ممکن نہیں۔ اپنے ہوٹل کے کمرہ میں میں اپنے تجربات کو اپنی یادوں کی دنیا میں سمیٹ رہا تھا اس وقت میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ تمہارے اس سفر کے تجربات کا آخری خلاصہ کیا ہے تو میں کیا کہوں گا۔ یہ سوچتے ہوئے یہ فقرہ میری زبان پر آگیا ـــــــــــ کامل انسان وہ ہے جو اپنے کو غیر کامل سمجھے، جو بڑا ہونے کے باوجود اپنے آپ کو چھوٹا بنا لے۔ اور یہ حقیقۃً ہو نہ کہ اظہار خاکساری کے طور پر۔

واپسی روم کے راستہ سے ہوئی۔ الیتالیا کے جہاز کے ذریعہ ۲۰ جون کی سہ پہر کو روم پہنچا۔ یہاں ہوائی اڈہ کے پسنجر سروس پر میں نے اپنا ٹکٹ دکھایا اور معلوم کیا کہ ایر انڈیا کا بورڈنگ پاس لینے کے لئے مجھے کہاں جانا چاہئے۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے اطالوی آدمی نے کمپوٹر پر انگلیاں ماریں اور کہا کہ "گیٹ نمبر ۴۱"۔ وسیع ہوائی اڈہ کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا میں گیٹ نمبر ۴۱ پر پہنچا تو وہاں کاؤنٹر پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کو میں نے اپنا ٹکٹ دیا۔ اس نے دوبارہ کمپوٹر پر اپنی انگلیاں ماریں اور اس کے نقوش کو دیکھ کر بتایا کہ آپ گیٹ نمبر ۱۴ پر جائیں۔

اب دوبارہ مجھے اِس سرے سے اُس سرے کا سفر کرنا پڑا۔

خاتون کی اطلاع درست تھی۔ اس نے ۱۴ کو ۱۴ پڑھا۔ جب کہ مرد نے ۱۴ کو ۴۱ پڑھ لیا۔ اس دنیا میں وہی رہنما سچا رہنما ہے جو ۱۴ کو ۱۴ پڑھے جو رہنما ۱۴ کو ۴۱ پڑھ لے وہ لوگوں کو بھٹکانے کے سوا کوئی اور خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

گیٹ ۱۴ پر میں نے اپنا ٹکٹ دیا تو اس نے اکانومی کلاس کا بورڈنگ کارڈ دیدیا حالانکہ میرا ٹکٹ اوپر کے درجہ کا تھا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اوپر کے درجہ میں آپ کا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا، چوں کہ اس میں سیٹ خالی نہیں ہے اس لئے اگر آپ اس جہاز سے سفر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اکانومی کلاس میں جانا ہوگا۔ میں بورڈنگ پاس لے کر انتظار گاہ میں بیٹھ گیا اور یہ سوچکر مطمئن ہوگیا کہ دونوں درجہ کے مسافر ایک ہی وقت میں منزل پر پہنچیں گے، پھر اس کے لئے پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

انتظار گاہ میں میرے قریب ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک جرمن انجینیر ہیں اور ٹکنکل تعاون کے تحت ہندستان جارہے ہیں :

Gunter Gentzsch, Ingenieur
DDR-6530 Hermsdorf, Thur. Telefon: 510

ان سے گفتگو ہونے لگی۔ میں نے پوچھا کہ آپ خدا کو مانتے ہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔ میرے والدین خدا و مذہب کو مانتے ہیں، مگر میں نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا پھر آپ کس چیز پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا عوام (people) پر۔ انھوں نے کہا کہ اصل اہمیت کی چیز انسانیت ہے نہ کہ مذہب۔ اس طرح کی گفتگو دیر تک ہوتی رہی۔

اتفاق سے ان کا کیس بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ یعنی ان کا ٹکٹ بھی اوپر کے درجہ کا تھا مگر ریزرویشن کے وقت ان کا نام ویٹنگ لسٹ میں تھا۔ چنانچہ سیٹ نہ ہونے کی بنا پر ان کو اکانومی کلاس کا بورڈنگ پاس دیا گیا تھا۔ ہم لوگ انتظار میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایر انڈیا کا اطالوی نمائندہ آیا۔ اس نے کہا کہ اوپر کے درجہ میں صرف ایک سیٹ ہے۔ اب آپ دونوں فیصلہ کرلیں۔ میں نے کہا کہ آپ (جرمن انجینیر) ہمارے ملک میں

بطور مہمان جارہے ہیں اس لئے ان کا حق مقدم ہے۔ مگر میرے اصرار کے باوجود وہ سیٹ لینے پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک "ینگ" آدمی ہوں اور آپ "اولڈ" آدمی ہیں اس لئے آپ کا حق پہلے ہے۔ آخر کار انھوں نے میرا بورڈنگ پاس بدلوا کر اس کو اوپر کے درجہ کے لئے کرادیا۔

۲۱ جون ۱۹۸۷ کی صبح کو میں واپس دہلی پہنچا۔

ایک سفر

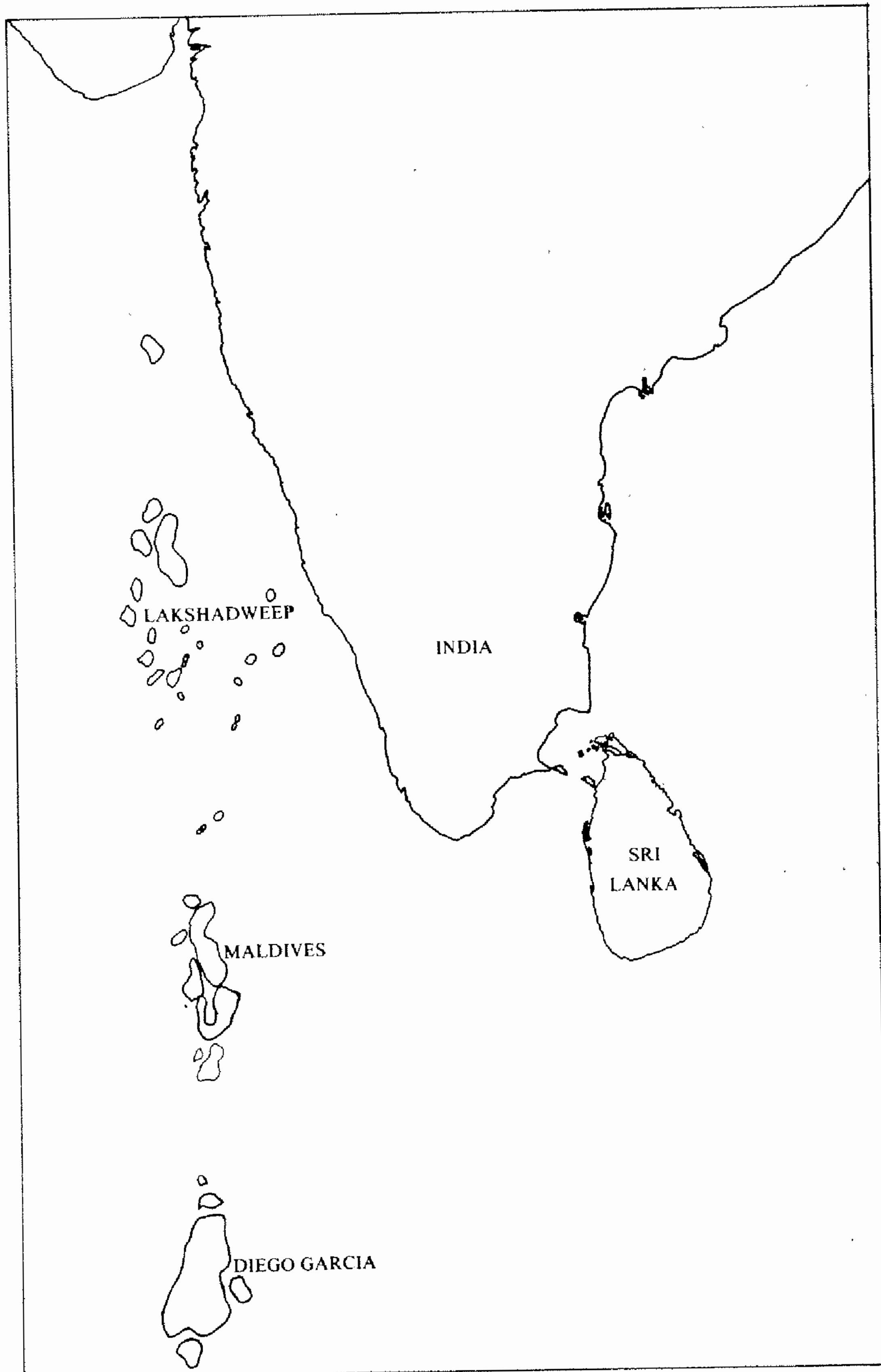
ڈیگوگارشیا سے لے کر لکا دیپ تک سمندر میں جگہ جگہ چٹانی ابھار اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے کسی نے اتھاہ پانی کے درمیان لکڑی کے بہت سے تختے ڈال دئے ہوں۔ اسی لمبے سلسلہ کے درمیان وہ "ملک" ہے جس کو جزائر مالدیپ کہتے ہیں۔ یہ جزائر ہندستان کے جنوبی ساحل سے تقریباً ۴۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔

مالدیپ کے بارہ میں راقم الحروف نے سب سے پہلے الجمعیۃ ویکلی ۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک مفصل مضمون شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: مالدیپ کا رقبہ صرف ۳۰۰ مربع کلومیٹر ہے، مگر کلیدی محل وقوع کی وجہ سے وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس کی اسی اہمیت کی بنا پر برطانیہ نے پہلی بار مالدیپ (مالے) میں ایک ہوائی اڈہ بنایا۔ دوسری عالمی جنگ میں فوجی اہمیت کے اس ہوائی اڈہ سے برطانیہ نے بہت کام لیا تھا۔ بحر ہند کے درمیان اس ہوائی اڈہ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ انگریز واقعتہً دوررس نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے وہ دنیا کے اتنے بڑے رقبہ پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

الجمعیۃ کے اس مضمون میں راقم الحروف نے مزید لکھا تھا: جزائر مالدیپ کی پوری آبادی مسلمان ہے۔ یہ پانچ سو سال پہلے کے اس واقعہ کی یادگار ہے جب کہ عرب تاجروں کے ذریعہ اسلام جنوبی ہند کے ساحل سے لے کر سیلون، مشرقی بنگال، ملیشیا اور چین تک پھیل رہا تھا۔ پندرہویں صدی کے آخر میں پرتگالی قافلے بحر ہند میں آگئے، اور انھوں نے اس علاقہ سے عربوں کی تجارت منقطع کردی۔ اس کے بعد اس علاقہ میں اسلام کی اشاعت کا کام بھی بند ہوگیا (صفحہ ۱۰)

مالدیپ کے لئے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۸۳ میں ہوا۔ یہ سفر ایک اسلامی کانفرنس کی دعوت پر تھا۔ اس سفر کی روداد الرسالہ مئی ۱۹۸۳ میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کانفرنس میں مجھے ایک مقالہ "جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں اسلام کی اشاعت" کے موضوع پر پیش کرنا تھا۔ مقالہ کی تیاری کے لئے کتابوں کی ضرورت تھی۔ دہلی کے مسلم اداروں میں مجھے اس موضوع پر کوئی کتاب نہ مل سکی اس کے بعد میں نے دہلی کے ایک مسیحی ادارہ کو ٹیلیفون کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ آج شام


LAKSHADWEEP
INDIA
SRI
LANKA
MALDIVES
DIEGO GARCIA

کو ہماری لائبریری میں آجائیں۔ شام کو میں وہاں پہنچا تو انھوں نے دس انگریزی کتابیں خاص اسی موضوع پر میرے حوالے کر دیں —— کتنا فرق ہے ایک میں اور دوسرے میں۔

مالدیپ کے لئے میرا دوسرا سفر دسمبر ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر دوبارہ ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس میں شرکت کے لئے تھا جس کا اہتمام حکومت مالدیپ کے تعاون سے کیا گیا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو فجر سے پہلے گھر سے روانہ ہونا تھا۔ ۴ دسمبر کی شام کو مختلف کاموں میں دیر ہوگئی اور میں ساڑھے بارہ بجے سے پہلے بستر پر نہ جا سکا۔ سوتے وقت دل سے دعا نکلی کہ خدایا مجھے تین بجے جگا دیجئے۔ تاخیر کی وجہ سے نیند بھی کسی قدر دیر میں آئی۔ میں گہری نیند سو گیا۔ بالکل بے خبر سو رہا تھا کہ خلاف معمول اچانک نیند کھل گئی۔ دیکھا تو گھڑی کی ایک سوئی تین پر تھی اور دوسری سوئی بارہ پر۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ دل نے کہا کہ اللہ کی مدد ٹھیک اپنے وقت پر آتی ہے۔ اگرچہ انسان اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے گھبرا اٹھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید خدا کی مدد آنے والی نہیں۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۶۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ میرے پاس جو ریٹرن ٹکٹ ہے، اس پر لکھا ہوا ہے: دہلی —— مالدیپ —— دہلی۔ اس کو دیکھ کر خیال آیا کہ اسی طرح ہر آدمی کے پاس ایک اور ریٹرن ٹکٹ ہے۔ یہ دوسرا ٹکٹ بظاہر دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس پر غیر تحریری زبان میں پختہ طور پر لکھا ہوا ہے: آخرت —— دنیا —— آخرت۔ مجھے دہلی سے مالدیپ پہنچ کر وہاں چند دن قیام کرنا ہے اور پھر دوبارہ دہلی واپس آجانا ہے۔ اسی طرح ہر آدمی جو یہاں ہے وہ آخرت سے دنیا میں آیا ہے۔ اور دوبارہ اس کو یہاں سے آخرت کی طرف جانا ہے۔ پہلی قسم کے سفر کو ہر شخص جانتا ہے، مگر دوسری قسم کے سفر کو جاننے والے اتنے کم ہیں کہ دوربین اور خوردبین سے تلاش کرنے پر بھی کہیں کوئی نہیں ملتا۔

ہوائی جہاز کے اعلانات میں ہمیشہ ایک ضروری اعلان سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہوتا ہے —— ٹوائلٹ میں اسموکنگ نہ کریں، لینڈنگ کے وقت اسموکنگ نہ کریں، وغیرہ۔ اعلان کرنے والا سگرٹ نوشی کے بارہ میں ہمیشہ "نہ کریں" والے مواقع کو بتاتا ہے، وہ "کریں" والے موقع کا اعلان نہیں کرتا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارہ میں "کریں" والی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو آدمی بتائے بغیر کرے گا۔ ایسی چیزوں کیلئے صرف "نہ کریں" والا پہلو یاد دلانے

کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اپنے طبعی تقاضوں کے جوش میں وہ اس دوسرے پہلو کو بھول جاتا ہے۔

جہاز میں مختلف اخباروں کے ساتھ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس (۵ نومبر ۱۹۸۷) بھی تھا۔ میں نے اس کو کھولا تو درمیان کے صفحہ پر ایک مضمون تھا جس کا عنوان حسب ذیل الفاظ میں قائم کیا گیا تھا: "پنجاب پر ایک آشاوادی نظر" اڈیٹوریل کے عنوانات یہ تھے: واپسی لمبی ہوگی، عام آدمی کو انصاف۔ آجکل ہندی اخبارات میں جو زبان ہوتی ہے وہ سادہ اردو ہوتی ہے۔ زیادہ بڑا فرق رسم الخط کا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ ہندستان میں "اردو دانوں" کے لئے کبھی وہ چیز پیدا ہونے والی نہیں جس کو لینگویج گیپ کہا جاتا ہے۔ یعنی زبان کی دوری۔ اصل فرق رسم الخط کا ہوگا۔ اور وہ کوئی زیادہ بڑا فرق نہیں۔

راقم الحروف نے ہندی صرف سات دن پڑھی ہے، روزانہ ایک گھنٹہ کی رفتار سے۔ اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں ایک کائستھ بھولیشور لال نے ایک ہفتہ ہمارے گھر پر آکر ہندی زبان پڑھائی تھی۔ اس سات گھنٹہ کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہے کہ بس ہندی کے بڑے حروف (عنوان، پوسٹر، نام) بآسانی پڑھ لیتا ہوں۔ اردو داں لوگ اگر صرف ہندی رسم الخط سیکھ لیں تو وہ کبھی ہندی علاقہ میں اجنبی نہیں ہوں گے۔

انڈین ایرلائنز کے میگزین سواگت (دسمبر ۱۹۸۷) میں ایک مضمون لکادیپ کے بارہ میں تھا۔ لکادیپ جغرافی اعتبار سے بالکل مالدیپ کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ ہندستانی ایڈمنسٹریشن کے تحت ہے۔ یہاں کے ایک حصہ میں مالدیپی زبان بولی جاتی ہے۔ آبادی چالیس ہزار ہے جو سب کی سب مسلمان ہے۔ ۳۶ جزائر کا یہ مجموعہ صرف ۳۲ مربع کلو میٹر کا رقبہ رکھتا ہے۔

مضمون نگار مسٹر پی۔ کے۔ ڈے مالدیپ گئے۔ وہاں سمندر کے کنارے کے خوبصورت سیپ انھیں بہت پسند آئے اور انھوں نے بہت سے سیپ اپنے بیگ میں جمع کر لئے۔ وہ لکھتے ہیں:

I managed to collect a bagful of sea shells of various shapes and hues. However, many of these I had to throw back as soon as it was discovered that inside these were nestling live hermit crabs!

وہ خوبصورت سیپ جن میں دنیا کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہوں، ان کو ہر آدمی دیکھ لیتا ہے اور اپنے سے دور پھینک دیتا ہے۔ مگر یہاں دوسرے بہت سے خوبصورت سیپ ہیں جن میں آخرت کے کیکڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان دوسری قسم کے کیکڑوں کو کوئی نہیں دیکھتا۔ ان کو ہر آدمی اپنے بیگ میں محفوظ کئے ہوئے ہے۔ وہ ان کو صرف آخرت میں پھینکنا چاہے گا۔ مگر اس وقت کا پھینکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

جہاز میں انگریزی اخبار دکن کرانیکل (۵ دسمبر ۱۹۸۷) نظر سے گزرا۔ اس کی ایک خبر کی سرخی تھی ـــــ معمولی جھگڑے پر موت:

Petty quarrel leads to death

خبر میں بتایا گیا تھا کہ حیدر آباد میں ایک شخص نے رات کے وقت کسی آدمی کا دروازہ کھٹکھٹایا صاحب مکان کو اتنی رات میں دروازہ کھٹکھٹانا قابل اعتراض معلوم ہوا۔ وہ آنے والے سے جھگڑنے لگا۔ اب دوسرا شخص جو اس کا جاننے والا تھا اور سادہ طور پر صرف ملنے کے لئے آیا تھا۔ وہ بھی غصہ میں آکر لڑنے لگا۔ یہاں تک کہ مارپیٹ کی نوبت آگئی اور ایک شخص شدید زخمی ہو کر ہلاک ہو گیا۔

بظاہر یہ دو جاہل آدمیوں کی کہانی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی پوری ملت کی کہانی ہے۔ آج تمام دنیا میں مسلمانوں کا حال یہی ہے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر لڑ جاتے ہیں اور لڑائی شروع ہونے کے بعد ان کی لڑائی دوبارہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک ان کے اندر لڑنے کی سکت ہی ختم نہ ہو جائے ـــــ عراق۔ ایران کی حکومتی جنگ سے لے کر بستیوں کی انفرادی مقدمہ بازی تک ہر جگہ مسلمانوں کا حال یہی ہے۔

راستہ میں ہمارا جہاز کچھ دیر کے لئے کوچن اترا۔ ۲۵ سال پہلے میں ایک بار چند دن کے لئے کوچن آیا تھا۔ اس وقت کی کئی باتیں ابھی تک مجھ کو یاد ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں کوچن سے راس کماری (کیپ کورن) گیا تھا۔ اس وقت یہاں تعمیرات نہیں ہوتی تھیں۔ ہندستان کے آخری ساحل پر بیٹھ کر دیر تک میں سمندر کے مناظر کو دیکھتا رہا۔ ساحل سے تقریباً نصف فرلانگ کے فاصلہ پر سمندر کے درمیان ایک چٹان تھی۔ اس سے سمندر کا پانی ٹکرا کر اچھلتا تھا تو عجیب منظر پیدا ہوتا تھا۔ سوامی ویویکانند ہندستان کا سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تو

انھوں نے سمندر میں چھلانگ لگادی ۔ وہ تیرتے ہوئے مذکورہ چٹان کے اوپر پہنچے اور وہاں دھیان گیان کیا۔ اب اس چٹان پر ان کے نام سے بہت بڑا اسنٹر بنا یا گیا ہے۔ تاہم قدرت کا سابقہ منظر اب وہاں موجود نہیں۔

آتے اور جاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے جہاز گوا میں ٹھہرا۔ بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ گوا ۱۵۰۵ سے پرتگال کے قبضہ میں تھا۔ ۱۹۶۲ میں دوبارہ وہ ہندستان کے قبضہ میں آیا۔ آزادی (۱۹۴۷) سے قبل ہندستان میں تین مغربی طاقتیں تھیں۔ زیادہ بڑے حصہ پر انگریز اور چند چھوٹے مقامات پر فرانسیسی اور پرتگالی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے بدلے ہوئے حالات کا اعتراف کرتے ہوئے پرامن طور پر اپنے زیر قبضہ علاقے خالی کر دئے۔ مگر پرتگالی پرامن تخلیہ کے لئے راضی نہیں ہوئے ۔ ملک میں آزاد قومی حکومت کے قیام کے بعد جواہر لال نہرو نے مسلسل یہ کوشش کی کہ پرتگالی پرامن طور پر اپنے علاقے کو آزاد کر دیں۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ آخر کار دسمبر ۱۹۶۱ میں ہندستان نے فوجی کارروائی کرکے بزور گوا پر قبضہ کرلیا۔

اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے نہایت بامعنی بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ نہرو کے فوجی قبضہ کے بعد مغربی ملکوں میں اس کے خلاف کافی شور و غل ہوا مگر تاریخ کی روشنی میں نہرو کا اقدام جائز تھا۔ برطانی اور فرانسیسی واپسی کے بعد ہندستان میں پرتگالی مقبوضات کی موجودگی ایک خلاف زمانہ حرکت تھی :

With the withdrawl of the British and the French, the Portugese colonial presence in India became an anachronism (12/946).

حقیقت، واقعہ کا اعتراف اگر آپ بخوشی نہ کریں تو بالآخر آپ کو حقیقت واقعہ کا اعتراف بجبر کرنا پڑے گا۔ اور دوسری صورت کے مقابلہ میں پہلی صورت یقینی طور پر زیادہ اہون ہے۔

تریوندرم سے جہاز بدلنا تھا، اس لئے یہاں چند گھنٹے رکنا پڑا۔ تریوندرم ریاست کیرلا کا دارالسلطنت ہے جو ساحل سمندر سے ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ تریوندرم کو پہلی بار ۱۷۴۵ میں اہمیت حاصل ہوئی جب کہ راجہ مارتنڈاورما نے اس کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ کیرلا یونیورسٹی یہیں قائم ہے۔ مشہور اورینٹل کانفرنس (۱۹۳۷) تریوندرم ہی میں ہوئی تھی ۔ اس کے صدر

ڈاکٹر ٹامس (F.F. Thomas) تھے۔ انھوں نے میکس مولر کا حوالہ دیتے ہوئے یہ انوکھی بات کہی تھی کہ سنسکرت اس ملک میں اتنی ہی عام ہے جتنا کہ قدیم یورپ میں لاتینی تھی۔ اور سنسکرت کی ایک سادہ صورت (Simple form) کو پورے ملک کی مشترک زبان بنانے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے (ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ ۱۲۷)

تریوندرم جنوبی ساحل پر واقع ہے جہاں بحر عرب کی لہریں آکر ہندستان کی سرزمین سے ٹکراتی ہیں۔ اس علاقہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اسلام عرب تاجروں کے ذریعہ آیا۔ اس طرح یہاں کے لوگ اسلام سے اس خالص تعمیری پہلو کی حیثیت سے آشنا ہوئے جس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے شاندار کلچر (Brilliant culture) سے تعبیر کیا ہے۔

عرب تاجروں کے غیر سیاسی اور تعمیری انداز نے لوگوں کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ نہ صرف عوام بلکہ راجے اور مہاراجے بھی اسلام سے شدید طور پر متاثر ہوئے۔ کالی کٹ کے راجہ زمورن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عرب تاجروں کا سرپرست بن گیا۔ اور اپنی رعایا میں قبول اسلام کی حوصلہ افزائی کرنے لگا (پریچنگ آف اسلام، ۲۶۹)

پروفیسر آرنلڈ نے لکھا ہے کہ سولھویں صدی کے آغاز میں موپلا نومسلم مالا بار کی آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ تھے۔ اگر پرتگالی اس علاقہ میں نہ پہنچتے تو اس ساحل کے تمام لوگ مسلمان ہو جاتے۔ کیوں کہ وہ کثرت سے اسلام قبول کر رہے تھے اور مسلم تاجروں کا طبقہ ان کے اوپر نہایت گہرا اثر ڈال رہا تھا (۲۶۹)

ہندستان میں "ملک" ایک واحد جغرافی خطہ کا نام ہوتا ہے۔ مگر جب آپ مالدیپ کی فضا میں پہنچ کر نیچے کی طرف نظر ڈالیں تو "ملک" کا تصور بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ یہاں "ملک" ایک ایسے مجموعہ کا نام ہے جو منتشر صورت میں سمندر کے اندر دور دور تک بکھرا ہوا ہو۔ مالدیپ ۱۰۸۷ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان کا مجموعی رقبہ ۲۹۸ مربع کیلو میٹر ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے سمندر میں تقریباً ساڑھے سات سو کیلو میٹر لمبائی اور تقریباً سوا سو کیلو میٹر چوڑائی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے صرف ۲۱۹ جزیرے آباد ہیں جن میں یہاں کے تقریباً پونے دو لاکھ باشندے رہتے ہیں۔ باقی جزیرے زیادہ تر جنگلات کی صورت میں ہیں۔ مالے (Male) نامی

جزیرہ یہاں کا دار السلطنت ہے۔ یہ جزیرہ صرف ایک میل چوڑا اور ڈیڑھ میل لمبا ہے۔

مالدیپ کے سابق وزیر اعظم مسٹر احمد ذکی مارچ ۱۹۷۴ میں ہندستان آئے تھے۔ یہاں انھوں نے ایک بیان میں کہا تھا کہ " ان کا ملک چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹا ہوا ہے، اس بنا پر رسل ورسائل (communication) کی بہت دشواری ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے"۔ آزادی (۱۹۶۵) کے بعد مالدیپ نے اس میدان میں خصوصی توجہ دی۔ اب یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا ہے۔ تمام آباد جزائر میں بندرگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ جدید طرز کی کشتیاں جزائر کو مربوط کرنے کے لئے ہر وقت سمندر میں دوڑتی رہتی ہیں۔ وائرلیس کا عمدہ نظام قائم ہے جس کی وجہ سے ایک لمحہ میں ایک جزیرہ اور دوسرے جزیرہ کے درمیان ربط قائم کیا جا سکتا ہے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ مالدیپ کے ذمہ دار اگر یہ مہم چلاتے کہ مالدیپ کے ۱۰۸۷ جزیروں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تاکہ دوسرے ملکوں کی طرح ان کا ملک بھی ایک واحد زمینی خطہ بن جائے جس میں اس سرے سے اس سرے تک سڑکیں ہوں اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ریلیں دوڑتی ہوں۔ اگر وہ ایسی مہم چلاتے تو وہ صرف ایک بے فائدہ لفظ بازی ہوتی جس کا موجودہ اسباب کی دنیا میں کوئی حاصل نہیں۔ مگر انھوں نے اس قسم کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ اس کے برعکس انھوں نے صورت واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے حسب حال اپنے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۵ سال کے اندر ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جب کہ جزائر کی یکجائی کے لئے ان کی "مطالباتی مہم" ۲۵ ہزار سال میں بھی کسی نتیجہ پر پہنچنے والی نہیں تھی۔

اس دنیا میں کامیابی کی پہلی شرط حقیقت واقعہ کا اعتراف ہے۔ حقیقت واقعہ کے اعتراف کے بعد ہی کسی شخص یا قوم کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کریں، ان کا سفر ہی شروع نہیں ہوگا۔ اور جس سفر کا آغاز نہ ہوا ہو وہ سفر اختتام پر کیسے پہنچ سکتا ہے۔

۵ دسمبر ۱۹۸۷ کی سہ پہر کو مالدیپ پہنچے۔ یہاں کا خاص شہر اور دار السلطنت مالے ہے۔ مالے سے کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا اور لمبا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ پر ہوائی اڈہ بنا ہوا ہے۔ اس جزیرہ کا رقبہ بس اتنا ہی ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے ہوائی اڈہ کے طور پر استعمال ہو سکے۔

اس کا طرز تعمیر عام ہوائی اڈوں سے مختلف ہے۔ وہ جس طرح فطری ماحول میں ہے، اسی طرح وہ فطری انداز میں بنایا گیا ہے اور نہایت خوبصورت ہے۔

ہوائی اڈہ اور مالے کے درمیان سمندر حائل ہے۔ یہ فاصلہ جدید طرز کی موٹر بوٹ کے ذریعہ طے ہوا۔ یہ سفر اس درجہ پرکشش تھا کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک عرب شیخ بار بار "جمیل، جمیل" کہے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے ہوائی اڈہ پر جہاز رن وے پر دوڑ رہا تھا، اور ہمارے سامنے مشینی کشتی سمندر کی موجوں کو پھاڑتی ہوئی آگے چلی جا رہی تھی۔ چاروں طرف آفاقی مناظر اور حسین فطرت آدمی کو مبہوت کر رہے تھے۔ اس تجربہ کے زیر اثر میں ہوٹل کے کمرہ میں داخل ہوا تو وہاں دیوار پر ایک خوبصورت تصویر تھی جس میں سمندر کے پس منظر میں جزیرہ کو دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:

A taste of paradise

میں نے سوچا کہ جس جنت کی دور کی ایک جھلک اتنی حسین ہو، وہ جنت خود کتنی زیادہ حسین ہوگی۔ بے اختیار یہ دعا نکلی کہ خدایا، میرے پاس کوئی عمل نہیں جس سے میں جنت جیسی قیمتی چیز کا امیدوار بن سکوں دوسرے لوگوں کو آپ جنت بطور جزا دیں گے، مجھ کو جنت بطور عطیہ دے دیجئے۔

موٹر بوٹ سے اتر کر سڑک پر آئے تو وہاں سب سے پہلے جو چیز نظر کے سامنے تھی وہ ایک بڑا سا بینر تھا جس پر لکھا ہوا تھا: مرحبا بالعلماء المسلمین علی ارض الاسلام (اسلام کی سرزمین پر مسلم علماء کا آنا مبارک) یہ گویا پہلی تحریری علامت تھی کہ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں مذکورہ انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس کا انعقاد ہونے والا ہے۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں مالدیپ کے تذکرہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ گمان غالب ہے کہ مالابار کے راستہ سے اسلام مالدیپ میں پہنچا۔ اس جزیرے کے باشندے عرب اور ایرانی تاجروں کے ذریعے مسلمان ہوئے۔ یہ تاجر ان علاقوں میں آباد ہوتے۔ انھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح انھوں نے یہاں مؤثر تبلیغ کا راستہ ہموار کیا۔ اندازہ ہے کہ مالدیپ میں پہلا اسلام قبول کرنے والا شخص سلطان احمد شنورازہ تھا جو ۱۲۰۰ء کے قریب مسلمان ہوا۔ (صفحہ ۲۷۳) کچھ مورخین کا خیال ہے کہ لگ بھگ ۵۰۰ء میں سیلون سے کچھ بدھسٹ یہاں آکر آباد

ہوئے ۔ ۱۲ ویں صدی عیسوی میں ان لوگوں نے اجتماعی طور پر اسلام قبول کر لیا۔

جناب ابراہیم شہاب (اسپیکر) نے مالدیپ میں اسلام کے آغاز کی تاریخ کسی قدر مختلف انداز میں بتائی۔ انھوں نے کہا کہ پہلے یہاں ایک راجہ شری بھونا دیت تھے۔ ان کے زمانہ میں مغرب (افریقہ) سے ایک "ولی" ابوالبرکات یوسف البربری یہاں آئے۔ ۵۴۸ھ میں ان کے ہاتھ پر راجہ مسلمان ہوگیا۔ اور اپنا نام محمد بن عبد اللہ رکھا۔ اس کے بعد تھوڑی مدت میں مالدیپ کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔

جناب ابراہیم شہاب نے ایک اور عجیب بات یہ بتائی کہ سابق سلطان کا خاندان مالدیپ میں نئے حالات سے مکمل موافقت کر کے رہتا ہے۔ دوسرے باشندوں کی طرح اس کے افراد یا سروس میں ہیں یا تجارت میں۔ کسی شاہی خاندان کے لئے بدلے ہوئے حالات سے مطابقت کی یہ انوکھی مثال ہے جو غالباً یہاں کے سادہ فطری مزاج کی دین ہے۔

مالدیپ جیسے چھوٹے ممالک قدیم زمانہ میں ہمیشہ خطرہ کی حالت میں رہتے تھے۔ کسی بھی صبح و شام کوئی بڑی طاقت آکر ان پر قبضہ کر سکتی تھی۔ مثلاً پرتگالی ۱۵۵۸ میں آکر مالدیپ پر قابض ہوگئے۔ ان کا قبضہ ۱۵۷۳ تک جاری رہا۔ سترہویں صدی عیسوی میں وہ ڈچ حکمرانوں کے ماتحت رہا۔ ۱۸۸۷ سے وہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نو آبادیاتی نظام کمزور ہوا تو ۱۹۶۵ میں اس کو برطانیہ سے آزادی حاصل ہوگئی۔ ۱۹۶۸ سے مالدیپ میں مکمل جمہوریہ قائم ہے۔ موجودہ دور میں پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ چھوٹی قومیں بھی اپنی آزاد حکومت قائم کر سکیں۔ مالدیپ ۱۹۶۵ سے اقوام متحدہ کا ممبر ہے۔ یہاں تقریباً ۸۵ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔

مساوات اور قومی سالمیت اور انسانی آزادی کے احترام کا دور جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو عام طور پر لوگ اس جدید مغربی انقلاب سے منسوب کرتے ہیں جس کی ایک علامت اقوام متحدہ ہے۔ مگر خود جدید انقلاب اور اقوام متحدہ اس اسلامی انقلاب کی پیداوار ہیں جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے عالمی سطح پر پیدا کیا تھا۔

۱۶ ویں صدی کے پرتگالی سیاح باربوسا (Duarte Barbosa) نے جنوبی ہند کا سفر کیا تھا۔ وہ ۱۵۰۴ اور ۱۵۱۷ کے درمیان وجیا نگرم آیا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں

مالدیپ میں جہاز سازی کی صنعت قائم تھی۔ اور جنوبی ہند کے لوگ اپنی ضرورت کے جہاز مالدیپ میں بنوایا کرتے تھے۔ وجیانگرم کے راجہ کے جہاز بھی مالدیپ سے بن کر آتے تھے۔

جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ سلطان ٹیپو کا باپ حیدر علی (۱۷۲۲ – ۱۷۸۲) نہایت عزم اور حوصلہ والا آدمی تھا۔ وہ ہندستان کی تاریخ میں ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ وہ پورے ملک کا لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ حیدر علی نے دوسروں سے بہت پہلے سمندری طاقت کا اندازہ کر لیا تھا اور یہ سمجھ گیا تھا کہ انگریزوں کی کامیابی کا اصل راز بحری طاقت میں ان کی برتری ہے۔ اس نے خود اپنا ایک بحری بیڑہ بنانا چاہا اور مالدیپ پر قبضہ کر کے اس کو جہاز سازی اور بحری سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی کوشش کی:

He started building his own navy and, capturing the Maldive Islands, made them his headquarters for ship building and naval activities (p. 275).

مالدیپ کے ساحل پر جب میں نے یورپ کی بنی ہوئی مشینی کشتیوں کی قطاریں دیکھیں تو میں نے کہا: روایتی جہازسازی کے دور میں مالدیپ جہاز کا "تاجر" تھا، مگر سائنسی جہاز سازی کے دور میں مالدیپ صرف "خریدار" بن کر رہ گیا۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا حال ہے۔ مسلمان دور قدیم میں سب سے آگے تھے، مگر دور جدید میں وہ سب سے پیچھے ہو گئے۔

یہاں میرا قیام نسَن دُھرا پیلیس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۸ میں تھا۔ یہ عین سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ایک طرف ہوٹل کی عمارتوں کی صورت میں انسانی مصنوعات کا منظر ہے اور دوسری طرف سمندر کی لہروں اور پھیلے ہوئے آسمان کی صورت میں خدائی مصنوعات کا۔ ہوٹل اور سمندر کے درمیان صرف ایک سڑک حائل ہے۔ سمندر کا یہ منظر میرے لئے ہمیشہ وسخر لکم ما فی السمٰوات والارض کی تصویر ہوتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے جزیروں کے مقابلہ میں سمندر ہیبت ناک حد تک بڑا ہے۔ مگر اس کی موجیں ساحل کو چھو کر اس طرح واپس چلی جاتی ہیں جیسے کہ ان کو ایک برتر حکم کے تحت پابند کر دیا گیا ہو کہ تمہاری حد یہاں ختم ہو گئی، اس سے آگے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔

زندہ چیزوں میں ہاتھی اور غیر زندہ میں سمندر کا انسان کے لئے مسخر ہونا انتہائی عجیب ہے۔

اگرچہ سخر لکم ما فی السموات و الارض کے دوسرے بے شمار پہلو ہیں جو اس سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ مگر ان کو جاننے کے لئے سائنسی معلومات کی ضرورت ہے لیکن ہاتھی اور سمندر کا مسخر ہونا ایسے کھلے ہوئے واقعات ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اور ان سے اپنے لئے سبق حاصل کر سکتا ہے۔

مالدیپ کو "سیاحوں کی جنت" کہا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے مغربی ملکوں کے لوگ تفریح اور سیاحت کے لئے آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں سے یہاں میری گفت گو ہوئی۔ میرا عام تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور مغربی اقوام میں ایک خاص فرق پایا جاتا ہے۔ اگر آپ ایک مسلمان سے کسی موضوع پر گفت گو کریں تو اس کے لئے انتہائی مشکل ہوگا کہ وہ اپنے ذاتی خیالات سے الگ ہو کر آپ کی بات سن سکے۔ وہ آپ کی بات کو اس طرح سنتا ہے جیسے کہ کب آپ کی بات ختم ہو اور وہ دوبارہ اپنے دماغ کا ٹیپ کھول دے۔

میں نے اپنے تجربہ میں بار بار یہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں مغربی انسان کا حال بالکل مختلف ہے۔ ذاتی طور پر وہ خواہ کوئی بھی خیال رکھتا ہو، مگر جب آپ اس سے ایک بات کہیں تو وہ اپنے خیالات سے جدا ہو کر آپ کی بات کو سنے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ خالی الذہن ہو گیا ہے اور ہر دوسری چیز سے بالکل بے تعلق ہو کر آپ کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بے حد اہم فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا سبب ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جمود کی حالت میں مبتلا کر دیا ہے، اور مغربی قومیں مسلسل ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کئے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک پاکستانی افسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے اور اگست ۱۹۴۷ میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ میرا اڈس ایڈ وانٹج یہ ہے کہ میں ایک "اردو اسپیکنگ مہاجر" ہوں، اس لئے بڑی ترقیوں کے دروازے میرے لئے بند ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا گروہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پاکستان میں بے حیثیت ہو رہا ہے۔ ان کے الفاظ میں "ان مہاجرین کے اندر Nuisance value تو ہے، مگر ان کے اندر Democratic value نہیں اس لئے وہ شور و غل تو کر سکتے ہیں، مگر وہ ملک کے ڈھانچہ میں کوئی موثر تبدیلی لانے کی طاقت نہیں رکھتے ـــــ جو لوگ "ہندو اکثریت" سے خائف ہو کر پاکستان چلے گئے تھے، وہ دوبارہ

خود "مسلم اکثریت" کا شکار ہو کر رہ گئے۔

یہ بات جو مذکورہ پاکستانی نے اپنے ملک کے بارہ میں کہی، یہی ہندستان کے مسلمانوں کے بارہ میں بھی درست ہے۔ یہاں کے مسلمان جلسے جلوس، تقریروں اور بیانوں کے ہنگامے تو دکھارہے ہیں مگر وہ ملکی نظام پر اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ اور اس کی مشترک وجہ یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اسی کے ساتھ غیر منظم بھی۔ ان کے موجودہ طریق کار کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ صرف غوغائی گروہ Clamorous group کا لقب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اس کے بجائے "تخلیقی گروہ" بننا چاہئے۔ انھیں احتجاج اور مطالبہ کے بجائے اپنی افادیت ثابت کرکے اس ملک میں اپنا مقام حاصل کرنا چاہئے۔

ایک اور پاکستانی مسلمان نے بتایا کہ ۱۹۸۶ میں کراچی میں شیعہ سنی فساد کا سبب جلوس تھا۔ شیعہ حضرات نے ایک ایسے راستہ سے اپنا جلوس نکالا جس پر سنی حضرات کو اعتراض تھا۔ انھوں نے روٹ بدلنے پر اصرار کیا۔ تاہم روٹ میں تبدیلی نہ ہوسکی اور فساد ہو گیا۔ یہی کہانی ہندستان میں بھی بار بار دہرائی جارہی ہے۔ جلوس کے روٹ پر اعتراض کا سبب غالباً مسلمانوں کا بڑھا ہوا جذبہ فخر ہے۔ جلوس کو مسلمان شان وشوکت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں، اس لئے غیر قوم کے جلوس کا اپنے علاقہ سے گزرنا انھیں گوارا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں سے اگر جھوٹے فخر کی یہ نفسیات ختم ہو جائے تو جلوس جیسی چیزوں پر فساد برپا ہونے کا سلسلہ بھی یقیناً ختم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر شیر چودھری جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ وہ اصلاً پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر اب افریقہ میں وہاں کے شہری کی حیثیت سے رہ رہے ہیں۔ انھوں نے ایک گفتگو کے دوران بہت دلچسپ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی اصلاح کیسے ہو۔ کوئی شخص جب مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نکلتا ہے، تو خواہ وہ جدھر بھی نکلے، فوراً راستہ میں ایک مردہ آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کا سفر وہیں رک جاتا ہے (مردہ کھڑا ہونے سے ان کی مراد کیا تھی، اس کی تشریح ناظرین خود کر سکتے ہیں)

مذکورہ اسلامی کانفرنس کا ایجنڈا (جدول الاعمال) حسب ذیل تھا:

عالمی اسلامی مسائل پر رپورٹ

مشکلات جو عالم اسلامی کو درپیش ہیں (المشاکل التی تواجه العالم الاسلامی)

دنیا میں مسلم اقلیتوں کی حالت (اوضاع الاقلیات الاسلامیة فی العالم)

دعوت اسلامی میں مسلم عورت کا حصہ (دور المرأة المسلمة فی الدعوة الاسلامیة)

۷ دسمبر سے ۱۱ دسمبر تک ان موضوعات پر بحث و گفتگو جاری رہی۔ اپنے عام طریقہ کے مطابق میں اس سفر نامہ میں رپورٹ کے انداز کی تفصیلات درج نہیں کروں گا۔ میں صرف ان چند یادوں کو پیش کروں گا جن میں کوئی سبق ہے اور جن میں عام لوگوں کے لئے غور وفکر کا سامان ملتا ہے۔

کانفرنس کا افتتاح ۷ دسمبر ۱۹۸۷ کی صبح کو اسلامک سنٹر کے ہال میں کیا گیا۔ یہ وسیع اور خوبصورت اسلامک سنٹر ابھی حال میں مختلف اسلامی ملکوں کے تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔ کارروائی کا آغاز مالدیپ کے ایک قاری کی قرأت قرآن سے ہوا۔ قاری جب قرآن کی قرأت کر رہا تھا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ دنیا کے جس گوشہ میں بھی میں نے کسی شخص کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا ہے، اس کی زبان اور اس کا لہجہ ہمیشہ ٹھیک وہی ہوتا ہے جو یہاں اس چھوٹے سے جزیرہ میں مجھ کو سنائی دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چودہ سو سال پہلے ایک زندہ ٹیپ تیار کیا گیا تھا، یہ ٹیپ آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے اور اسی ابتدائی آواز میں ہر جگہ لوگوں کو خدا کا ابدی پیغام سنا رہا ہے۔

مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم کے کلمات سے کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنی عربی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ باہمی اتفاق واتحاد پر زور دیتے ہوئے کہا:

لقد نسینا قول الله عز وجل (ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ریحکم)

ونسینا قول رسوله الکریم (لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وکونوا عباد الله اخوانا)

میں نے سوچا کہ مسلمان کس قدر خوش قسمت ہیں کہ خدا اور رسول کے کلام کی صورت میں ان کے پاس ایک ایسا مستند ہدایت نامہ موجود ہے جس کا حوالہ باہمی معاملات میں دیا جا سکتا ہو اور جس کے

آگے تمام لوگوں کی گردنیں جھک جائیں۔ اس کے باوجود کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کا حال موجودہ زمانہ میں ایسا ہو رہا ہے جیسے کہ ان کے پاس کوئی متفقہ فکری اور اعتقادی بنیاد ہی نہیں ـــ کسی قوم کے افراد میں اگر بےحسی پیدا ہو جائے تو انتہائی قیمتی پیغام بھی اس کے لئے بے اثر ہو جاتا ہے۔

مجھے جہاں کہیں بھی موقع ملا، میں نے دعوت کے پہلو پر زور دیا۔ ایک عرب مقرر نے اپنی تقریر میں کہا کہ کیف ندعوا غیر المسلمین الی الاسلام و المسلمون منهزمون امام اعدائهم (ہم کیسے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دے سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے شکستہ اور مغلوب ہو رہے ہیں) میں نے کہا کہ قدیم مکہ میں مسلمان اپنے دشمنوں سے مغلوب تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان کو دعوت دی اور کامیابی حاصل کی۔ تاتاری حملہ کے بعد مسلمان مغلوب ہو گئے تھے، پھر بھی انھوں نے ان کو دعوت دی اور اسلامی دعوت کے ذریعہ دوبارہ مسلم دنیا میں اسلام کی ایک نئی تاریخ ظہور میں آئی۔

موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر دوسرے پروگرام کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ مگر خالص اسلامی دعوت کا پروگرام ان کی سمجھ میں نہیں آتا، اگرچہ اس کے حق میں کتنے ہی زیادہ دلائل پیش کر دئے جائیں۔ دوسرے پروگراموں کی مسلسل ناکامی کے باوجود اس طریقہ کے بارے میں ان کا یقین ختم نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر "مسائل دنیا" کا غلبہ ہے، ان کے اوپر "مسائل آخرت" کا غلبہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اور دنیوی نوعیت کے مسائل فوراً ہر شخص کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مگر ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں مسلمانوں کو اقوام عالم کے اوپر گواہ بنانا چاہتا ہے اور آخرت کی یہ گواہی وہ اسی وقت دے سکتے ہیں جب کہ اس سے پہلے دنیا میں انھوں نے دعوت الی اللہ کا کام کیا ہو۔

عام طور پر لوگ بڑے بڑے واقعات سے دل چسپی لیتے ہیں۔ اس کے برعکس مجھے ہمیشہ ان چیزوں سے دل چسپی ہوتی ہے جن کو لوگ معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً بین اقوامی اجتماعات میں فوری ترجمہ کا انتظام۔ یہ ایک عام اور معلوم بات ہے۔ مگر جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھ کو اتنا عظیم معلوم ہوتا ہے کہ شدت تاثر سے میرے جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک شخص عربی زبان میں تقریر کر رہا ہے۔ عین اسی وقت اس کی تقریر انگریزی زبان میں منتقل کی جارہی ہے۔ مثلاً ایک مقرر اپنی تقریر کے دوران ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: لـذا الك انی اقـترح، عین اسی وقت مترجم کہتا ہے Therefore I propose اسی طرح مثلاً ایک شخص کی تقریر کے دوران دوسرا شخص مداخلت کرتے ہوئے کہتا ہے: نقطـة نظام۔ عین اسی وقت مترجم کہتا ہے: Point of order بظاہر یہ ایک انسانی واقعہ ہے مگر جب میرے سامنے یہ واقعہ گزرا تو وہ مجھے ایک خدائی کرشمہ معلوم ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ دو الگ الگ ذہنوں کے درمیان ایک انتہائی پیچیدہ معاملہ میں انتہائی کامل مطابقت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ دونوں شخصیتوں کا خالق (بالفاظ دیگر منصوبہ ساز) ایک ہو۔ اور دونوں کا منصوبہ ساز ایک ہستی کو ماننے ہی یہ ماننا بھی لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کا خالق "شعور" ہے نہ کہ بے روح مادی اسباب کا اندھا تعامل۔

اسی طرح بڑی کانفرنسوں میں یہ منظر عام ہے کہ ٹیلی وژن کے آدمی مشینیں لئے ہوئے موجود ہیں اور لوگوں کی آوازیں اور ان کی حرکات ریکارڈ کر رہے ہیں۔ ۹ دسمبر کی رات کو میٹنگ چل رہی تھی۔ حسب معمول دو آدمی اپنی مشینوں کے ساتھ اپنی کارگزاری میں مصروف تھے۔ میں نے اس منظر کو دیکھا تو اچانک وہ میرے ذہن میں اُس واقعہ میں مبدّل ہوگیا جس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید (ق : ۱۷) ایک منٹ کے لئے مجھے ایسا لگا جیسے واقعتہً ہمارے دونوں طرف فرشتے کھڑے ہوئے ہیں اور نہایت صحت کے ساتھ ہمارے قول وعمل کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔

ایک بزرگ (شیخ راشد فرحان) نے کہا تھا کہ ہمیں سیاست سے الگ رہ کر صرف دعوت کے کام پر مرتکز رہنا چاہئے۔ اس پر ایک نوجوان نے پرجوش طور پر کہا کہ اسلام صرف مذہب نہیں، اسلام سیاست بھی ہے۔ اس لئے ہم اپنے پروگراموں سے سیاست کو الگ نہیں کر سکتے۔ اس کے جواب میں دکتور اسکندر نے کہا: یہ صحیح ہے کہ اسلام دین اور سیاست دونوں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اسلام حکمت بھی ہے۔ اور حکمت کا تقاضا ہے کہ اس وقت ہم سیاسی مسائل سے الگ رہیں۔ ورنہ کوئی بھی کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ کُل کو لینے

کی کوشش میں جز، کو بھی کھو دیں، حتی کہ خود دعوت کو بھی۔

ایک عرب نوجوان نے پرجوش طور پر اس چیز کا ذکر کیا جس کو آجکل صحوۃ اسلامیۃ (اسلامی بیداری) کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ صحوہ اسلامیہ نہیں ہے بلکہ صحوہ قومیہ ہے۔ ان تحریکوں کے پیچھے رومانی جوش کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے منفی دھوم میں تو ضرور اضافہ کیا ہے۔ مگر ان کے ذریعہ اب تک کوئی مثبت انجام ظاہر نہ ہو سکا۔

اسلامی صحافت کے موضوع پر کلام کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا جو لندن سے آئے تھے۔ کہ ہمارے نزدیک اسلامی صحافت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو معصوم فرض کرتے ہوئے صرف اغیار کو ظالم اور فاسد بتایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ایک طرف ہماری یہ "اسلامی صحافت" ہے۔ دوسری طرف یہودی صحافت کا حال یہ ہے کہ میں یہودیوں کے بڑے بڑے اخبارات کو پابندی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ میں نے پایا ہے کہ یہودی اخبارات میں کسی تحفظ کے بغیر یہودیوں کے درمیان پائی جانے والی خرابیوں کو بتایا جاتا ہے اور کوئی یہودی اس کو برا نہیں مانتا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی یہ شکایت اگر صحیح مان لی جائے کہ یہودی اور عیسائی اخبارات ہمیشہ مسلمانوں کی بری تصویر پیش کرتے ہیں تو عین یہی بات خود مسلم اخبارات بھی عیسائیوں اور یہودیوں کے بارہ میں کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسلم صحافت سے اگر ہماری مراد مسلم وکالت ہے تو یہ بالکل بے فائدہ ہے۔ اس کے برعکس مسلم صحافت کو بیانِ واقعہ پر مبنی ہونا چاہئے۔ اس طرح ایک طرف ہم اپنے نقائص سے مطلع ہو کر اس کی اصلاح کی طرف توجہ دے سکیں گے۔ دوسری طرف ہمارے اخبار کو قارئین کے درمیان مقبولیت حاصل ہوگی۔ وکیلانہ صحافت کو کبھی عمومی ریڈرشپ نہیں مل سکتی، حتی کہ اس گروہ کے درمیان بھی نہیں جس کی وکالت کے لئے اسے جاری کیا گیا ہے۔

سری لنکا سے ایک صاحب کانفرنس میں شریک ہوئے۔ انھوں نے ان مظالم کی تفصیل بیان کی جو اکتوبر۔ نومبر ۱۹۸۷ میں وہاں کے مسلمانوں کو پیش آئے اور جس کے نتیجے میں تقریباً پچاس ہزار آدمی اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے جو تفصیلات بیان کیں، ان سے میں نے جو نتیجہ نکالا، وہ یہ تھا کہ سری لنکا کے ایک علاقہ میں تامل باشندوں نے آزاد تامل اسٹیٹ کا مطالبہ کیا۔ اس علاقہ کے ایک مختصر حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ان مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ وہ تامل اسٹیٹ کے

اندر کمزور اقلیت بن جائیں گے۔ چنانچہ ان کے لیڈروں نے مطالبہ کیا کہ اس علاقے میں ایک "مسلم پراونشیل کونسل" بنائی جائے جس کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے براہ راست یا بالواسطہ مطالبے اور مظاہرے شروع ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سری لنکا کے مسلمان حکومت اور تامل ٹائیگرس دونوں کی نظر میں مشتبہ ہو گئے۔ اسی سیاست کا نتیجہ ہے کہ جس سے آجکل سری لنکا کے ایک ملین سے زیادہ مسلمان دوچار ہیں۔

سری لنکا اور دوسرے بہت سے ملکوں (مثلاً برما، فلپائن، اریٹیریا وغیرہ) میں آج کل مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ میرے نزدیک "تقسیم" کی سیاست کی توسیع ہے۔ اس طریق کار کی نادرستگی خود اس ملک میں ثابت ہو چکی ہے جو تقسیم کی سیاست کے نتیجہ میں بنا تھا۔ یہ منقسم ملک ۱۹۷۱ میں دو ملک میں تقسیم ہو گیا اور اب وہاں تقسیم کرانے والے لوگ دوبارہ ایک اور تقسیم (مہاجر صوبہ) کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس واضح ناکامی کے باوجود جو لوگ بدستور تقسیم کو اپنے مسئلہ کا حل سمجھیں اور اس کے لئے تحریک چلائیں، ان کے متعلق کم سے کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بصیرت سے محروم ہیں۔ ان کو ماضی کا گزرا ہوا واقعہ بھی دکھائی نہیں دیتا، پھر کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ مستقبل کے آنے والے واقعہ کو دیکھ سکتے ہیں۔

"جمہوریت" بظاہر اچھی چیز ہے۔ مگر جمہوریت کی صحیح کارکردگی کے لئے شعوری پختگی اور فکری انضباط نہایت ضروری ہے ورنہ جمہوریت بے فائدہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً اس کانفرنس میں ایک موضوع خواتین کا دعوتی رول (دور المرأة المسلمة في الدعوة الاسلامية) تھا۔ اس موضوع کا آغاز ایک صاحب کی تقریر سے ہوا۔ ان کی تقریر عمومی نوعیت کی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی ایک صاحب نے کہا کہ یہ تقریر غیر متعلق ہے۔ کیوں کہ ایجنڈا کے مطابق موضوع " دعوت اسلامی میں مسلم عورت کا رول" ہے اور مقرر نے عمومی طور پر مسئلہ خواتین پر تقریر کی ہے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ " دعوت" کسی محدود چیز کا نام نہیں۔ دعوت سے مراد تمام اسلامی سرگرمیاں ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ دعوت کا مطلب میرے نزدیک اسلام کا عملی پہلو (Practical aspect of Islam) ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی بحثیں دیر تک ہوتی رہیں اور کوئی متعین اور مثبت چیز سامنے نہ آسکی۔

جمہوری انداز کی ہر میٹنگ یا کانفرنس میں میں نے یہی منظر دیکھا ہے۔ ہمارے لیڈر جو جمہوریت کی حمایت میں پرجوش تقریریں کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے لوگوں کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرنی چاہئے کہ وہ فکری انضباط کے ساتھ سوچنے کے قابل ہوسکیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے زمانہ میں میرے ایک ساتھی محمد عبد الرشید برمی تھے۔ وہ رنگون کے رہنے والے تھے۔ اپنے ملک واپس جانے کے بعد انھوں نے "برمی مسلم آرگنائزیشن" کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ وہ اس کے صدر رہے۔ یہ تنظیم برما میں بہت مقبول ہوئی۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے انھوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور اس کے بعد "لیبر اینڈ انڈسٹری" محکمہ کے وزیر مقرر ہوئے۔ دوسرے ممالک سے برما کے تعلقات قائم کرنے میں انھوں نے اہم رول ادا کیا اور ملک میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔

مالدیپ کی کانفرنس میں برما کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عبد الرشید (ایم اے رشید) کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ان سے ان کے بارہ میں کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۶۲ میں جب برما میں فوجی حکومت قائم ہوئی اور اس نے منتخب حکومت کو ختم کر دیا تو عبد الرشید صاحب کھل کر اس کے خلاف تنقید یں کرنے لگے:

He used to criticise the government openly

چنانچہ حکومت ان کی مخالف ہوگئی۔ آخر عبد الرشید صاحب پاکستان چلے گئے اور وہیں ۱۹۷۸ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ عبد الرشید صاحب نے اپنی وزارت کے زمانہ میں علما کی ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے قرآن کا ترجمہ برمی زبان میں کیا۔ تاہم اس کے چھپنے سے پہلے عبد الرشید صاحب کی حکومت ختم ہوگئی۔ بعد کو قرآن کا یہ ترجمہ خود موجودہ حکومت کے تعاون سے شائع ہوا۔ موجودہ حکومت مسلم تنظیموں کو ۶۵۰۰۰ چاٹ (برمی سکہ) سالانہ امداد دیتی ہے۔ اسی سے مذکورہ ترجمہ قرآن شائع کیا گیا ہے۔

میں نے کہا کہ عبد الرشید صاحب نے ختم حکومت کے بعد جو راستہ اختیار کیا، وہ یہ تھا کہ نئی حکومت کے مخالف بن کر کھڑے ہوں اور بالآخر پاکستان جاکر خاموشی کے ساتھ فوت ہو جائیں۔ اس

کے بجائے اگر انھوں نے بدلے ہوئے حالات سے مطابقت کی روش اختیار کی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ ان کو نئے حالات میں دوبارہ مواقع کار مل جائیں جس طرح ان کے ترجمہ قرآن کے کام کو نئی حکومت کے زمانہ میں مواقع ملے۔ مذکورہ برمی مسلمان میری یہ بات سُن کر خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ طرز فکر ان کے لئے بالکل نیا ہے۔

ایک صاحب جنوبی افریقہ سے آئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اچھی انگریزی بولتے ہیں اور کافی معلومات رکھتے ہیں۔ میرے پاس گاڈ ارائزز (God Arises) کا ایک نسخہ تھا۔ میں نے واپسی کی شرط پر ان کو یہ کتاب دیکھنے کے لئے دی۔ اگلے دن انھوں نے بتایا کہ میں کتابیں چوری کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مگر آپ کی اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اس کے بارہ میں میری نیت خراب ہو گئی ہے۔ میں اس کو واپس کرنا نہیں چاہتا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی انگریزی اتنی اچھی ہے کہ میں نے بے شمار کتابیں پڑھی ہیں مگر اب تک کسی دینی شخصیت کی کتاب میں مجھے ایسی انگریزی زبان نہیں ملی۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ نے کیوں کر ایسی کتاب تیار کی۔ میں نے وہ کتاب ان کے حوالے کر دی۔ گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ علمی ذوق رکھتے ہیں اور کثرت سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک اور کتاب انھیں دیدی جو "پرافٹ آف ریولیوشن" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

"بغیر دیکھے میں جانتا ہوں آپ کو آپ کی کتابوں سے" یہ کہتے ہوئے ایک صاحب مجھ سے ملے۔ ان کے صاف اردو لہجہ پر مجھے تعجب ہوا۔ یہ جناب ابراہیم شہاب تھے جو مالدیپ کی اسمبلی میں اسپیکر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جامعہ ملیہ (دہلی) میں اس وقت تعلیم حاصل کی ہے جب کہ جامعہ قرول باغ میں تھی، پھر انھیں کے زمانے میں وہ اوکھلا منتقل ہو گئی۔

ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوا کہ یہاں بہت سے مرد اور عورتیں ہیں جو الرسالہ سے واقف ہیں یا اسلامی مرکز کی اردو یا عربی یا انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک خاتون جو ایک مقامی اخبار سے منسلک ہیں، انھوں نے بتایا کہ ہم نے الرسالہ کے کئی مضامین دویہی زبان میں ترجمہ کر کے مقامی اخبار میں شائع کئے ہیں۔ (مالدیپ کی مقامی زبان کا نام دویہی ہے)

جناب عبد اللطیف صاحب کا تعلق ایجوکیشن منسٹری سے ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مالدیپ میں بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی کتابیں (عربی یا انگریزی) پڑھی ہیں۔ ہم لوگ دینی علمی موضوعات

ہیں آپ ہی کے افکار کا حوالہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ سائنٹفک انداز میں ہوتے ہیں۔ ان کو میں نے الرسالہ انگریزی (نومبر، دسمبر ۱۹۸۷) ایک ایک عدد دیا۔ جناب عبد الحمید عبد الوہاب (ہائیکورٹ) کا خط مجھے دہلی میں ملا تھا، انھوں نے دو کتابوں کی فرمائش کی تھی۔ یہ کتابیں میں اپنے ساتھ لایا تھا اور یہاں ان کے حوالہ کر دیا۔ یہ کتابیں تھیں: خاتون اسلام اور گاڈ ارائزز۔

ایک صاحب کناڈا سے آئے تھے۔ وہ کناڈا ہی میں پیدا ہوئے، ان کی مادری زبان انگلش ہے۔ انھوں نے اعلیٰ مرحلہ تک کناڈا ہی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کو میں نے انگریزی الرسالہ دیکھنے کے لئے دیا۔ انھوں نے اسی دن سب پڑھ ڈالا۔ انھوں نے خاص طور پر "چھوٹے چھوٹے بامعنی مضامین" کو پسند کیا۔ میں نے الرسالہ کی زبان کے بارہ میں ان کی رائے پوچھی۔ انھوں نے کہا:

> The articles were not written as translations from Urdu or Arabic into English, but as from English to English.
>
> Haroon Salamat, P.O. Box 66
> Station U, Toronto, ONT, Canada M8Z ITO

۷ دسمبر ۱۹۸۷ کی شام کا کھانا ایک اور جزیرہ پر رکھا گیا تھا۔ اس کو یہاں کی زبان میں کورمبا گاؤں (Kurumba village) کہا جاتا ہے۔ کانفرنس کے تمام شرکاء بڑی موٹر بوٹ کے ذریعہ مالے سے کورمبا لے جائے گئے۔ اس جزیرہ پر سیاحوں کے لئے بہت بڑا ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جزیرہ مالے سے جزیرہ کورمبا تک ۲۰ منٹ کا راستہ ہے۔ اس وقت سمندر میں کسی قدر تموج تھا، اس لئے موٹر بوٹ معمول سے زیادہ ہلنے لگی۔ اس قسم کا تموج مہلک نہیں، تاہم وہ انسان کے عجز کے مقابلہ میں سمندر کی طاقت کا تجربہ کراتا ہے۔ میں نے کہا کہ خدایا، جس طرح آپ اتھاہ سمندر میں غرقابی سے بچاتے ہوئے میرا سفر طے کرا رہے ہیں، اسی طرح معاندین کی سازشوں سے محفوظ رکھ کر اس مشن کو جاری رکھئے، جس کے لئے اٹھنے کی آپ نے اس عاجز اور حقیر بندے کو توفیق عطا فرمائی ہے۔

ایک روز کھانے کی میز پر میرے سامنے نئے حلیہ کے ایک آدمی تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ جاپانی ہیں۔ ان کا نام تنوگو کٹاکورا ہے۔ مالدیپ میں آجکل جاپان کی امداد کے تحت ٹیلیفون لگائے جارہے ہیں، اس میں وہ بطور کنسلٹنٹ یہاں آئے ہیں۔ وہ ٹوکیو کے مضافات میں ۱۷ جنوری ۱۹۳۰ کو

پیدا ہوئے۔ وہ دوسری جنگ عظیم کے وقت مڈل اسکول کے طالب علم تھے۔

ان سے انگریزی میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ جاپانیوں کے بارہ میں مجھے سب سے زیادہ عجیب چیز ان کی تبدیلی کی صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک وہ بالکل جنگ جو قوم تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر اچانک وہ پرامن قوم بن کر تعلیم اور سائنس کے میدان میں سرگرم ہوگئے۔ جاپانیوں کی اس صلاحیت کا سرچشمہ کیا ہے۔

انھوں نے اس کا سبب جاپانی جغرافیہ کو قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ جاپان میں سال میں چار موسم ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمیں بار بار اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ جاپان میں کثرت سے زلزلے اور طوفان آتے ہیں اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ہر وقت نئی صورت سے مطابقت کرنے کے لئے تیار رہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ جاپانی لوگ نئی باتوں کو جاننے کے لئے بے حد تجسس رہتے ہیں:

Japanese are very curious to know new things, new ideas

جاپانی قوم کی اسی صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ جنگ عظیم کی بربادی کے بعد ان کے اندر شدت سے نئی سوچ ابھری۔ انھوں نے سابقہ روش کو ترک کرکے نئے حالات کے مطابق دوسری روش اختیار کر لی۔ میں نے سوچا کہ یہ فرق بھی کتنا عجیب ہے۔ ایک قوم کے لئے اس کے "زلزلے" ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں، اور دوسری قوم کے "زلزلے" اس کو صرف فریاد و ماتم کی غذا دے رہے ہیں۔

مسٹر شوگو کٹاکورا سے دوسری بار ۱۰ دسمبر کو ملاقات ہوئی تو میں نے خدا اور مذہب کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا جس میں ان کا حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Shogo Katakura, 33, Udagawa-Cho, Shibuya-Ku
Tokyo 150, Japan. Phone 81-3-4622221

وہ پیدائشی طور پر بدھسٹ ہیں۔ مگر خدا اور مذہب کے بارہ میں زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ زندگی بعد موت کے بارہ میں مشتبہ ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک برطانی مصنف نے لکھا ہے کہ جاپان کی جدید نسل کے اندر میٹریلزم سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی ہے، وہ کہہ رہے ہیں ہمارا کلچر تو صرف مرچینٹ کلچر ہے۔ زندگی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دوسری جنگ کے بعد جاپان میں زندگی بہت

مشکل ہوگئی تھی۔ کھانا اور کپڑا جیسا ضروری سامان بھی بہت کم ملتا تھا۔ چنانچہ جاپانیوں میں شدت سے کمانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب موجودہ جاپانی کے پاس سب کچھ بافراط موجود ہے تو اس کو احساس ہو رہا ہے کہ صرف مادی ساز و سامان کافی نہیں۔ چنانچہ جاپان میں ایسے افراد کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ اور مادیت سے آگے کسی اور چیز کی تلاش کر رہے ہیں۔

جاپان کے لوگوں کو اسلام سے متعارف کیا جائے تو وہاں بہت تیزی سے اسلام پھیل سکتا ہے۔ مگر یہ کام صرف جاپانی زبان میں ممکن ہے کیوں کہ جاپان میں ایسے لوگ بہت کم ہیں جو جاپانی کے سوا کوئی اور زبان بخوبی جانتے ہوں۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ان کے ساتھ اتنے زیادہ لوگ جمع ہوگئے جو کبھی کسی پیغمبر کے ساتھ بھی جمع نہیں ہوئے تھے، حتیٰ کہ پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ بھی نہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت ہمیشہ داخل رخی ہوتی ہے اور موجودہ زمانہ کے رہنماؤں کی دعوت خارج رخی تھی۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں کے پیروؤں کی تعداد میں اتنا زیادہ فرق پیدا کر دیا۔ اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد آدمی کی اپنی ذات پر پڑتی ہو، جو خود اپنے اندر تبدیلی کا تقاضا کرتی ہو تو آپ کو بہت کم ساتھ دینے والے ملیں گے، کیوں کہ احتساب خویش انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ ایسی تحریک اٹھائیں جس کی زد دوسروں کے اوپر پڑتی ہو، جس میں دوسروں کے خلاف جھنڈا اٹھانے کا موقع ملتا ہو تو آپ کے ساتھ بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ کیوں کہ احتساب غیر انسان کی محبوب ترین چیز ہے۔

دکتور حسن القوتلی (پیدائش ۱۹۳۱) لبنان سے آئے تھے۔ کھانے کی میز پر ایک بار ان کا ساتھ ہوگیا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ہمارے ساتھیوں کے درمیان ایک مسئلہ پر کئی دن تک بحث ہوتی رہی۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ قرآن خدا کا مکمل کلام ہے یا جزئی کلام۔ اس سوال کی بنیاد یہ تھی کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمام سمندر سیاہی بنا دئے جائیں اور خدا کے کلمات لکھے جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے، مگر خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے (الکہف ۱۰۹) گویا خدا کے کلمات غیر محدود ہیں جبکہ

قرآن محدود کتاب ہے۔ اسی طرح قرآن میں ہے کہ ادعونی استجب لکم (البقرہ ۱۸۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کا کلام جاری ہے، وہ ختم نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا کہ پھر آپ لوگوں نے کس رائے پر اتفاق کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس پر اتفاق کیا کہ: اِنّ کلام اللہ فی القرآن ھو کلام اللہ بالمجمل، اما کلامہ بالتفصیل فھو موجود فی الکون (قرآن میں اللہ کا کلام مجمل ہے، اس کا تفصیلی کلام کائنات میں موجود ہے)

اسی نشست میں ان سے لبنان کے حالات پر گفت گو ہوئی تو وہ فوراً لبنانی عیسائیوں کی شکایت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ عیسائی ہم پر مسلسل ظلم کر رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو ھر قسم کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کے بارہ میں ایک غیر متعلق بحث میں آپ اور آپ کے ساتھیوں نے کئی دن صرف کر دئے۔ مگر عیسائی مسئلہ کا جواب آپ نے قرآن میں تلاش نہیں کیا۔ حالانکہ وہ براہ راست آپ سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر میں نے آیات اور احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں ہر آدمی کو آزادی حاصل ہے۔ اس بنا پر یہاں ہر ایک اپنے امکان کے بقدر استغلال میں لگا رہتا ہے۔ لبنان کے عیسائی علم اور ثقافت کے میدان میں مسلمانوں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا استغلال کر رہے ہیں۔ اس کا حل شکایت اور فریاد نہیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ترقی کے راستوں میں آگے بڑھایا جائے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

۱۰ دسمبر کی شام کو مالدیپ کے صدر مامون عبد القیوم سے اجتماعی ملاقات ہوئی۔ وہ عربی اور انگریزی دونوں زبانیں روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ وہ مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے میری عربی کتابیں قاہرہ میں تعلیم کے زمانہ میں پڑھی ہیں۔ مالدیپ کے وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں میں اکثر لوگ انگریزی کے ساتھ عربی زبان بھی بخوبی جانتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا: "مالدیپ موجودہ زمانہ میں واحد مسلم ملک ہے جہاں مولویوں کی حکومت ہے"۔ میں نے کہا کہ آپ کی بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا ہر مسلم حکمراں خواہ وہ بظاہر بے ریش ہو، اندر سے وہ "مولوی" ہی تھا۔ مگر مسلم قائدین

کی جھوٹی مخالفانہ سیاست نے ہر مولوی حکمراں کو مسٹر حکمراں بنا دیا۔

استاذ محمود احمد کفتارو (۴۰ سال) دمشق سے آئے تھے۔ وہ وہاں مفید دینی کام کر رہے ہیں۔ دوسرے بہت سے مسلم نوجوانوں کی طرح ان کا انجام بھی یہ ہو سکتا تھا کہ جہاد کے نام پر حکمرانوں سے بے معنی جنگ کریں اور پھر ناکام ہو کر دنیا کو یہ خبر دیں کہ یہ حکمراں اسلام اور اسلامی تحریکوں کے دشمن ہیں۔ مگر ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایسا باپ ملا جو واقعی معنوں میں حکیم تھا۔ اس نے ان کو صحیح ترین مشورہ دیا۔ اور سعادت مند بیٹے نے اس مشورہ کو قبول کرلیا۔

دکتور الشیخ احمد کفتارو (المفتی العام للسوریة، رئیس المجلس الافتاء الاعلی) نے اپنے لائق بیٹے کو بتایا کہ کوئی حقیقی کام کرنے کے لئے لازمی طور پر حکمت درکار ہوتی ہے۔ حکمت کے بغیر نہ دین کا کوئی کام کیا جاسکتا اور نہ دنیا کا۔ حکمت کیا ہے، حکمت یہ ہے کہ مطلوب کام مطلوب وقت پر اور مطلوب شکل میں کیا جائے (الحکمة: فعل ماینبغی، فی الوقت الذی ینبغی، وعلی الشکل الذی ینبغی)

شیخ کفتارو کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے لازم ہے کہ ہمارا بنیادی کام دعوت کے میدان میں ہو۔ ہم سیاسی لوگوں سے جھگڑا نہ کریں تاکہ دعوت اسلامی کے مواقع ضائع نہ ہو جائیں (یجب ان یکون عملنا الاساسی فی میدان الدعوة و لا نتناحر مع السیاسیین حتی لا تضیع علی الدعوة الاسلامیة الفرص)

شیخ کفتارو کے صاحبزادہ محمود احمد کفتارو کی زبان سے میں نے یہ باتیں سنیں تو میں نے کہا کہ بلاشبہ یہی حکیمانہ طریقہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اس کے سوا جو کچھ آج اسلام کے نام پر کیا جارہا ہے وہ محض بے معنی لیڈری ہے جس کی کوئی قیمت نہ دین کے اعتبار سے ہے اور نہ دنیا کے اعتبار سے۔

ایک صاحب نے اپنی پرجوش تقریر میں کہا کہ غیر مسلم تنظیموں اور غیر مسلم حکومتوں میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔

All are enemies of Islam

میں نے کہا کہ آپ کا فرمانا ہے کہ سب اسلام دشمن ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سب اسلام دوست

ہیں۔ آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ معاملہ کو اس کے ظاہری پہلو (Face value) پر دیکھ رہے ہیں۔ اور میں معاملہ کو اس کی حقیقت کے اعتبار سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی فرق ہے جو خود پیغمبرؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھا۔ اس وقت عرب کے بیشتر لوگ پیغمبر کے سخت ترین مخالف بنے ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کے سب اسلام کے دشمن ہیں۔ مگر بعد کو لوگوں نے دیکھا کہ حالات بدلے اور انھیں لوگوں نے اسلام کی صف میں شامل ہو کر اسلام کی تاریخ بنائی۔ یہ سب کچھ آج بھی ممکن ہے، بشرطیکہ ہم پیغمبر اسلام والے طریقہ پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بڑے جوش سے کہا: میں قرآن کو مانتا ہوں مگر میں حدیث کو نہیں مانتا۔ میں نے پوچھا کیوں۔ انھوں نے کہا کہ حدیث میں ایسی ایسی باتیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے کہا کوئی مثال دیجئے۔ انھوں نے مثال میں وہ حدیث پیش کی جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ سے کہا کہ جاؤ لوگوں کو خوش خبری دے دو کہ جو شخص لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت عمر راستہ میں مل گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت ابوہریرہ اس طرح کہہ رہے ہیں تو ان کو پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے اور کہا کہ ایسا مت کیجئے۔ ورنہ لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے (اذاً یتکلوا) آپ نے حضرت عمر کی رائے سے اتفاق کرلیا۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث انتہائی بامعنی ہے۔ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی وہ باعتبار حقیقت تھی۔ مگر حضرت عمر کو اندیشہ ہوا کہ لوگ اس کو باعتبار الفاظ لے لیں گے اور محض تلفظ کلمہ کو جنت کا زینہ سمجھنے لگیں گے۔ حالانکہ اصل چیز حقیقتِ کلمہ ہے نہ کہ تلفظِ کلمہ۔ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن میں ساتویں پارہ کے شروع میں بیان ہوئی ہے۔

۱۰ دسمبر کو دن کا کھانا حکومت مالدیپ کی طرف سے جزیرہ بانڈوس (Bandos) پر تھا۔ دو موٹر بوٹ کے ذریعہ کانفرنس کے شرکاء جزیرہ پر پہنچائے گئے۔ یہ سفر دن میں ہوا۔ اس لئے جسمانی سفر کے ساتھ روحانی سفر کی منازل بھی خدا کی توفیق سے طے ہوتی رہیں۔

مالدیپ کی اقتصادیات کا انحصار، مچھلی کے بعد "ٹورسٹ انڈسٹری" پر ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز سیاحت رخی انداز میں بنائی گئی ہے۔ بانڈوس جزیرہ پر بھی سیاحوں کے ذوق کے

مطابق ایک ہوٹل بنایا گیا ہے۔ اسی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔

کھانے سے فراغت کے بعد سمندر کے کنارے میں ایک "چھتری" کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے سامنے ساحل تھا اور ساحل پر مغربی مرد اور عورتیں نیم برہنہ حالت میں تفریح میں مشغول تھے۔ میں نے سوچا کہ مغربی تقسیم کے مطابق سامان حیات کے تین درجے ہیں: ضرورت، راحت، تعیش۔ جدید انقلاب نے مغربی انسان کو موقع دیا کہ وہ ایک کے بعد ایک ان تینوں مراحل سے گزر سکے۔ مگر تعیش کے اعلیٰ مرحلہ پر پہنچنے کے بعد بھی اس کو تسکین نہیں ملی۔ چنانچہ اب مغربی انسان اباحیت کا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا آخری مرحلہ ہے، اس کے بعد کوئی اور مرحلہ نہیں۔ اس کے بعد جو مرحلہ ہے وہ صرف مایوسی کا مرحلہ ہے۔ مغربی زندگی میں اس مرحلہ کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس طرح اب وہ آخری وقت آگیا ہے جب کہ انسان کو خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچایا جائے اور وہ اس کو اپنے اندرونی اضطراب کا جواب پاکر اسے قبول کرلے۔

۱۱ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سنٹر کی مسجد میں ادا کی۔ یہ سنٹر غالباً مالدیپ کی سب سے زیادہ شاندار عمارت ہے۔ کم از کم صدر مالدیپ کی قیام گاہ سے یقینی طور پر زیادہ شاندار ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد جب باہر آئے تو امام کے خطبہ کی فوٹو کاپیاں لوگوں کو تقسیم کی جارہی تھیں۔ امام اپنا خطبہ عربی اور مالدیپی میں پہلے سے لکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس کی فوٹو کاپی تیار کرلی جاتی ہے اور اس کو نماز کے بعد تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہر جمعہ کو کیا جاتا ہے۔

پہلے دن جب میں مالدیپ میں داخل ہوا تو یہاں کی دنیا مجھ کو بہت پرکشش معلوم ہوئی تھی۔ اتھاہ سمندر کے درمیان جگہ جگہ ابھری ہوئی خشکی اور اس کے اوپر ہرے بھرے درخت، سمندر میں ہر طرف دوڑتی ہوئی کشتیاں، چاروں طرف کھلی ہوئی فضا اور کھلا آسمان، اس طرح کے مختلف مناظر جو یہاں افراط کے ساتھ موجود ہیں وہ کچھ دیر کے لئے آدمی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ مگر چند ہی دن کے بعد وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جس کو آجکل کی زبان میں بورڈم Boredom کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۷ کو جب میں مالدیپ سے روانہ ہوا تو تمام ابتدائی کشش ختم ہو چکی تھی۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے لامحدود دنیا چاہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ موجودہ محدود دنیا اس کے لئے مستقل خوشی کا سبب نہیں بنتی۔ ابدی مسرت صرف ان انسانوں کے لئے

مقدر ہے جن کو اللہ اپنی رحمتِ خاص سے آخرت کی ابدی جنتوں میں داخل کردے۔

اس سفر کا ایک عجیب واقعہ وہ ہے جو واپسی میں تریوندرم انٹرنیشنل ایرپورٹ پر گزرا۔ دہلی کا جہاز لینے کے لئے دوبارہ مجھے یہاں اترنا تھا۔ ایمگریشن سے فارغ ہوکر اندر داخل ہوا تو کسٹم کاؤنٹر سامنے تھا جہاں لوگوں کے بکس اور بنڈل کھول کھول کر دیکھے جارہے تھے۔ چونکہ میرے پاس کوئی کسٹم والی چیز نہیں تھی، میں نے چاہا کہ میں سیدھا گیٹ پر چلا جاؤں۔ مگر پولیس کے آدمی نے مجھے روک دیا اور کہا کہ پیچھے جاکر لائن میں کھڑے ہو جائیے۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کیوں کہ میں سب سے پیچھے تھا اور لمبی لائن میں مجھے گھنٹوں تک کھڑا رہ کر انتظار کرنا پڑتا۔ اتنے میں کسٹم کے ایک آدمی نے شاید میرا "مولویانہ" حلیہ دیکھ کر خود ہی مجھ کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہیں۔ میں نے کہا کہ مالدیپ سے۔ کس لئے گئے تھے۔ میں نے دوبارہ کہا اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ اس نے چک کئے بغیر کہا کہ جائیے۔

دوسرا شدید تر مرحلہ یہ تھا کہ میری دہلی کی فلائٹ اگلے دن تھی۔ چنانچہ مجھے تقریباً ۲۴ گھنٹے تریوندرم میں رکنا تھا، راستہ میں میں نے بعض مسافروں سے پوچھا کہ کیا یہاں انڈین ایرلائنز کی طرف سے ٹرانزٹ پسنجر کو ٹھہرانے کا انتظام ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں باہر نکل کر لاونج میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ رات کے وقت اس نامعلوم جگہ پر کہاں جاؤں۔ اتنے میں ایک تیلون پوش ادھیڑ عمر کے آدمی آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ٹرانزٹ پسنجر ہوں ..... ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے کہا: اپنا بیگ اٹھالیجئے اور میرے ساتھ آئے۔ وہ مجھ کو ایرپورٹ کے ایک افسر کے پاس لے گئے اور اس کو میرا معاملہ بتایا:

K.V. Thimothy, Station Duty Officer
Air Customs, International Airport, Trivandrum.

مذکورہ افسر نے کہا کہ یہ میری ڈیوٹی تو نہیں ہے۔ مگر میں ہوٹل لوسیا کانٹی نینٹل (Luciya) (Continental) کو ٹیلی فون کرکے پتہ کرتا ہوں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً ہی ہوٹل کے منیجر سے ٹیلی فون پر بات کی اور پھر مجھ سے کہا کہ آپ وہاں چلے جائیں۔ آپ کا کمرہ، کھانا، ٹیکسی کا کرایہ سب انڈین ایئرلائنز کے ذمہ ہوگا۔ مزید انھوں نے پولیس کے ایک آدمی کو میرے ساتھ کر دیا اور اس سے کہا کہ

ان کو لے جا کر ٹیکسی پر بٹھاؤ اور ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لو۔ اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ مذکورہ افسر نے نہ میرا پاسپورٹ مانگا اور نہ میرا ٹکٹ دیکھا۔ اس نے صرف میرے زبانی بیان پر اعتماد کرتے ہوئے یہ پوری کارروائی کی۔

میں نے سوچا کہ جس ملک میں اتنے شریف انسان بستے ہوں، وہاں چند استثنائی واقعات کو لے کر سارے ملک میں ہندو مسلم مسئلہ کھڑا کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ اور افسوس کہ اس ملک کی مسلم قیادت اسی مجرمانہ کام میں پچھلے پچاس برس سے مبتلا ہے۔ اس کو نہ قرآن کی آیتیں اس بے معنی کام سے روکنے والی ثابت ہو رہی ہیں اور نہ مسلمانوں کے حق میں اس پالیسی کے اندوہناک نتائج۔

ہوٹل لوسیا کانٹی ننٹل کا کمرہ نمبر ۳۱۶ ہے۔ میں رات کے وقت سویا ہوا ہوں۔ نیند کھلتی ہے تو میں وقت جاننا چاہتا ہوں۔ اپنی گھڑی کے بارہ میں مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے۔ میں ٹیلیفون کا ریسیور اٹھاتا ہوں۔ اس کے بعد میرے اور ریسپشن کے آدمی کے درمیان مختصر گفتگو ہوتی ہے جو حسب ذیل ہے:

Good Morning, Sir
Good Morning, Time please.
Three, thirty
Thank you

یہ ایک سادہ سی بات ہے جو ہر ایک کے ساتھ پیش آتی ہے۔ مگر جب ۱۲ دسمبر کی رات کو اس اجنبی جگہ پر میرے ساتھ یہ واقعہ گزرا تو اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کہ وہ اس آیت کی عملی تفسیر ہو: و اذا سألك عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوة الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلهم یرشدون (البقرة ۱۸۶) اس دنیا کے محسوس واقعات غیر محسوس حقیقتوں کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ مگر اس کو وہی شخص جان سکتا ہے جو اس پر کان لگائے اور خالی الذہن ہو کر اس کو سننے کے لئے تیار ہو۔

لوسیا ہوٹل میں گیڈینس (Gideons) کی بائبل رکھی ہوئی تھی۔ یہ بائبل تمام دنیا کے ہوٹلوں میں مفت رکھی جاتی ہے۔ بائبل کے اس نسخہ میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی چھپا ہوا تھا کہ اگر آپ اس علاقہ میں گیڈینس سے ربط قائم کرنا چاہتے ہیں تو براہ کرم مقامی ٹیلیفون ڈائرکٹری سے معلوم کیجئے:

If you desire to contact Gideons in this area,
please consult the local telephone directory.

موجودہ زمانہ میں بے شمار نئے امکانات پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں جدید طرز کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں جن میں بے شمار انسانی قافلے ٹھہرتے ہیں۔ ہر جگہ ٹیلی فون کا نظام قائم ہے اور ڈائرکٹریاں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ ان ذرائع نے کسی فکر کی اشاعت کا زبردست نیا امکان پیدا کر دیا تھا۔ مگر ہمارے رہنماؤں نے بے معنی لڑائیوں میں پورا ایک دور ضائع کر دیا۔ جدید ذرائع میں سے کسی ذریعہ کو بھی وہ دین خداوندی کی اشاعت کے لئے استعمال نہ کر سکے۔

بائبل کے اس نسخہ کے شروع میں درج تھا کہ بائبل (John 3:16) میں ایک جملہ ہے جس کو گیارہ سو سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ نسخہ میں چند درجن زبانوں کے ترجمے نقل کئے گئے تھے۔ اس کا عربی ترجمہ ان الفاظ میں درج کیا گیا تھا:

لانہ ھٰکذا احب اللہ العالم حتی بذل ابنہ الوحید

لکی لا یھلك کل من یؤمن بہ بل تکون لہ الحیٰوۃ الابدیۃ

ابنیت مسیح کا یہ عقیدہ چرچ کے مطابق، مسیحی مذہب کا اہم ترین عقیدہ ہے۔ بلکہ اسی عقیدہ پر موجودہ مسیحیت قائم ہے۔ مگر چرچ کے نزدیک وہ جتنا اہم ہے، عام انسان کو وہ اتنا ہی زیادہ غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ایک مظاہرہ خود بائبل کے اس نسخہ میں موجود تھا جو لوسیا ہوٹل میں رکھا ہوا تھا۔ اس کو میں نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس کے آخری صفحہ پر ایک جملہ درج تھا۔ یہ کسی مسافر کا تاثر تھا جو اس نے "مقدس کتاب" کے آخر میں ثبت کیا تھا۔ اگرچہ وہاں مسافر کا نام نہیں تھا۔ تاہم اس کا فقرہ بہت بامعنی تھا۔ اس نے اپنے قلم سے لکھا تھا:

Man is only a personality. Nothing beyond that.

یعنی آدمی صرف ایک شخصیت ہے، اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ موجودہ مسیحی مذہب کی بنیاد الوہیت مسیح کے عقیدہ پر قائم ہے مگر انسان کی عقل میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ ایک شخص جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا وہ خدا یا خدا کا بیٹا تھا — اگر آپ مسیحیت کو مانیں تو آپ کو عقل سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور اگر عقل کو مانیں تو مسیحیت سے۔

تریوندرم سے واپسی میں ایئر پورٹ پر اٹلی کے ایک سیاح سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام اسٹفانو گرافینی (Stefano Garaffini) بتایا۔ وہ اٹلی کے شہر فرنز (Firenze) کے رہنے والے ہیں۔ چھٹی میں اپنی بیوی کے ساتھ سیاحت کے لئے نکلے ہیں۔ ابتدائی تعارف کے بعد میں ان سے اس طرح کے سوالات کرتا رہا: کیا آپ خدا کو مانتے ہیں، کیا آپ مذہب میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان سے گفتگو کے بعد خیال آیا کہ ہمارے پاس ایک چھپا ہوا دو ورقہ ہونا چاہئے۔ جو اس طرح کے لوگوں کو فوری مطالعہ کے لئے دیا جا سکے۔ اس میں مختصر اور واضح انداز میں اسلام کا تعارف کیا گیا ہو۔ ان شاء اللہ مرکز کی طرف سے اس قسم کا دو ورقہ چھاپنے کی کوشش کی جائے گی۔

۱۳ دسمبر کو تریوندرم ایئر پورٹ پر تین ہندو نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے "لیڈر" سنجیو بھارگوا تھے جو نئی دہلی میں انڈین ایر لائنز کالونی میں رہتے ہیں۔ ان سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ لوگ مکمل طور پر ہندوؤں کی نئی نسل کے نمائندہ تھے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ میرے نزدیک یہ تھا کہ ہندو نوجوانوں کا بگاڑ محض وقتی ہے نہ کہ دائمی اور ابدی۔ سنجیو بھارگوا نے کہا کہ ایک سادہ مثال لیجئے۔ ایک شخص بس میں سفر کر رہا ہے۔ اس کے پاس ایک روپیہ کا پھٹا ہوا نوٹ ہے۔ اگر وہ اس نوٹ کو فولڈ کر کے بس کنڈکٹر کو دے تو وہ اس کو لے لے گا۔ اور اگر وہ اسی نوٹ کو دکھا کر دے تو کنڈکٹر کبھی بھی نہیں لے گا اور اس کو بس سے اتار دے گا۔ یہ تجربات ہیں جو جدید نسل کو بگاڑ رہے ہیں۔

سنجیو بھارگوا نے کہا کہ میری ایج کے ہر آدمی کا نیچر یہ ہوتا ہے کہ وہ غلط کو غلط سمجھتا ہے اور اس سے لڑنا چاہتا ہے۔ مگر جیسے جیسے اس کا تجربہ بڑھتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ غلط کو غلط بتانے میں وہ خود غلط ہو رہا ہے تو اب اس میں ایک تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے۔ نیچر کی سطح پر درست ہونے کے باوجود اوپر کی سطح پر وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ ان کی تقسیم کے مطابق، جدید بھارتی نوجوان کے تین دور ہیں ـــــــ نیچر، فرسٹریشن، چینج۔

جدید ہندستانی نوجوان کی جارحیت جس کے خلاف ہمارے لیڈر فریاد کرتے رہتے ہیں، وہ محض اوپری بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ اپنے اندر اب بھی وہ وہی فطرت لئے ہوئے ہے جو خدا نے ہر ایک کے اندر پیدا کی ہے۔ اگر ہم حکمت اور اخلاق کے ذریعہ اس کی اندرونی فطرت کو جگا سکیں تو یہاں بھی وہی واقعہ

ظہور میں آئے گا جس کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ...... فاذا الذی بینك وبینه عداوة كأنه ولی حمیم (حم السجدہ ۳۴)

واپسی کے بعد کانفرنس کے شرکاء میں سے ایک صاحب سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ یہ ڈاکٹر عبدالحکیم طبیبی ہیں۔ وہ افغانی ہیں اور آجکل سوئزرلینڈ میں رہتے ہیں۔ وہ سید جمال الدین افغانی سے بہت متاثر ہیں اور ان کے تاریخی ماہنامہ العروۃ الوثقیٰ کو اسی نام سے عربی اور انگریزی میں جنیوا سے نکال رہے ہیں۔

کانفرنس کے بعد وہ ایک ضرورت کے تحت دہلی آئے اور ہمارے مرکز اور ہمارے کام کو بھی یہاں آکر دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہاں جو کام کر رہے ہیں وہ اتنا اہم ہے کہ اس کے مقابلہ میں کسی " انٹرنیشنل کانفرنس " میں شرکت کی کوئی اہمیت نہیں۔

میں نے کہا کہ مجھے اس قسم کی کانفرنسوں میں شرکت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات وہ مجھے اوقات کا کمتر مصرف معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ایک فائدہ ہے جس کی وجہ سے میں ان کانفرنسوں میں جاتا ہوں۔ اور وہ تجربہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ممالک کا سفر اور بین اقوامی کانفرنسوں میں شرکت سے جو تجربات حاصل ہوتے ہیں وہ دفتر میں یا لائبریری میں بیٹھ کر حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر میں بیرونی ممالک کا سفر کرتا ہوں۔ میرے یہ تجربات " سفرنامہ " کی صورت میں الرسالہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ اردو زبان میں ہوتے ہیں، اس لئے آپ جیسے لوگ ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ تاہم اب انگریزی الرسالہ میں بھی سفرناموں کا خلاصہ شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔

ایک سفر

نئی دہلی کے افغانی سفارت خانہ سے مجھے ان کا خط مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ ملا جس میں فرسٹ سکریٹری کے دستخط تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ افغانستان کی اسلامی وزارت اور وہاں کی مجلس علماء کے اشتراک سے ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس منعقد کی جارہی ہے۔ یہ کانفرنس ۲۲-۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو کابل میں ہوگی۔ مجھے دعوت دی گئی تھی کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کروں اور وہاں سیرت کے یونیورسل پہلو پر ایک مقالہ پیش کروں۔ اس دعوت کے مطابق کابل (افغانستان) کا سفر ہوا۔

۲۰ اکتوبر کو صبح پونے پانچ بجے کا وقت تھا۔ فضا میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اچانک باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ کل شام کو "ٹیکسی اسٹینڈ" سے ٹیلیفون پر کہا گیا تھا کہ ہم کو صبح پونے پانچ بجے ایک ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ اس کے مطابق ٹیکسی والا ٹھیک چار بج کر ۴۵ منٹ پر ہمارے گیٹ کے سامنے موجود تھا، نہ ایک منٹ پہلے اور نہ ایک منٹ بعد۔

ٹیکسی والا اپنے پیشہ کے معاملہ میں اتنا زیادہ پابند کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے پیشہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کی چیز بنا رکھا ہے۔ کوئی معاملہ جب آدمی کے لئے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ بن جائے تو اس کے بارہ میں وہ ہر بات کو بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کے لئے اس کی تمام ذہنی اور عملی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ مسلمانوں نے اسلامی دعوت کے معاملہ کو اپنے ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اسلامی دعوت کے معاملہ میں وہ کردار نظر نہیں آتا جس کا ایک نمونہ ٹیکسی والے کے یہاں ملتا ہے۔

گھر سے ایر پورٹ کے لئے روانہ ہوا تو سڑک کے دونوں طرف سرسبز درختوں کی قطاریں مسلسل چلی جارہی تھیں۔ اس کو دیکھ کر مجھے ۱۹۸۳ کا سفر یاد آیا جب کہ الشیخ علی الحویتی (قاضی شارجہ) مجھے اپنے رہائشی مکان پر لے گئے تھے جو کہ شہر سے تقریباً ۲۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ سفر پورا کا پورا ریتیلے میدان میں ہوا۔ دہلی کا سفر اگر سرسبز ماحول میں تھا تو شارجہ کا یہ سفر صحرائی ماحول میں۔ اس دنیا میں "درخت" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر شکر کرے۔ "صحرا" اس لئے ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر صبر کرنا سیکھے۔ آدمی دونوں قسم کی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر وہ ان سے نہ شکر کا سبق لیتا ہے اور نہ صبر کا۔

دہلی میں دو ایر پورٹ ہیں اور دونوں کے درمیان کافی فاصلہ ہے۔ ٹیکسی والے نے ہم کو قریب کے

ہوائی اڈہ (پالم ایرپورٹ) پر پہنچا دیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ کابل کا جہاز اگلے ہوائی اڈہ (اندرا ایرپورٹ) سے جائے گا۔ چنانچہ پالم سے واپس ہوکر دوبارہ آگے کے لئے روانہ ہوئے۔ چوں کہ ہم گھر سے کسی قدر پہلے روانہ ہو گئے تھے اس لئے اس تاخیر سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اسی قسم کے اتفاقات ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے روانہ ہو تاکہ اگر راستہ میں تاخیر کا کوئی اتفاقی سبب پیش آجائے تب بھی وقت پر اپنی منزل پر پہنچ جاؤ۔

اس تجربہ کے بعد مجھے حضرت ابوہریرہ کی وہ حدیث یاد آئی جس کو ترمذی نے روایت کیا ہے:

قال رسول صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی کو اندیشہ ہوتا ہے وہ رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے، اور جو رات سے اپنا سفر شروع کرتا ہے وہی (دن میں) اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ سن لو کہ اللہ کا سودا بہت قیمتی ہے، سن لو کہ اللہ کا سودا جنت ہے۔

دنیا کے مقصد کو پانا ہو یا آخرت کے مقصد کو پانا، دونوں ہی میں خصوصی اہتمام کرنا ضروری ہے۔ خصوصی اہتمام کے بغیر نہ دنیا کا مقصد صحیح طور پر حاصل کیا جاسکتا اور نہ آخرت کا۔

جہاز کو مقررہ وقت کے اعتبار سے ساڑھے سات بجے روانہ ہونا تھا۔ تمام مسافر جہاز میں بیٹھے ہوئے اڑان کا انتظار کر رہے تھے کہ آدھ گھنٹہ بعد پائلٹ نے ہوائی جہاز کے ایڈریس سسٹم پر اعلان کیا کہ جہاز کے ایک پہیہ میں پریشر کم پایا گیا ہے۔ اس لئے اس کو بدلا جا رہا ہے۔ آپ اس دیری کے لئے ہمیں معاف کریں گے۔ دیری بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ جہاز روانہ ہوا تو گھڑی میں ساڑھے دس بج رہے تھے۔ یعنی اصل مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد ـــــ دہلی سے کابل تک جہاز کو پہنچنے کے لئے ڈھائی گھنٹہ درکار تھا۔ مگر دہلی میں پہیہ کی اصلاح میں دو گھنٹے لگ گئے۔

جہاز کے ساتھ یہ جو حادثہ پیش آیا، اس کا "جھٹکا" جہاز سے زیادہ جہاز کے مسافروں کو برداشت کرنا پڑا۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ چلتی ہوئی سواری پر مسافر کی حیثیت شاک ابزاربر (جھٹکا سہنے والے) کی ہوتی ہے:

Passengers are shock absorbers on moving vehicles.

ایرپورٹ کے اندر داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا گویا ہم ایک اور ملک میں پہنچ گئے ہیں۔ یہاں

ہر چیز کا معیار مختلف تھا۔ ایرپورٹ کے باہر اگر "دیشی ہندستان" کا منظر تھا تو ایرپورٹ کے اندر "بدیشی ہندستان" کا۔ ہر ملک خواہ وہ کتنا ہی غریب ہو، یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے ایرپورٹ کو بین اقوامی معیار پر بنائے۔ "ایرپورٹ" گویا ہر ملک کا ایک تہذیبی جزیرہ ہے۔

ایک سیاح تھوڑے دنوں کے لئے ہندستان آیا۔ اس نے ان مقامات کا سفر کیا جہاں ہوائی جہاز اس کو لے جاسکتا تھا۔ اس نے لال قلعہ اور تاج محل جیسی قابل دید چیزوں کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ اس سیاح کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس نے ہندستان کے تہذیبی جزیرہ کو دیکھا، وہ وسیع تر ہندستان کو نہ دیکھ سکا۔ ایسی حالت میں عجب نہیں کہ وہ واپس جا کر لکھے: ہندستان کے لوگ بہت خوش قسمت ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوتے ہیں تو وہ لال قلعہ میں رہتے ہیں، اور جب مرتے ہیں تو تاج محل میں دفن ہوتے ہیں ــــــــ مصنوعی مشاہدہ اور حقیقی مشاہدہ میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

ہوائی جہاز جب بلند ہو کر فضا میں اڑتا ہے، اس وقت آپ نیچے زمین کی طرف دیکھیں تو زمین کی سطح پر ہر چیز معمولی دکھائی دیتی ہے ــــــــ مکانات چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ سڑکیں پھیلی ہوئی لکیر کی مانند دکھائی دیتی ہیں۔ سمندروں میں تیرتے ہوئے جہاز دیا سلائی کی ڈبیا معلوم ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ وہ صرف ٹیلے ہوں۔ اونچے کھڑے ہوئے درخت پودے کی مانند نظر آتے ہیں۔ وغیرہ۔

میں نے اس منظر کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز "عالم سفلی" سے اوپر اٹھ کر "عالم علوی" میں سفر کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مادی مشاہدہ ایک روحانی حقیقت کی تمثیل ہے۔ مومن کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ اس کا جسم بظاہر عالم سفلی میں ہو، مگر اس کی روح یا اس کا فکری وجود عالم علوی میں سفر کر رہا ہو۔ موجودہ دنیا میں اس طرح اپنے آپ کو بلند کرنا درحقیقت حیات دنیا سے گزر کر حیات آخرت کا تجربہ کرنا ہے۔ آج کی دنیا میں یہ تجربہ تمثیلاتی طور پر ہوتا ہے۔ موت کے بعد کی زندگی میں یہ تجربہ واقعی طور پر ہوگا۔

جہاز میں آج کے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات مطالعہ کے لئے موجود تھے۔ اخبار اٹھایا تو ہر ایک کی پہلی سرخی ایک سخت ہوائی حادثہ کے بارہ میں تھی۔ نوبھارت ٹائمز (۲۰ اکتوبر) کی پہلی سرخی یہ تھی:

" دو وِمان درگھنٹوں میں ۱۶۴ مرے "۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۰ اکتوبر) کی پہلی آٹھ کالمی سرخی یہ تھی:

164 killed as IA, Vayudoot planes crash

یہ ہندستان کی شہری ہوا بازی کی تاریخ میں دوسرا سب سے زیادہ ہولناک حادثہ تھا۔ پہلا شدید تر حادثہ وہ تھا جو ۲۳ جون ۱۹۸۵ کو پیش آیا۔ ایر انڈیا کا ایک جہاز (کنشکا) ایک بم کے پھٹنے سے تباہ ہو گیا تھا اور بحر الکاہل میں گر پڑا تھا۔ موجودہ حادثہ دو الگ الگ جہازوں کا تھا مگر وہ ایک ہی دن ہوا۔ ایک احمد آباد میں اور دوسرا گوہاٹی میں۔ دونوں موسم کی خرابی کی بنا پر ہوئے۔ احمد آباد میں تباہ ہونے والا جہاز جب ہوائی اڈہ کے اوپر پہنچا تو وہاں فضا میں سخت کہر کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پائلٹ سطح زمین پر دیکھ نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹائمس آف انڈیا کی رپورٹ (۲۰ اکتوبر) کے مطابق جہاز ہوائی اڈہ کے اندر اترنے والی سڑک پر اترنے کے بجائے باہر ایک کھیت میں اتر گیا اور وہاں درختوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا:

Instead of landing at the airstrip, it crashed into a field in the outskirts of the city.

اسی طرح چند دن پہلے اخبار کے صفحہ اول پر ایک تصویر تھی جس میں ایک ٹوٹا ہوا جہاز آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ یہ یوگنڈا کی کمپنی (Ugandan Airlines) کی فلائٹ نمبر ۵ ،، تھی۔ یہ بوئنگ جہاز لندن سے براستہ روم یوگنڈا جا رہا تھا۔ اس پر عملہ سمیت ۵۲ مسافر سوار تھے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کی شام کو اسے کچھ دیر کے لئے روم کے ہوائی اڈہ پر اترنا تھا۔ اس وقت یہاں شدید کہر چھایا ہوا تھا۔ جہاز کا پائلٹ رن وے کو صاف طور پر دیکھ نہ سکا۔ چنانچہ جہاز ایک پختہ عمارت (Hangar) سے ٹکرا گیا۔ ٹکراتے ہی جہاز آگ کا ایک گولا بن گیا۔ بیشتر لوگ اسی وقت ہلاک ہو گئے۔ تقریباً ۲۰ آدمی اس حالت میں اسپتال میں پہنچائے گئے کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور بدن آگ کے اثر سے جھلسا ہوا تھا۔

زندگی حادثات سے اتنی زیادہ بھری ہوئی ہے کہ آدمی اگر حادثات کو یاد رکھے تو اس کے اعصاب پھٹ جائیں اور پھر وہ کوئی سفر یا دوسرا کوئی اقدامی کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ذہن کی وہ صفت ہے جس کو قدیم زمانہ میں فراموشی کہا جاتا تھا، اور موجودہ زمانہ

ہیں اس کو لاشعور کا معاملہ کہا جاتا ہے۔

جدید نفسیاتی تحقیقات بتاتی ہیں کہ انسان جب رات کو سوتا ہے تو اس کا ذہن خود کار مشین کی طرح ایک خاموش کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وہ یاد رکھنے کے قابل باتوں کو تو زندہ شعور کے خانہ میں باقی رکھتا ہے۔ اور دوسری تمام باتوں کو دماغ کے پچھلے خانہ (لاشعور) میں ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کے ساتھ دن میں ایک سخت واقعہ پیش آتا ہے، شام کو وہ اس حال میں سوتا ہے کہ وہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوتا ہے۔ مگر صبح کو جب وہ اٹھتا ہے تو دوبارہ وہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی ذہن عام مشینی کمپیوٹر کی مانند ہوتا اور تمام پیش آنے والی باتوں کو یکساں طور پر اپنی یادوں میں لئے رہتا تو انسان کے لئے زندگی گزارنا ہی ناممکن ہو جاتا۔

اخبار میں ایک عبرت انگیز خبر پڑھی جو نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس کے مطابق ۷ اگست ۱۹۸۸ کا ہوائی حادثہ جس میں جنرل ضیاء الحق، امریکی سفیر اور دوسرے بہت سے "وی آئی پی" ہلاک ہوئے، اس کے سبب کے بارہ میں امریکہ اور پاکستان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پاکستان مصر ہے کہ یہ تخریب کاری (Sabotage) کا نتیجہ تھا۔ جب کہ امریکی ماہرین جنھوں نے حادثہ کے تمام پہلوؤں کا نہایت دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ حادثہ کا سبب جہاز میں مشینی خرابی (Mechanical failure) تھا۔ امریکہ نے واقعہ کو صرف ٹکنکل حقیقت کے اعتبار سے دیکھا۔ اس کو واقعہ کا صرف وہی سبب دکھائی دیا جو فی الواقع تھا۔ جب کہ پاکستان کو اس حادثہ سے سیاسی اور قومی فائدہ اٹھانا تھا۔ اس لئے اس نے ماہرین کی رپورٹ کی اشاعت کو "عوامی مفاد" کے خلاف قرار دے کر اعلان کر دیا کہ اس کا سبب تخریب کاری تھا۔

امریکی حکام نے تاریخ نگاری کے اصول کو اختیار کیا، پاکستانی حکام نے تاریخ سازی کے طریقہ کو، اور دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز پائی جاتی ہے وہ یہی تاریخ سازی ہے۔ خاص طور پر موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والے تو شاید تاریخ سازی کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔

ملاپ (۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸) میں دسہرہ کی مناسبت سے اداریہ تھا: من کا راون کب جلے گا۔ اس میں اڈیٹر نے لکھا تھا کہ "آج دسہرہ کے دن سارا دیش خوشیاں منا رہا ہے۔ کیوں کہ آج کے دن بھگوان رام نے راون روپی برائیوں کو ختم کر کے فتح حاصل کی تھی۔ لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ صرف پتلا ہی جلایا جاتا ہے

اور باقی برائی جوں کی توں قائم رہتی ہے"۔

ایک مسلمان اگر میلاد النبی کے جلسوں پر تبصرہ کرے تو وہ بھی اسی قسم کے الفاظ لکھے گا کہ میلاد النبی کے جشن میں رسول اللہ کے بارہ میں پرجوش تقریریں ہوتی ہیں مگر رسول اللہ کی سنت پر عمل نہیں کیا جاتا۔

میرے نزدیک یہ دونوں تبصرے بالکل بے فائدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے دسہرہ کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دینی اعتبار سے میلاد النبی کے جشن اور جلوسوں کی کوئی اصل نہیں۔ اس لئے دونوں مبصروں کو سرے سے ان رسموں ہی کو لغو قرار دینا چاہئے۔ ہندو مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ دسہرہ کا میلا ایک تاریخی بدعت ہے، اس لئے اس کو ختم کرو۔ اسی طرح مسلمان مصلح کو یہ کہنا چاہئے کہ "جشن میلاد النبی" ایک دینی بدعت ہے، اس لئے اس کو بند کرو۔ مگر ایسا کہنے کی ہمت نہ ہندو مصلح میں ہے اور نہ مسلمان مصلح میں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسی زبان بولتے ہی وہ اپنی قوم میں نکو بن جائیں گے۔ مگر اصلاح کا کام ہمیشہ نکو بننے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو نکو بننے کا حوصلہ نہ ہو انھیں مصلح کا کریڈٹ لینے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہئے۔

جہاز میں ایک عرب مسافر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک عربی اخبار الوطن (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) تھا۔ یہ کویت سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ایک چھوٹا سا مضمون چوکھٹے میں تھا۔ یہ سوال کے انداز میں تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے: هل تعرفون ما العلاقة بين صمت الانظمة العربية على تقسيم لبنان و المثل العربي القائل بأن "الصمت علامة الرضا"۔ یعنی کیا آپ جانتے ہیں کہ لبنان کی تقسیم پر عرب حکومتوں کی خاموشی اور اس عربی مثل میں کیا نسبت ہے کہ خاموشی رضامندی کی علامت ہے۔

الوطن العربی کی ایک اور خبر میں بتایا گیا تھا کہ عرب دنیا کی آبادی، تازہ اعداد و شمار کے مطابق، ۱۵۶ ملین ہے (۱۵۶ مليونا عدد سكان العالم العربي)۔ یہاں بھی میرا خیال ہے کہ مذکورہ سوال ۱۵۶ ملین عربوں سے کرنے کے بجائے لبنان کے ان مسلمانوں سے کرنا چاہئے جنھوں نے انتہائی نادان سیاست اختیار کرکے وہ صورت حال پیدا کی جو بالآخر تقسیم تک جا پہنچی۔ یہ تقسیم اگر مکمل ہو گئی تو تقسیم کے بعد اس کا جو حصہ مسلمانوں کو ملے گا وہ گویا عرب دنیا کا "بنگلہ دیش" ہوگا۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو جب انڈین ایرلائنز کی فلائٹ ۴۵۱ مجھے لئے ہوئے کابل کی طرف جارہی

تھی تو مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بیرونی سفر کے دوران میری ملاقات پاکستان کے ایک افسر سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا نے پاکستان (کراچی، لاہور) کے لئے جو ہوائی سروس جاری کی ہے، وہ ایر انڈیا (بین اقوامی ہوائی ادارہ) کے تحت نہیں ہے، بلکہ انڈین ایر لائنز (ملکی ہوائی ادارہ) کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انڈیا نے ابھی تک ہم کو ایک مستقل ملک کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا، وہ ہم کو اپنی وسیع تر سلطنت کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔

دوسری طرف انڈیا کا حال یہ ہے کہ میں ۱۵ اگست ۱۹۸۸ کو نئی دہلی کے ایک اجتماع میں شریک ہوا۔ اس میں پاکستان کے قائم مقام سفیر کو چیف گسٹ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان نا جنگ معاہدہ (No-war pact) کی انتہائی شدید ضرورت ہے تاکہ دونوں ملک ایک دوسرے کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے ترقیاتی کاموں میں لگ سکیں۔ مگر، ان کے بیان کے مطابق، دونوں پڑوسی ملکوں کے درمیان نا جنگ معاہدہ پر صرف اس لئے اب تک دستخط نہ ہو سکے کہ انڈیا کا اصرار تھا کہ مسودہ میں ایک دفعہ یہ بڑھائی جائے کہ پاکستان کسی بیرونی ملک کو اپنی زمین پر فوجی بیس بنانے کی اجازت نہیں دے گا۔

میرے نزدیک پاکستان اور ہندستان دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف شبہات کا شکار ہیں۔ مگر انڈیا کے بارہ میں پاکستان کا شبہہ بھی غلط ہے اور پاکستان کے بارہ میں انڈیا کا شبہہ بھی غلط۔ یہ شبہات ایسے ہی بے بنیاد ہیں جیسے کہا جائے کہ انڈیا افغانستان کو اپنے ملک کا ایک صوبہ سمجھتا ہے، حتی کہ بنکاک پورٹ بلیر، سنگاپور، مالدیپ وغیرہ کو بھی، کیوں کہ اس نے ان تمام جگہوں پر ایر انڈیا کے بجائے انڈین ایر لائنز کے تحت اپنی ہوائی سروس جاری کر رکھی ہے۔

ایک معاملہ کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ بھیانک بن جاتا ہے۔ اسی معاملہ کو شبہات سے اوپر اٹھ کر دیکھیں تو وہ معمولی قسم کا ایک سادہ واقعہ معلوم ہوگا۔

" تھوڑی دیر بعد ہمارا جہاز کابل کے ہوائی اڈہ پر اترے گا" اناؤنسر نے اعلان کیا۔ چند منٹ میں جہاز بالکل نیچے آ گیا اور ہوائی اڈہ کی زمین صاف دکھائی دینے لگی۔ اتنے میں اچانک ہوائی جہاز اوپر اٹھنے لگا۔ اس نے فضا میں بلند ہو کر چند چکر لگائے اور پھر کسی قدر تاخیر کے ساتھ ہوائی اڈہ پر اترا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ کچھ فوٹو گرافر ہوائی جہاز کا فوٹو لینے کے لئے رن وے پر آ گئے تھے۔ اترنے کی صورت میں چوں کہ ان سے ٹکراؤ کا اندیشہ تھا، اس لئے پائلٹ نے جہاز کا رخ دوبارہ اوپر کی طرف کر دیا۔ اور ہوائی اڈہ کا چند

چکر لگاکر دوبارہ نیچے آیا۔

جہاز میں بیک وقت دونوں صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اوپر جاکر دوبارہ نیچے آسکتا ہے، اسی طرح وہ نیچے آکر دوبارہ اوپر کی طرف اٹھ سکتا ہے۔ یہی دوگونہ صفتیں زندگی کے وسیع تر سفر کے لئے بھی درکار ہیں۔ جو لوگ صرف ایک رخ پر بڑھنا جانتے ہوں۔ وہ اوپر جاکر نیچے نہ اتریں، یا نیچے آکر دوبارہ اوپر نہ جاسکیں، ایسے لوگ کبھی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہوائی اڈہ پر اترتے تو نظر آیا کہ اوپر ہر طرف فوجی ہیلی کاپٹر اڑ رہے ہیں۔ یہ اہتمام سیکوریٹی کی غرض سے کیا گیا تھا۔ میں نے فضا میں دیکھا تو اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر بار بار کوئی چیز گرا رہے تھے جو باہر آتے ہی آگ کے گولے کی طرح جل اٹھتی تھی۔ ایک منٹ کے بعد وہ سفید دھوئیں کی لکیر کی طرح فضا میں پھیل جاتی تھی۔ یہ واقعہ فضا میں بار بار ہورہا تھا۔

ایک افغانی سے میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ "پہاڑوں" کی طرف سے لوگ امریکہ کے بنے ہوئے اینٹی ایرکریفٹ مزائل مارتے ہیں جن کو اسٹنگر (Stinger) کہا جاتا ہے۔ ان اسٹنگروں میں یہ صفت ہے کہ وہ گرم چیز کی طرف تیزی سے جاتے ہیں جس رخ پر انھیں پھینکا گیا ہے، وہاں سب سے زیادہ گرم چیز، ہوائی جہاز کا انجن ہے۔ چنانچہ وہ انجن کا پیچھا کرکے اس کو مارتے ہیں۔

شروع میں اسٹنگر ہوائی جہازوں کو مار گرانے کا بالکل یقینی ذریعہ تھے۔ مگر اس کے بعد روسیوں نے ایک چیز ایجاد کرکے اسٹنگر کو بڑی حد تک بے اثر بنا دیا ہے۔ اس ایجاد کا نام فش (Fish) ہے۔ فش کوئی کیمیکل ہے۔ جب اس کو ہیلی کاپٹر کے باہر پھینکا جاتا ہے تو وہ بھڑک کر جل اٹھتا ہے۔ یہ جلنے والا مادہ جہاز کے انجن سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اسٹنگر کو اس کی طرف پھینکا جاتا ہے تو وہ جہاز کے انجن کی طرف جانے کے بجائے جلتے ہوئے گرم مادہ کی طرف جاکر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز بچ کر آگے نکل جاتا ہے۔

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے شخص کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ زیر نشانہ آدمی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ نشانہ کو بے نشانہ کردے۔ وہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو نشانہ بننے سے بچالے۔ فریق ثانی کے خلاف شور وغل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

آج کل ایک جغرافی اصطلاح استعمال ہوتی ہے جس کو جنوبی ایشیا (South Asia) کہا جاتا ہے۔

اس علاقہ میں ہندستان، پاکستان، سری لنکا، عرب اور افغانستان شمار کئے جاتے ہیں۔ افغانستان سے میرا تعلق، ایک اعتبار سے خاندانی ہے۔ میرے مورث اعلیٰ احسن خاں مرحوم ایک افغانی پٹھان تھے۔ جو غالباً ۱۵ویں صدی عیسوی میں اپنا وطن چھوڑ کر ہندستان چلے آئے۔ اس زمانہ میں افغانستان کے بہم جو افراد اکثر ہندستان کا رخ کیا کرتے تھے۔

حسن خاں مرحوم چترال کے رہنے والے تھے۔ چترال کا علاقہ پہلی صدی قبل مسیح میں چینیوں نے فتح کیا۔ ۱۱ویں صدی عیسوی میں یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ علاقہ پہلے افغانستان کا حصہ تھا۔ ۱۸۸۹ء میں وہ انگریزوں کی ماتحتی میں آیا۔ ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا حصہ ہے۔

ایک افغانی جرنلسٹ مسٹر سرور سے میں نے کہا کہ میرے افغانی مورث اعلیٰ افغانستان کو چھوڑ کر جونپور (ہندستان) گئے۔ اس وقت وہاں ایک افغان (سلطان شرقی) کی حکومت تھی۔ میرے مورث اعلیٰ کھیتا سرائے کے جنگل میں پہنچے تو وہاں ایک شیر سامنے آگیا۔ ان کے پاس اس وقت صرف ایک تلوار تھی۔ اس تلوار سے انھوں نے شیر کا مقابلہ کیا اور اس کو مار ڈالا۔ ان کی اس بہادری کی خبر سلطان شرقی تک پہنچی تو اس نے ان کو اپنے دربار میں بلایا اور اس علاقہ میں انھیں جاگیر عطا کی۔

میں نے سرور صاحب سے پوچھا کہ کیا اب بھی افغانستان میں ایسے لوگ ہیں جو تلوار کے ذریعہ شیر کو مار سکیں۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کا واقعہ بتایا کہ ایک بار جنگل میں ان کی مڈبھیڑ ایک شیر سے ہوگئی۔ اس وقت ان کے پاس ایک بڑی چھری تھی۔ اسی چھری سے انھوں نے شیر کو مار ڈالا۔ اگرچہ اس مقابلہ میں وہ خود بھی کافی زخمی ہوئے۔

پٹھانوں (افغانی باشندوں) کی تصویر قدیم زمانہ میں "طاقتور بیوقوف" کی تھی۔ پٹھانوں کی بیوقوفی کے بارہ میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ مثلاً ایک پٹھان کی کسی نے دعوت کی اور اس میں اسے برفی کھلائی۔ پٹھان کو برفی پسند آگئی۔ وہ بازار میں نکلا تو چاہا کہ مزید برفی حاصل کرے۔ ایک دکان پر سفید صابن کی ٹکیاں برائے فروخت رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سمجھا کہ یہی برفی ہے اور اس کو خرید لیا۔ گھر پر لاکر کھانا شروع کیا تو وہ بہت بدمزہ تھیں۔ پٹھان منھ بگاڑ بگاڑ کر برفی کے ہم شکل صابن کو کھا رہا تھا۔ ایک شخص گزرا۔ اس کے بعد جو سوال وجواب ہوا وہ یہ تھا:

سوال: آغا چہ می خوری   جواب: پیسہ می خورم

شاید پٹھانوں کی اسی کمتر تصویر کا نتیجہ تھا کہ ہندستانی شاعر نے پٹھانوں کو "غسال" کے خانہ میں ڈال دیا۔ ہندستانی مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مغربیت پر طنز کرتے ہوئے اس نے کہا کہ دین سے ان کی دوری اور علم واقفیت کا یہی انجام رہا تو آئندہ یہ حال ہوگا کہ :

آئیں گے غسال کابل سے کفن جاپان سے

تاہم موجودہ زمانہ میں روس کا افغانستان پر حملہ پٹھانوں کے لئے اس اعتبار سے مفید ثابت ہوا ہے کہ اس نے ان کی سابقہ تصویر بدل دی۔ پہلے اگر ان کی تصویر "طاقتور بے وقوف" کی تھی تو اب ان کی تصویر "طاقتور مجاہد" کی بن گئی ہے۔ اب وہ پوری مسلم دنیا میں ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

افغانوں کی بہادری مشہور ہے۔ یہاں بھی ان کی بہادری کے کئی قصے سننے میں آئے۔ میں نے ایک افغانی نوجوان آصف اللہ شمس (عمر ۳۰ سال) سے پوچھا کہ افغانی لوگ اتنے بہادر اور اتنے نڈر کیوں ہوتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم لوگوں کو بچپن سے اپنے گھر میں اور اپنے ماحول میں یہی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔ کوئی افغان لڑکا یا کوئی افغان آدمی اگر بزدلی کی بات کرے تو فوراً اس کو یہ سننے کو ملے گا کہ تم بے غیرت ہو، تم کو شرم نہیں آتی کہ تم افغانی ہو اور تمہارے اندر افغانیت نہیں :

تو بی غیرت ہستی، نی شرمی، افغان ہستی و افغانیت نداری۔

مسٹر سالم علی اور ایک انگریز عالم حیوانات کرنل مینرزاگن (R. Meinertzhagen) چڑیوں کے مطالعہ کے لئے ۱۹۳۵ میں افغانستان گئے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ چند ہفتے وہاں مقیم رہے۔ وہ افغانی چڑیوں کی تلاش میں دور دور کے علاقوں میں نکل جاتے۔ سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اپنا کھانے پینے کا سامان راستہ پر یا سڑک کے کنارے رکھ دیتے اور اپنی دوربینوں کے ساتھ جنگلوں میں چلے جاتے یا پہاڑوں پر چڑھ جاتے۔ جب وہ لوگ اپنا کام کرکے واپس آتے تو وہ تعجب کے ساتھ پاتے کہ ان کا سامان بدستور اپنی اصل حالت میں موجود ہے۔ مکھیوں کے سوا کسی اور نے ان کو نہیں چھوا ہے :

Salim Ali, *The Fall of Sparrow*, 1987, p. 100.

یہ خصوصیت آج بھی افغانیوں میں موجود ہے۔ افغانی آج بھی ایک باکردار قوم ہیں۔ تاہم اسی کے ساتھ جان غیر کو مارنا ان کے یہاں اتنا ہی جائز ہے جتنا کہ مال غیر کو لینا ناجائز۔

کابل شہر پہاڑوں کے درمیان آباد ہے۔ بلندی سے دیکھیں تو پورا شہر درختوں اور باغوں

کے جھرمٹ میں نظر آتا ہے"۔ فطرت کی دنیا کتنی حسین ہے"۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا" مگر انسانی دنیا حسین نہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت" پابند" ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان" آزاد" ہے۔ خدا کی دنیا میں اس کی مخلوقات کا حسن یہ ہے کہ وہ نظام خداوندی کی پابند بن کر رہے۔ فطرت اس کی مکمل پابندی کرتی ہے اس لئے وہ حسین ہے۔ انسان اس کی پابندی نہیں کرتا اس لئے وہ حسین نہیں۔

خدا نے چاہا کہ انسان کی صورت میں ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو آزاد ہوتے ہوئے بطور خود اپنے آپ کو نظام خداوندی کا پابند بنالے۔ وہ آزادانہ پابندی والے حسن کا نمونہ پیش کرے۔ مگر انسان، کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر، اس خدائی منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آزادی کے باوجود پابندی کا نمونہ اس نے پیش نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں درخت حسین ہے، مگر انسان حسین نہیں۔ ایک مفکر کے الفاظ میں: اس دنیا میں ہر چیز حسین ہے، مگر یہاں کی صرف ایک چیز حسین نہیں، اور وہ انسان ہے۔

۲۱ اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز یہاں کی مسجد" جامع وزیر محمد اکبر خاں" میں پڑھی۔ یہ مسجد یہاں کی سب سے خوبصورت مسجد بتائی جاتی ہے۔ خطبہ سے پہلے امام صاحب نے فارسی زبان میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اس آیت سے آغاز کیا: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (شما امت بہتر است) انھوں نے کہا کہ امروز حقّیت اسلام بر دنیا واضح است (آج اسلام کی حقانیت دنیا پر واضح ہے) مگر ہم خود اسلام کے لئے نہیں اٹھتے۔ انھوں نے روتے ہوئے کہا کہ آج افغان عورتیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ بچے یتیم ہو رہے ہیں۔ گھر اجڑ رہے ہیں۔ کاروبار برباد ہو گئے۔ حالانکہ اسلام دین ترحم است۔ آخر میں انھوں نے رقت آمیز انداز میں یہ دعا کی:

خدایا اسلام را اتفاق نصیب کن، خدایا اسلام را برادری نصیب کن۔

مسجد میں ایک بات مجھے بہت پسند آئی کہ تمام لوگ صفوں میں مل کر بیٹھے۔ جب جماعت کھڑی ہوئی تو تمام صفیں بیک وقت کھڑی ہو گئیں۔ وہ صورت پیدا نہیں ہوئی جو دہلی میں نظر آتی ہے کہ جماعت کھڑی ہوتے ہی آگے آئیے، آگے آئیے، کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ جو بعض اوقات قرأت شروع ہونے تک جاری رہتی ہے۔ میرے اپنے تجربہ میں دہلی کا مسلمان سب سے زیادہ غیر منظم ہے۔ حتیٰ کہ مسجد کی ہفتہ وار نماز میں بھی ایک ہی بے نظمی سالہا سال سے جاری ہے، اس میں کوئی کمی یا اصلاح نظر نہیں آتی۔

نماز سے فراغت کے بعد مسجد سے نکلے تو فقیروں کی جماعت دروازہ پر کھڑی ہوئی تھی۔ ان میں بڑی

تعداد میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ان کے پھٹے کپڑوں اور میلے جسموں کے پیچھے خوبصورت افغان چہرے جھلک رہے تھے۔ تعلیم کی کمی اور معاشیات کی بربادی افغانستان میں اپنی آخری حد کو پہنچ رہی ہے۔ یہاں ہندستانی روپیہ چلتا ہے۔ ایک روپیہ پندرہ افغانی روپیہ کے برابر ہے۔ اس سے یہاں کی اقتصادی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مسجد کے دروازہ کے باہر ایک بوڑھا افغانی انار اور سیب بیچ رہا تھا۔ لکڑی کی پرانی گاڑی کے اوپر ایک طرف پھل تھے اور دوسری طرف ترازو اور اس کے ساتھ پتھر کے باٹ۔ گاہکوں کی آمد سے بے پروا ہوکر وہ ہاتھ میں تسبیح لئے کھڑا تھا اور "سیب لو سیب" یا "انار لو انار" جیسی آوازیں لگانے کے بجائے خاموش تسبیح خوانی میں مشغول تھا ——— افغانستان میں جہازوں کی گڑگڑاہٹ اور بم کے دھماکوں کے سوا مجھے زندگی ہر جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی۔

افغانستان میں پشتو اور دری، دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایران میں جس زبان کو فارسی کہا جاتا ہے اس کو افغانستان میں دری کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دری اور پشتو زبانیں ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی۔ دو تقابلی فقرے سے اس فرق کو سمجھا جاسکتا ہے:

دری	پشتو
من چای می خورم	زہ چای خورم
من خانہ دارم	زہ کور لرم

کابل میں میرا قیام جس ہوٹل (روم ۳۲۸) میں تھا، اس کو مقامی لوگ اپنی زبان میں میلہ پال ہوٹل کہتے ہیں۔ مگر اس نام کی بنا پر اس کو افغانی ہوٹل سمجھنا ایسا ہی ہوگا جیسے قاہرہ میں "نصر" کار کو دیکھ کر کوئی شخص سمجھے کہ یہ مصری صنعت کی بنائی ہوئی کار ہے۔ مسلم ملکوں میں بہت سی جدید چیزیں ہیں جن کے نام بظاہر مقامی مسلم زبان میں ہوتے ہیں، مگر حقیقۃً وہ خالص مغربی ہوتی ہیں۔

اس ہوٹل کا اصل نام "انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل" ہے۔ یہ دراصل مغربی سرمایہ کے تحت قائم شدہ ایک عالمی تجارتی تنظیم ہے جس کا رجسٹرڈ نام Inter-Continental Hotels ہے۔ اس کے تحت یروشلم سے لے کر نیویارک تک درجنوں شہروں میں ہوٹل قائم ہیں۔ اسی طرح ابوظبی، عمان، قاہرہ، دوبئی، اصفہان، کابل، مکہ، مسقط، ریاض، شارجہ، طائف، تہران، کراچی، لاہور وغیرہ

ہیں بھی اس کے ہوٹل چل رہے ہیں۔ " ہوٹل " اپنے جدید معنوں میں ایک زبردست انڈسٹری ہے اور موجودہ زمانہ کی دوسری انڈسٹری کی طرح مسلمان یہاں بھی بہت پیچھے ہیں۔

میرے کمرہ کے دروازہ پر دستک ہوئی۔ کھولا تو ایک افغانی عالم اندر داخل ہوئے۔ وہ روانی کے ساتھ عربی بول رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں عرب انداز کی تسبیح تھی جس پر مسلسل ان کی انگلیاں چل رہی تھیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں مسلمانوں کا حال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر لحاظ سے بہت اچھا (عالی من جمیع الجہات) انھوں نے بتایا کہ صرف کابل میں ۱۰۶۱ مسجدیں ہیں۔ البتہ دینی درس گاہ صرف ایک ہے۔ ان سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں میں نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اس طرح اپنا نام بتایا:

حجۃ الاسلام الشیخ محمد عوض صادقی، معین وزارۃ الشئون الدینیہ والاوقاف۔

ایک روز ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ ایک افغانی بھائی بھی تھے۔ میز پر مختلف قسم کے کھانے کے سامان موجود تھے۔ اسی کے ساتھ ایک پیالہ میں شکر کے ڈلے تھے جو چائے میں ڈالنے کے لئے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے افغانی بھائی سے پوچھا کہ یہاں عام افغانی کا روزانہ ناشتہ کیا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت اپنی ڈبل روٹی میں مکھن لگا رہے تھے۔ وہ اچانک ٹھہر گئے۔ انھوں نے شکر کے پیالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: روٹی اور شکر۔

گفتگو کے دوران میں نے ان سے مزید پوچھا کہ افغانستان میں اتنی زیادہ جہالت ہے۔ افغانی لوگ اپنے بچوں کو پڑھاتے کیوں نہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ عام افغانی کو اپنی روٹی کے لئے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کہ بچوں کو پڑھانا اس کے بس میں نہیں۔ افغانی لوگ بے حد محنتی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس نہایت قیمتی زمینیں ہیں۔ اس کے باوجود افغانی قوم جہالت اور غربت کی شکار ہے۔ میری معلومات کے مطابق امیر امان اللہ خاں کے بعد یہاں کوئی قابل ذکر تعمیری کام نہیں ہوا۔

کابل میں میں ایک افغانی سے ملا۔ اس نے اپنا نام محمد سرور بتایا۔ وہ مجھ سے قطعاً واقف نہ تھا۔ حتی کہ اس نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس سے میں نے پوچھا کہ افغانی لوگ امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ امان اللہ خاں کے بارہ میں عام افغانیوں کی عین وہی رائے ہے جو خود میری رائے ہے۔ اس افغانی نے اپنی زبان میں کہا:

آزادی افغانستان توسط امان اللہ خاں غازی درسال ۱۹۱۹ تامین گردید۔ و مردم افغان اورا بہ دیدۂ قدر می نگرند۔ وہیچ کس در افغانستان اورا بدنمی بنید۔ و در راہ اعمار افغانستان او بسیار کوشش زیاد نمودہ است۔

یعنی امان اللہ خاں کے ذریعہ ۱۹۱۹ میں آزادی حاصل ہوئی۔ افغانستان کے لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ افغانستان میں کوئی بھی شخص ان کو برا نہیں سمجھتا۔ افغانستان کی تعمیر کی راہ میں انھوں نے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں۔

۲۴ اکتوبر کی صبح کو ناشتہ کی میز پر میرے ساتھ دو تعلیم یافتہ افغانی تھے۔ ایک نے اپنا نام راشد بتایا دوسرے نے کمال۔ میں نے ان سے امیر امان اللہ خاں کے بارہ میں پوچھا۔ دونوں نے ان کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ پھر ان کے زوال کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ یورپ گئے۔ وہاں انھوں نے جدید تعلیم کو دیکھا اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ واپس آئے تو انھوں نے چاہا کہ افغانستان میں اصلاحات کریں اور جدید تعلیم کو یہاں رائج کریں۔

انھوں نے کہا کہ "ملاؤں" کا طبقہ ان کے خلاف ہوگیا۔ افغانی علماء کی اکثریت ان کو کافر اور بے دین کہنے لگی۔ امیر امان اللہ خاں میں اتنی اعلیٰ خصوصیات تھیں کہ پھر بھی شاید ان کے مخالفین کامیاب نہ ہوتے۔ مگر امیر امان اللہ خاں کی ایک غلطی نے انھیں موقع دے دیا، اور وہ ان کی جلد بازی تھی۔ انھوں نے چاہا کہ جدید اصلاحات افغانستان میں فوراً نافذ ہو جائیں۔ مثلاً انھوں نے پہلے ہی مرحلہ میں کچھ افغانی لڑکیوں کو نرسنگ کی تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیا۔ اس طرح کا کام اگر وہ رفتہ رفتہ کرتے تو کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ عوام ان سے خوش تھے۔ راشد صاحب نے بتایا کہ میری ماں نے امیر امان اللہ خاں کو دیکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ امان اللہ بہت اچھے اخلاق کے آدمی تھے۔ راستہ چلتے ہوئے بے تکلف عوام سے ملتے اور انھیں پیسہ اور تحفہ پیش کرتے۔ ہر ایک سے یکساں طور پر معاملہ کرتے۔

مگر اس وقت افغانی خاندانوں میں پردہ کا بہت شدت سے رواج تھا۔ جب انھوں نے افغانی لڑکیوں کو نرس کی ٹریننگ کے لئے یورپ بھیجا تو "ملاؤں" کو موقع مل گیا۔ انھوں نے ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ اس وقت بھی امان اللہ خاں کی شرافت تھی کہ انھوں نے مخالفین کو دبانے کے لئے پولیس اور فوج کی طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ خود اپنی قوم کے خلاف مار دھاڑ کریں۔ چنانچہ وہ

از خود ملک چھوڑ کر چلے گئے۔

امیر امان اللہ خاں نے ملکی اشیا، رواج دینے کی ہم چلائی۔ انھوں نے کہا کہ اپنے ملک کا کپڑا پہنو۔ اگر کوئی افغانی یا کوئی افسر بیرون ملک کے کپڑے پہنے ہوئے نظر آیا تو انھوں نے فوراً اس کے قریب جاکر اولاً اس کی تعریف کی اور پھر اپنی جیب سے چھوٹی قینچی نکال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا کاٹ لیا اور کہا کہ نمونہ گیریم (ہم تمہارے کپڑے کا ایک نمونہ لے رہے ہیں) اس طرح اس کے کپڑے کو برباد کر دیتے۔

امان اللہ خاں راتوں کو اکیلے گھومتے تھے۔ چوں کہ کابل میں رات کو اکیلے نکلنا منع تھا، ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ان کو گرفتار کر لیا۔ تاہم امان اللہ خاں نے ناخوش ہونے کے بجائے اس کی فرض شناسی پر اس کو انعام دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے ملک میں تعلیم جاری کی۔ سائنس کی تعلیم کے لئے کچھ لڑکوں کو لندن بھیجا۔ ان افغانی طلبہ کے ساتھ انھوں نے ایک عالم بھی حکومت کے خرچ پر روانہ کیا۔ انھوں نے یہ تاکیدی ہدایت کی کہ ان کے اسکول کے عیسائی لڑکے جب چرچ جائیں تو افغانی لڑکے اس وقت قرآن کی تلاوت کریں (۹۴)

امیر امان اللہ خاں ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۹ تک افغانستان کے حکمراں تھے۔ اس کے بعد ملک میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ یہاں تک کہ انھیں ملک چھوڑ کر باہر چلا جانا پڑا۔ اسی جلاوطنی کی حالت میں ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ کو زیورک میں ان کا انتقال ہوگیا۔

امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کرنے والوں کا خاص الزام ان کے اوپر یہ تھا کہ وہ خلاف شرع طریقے ملک میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً وہ چاہتے تھے کہ افغان عورتیں گھر سے باہر نکل آئیں اور بے پردہ ہوکر مردوں کے ساتھ کام کریں۔

مگر یہی پٹھان تھے جنھوں نے اس سے تقریباً سو سال پہلے سید احمد شہید بریلوی کے معاملہ میں اس سے بالکل مختلف روش اختیار کی۔ سید صاحب نے پٹھانوں کے علاقہ میں اسلامی امارت قائم کی اور شرعی قوانین (زکوٰۃ وغیرہ کا قانون) جاری کیا۔ مگر پٹھانوں نے شرعی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی ——— امیر امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کو اگر دینی حمیت یا اسلامی جہاد کہا جائے تو سید صاحب کے خلاف بغاوت کو کیا نام دیا جائے گا۔

بیسویں صدی میں مسلم دنیا کو تین ایسے حکمراں ملے جو واقعی معنوں میں مدبر تھے اور دور جدید

کی حکومت کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے ــــــ افغانستان کے امان اللہ خاں (۱۹۶۰ - ۱۸۹۲) اور سعودی عرب کے ملک فیصل (۱۹۷۵ - ۱۹۰۶) اور پاکستان کے محمد ایوب خاں (۱۹۷۴ - ۱۹۰۷) مگر تینوں حکمرانوں کو پوری طرح کام کرنے کے مواقع نہ مل سکے۔ ان تینوں کی قاتل، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، موجودہ زمانہ کی نام نہاد اسلامی سیاست تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس "اسلامی سیاست" سے اسلام کو جتنا نقصان پہنچا ہے اتنا کسی اور چیز سے اس کو نہیں پہنچا۔

بعض باتیں قومی امنگوں کے اعتبار سے بہت سنگین معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں باتوں کو اگر خالص حقیقت کے اعتبار سے جانچا جائے تو وہ بالکل مختلف نظر آئیں گی۔ مثال کے طور پر انگریز جب ہندستان پر قابض ہوئے تو وہ مسلسل یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی نوآبادیاتی سلطنت کو افغانستان تک وسیع کر سکیں۔ اس کا مقصد افغانستان پر قبضہ سے زیادہ روسی خطرہ کا دفاع تھا۔ مگر افغانیوں کی شدید مزاحمت کی وجہ سے انگریز اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہمارے پرجوش رہنما عام طور پر اس واقعہ کو اپنے اور افغانیوں کے فخر کے خانہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو وہ صرف ایک پرجوش نادانی نظر آئے گی۔ انگریز کا معاملہ معروف معنوں میں صرف ایک "بیرونی سامراج" کا معاملہ نہ تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ جدید تعلیم اور سائنٹفک انقلاب کے ہراول بن کر ایشیا میں داخل ہوئے تھے۔ نیز یہ کہ خود سائنسی انقلاب کی اپنی داخلی منطق کے تحت یہ بھی مقدر تھا کہ نوآبادیاتی اقتدار بالآخر ختم ہو اور قومی اقتدار اس کی جگہ لے لے۔

افغانی لوگوں کا جوش اگر ہوش کے تابع ہوتا اور وہ وقتی طور پر برطانیہ کی سرپرستی کو قبول کر لیتے تو اس کا انھیں زبردست فائدہ ملتا۔ برطانی اقتدار تو یقیناً اپنے وقت پر ختم ہو جاتا۔ مگر افغانستان کو اس "صبر" کی یہ قیمت ملتی کہ آج افغانستان ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا نہ کہ ایک برباد شدہ ملک جیسا کہ آج وہ نظر آتا ہے۔

کانفرنس کا رسمی آغاز ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۸ کی صبح کو ہوا۔ اس کارروائی کو "پریس کانفرنس" کا نام دیا گیا تھا۔ مگر زیادہ صحیح طور پر وہ ایک ملاقات تھی۔ کیونکہ اس موقع پر جو کارروائی ہوئی وہ یہ تھی کہ افغانستان کی وزارت امور اسلامی کے ذمہ داروں نے افغانستان میں اسلام اور اسلامی تعلیم کی حالت کے بارہ میں معلومات بیان کیں۔

شام کو تمام شرکاء کو کابل کے باہر ایک کھلے مقام پر لے جایا گیا۔ یہاں "شہدای راہ انقلاب" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دور تک "اپریل انقلاب" میں ہلاک ہونے والے فوجیوں کی قبریں نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مخصوص فوجی آداب کے ساتھ "شہداء" کو پھول (wreath) چڑھایا گیا۔ میرے لئے یہ منظر نیا تھا۔ مجھے کسی شخص کا یہ قول یاد آیا کہ حکومت کے خلاف مسلح اقدام اگر کامیاب نہ ہو تو وہ بغاوت ہے، اگر کامیاب ہو جائے تو وہ انقلاب ہے۔

۲۲ اکتوبر کی صبح کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ ڈاکٹر نجیب (رئیس جمہوریہ افغانستان) اور دوسرے اعلیٰ حکومتی ذمہ دار اسٹیج پر موجود تھے۔ کارروائی کا آغاز ایک نابینا قاری کی تلاوت سے ہوا۔ انھوں نے سورۂ احزاب کا وہ حصہ پڑھا جس میں یہ آیت ہے: یخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ۔ میں نے سوچا کہ اگر بالفرض آج کوئی نئی کتاب اترے اس میں مذکورہ الفاظ ہوں اور ان کو لے کر کوئی شخص ایک ایسے اجتماع میں ان کی تلاوت کرنے لگے جہاں وقت کے حکمراں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں تو شاید اس کو نکال کر باہر کر دیا جائے گا۔ مگر قاری اس قسم کی آیت قرآن سے پڑھتا ہے تو کسی کے اندر کوئی جنبش نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ نیا پیغمبر اس کو زندہ پیغام کے طور پر پڑھے گا، اور نابینا قاری اس کو صرف ایک روایتی قرأت کے طور پر اس کا ترنم کر رہا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام سے مقالات کا سلسلہ شروع ہوا جو ۲۳ اکتوبر کی شام تک جاری رہا۔ میں نے جو مقالہ پیش کیا، اس کا عنوان یہ تھا:

The Prophet of Islam: Benefactor of Humanity

یہ مقالہ انشاء اللہ انگریزی الرسالہ میں شائع کر دیا جائے گا۔

۲۲ اکتوبر کو یہاں کے ٹیلی وژن والوں نے انٹرویو لیا۔ اپنے مرکز کے تعارف کے بعد میں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک اسلام کا مطلب ہے آخرت اورینٹڈ لائف۔ دوسری بات میں نے وہی کہی جو الرسالہ میں بار بار آتی ہے۔ یعنی تصادم کو اوائڈ کرتے ہوئے ممکن دائرۂ عمل میں اپنا کام کرنا۔ اس سلسلہ میں میں نے مزید کہا کہ یہ باتیں میں خاص طور پر افغانستان کے پس منظر میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا مستقل پیغام ہے جس کی میں پچھلے ۳۰ سال سے برابر تبلیغ کر رہا ہوں۔

یہ اللہ کا فضل ہے کہ میں غالباً ہندستان کا اکیلا شخص ہوں جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ ایک

ہی بات کہتا ہے ۔ ورنہ میری معلومات کے مطابق ، ہندستان کے تمام علما اور قائدین اس معاملہ میں ذوالوجہین ہو رہے ہیں۔ وہ ہندستان میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر تصادم اور ایجی ٹیشن کی بات کرتے ہیں، اور جیسے ہی وہ کسی مسلم ملک کے ہوائی اڈہ پر اترتے ہیں ان کی زبان بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ لوگ باہر کے مسلم ملکوں میں جو بات کہتے ہیں، وہی میں دونوں جگہ کہتا ہوں۔ البتہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ باہر کے مسلم ملکوں کے لئے ان کا ٹیپ دوسرا ہے اور ہندستان کے لئے دوسرا۔

کابل سے ایک فارسی روزنامہ ہیواد نکلتا ہے۔ اس نے اپنے شمارہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۸ میں میرا انٹرویو شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک فلسطینی جو اسپین میں رہتے ہیں اور اسپینی زبان بخوبی جانتے ہیں، انھوں نے بھی ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں انٹرویو لیا۔ اس کو وہ اسپین کے بعض اخبارات میں شائع کریں گے۔ وہ اسپین ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور بعض اسپینی اخبارات کے نامہ نگار ہیں۔ ان کا نام سعید علمی ہے اور وہ میڈرڈ میں رہتے ہیں۔

سعید علمی صاحب نے اسپین میں اسلام کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں اسلام کی تبلیغ کے مواقع ہیں۔ کیوں کہ موجودہ نظام کے تحت وہاں ہر مذہب کو آزادی حاصل ہے۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ اسپینی زبان میں اسلامی لٹریچر موجود نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ قرآن کا اسپینی ترجمہ کسی مسلمان کے ہاتھ کا کیا ہوا موجود نہیں۔ البتہ ایک ترجمہ ہے اور وہ اسپین کے مسیحی کا کیا ہوا ہے:

لا یوجد فی اسبانیا قرآن مترجم الی الاسبانیة علی ید مسلمین۔ و لکن یوجد مترجما علی ید مسیحی اسبان۔

ایک صاحب نے پیغمبر اسلام کی عظمت پر مقالہ پیش کیا۔ آپؐ کے ذریعہ دنیا میں اصلاح اور انقلاب کا جو دور آیا، اس کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ تمام نبیوں سے افضل تھے۔ آپ کا دین دوسرے تمام دینوں کے مقابلہ میں مکمل تھا۔ وغیرہ۔ میں نے ان کے مقالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بات بطور واقعہ درست ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ دنیا میں عظیم ترین اصلاحی انقلاب آیا۔ مگر اس کی وجہ افضلیت اور اکملیت نہ تھی جس کو آپ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ نتیجۂ توحید تھا نہ کہ نتیجۂ اکملیت۔

اصل یہ ہے کہ یہ تمام ترقیاں "توحید" کا نتیجہ ہیں۔ توحید ہی ہر قسم کی اصلاح و ترقی کا اصل سرچشمہ ہے۔ پچھلے دور میں جو انبیا آئے ان کا دین بھی توحید کا دین تھا۔ انھوں نے بھی اسی توحید کی

دعوت دی جس کی دعوت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ مگر دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ کہ پچھلے پیغمبروں کے زمانہ میں توحید کی دعوت صرف فکری اور نظریاتی مرحلہ میں رہی، وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچی۔ چنانچہ توحید کی تبلیغ کے باوجود توحید کے عملی نتائج ظہور میں نہیں آرہے تھے۔ پیغمبر اسلامؐ نے دعوتِ توحید کو انقلابِ توحید تک پہنچادیا۔ جب ایسا ہوا تو انسان کو اس کے نتائج ملنا شروع ہوگئے جن سے وہ اب تک محروم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور دوسرے پیغمبروں کے درمیان جو فرق ہے وہ نفس دین کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ دین کے اظہار کے اعتبار سے ہے۔

ایک صاحب نے سیاسی انداز میں تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خاص نشانہ امریکہ تھا۔ اپنی پرجوش تقریر میں وہ ظالم امریکہ، مردود امریکہ اور شیطان امریکہ جیسے الفاظ بے تکلف استعمال کررہے تھے۔ میں نے سوچا کہ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل جس کے وسیع ہال میں یہ تقریر ہورہی ہے، وہ ایک امریکی کمپنی کا بنوایا ہوا ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ افغانستان کے پاس سارے ملک میں دوسرا کوئی ہوٹل یا ہال نہیں جہاں ایک بین اقوامی سطح کی سیرت کانفرنس شایان شان طور پر کی جاسکے۔ ایسی حالت میں امریکہ کو برا بھلا کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس امریکہ کے نفوذ کا یہ حال ہو کہ اس کو گالی دینے میں جو پیسہ خرچ ہو وہ بھی اسی کی جیب میں جائے، ایسے امریکہ کا مقابلہ عمل کے اسٹیج پر کیا جاسکتا ہے نہ کہ کسی قسم کے لفظی اسٹیج پر۔

ایک بڑے کمرہ میں افغانستان کی اسلامی مطبوعات کی نمائش کی گئی تھی۔ بڑی تعداد میں مختلف موضوعات پر کتابیں موجود تھیں۔ ایک کتاب کا نام تھا: نقش علماء در دعوت بہ صلح۔ اس کے "نویسندہ" ڈاکٹر عبدالغفور باہر تھے۔ اس کتاب کا موضوع تھا صلح کی دعوت میں علماء کا رول۔ اس کو عربی میں کہہ سکتے ہیں: دور العلماء فی الدعوۃ الی السلم۔

اس کتاب کا پہلا جملہ یہ تھا کہ یہ واضح بات ہے کہ اسلام کی دعوت عالمی دعوت ہے اور دنیا میں رحمت لانے کے لئے ہے (واضح است کہ دعوت اسلام دعوت جہانی و تا مین رحمت است)

یہاں مختلف ملکوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جو لوگ عربی یا انگریزی زبان جانتے تھے، ان سے گفتگو کرنا آسان تھا۔ مگر جو لوگ صرف اپنی مقامی زبان جانتے تھے، ان سے براہ راست ربط قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک موقع پر میرے ساتھ اسی قسم کی "بے بسی" پیش آئی۔ اس تجربہ کے موقع پر بے اختیار مجھے آخرت کی دنیا یاد آگئی۔ میری زبان سے نکلا: آخرت کی دنیا کیسی عجیب دنیا ہوگی۔ وہاں تمام انسانوں سے ایک زبان میں کلام

کرنا ممکن ہوگا۔ وہاں تمام انسانوں کی سطح ایک ہو جائے گی۔ وہاں ہر آدمی حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ وہاں کسی کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ وہ دھواں بکھیر کر فضا کو آلودہ کرے۔ وہاں کسی کو یہ قدرت نہ ہوگی کہ وہ ظلم اور جبر کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہو جائے اور پھر اپنی ذات کو بچانے کی خاطر سارے معاملات کو تہس نہس کر ڈالے۔ وہاں کسی کو یہ موقع نہ ہوگا کہ جھوٹ اور استحصال کی بنیاد پر لیڈر بن جائے۔

آخرت کی دنیا میں ہر چیز اپنی اصل تخلیقی حالت پر ہوگی۔ وہاں ہر آدمی کو اس حد پر ٹھہرنے کے لئے مجبور کر دیا جائے گا جو اس کی واقعی حد ہے۔ وہاں ہر قسم کا مصنوعی فرق مٹ چکا ہوگا۔ موجودہ دنیا اگر انسانی دنیا ہے تو وہ ربانی دنیا ہوگی۔ کیسی عجیب ہوگی یہ آنے دنیا، اور کیسے خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو اس معیاری دنیا میں آباد کاری کے لئے منتخب کئے جائیں۔

کانفرنس کی کارروائی کل شام کو ختم ہوگئی۔ اگلی صبح کو میں کابل کے ہوٹل انٹر کانٹی ننٹل (روم ۳۲۸) میں میز کے سامنے بیٹھا ہوں۔ سورج کی روشنی دیواری شیشہ سے گزر کر کمرہ میں آرہی ہے۔ ذہن میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا نقشہ گھوم رہا ہے۔ اچانک مجھے فارسی کا یہ شعر یاد آیا:

خانۂ شرع خراب است کہ ارباب صلاح　　　در عمارت گری گنبد اسلاف خود اند

میں نے سوچا کہ موجودہ زمانہ کا نصف حصہ اگر "گنبد اسلاف" کی تعمیر میں مشغول ہے تو بقیہ نصف حصہ "گنبد خویش" کی تعمیر میں۔ جہاں تک "خانۂ شریعت" کی تعمیر کا تعلق ہے، اس سے حقیقی طور پر کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ سوچتے ہوئے ایک تاثر طاری ہوا جو ان لفظوں میں ڈھل گیا: اپنے کو اسلامی ظاہر کرنے کے لئے ہر شخص دوڑ رہا ہے، مگر اپنے کو اسلامی بنانے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ اسلام کا جھنڈا بلند کرنے کے لئے ہر آدمی بے قرار ہے، مگر اسلام کی خاطر اپنا جھنڈا گرانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اسلام کے گنبد پر ہر شخص کھڑا ہونا چاہتا ہے، مگر اسلام کی بنیاد میں دفن ہونا کسی کو گوارا نہیں ——— کیسا عجیب ہے وہ اسلام جو سب کچھ ہو مگر اسلام ہی نہ ہو۔

ایک افغانی نوجوان جس نے بی اے کے مرحلہ تک تعلیم حاصل کی ہے، اس سے میں نے پوچھا کہ افغانستان میں ایسے لوگ کتنے ہوں گے جنھوں نے بی اے کیا ہو۔ اس کا جواب تھا کہ سو میں ایک۔ یہی افغانی قوم کی اصل کمزوری ہے۔ وہ بے حد بہادر قوم ہیں۔ مگر بہادری میں وہ جتنا آگے ہیں، تعلیم میں وہ اتنا ہی پیچھے ہیں۔ وہ لوگ جن کو "افغانی مجاہدین" کہا جاتا ہے، وہ ایک درجن تنظیموں میں بٹے ہوئے ہیں،

تاہم ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ وہ یہ کہ ان کی اکثریت تعلیم یافتہ نہیں۔

غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے افغانی مجاہدین ایک بات کو جانتے ہیں، مگر وہ دوسری اہم تر بات کو نہیں جانتے۔ وہ اس بات کو مبالغہ آمیز حد تک جانتے ہیں کہ ان کی شجاعت نے روسی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا ہے۔ مگر وہ اس تاریخی حقیقت سے سرے سے ناواقف ہیں کہ روسی فوجوں کی افغانستان سے واپسی دراصل ایک دور کا خاتمہ ہے۔ یہ ویسا ہی معاملہ ہے جیسے مہاتما گاندھی کی تحریک آزادی نے انگریزوں کو ہندستان سے نکلنے پر مجبور کیا۔ مگر انگریزوں کا یہاں سے نکلنا اسی کے ساتھ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ اب قدیم طرز کا نوآبادیاتی دور (Colonial age) ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ دوبارہ واپس آنے والا نہیں۔

مجاہدین میں اگر کچھ ایسے لوگ ہوتے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے اور وقت کی رفتار کو گہرائی کے ساتھ سمجھتے تو وہ جان لیتے کہ روسی فوجوں کی واپسی سادہ طور پر صرف واپسی نہیں ہے، یہ اس دور کا خاتمہ ہے جس میں روسی طرز کا تدخل ممکن ہوتا تھا۔ اگر افغانی مجاہدین اس راز کو جانتے تو ان کا طرز کار بالکل بدل جاتا۔ ہتھیار کی طاقت سے انھوں نے خارجی حریف کو زیر کیا تھا، امن کی طاقت سے وہ داخلی حریف پر قابو پا لیتے۔

کابل سے انگریزی کا صرف ایک اخبار نکلتا ہے جس کا نام "کابل ٹائمس" ہے۔ البتہ فارسی (دری) میں بہت سے اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ اخبار انیس (۱۰ ربیع الاول ۱۴۰۹) کے ایڈیٹوریل کا عنوان تھا: محمد صلعم مصلح کبیر وانسان دوست بزرگ۔ اس میں مولوی عبدالشکور (خطیب مسجد جامع باغ بالا) کی ایک تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس خبر کا عنوان یہ تھا ——— "ما صلح را پیش کش می کنیم"۔ خبر کے مطابق انھوں نے کہا: روایت است در جنگ حدیبیہ باوجودیکہ شرائط گرانی را بالای محمد قبول دار گردیدند، آنحضرت صلح را ترجیح داد۔ زیرا می دانست کہ یک طرف مشرکین از جملہ اقوام او می باشند، وطرف دیگر یاران ہم کابش، پس صلح حدیبیہ را بہ خاطر قطع جنگ وخون ریزی قبول دار شد۔

برادرکشی کے خاتمہ کے لئے (برائے ختم برادرکشی) افغان مجاہدین سے صلح کی پیش کش کی مزید تفصیل مجھے امریکی میگزین ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) سے ملی۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) نے لکھا ہے کہ افغانستان میں اس وقت ۳۵ سالہ احمد شاہ مسعود کو "شیر پنج شیر" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس افغانی نوجوان نے کابل کے پالی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ پچھلے تقریباً دس سال سے وہ مجاہدین کا استاد بنا ہوا ہے۔ اس کا تعلق افغانستان

کی اسلامی جماعت سے ہے۔

ٹائم نے اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ نو سال کی جنگ کے بعد افغانستان کی وادی خالی بستیوں اور برباد مکانات کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ افغانستان کی موجودہ حکومت جنگ بندی یا مخلوط حکومت تک پر راضی نظر آتی ہے۔ صدر نجیب اللہ جو اس وقت مایوسی کا شکار ہیں، کیونکہ ان کا حامی روس واپس جا رہا ہے۔ حال میں انھوں نے مسعود کو یہ پیش کش کی کہ امن قائم کرنے کے بدلے وہ حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کرلیں:

President Najibullah recently offered Massoud a choice of top government posts in exchange for peace (p.10).

ٹائم کے بیان کے مطابق، احمد شاہ مسعود نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے۔ وہ موجودہ حکومت کی بے دخلی سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ عین وہی غلطی ہے جو اس سے پہلے سید قطب اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کرچکے ہیں۔ سید قطب کو جمال عبد الناصر نے مصر کی وزارت تعلیم کی پیش کش کی۔ مگر سید قطب کو اس سے کم کوئی چیز قبول نہ تھی کہ جمال عبدالناصر کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔ اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی کو محمد ایوب خاں نے یہ پیش کش کی کہ حکومت انھیں اعلیٰ ترین وسائل دے گی، وہ ایک انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی قائم کریں اور اس میں اپنی صلاحیتیں لگادیں۔ مگر دوبارہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اس سے کم کسی بات پر راضی نہ ہوسکے کہ محمد ایوب خاں کرسی اقتدار سے ہٹ جائیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں رہنما مصر اور پاکستان میں ممکن تعمیری کام نہ کرسکے، وہ صرف بربادی کی تاریخ چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے۔ افغانی مجاہدین نے اگر اپنے رخ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو یقینی ہے کہ وہ بھی اس دنیا سے اس حال میں جائیں گے کہ ان کے پیچھے ایک برباد شدہ افغانستان کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔ اور اس دنیا سے بہر حال ہر ایک کو جانا ہے۔

افغانی مجاہدین کے بارے میں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی قربانی سے ۱۹۸۸ میں افغانستان میں اس تاریخی عمل کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچایا ہے جو ۱۹۷۳ میں ویت نام میں شروع ہوا تھا۔ ویت نام کو امریکہ نے طاقت کے ذریعہ مسخر کرنا چاہا۔ مگر ویت نامیوں کی ناقابل تسخیر مزاحمت نے امریکہ کو ۱۹۷۳ میں وہاں سے لوٹنے پر مجبور کردیا۔ اس واقعہ سے ثابت

ہوا کہ کوئی قوم خواہ عسکری طاقت میں "سپر پاور" کا درجہ حاصل کر لے وہ محض طاقت کے بل پر کسی قوم کو زیر نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ٹھیک اسی عمل کو سوویت روس نے افغانستان میں دہرایا۔ بعض داخلی اسباب نے اس کو موقع دیا اور اس نے اپنی دیرینہ خواہش کے تحت افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ مگر یہ اقدام ان کے لئے بے حد مہنگا پڑا۔ یہاں تک کہ ۱۹۸۸ میں انھوں نے افغانستان سے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اب یہ بات آخری طور پر ثابت ہو گئی کہ بین اقوامی معاملات میں طاقت کو پہلا فیصلہ کن مقام حاصل نہیں۔

افغانستان کی موجودہ سیاست بے حد مخدوش ہے۔ روس اگرچہ اپنی فوجوں کو واپس بلا رہا ہے تاہم وہ چاہتا ہے کہ افغانستان میں ایسی حکومت قائم ہو جو کمیونسٹ نواز ہو یا کم از کم اینٹی کمیونسٹ نہ ہو۔ دوسری طرف "مجاھدین" کا کہنا ہے کہ وہ افغانستان میں سوویت روس کے کسی بھی اثر و نفوذ کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ امریکہ اور پاکستان اس مطالبہ کی تائید کر رہے ہیں، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ "مجاہدین" کی جو حکومت ہوگی وہ امریکہ نواز یا پاکستان نواز ہوگی۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ "مجاہدین" کی بندوقوں کا رخ جو پہلے روسیوں کی طرف تھا، اب وہ حکمراں افغانی گروہ کی طرف ہو گیا ہے، کیونکہ ان کے متعلق ان کا خیال ہے کہ وہ روسی پالیسی کی حمایت کر رہے ہیں۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کا حل خوش تدبیری اور ایڈجسٹمنٹ ہے۔ مگر بظاہر ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پچھلے دس سال سے مجاہدین کے غیر مصالحانہ تشدد کو سارے عالم اسلام میں جس طرح گلوریفائی کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو ہیرو بنایا گیا ہے، اس کے بعد ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی ان کے لئے ہیرو کے مقام سے اترنے کے ہم معنی ہوگی۔ اور انسان کے لئے بلاشبہ یہ مشکل ترین کام ہے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اگر بالفرض روسی اثر و نفوذ افغانستان سے ختم ہو جائے تب بھی اصل مسئلہ ختم ہونے والا نہیں۔ کیونکہ عدم برداشت کا مزاج جو اس وقت روسیوں یا روس نوازوں کے خلاف کام کر رہا ہے وہی خود اپنوں کے خلاف کام کرنے لگے گا۔ اس دنیا میں کامیابی کا راز برداشت ہے، دوسروں کے مقابلہ میں بھی اور خود اپنوں کے مقابلہ میں بھی۔

اس سلسلہ میں لینن کی مثال بہت سبق آموز ہے۔ روس میں زار کے زوال کے بعد ۱۵ مارچ ۱۹۱۷ کو پہلی پراوژنل گورنمنٹ بنی۔ اس میں لینن کی حیثیت صرف اقلیتی ممبر کی تھی۔ اس کا وزیر اعظم شاہی خاندان کے جارجی لووف (Prince Georgy Lvov) کو بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد الیگزینڈر کرنسکی (Aleksander Kerensky) کو ایک اہم وزیر کی حیثیت سے اس میں نمبر ۲ کی حیثیت حاصل تھی۔ لینن کی حیثیت یہ تھی کہ وہ بالشویک پارٹی کا ممبر تھا جو اس وقت کی اسمبلی (Soviets) میں ایک اقلیتی گروپ (تہائی کی تعداد) رکھتی تھی۔

مگر لینن نے انتہائی گہری تدبیروں کے ساتھ اولاً حریف پارٹی کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اس کے بعد گہری تدبیروں کے ذریعہ ۷ نومبر ۱۹۱۷ کو ماسکو کی پوری حکومت اپنے قبضہ میں کر لی۔ لینن ابتداءً کمتر پر راضی ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس کا ملک دو بڑی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ افغانی مجاہدین "کمتر" پر راضی ہونے کے لئے تیار نہیں اس لئے مجھے امید نہیں کہ وہ کبھی برتر کو پانے میں کامیاب ہو سکیں گے (EB-16/68)

افغانستان میں اگر آپ افغانی مجاہدین سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین جہاد" ہے۔ اس کے برعکس کابل کے حکمراں طبقہ سے ملیں تو وہ کہیں گے کہ اسلام "دین صلح" ہے۔ بظاہر دونوں اسلام کا لفظ بول رہے ہیں۔ مگر حقیقۃً دونوں کا مقصد ایک ہے۔ اسلام کو اپنی پالیسی کی تائید کے لئے استعمال کرنا۔ افغان مجاہدین کے لئے جہاد کی آیتیں مفید ہیں اس لئے وہ جہاد کی آیتوں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس حکمراں طبقہ کے لئے صلح کی آیتیں مفید مطلب ہیں اس لئے وہ صلح کی آیتوں کی تلاوت کر رہے ہیں۔

آبزرور (Observer) کے نمائندہ مسٹر آرتھر کنٹ (Arthur Kent) نے افغانستان کے اندرونی علاقوں کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں وہ قندھار گئے۔ اپنے مشاہدات کے بعد انھوں نے جو رپورٹ مرتب کی، اس کو ٹائمس آف انڈیا (۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸) نے نقل کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ افغانستان کے سرسبز علاقے اجڑے ہوئے صحرا کا منظر پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ تمام بربادیوں کے باوجود افغانستان کا مستقبل غیر یقینی ہے، کیونکہ مجاہدین سات گروپ میں بٹے ہوئے ہیں۔ افغانستان کے مستقبل کے نقشہ کے بارہ میں ان کے درمیان اتفاق نہیں۔ افغانی مجاہدین کے پاس "پولٹیکل لیڈرشپ" نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے

قندھار کے ملا نقیب اللہ سے گفتگو کی۔ آرتھر کنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کا جواب یہ تھا:

When Najib is gone, we will have a council
so that all Afghans can decide who should lead.

صدر نجیب اللہ کے چلے جانے بعد ہم ایک کونسل بنائیں گے تاکہ تمام افغانی مل کر یہ فیصلہ کریں کہ کون ملک پر حکومت کرے ـــــ جہاں دورِ جدوجہد میں اتحاد نہ ہو، وہاں دورِ اقتدار میں اتحاد اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتا ہے، مگر افغانی لیڈروں کو اس کی خبر نہیں۔

ٹائم (۲۴ اکتوبر ۱۹۸۸) کی تین صفحہ کی باتصویر رپورٹ میں ایک بات یہ بتائی گئی ہے کہ روسیوں کے بیان کے مطابق، ان کے ۳۱۲ فوجی گم ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ روسی فوجی ہیں جن کو مجاہدین نے گرفتار کر لیا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو از خود بھاگ کر آنے والے (Defectors) ہیں۔ ان میں سے کچھ کو ٹائم کے نامہ نگار ٹی اے ڈیوس (T.A. Davis) نے خود سفر کے دوران دیکھا ہے۔ ٹائم کا بیان ہے کہ ان روسی فوجیوں میں سے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا ہے جو مجاہدین کا مذہب ہے اور خود ان کے سابق باپ دادا کا بھی:

Others are converts who have embraced Islam, the religion of their captors and, for many Asian Soviets, of their parents as well (p.12).

روس کا انخلا اگرچہ ابھی افغانستان سے مکمل نہیں ہوا ہے۔ تاہم عملی صورت حال میں اب بنیادی فرق پیدا ہو چکا ہے۔ پہلے افغانی مجاہدین کے تشدد کا نشانہ زیادہ تر روسی فوجیں بنتی تھیں۔ اب ان کے تشدد کا نشانہ خود ان کی اپنی قوم بن رہی ہے۔ پہلے وہ روسیوں کو مارتے تھے، اب وہ "روس حامی افغانیوں" کو مار رہے ہیں۔ مگر اس کو خواہ جو نام بھی دیا جائے، تاہم عملی واقعہ یہی ہے کہ پہلے اگر روس کا خاندان اپنے بیٹوں سے محروم ہو رہا تھا تو اب افغانی خاندان اپنے بیٹوں اور جوانوں سے محروم ہو رہا ہے پہلے اگر روسی ٹینک تباہ ہوتے تھے، تو اب خود افغانیوں کے کھیت اور باغ اور مکان تباہ ہو رہے ہیں۔

دہلی میں جو لوگ پالم کے علاقہ میں یا اس کے قریب رہتے ہیں، ان کے لئے سر پر گھڑ گھڑاتے ہوئے ہوائی جہازوں کی آوازیں روزانہ کا معمول ہیں۔ کابل میں پورے شہر کا یہی حال ہے۔ ہوائی اڈہ پر اترنے کے بعد سے لے کر پورے زمانہ قیام تک رات دن یہ حال تھا کہ فضا میں ہوائی جہاز اڑتے

ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم دہلی اور کابل میں ایک فرق ہے۔ دہلی کی فضا میں اڑنے والے جہاز مسافر جہاز ہوتے ہیں اور کابل کی فضا میں اڑنے والے جہاز جنگی جہاز۔ ایک افغانی سے میں نے اس کا ذکر کیا تو اس نے مسکرا کر کہا:

You know, we are at war.

مجھے یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ لوگ جن کو باہر کی دنیا میں "مجاہدین" کہا جاتا ہے، ان کو افغانستان کے لوگ کیا کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے ایک نوجوان (۲۴ سال) کو لیا۔ ان سے میں نے ایسے موقع پر گفتگو کی جب کہ وہاں کوئی ہماری گفت گو کو سننے والا موجود نہ تھا۔ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ یہاں ان کو مجاہدین تو کوئی نہیں کہتا۔ البتہ یہاں کے لوگوں میں ان کے لئے عام طور پر تین الفاظ رائج ہیں:

اپوزیشن، افراطیون، اشرار

روس۔ افغانستان جنگ پر ایک معلوماتی فلم بنائی گئی ہے۔ یہ فلم ۴ اکتوبر ۱۹۸۸ کو بی بی سی ٹیلیویژن پر دکھائی گئی۔ اس فلم میں افغانی فوجیوں کے مکالمات ہیں۔ اسی کے ساتھ اس میں روسی فوجیوں کے تاثرات بھی ان کی اپنی زبان میں دکھائے گئے ہیں۔ اس کے مطابق، ایک روسی جنرل نے کہا کہ مستقبل میں اگر کبھی سوویت یونین کو کوئی بین اقوامی مسئلہ طاقت کے ذریعہ حل کرنا پڑا تو وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سو بار اس پر غور کرے گا۔

روسی جنرل نے مزید کہا کہ پچھلے دس سال کی اس جنگ میں بے شمار افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ روس کے ایک اور فوجی افسر نے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ جنگ خالصتہً ایک سیاسی غلطی تھی، اور اس غلطی کے تمام تر ذمہ دار سابق روسی وزیر اعظم لیونڈ برژنیف ہیں ـــــــ برژنیف اگر زندہ ہوتے تو اس سنگین حقیقت کا انکشاف نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام بڑی بڑی سیاسی غلطیاں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب کہ ان کا ارتکاب کرنے والے لیڈر مر جائیں یا وہ اقتدار کی کرسی سے ہٹ چکے ہوں۔

روانگی سے پہلے دہلی میں مجھے سرینگر کا ایک ہفتہ وار اخبار (۷ اکتوبر ۱۹۸۸) ملا۔ اس میں افغانستان سے متعلق ایک مضمون تھا۔ نصف صفحہ میں اصل مضمون تھا۔ اور بقیہ نصف میں حسب ذیل سرخی جلی حرفوں میں درج تھی:

"اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے افغان مجاہدین کی جد و جہد فیصلہ کن مرحلہ میں"

اس میں افغان نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر میں کچھ افغانی نوجوان ایک تختی لٹکائے ہوئے تھے جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا ــــــ قرآن زندہ باد (Long live Qur'an)

خدا کو عرب میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کے لئے ڈھائی ہزار سالہ منصوبہ بنانا پڑا۔ مگر موجودہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے تمام اصاغر و اکابر ڈھائی دن سے بھی کم عرصہ میں اسلامی حکومت کا قلعہ کھڑا کرنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ موجودہ مسلمان سیاست کے معاملہ میں اس قدر مضحکہ خیز حد تک جذباتی کیوں ہیں۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ موجودہ لیڈروں نے تقریباً بلا استثناء یہ کیا کہ مسلمانوں کو دوبارہ اٹھانے کے لئے ایک یا دوسری شکل میں سیاسی لوریاں سنائیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی حساسیت سیاست کے معاملہ میں ضرورت سے زیادہ جاگ اٹھی۔ ۱۹۱۲ میں جب مصطفیٰ کمال اتاترک یونانی فوجیوں کو پسپا کرکے وقتی طور پر سمرنا میں داخل ہوگئے تو برصغیر ہند میں "سمرنا بہار" آگئی۔ اشعار اور مضامین اور تقریروں کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس کا خلاصہ ایک شعر میں یہ ہے:

وہ پہنچا پرچم اسلام پھر ارض سمرنا میں

مگر سمرنا کی فتح کو فتح اسلام سمجھنا جتنا بے معنی تھا، افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کو فتح اسلام سمجھنا بھی اتنا ہی بے بنیاد ہے۔ مگر اقتدار کے لئے مسلمانوں کی جوشں تمنا اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ہر لکڑی پر فتح اسلام کا جھنڈا باندھ دینا چاہتے ہیں، خواہ اگلے لمحہ حالات کا طوفان اس جھنڈے کو گرا کر گہری خندق میں کیوں نہ ڈال دے۔

ایک صاحب سے موجودہ زمانہ میں مختلف قوموں کے باہمی جھگڑوں کا ذکر ہوا۔ میں نے کہا کہ یہ جھگڑے زیادہ تر سیاسی جھگڑے کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان "پختون" علاقہ کے لئے جھگڑا۔ ایران اور عراق کے درمیان شط العرب کے لئے جھگڑا۔ پاکستان اور ہندستان کے درمیان کشمیر کے لئے جھگڑا۔ وغیرہ۔ کوئی قوم اس کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس کو بروقت جو کچھ حاصل ہے اس پر قانع ہو کر اپنی تعمیر کا کام کرے۔ ہر قوم اس چیز کے لئے لڑ رہی ہے جو اس کو حاصل نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ غیر حاصل شدہ کے پیچھے دوڑنے میں حاصل شدہ بھی برباد ہو رہا ہے۔

ایک صاحب اخوانی مزاج کے تھے۔ انھوں نے انقلابی اسلام والی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا کہ

موجودہ زمانہ میں تمام مسلم ممالک کا یہ حال ہے کہ وہاں کا حکمراں طبقہ ایک یا دوسری مغربی طاقت کا ایجنٹ بنا ہوا ہے۔ ان مسلم حکمرانوں سے لڑکر جب تک ان کا خاتمہ نہ کیا جائے، اسلام کو قائم اور غالب نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے کہا کہ یہ مسئلہ اسلام کا نہیں، بلکہ آپ کی مفروضہ تفسیر اسلام کا ہے۔ آپ لوگوں نے خودساختہ تفسیر کی بنا پر یہ سمجھ لیا ہے کہ اسلامی دعوت کا اصل کام اسلام کو ایک قانونی نظام کی حیثیت سے نافذ کرنا ہے، اور چوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم حکمراں اس قسم کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اس لئے پہلا کام یہ ہے کہ ان سے لڑکر نفاذ اسلام کی راہ ہموار کی جائے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں حکومت پیش کی گئی مگر آپ نے اس کو قبول نہیں فرمایا۔ اگر اصل مقصد اقتدار ہوتا تو آپ فوراً اس کو قبول کر لیتے اور اس کے بعد ڈنڈے کے زور پر اسلامی قانون نافذ فرماتے، جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض نام نہاد مجاہدین اسلام کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی دعوت کا نشانہ اصلاح قلب ہے نہ کہ اصلاح سیاست۔ سیاست کی اصلاح بطور نتیجہ پیدا ہوتی ہے نہ کہ وہی دعوت کا اصل نشانہ ہے۔

مزید میں نے کہا کہ قرآن میں ایک طرف کہا گیا ہے کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم اور دوسری طرف ارشاد ہوا ہے کہ ولا ینازعنك فی الامر وادع الی ربك اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت کی حکمت یہ ہے کہ اس کو کلمۂ سواء سے شروع کیا جائے نہ کہ کلمۂ نزاع سے۔ موجودہ زمانہ کے مدعیان دعوت نے اپنا کام کلمۂ نزاع سے شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار بربادی کے باوجود انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (حال مقیم واشنگٹن) نے ۱۹۶۲ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ لندن میں تھے۔ لندن یونیورسٹی میں ان کی ملاقات ڈاکٹر پدما سرا سے ہوئی۔ وہ ایک ہندستانی خاتون تھیں۔ جو اس وقت لندن یونیورسٹی میں تھیں۔ گفتگو کے دوران ڈاکٹر پدما سرا نے ایک واقعہ بتایا۔

انھوں نے کہا کہ وہ بنارس اور لکھنؤ کے درمیان سفر کر رہی تھیں۔ ان کے ڈبہ میں لکھنؤ کی ایک مسلمان عورت بھی تھی جو ایک سیٹ پر اپنی گٹھری رکھے ہوئے بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کپڑے بتا رہے تھے کہ وہ کسی معمولی گھر کی ہے۔ غالباً وہ سبزی فروش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس دوران میں وہ ایک بار باتھ روم گئی۔

اس کی غیر موجودگی میں ایک کھڑے ہوئے مسافر نے اس کی گٹھری ہٹادی اور جگہ بنا کر وہاں بیٹھ گیا۔ مذکورہ عورت جب باہر واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی گٹھری ہٹی ہوئی ہے اور وہاں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سخت برہم ہوگئی۔ اس نے غصہ میں کہا:

نہ رہی نوابی، ورنہ تم کو زندہ دیوار میں چُنوا دیتی

یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر سعید صاحب نے کہا کہ مسلمانوں سے حکومت چلی گئی، مگر ان کا حاکمانہ مزاج اب تک ان سے نہیں گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ آج جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ سب ان کے اسی مزاج کی قیمت ہے۔ کوئی نعمت آدمی کو ملے تو آدمی کو اس پر شکر کرنا چاہئے، اور جب وہ چھن جائے تو صبر۔ مگر مسلمانوں نے نہ پہلے شکر کیا اور نہ اب وہ صبر کرنے پر راضی ہیں۔

کھانے کی میز پر ایک بار چھ آدمی تھے۔ ان میں سے پانچ عرب تھے۔ صرف میں غیر عرب تھا۔ ایک مصری تھے جو مسلسل بول رہے تھے۔ دوسرے لوگ متکلم کے بجائے زیادہ تر سامع بنے رہے۔ مصری صاحب مجلسی انداز کی باتیں کر رہے تھے، اور طرح طرح کے لطیفے بیان کر رہے تھے۔ اس اثنا میں انھوں نے اس عربی مقولہ کو دہرایا: خیر الکلام ما قل ودل (بہترین کلام وہ ہے جو مختصر ہو اور مدلل ہو) اس مختصر مقولہ پر بھی انھوں نے ایک "مفصل" تقریر کر ڈالی۔

مصری کا مذکورہ مقولہ کو نقل کرنا مقولہ برائے مقولہ تھا۔ کیونکہ ان کا اپنا کلام سراسر اس سے مختلف تھا۔ یہی حال دین کے معاملہ میں بھی اکثر لوگوں کا ہے۔ وہ دین کے موضوع پر تقریر کرتے ہیں۔ مگر یہ سارا معاملہ تقریر برائے تقریر ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی مجلسی آدمی طرح طرح کی باتیں کرے، حالانکہ ان میں سے کسی بات پر بھی اس کا ایمان نہ ہو۔

یہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو ایک یورپی ملک سے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامیات سے ایم اے کیا ہے۔ وہ مجھ سے واقف نہ تھے۔ حتی کہ انھوں نے میرا نام بھی نہیں سنا تھا، ان سے ایک اسلامی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ میں نے ان کے نقطہ نظر سے مختلف نقطۂ نظر پیش کیا اور اس کے حق میں قرآن و حدیث سے دلیلیں دیں۔ میری بات سے ان پر استعجاب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تاہم وہ اپنی زبان سے یہ نہ کہہ سکے کہ آپ کا نقطۂ نظر درست ہے۔ انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی: مگر فلاں فلاں مشہور لوگوں نے تو

ایسا نہیں کہا۔

بیشتر لوگ کسی بات کو اس لئے مانتے ہیں کہ ان کی مسلمہ شخصیت نے ایسا کہا ہے نہ کہ دلیل سے اس طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے اندر سچائی کبھی ذہنی انقلاب بن کر داخل نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن ہمیشہ شخصیتوں کی عظمت میں گم رہتا ہے، وہ حقائق کی عظمت میں گم ہونے کا کبھی تجربہ نہیں کرتا۔

ڈاکٹر اسکندر احمد چودھری بنگلہ دیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ آجکل وہ ٹوکیو (جاپان) میں مقیم ہیں۔ وہاں وہ ریڈیو میں بنگالی اناؤنسر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اسلامک کلچر سوسائٹی جاپان کے ڈائرکٹر ہیں۔

ڈاکٹر چودھری سے جاپان کے بارہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں نے جاپان پر ۱۹۶۷ سے لکھنا شروع کیا جب کہ ہندستان میں جاپان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ جواہر لال نہرو اس کو اپنی ناوابستگی کی پالیسی کے خلاف سمجھتے تھے کہ وہ جاپان سے تعلق قائم کریں۔ پچھلے ۲۵ سال میں میں نے جاپان پر اتنے زیادہ مضامین لکھے ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک پوری کتاب بن جائے۔ میں نے کہا کہ جاپان سے میری دلچسپی کا سبب ہے "حدیبیہ" کی پالیسی جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے میدان میں عالی شان طور پر استعمال فرمایا تھا، اس کو تاریخ میں دوسری بار جاپان نے سیکولر میدان میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر چودھری سے میں نے کہا کہ اس پالیسی کو جاپانیوں نے عمل معکوس (Reverse course) کا نام دیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کے لئے جاپانی لفظ گیاکوتن (Gyakuten) ہے۔ ڈاکٹر چودھری سے گفتگو کے دوران میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جاپانیوں کی خاص صفت جس کی بنا پر انھوں نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے، وہ، ایک لفظ میں، حکم کی تابعداری (Submission to authority) کا مزاج ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کسی بڑی ترقی کے لئے یہ سب سے اہم صفت ہے۔ جاپانیوں میں یہ صفت آخری حد تک پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے افسر یا حاکم کی بات کو فوراً ماننے پر راضی ہو جاتے ہیں، خواہ وہ انھیں صحیح نظر آئے یا غلط۔ یہ صفت صحابۂ کرام میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں یہ صفت انتہائی حد تک مفقود ہے۔

اور بلاشبہ ان کی موجودہ بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

میں نے ان سے مزید پوچھا کہ جاپان نے موجودہ زمانہ میں جو ترقی کی ہے اس کو اقتصادی معجزہ کہا جاتا ہے۔ اس معجزہ کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مگر جاپانی اس کو معجزہ نہیں کہتے۔ وہ اس کو سخت محنت (Hard work) کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل درست ہے۔ اگر اس کو معجزہ کہا جائے تب بھی اس کا اصل راز ہارڈ ورک ہی ہے نہ کہ کوئی پراسرار چیز۔

ایک پاکستانی پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ وہ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں اور امریکہ کی یونیورسٹی میں استاد ہیں۔ وہ تقریباً ۲۰ سال سے امریکہ میں رہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ امریکہ میں زندگی بہت پرسکون ہے۔ مگر وہاں کا سب سے بڑا مسئلہ وہ ہے جو ہماری نسلوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ہمارے بچے وہاں کے ماحول سے اتنا زیادہ متاثر ہو رہے ہیں کہ اس بات کا شدید اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ ہماری تیسری نسل مسلمان بھی باقی رہے گی یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے جیسے لوگ برابر اپنے وطن واپس جانے کو سوچتے رہتے ہیں، مگر اب وطن کا ماحول بھی اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔

میں نے کہا کہ امریکہ کا مسئلہ اگر غیر اسلام ہے تو پاکستان میں کچھ لوگوں کی نادانی سے خود اسلام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ میری یہ بات انھیں عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ کچھ لوگ اس کو زبردستی اسلامائز کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہاں اسلام تو نہیں آیا، البتہ لوگ اسلام سے متوحش ہوگئے۔ ایک نوجوان اگر جاہل رہ جائے اور جلد تعلیم یافتہ بنانے کے شوق میں آپ اس کو مار مار کر پڑھانا شروع کر دیں تو وہ تعلیم یافتہ تو نہیں بنے گا، البتہ تعلیم سے متنفر ہو جائے گا۔ یہی صورت پاکستان کے ساتھ پیش آئی ہے۔

میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدت کے ساتھ یہ ہدایت دی تھی کہ میرے بعد مسلم حکمرانوں سے نہ لڑنا، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ تم دیکھو کہ ان میں بگاڑ آگیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا مقصود کوششوں کو روکنا نہیں بلکہ کوششوں کو ڈائورٹ (divert) کرنا تھا۔ یہی کام کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے۔ اور اسلام کی تاریخ میں اس کی انتہائی روشن مثال محدثین کا طبقہ ہے۔ محدثین کے زمانہ میں حکمرانوں میں بہت بگاڑ آچکا تھا، مگر انھوں نے حکمرانوں سے ٹکرانے کے بجائے اپنے آپ کو حدیث کی خدمت میں لگا دیا۔ اس کے نتیجہ میں حدیث کی جمع و تدوین کا وہ عظیم الشان کام انجام پایا جس کی

اہمیت قیامت تک ختم ہونے والی نہیں۔

پھر میں نے کہا کہ سوسائٹی سے سسٹم بنتا ہے سسٹم سے سوسائٹی نہیں بنتی۔ پاکستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کی سوسائٹی اسلام کے نظام قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسی حالت میں پہلا کام یہ ہے کہ سوسائٹی کے اندر اس کی استعداد پیدا کی جائے۔ یہ کام صرف تذکیر ونصیحت کے ذریعہ انجام پاتا ہے نہ کہ کوڑا مارنے اور سزائیں جاری کرنے سے۔ یہ گفتگو ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۸ کو ہوئی۔

ہم لوگ ہوٹل کی لابی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک نیچی میز تھی جس کے اوپر لکڑی کے تختہ کے بجائے سفید مائل سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ یہ سنگ مرمر افغانستان کی خاص چیز ہے۔ اور جب لاہور میں اقبال کا مقبرہ بن رہا تھا تو اس وقت کے افغانی حکمراں نے اس میں لگانے کے لئے افغانی سنگ مرمر بطور ہدیہ روانہ کیا تھا۔

ایک صاحب اقبال کے فارسی کلام سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کو حوصلہ دیا۔ اگر اقبال نہ ہوتے تو موجودہ مسلمان بے حوصلہ ہو کر رہ جاتے۔ میں نے کہا کہ اقبال نے شاعرانہ ترنم تو قوم کو ضرور دیا۔ مگر جہاں تک حوصلہ کا تعلق ہے، ان کے کلام نے برعکس کام کیا ہے۔ میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے سلطان ٹیپو کے بارہ میں کہا کہ وہ ہماری ترکش کا آخری تیر تھا:

ترکش مارا خدنگ آخریں

اس شعر کی روشنی میں دیکھئے تو سلطان ٹیپو کی شکست (بالفاظ دیگر، مسلمانوں کی عسکری قوت کی بربادی) کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے پاس گویا کچھ نہیں رہا۔ یہ تصور کتنی زبردست پست حوصلگی پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ کے خیال میں اقبال کو کیا کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ اقبال کو کہنا چاہئے تھا کہ ٹیپو کی عسکری طاقت ختم ہوگئی تو غم کی بات نہیں۔ اسلام کی دعوتی طاقت زندہ ہے۔ تم اسلامی دعوت کو لے کر اٹھو۔ اور اس کے ذریعہ سے دنیا کو مسخر کرو۔ اقبال اگر یہ بات کہتے تو اس سے مسلمانوں کو رہنمائی ملتی۔ مگر ٹیپو کو "آخری تیر" کہہ کر انھوں نے مسلمانوں کو بے حوصلگی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ ان کی تعلیم پاکستان کے ایک دار العلوم میں ہوئی ہے اور اچھی اردو جانتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں الرسالہ برابر پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے پاکستان کے ایک واقف کار کے ذریعہ

مل جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ صاحب پورے رسالہ کی فوٹو کاپی کر کے مجھے روانہ کر دیتے ہیں۔

انھوں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اکتوبر ۱۹۸۸ کے الرسالہ میں زمین سے محروم (صفحہ ۳) کے عنوان سے جنرل ضیاء الحق مرحوم پر جو مضمون ہے وہ لاجواب ہے۔ انھوں نے کہا کہ جنرل ضیاء کی موت پر مسلم دنیا کے تقریباً ہر اخبار اور ہر رسالہ نے مضامین شائع کئے ہیں اور ہر رہنما نے اپنے بیانات دئے ہیں، مگر آپ کا مضمون ان سب میں منفرد تھا۔ دوسرے لوگوں نے عام طور پر صرف ضیاء کی تعریف کی ہے۔ ان کو ہیرو بنایا ہے۔ مگر آپ نے اس سے سبق کا پہلو نکالا ہے۔ اور مومن کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ہر واقعہ اور ہر حادثہ سے عبرت اور نصیحت لے سکے۔

انھوں نے کہا کہ امت پر اس قسم کا سب سے بڑا واقعہ وہ تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اس وقت صحابہ کرام نے ایسا نہیں کیا کہ ہر ایک آپ کی شان میں تعریفی تقریر کرنے لگے اور آپ کو "شہید" یا اسلامی ہیرو ثابت کرنے میں تمام الفاظ صرف کر ڈالے۔ اس کے برعکس انھوں نے اس واقعہ سے موت اور آخرت کی یاد حاصل کی۔ حضرت ابوبکر تشریف لائے اور آپ کی میت کو دیکھا تو قرآن کی یہ آیت پڑھی: كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام۔ اسی طرح حضرت عباس نے فرمایا: والله الذی لا اله الا هو لقد ذاق رسول الله صلی الله عليه وسلم الموت۔

مذکورہ عالم نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں الرسالہ سنت رسول اللہ کو زندہ کر رہا ہے۔ لوگوں کو قومی دین سے نکال کر خداوندی دین پر لا رہا ہے۔ اس وقت اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔

کمرہ کی جو میز تھی، اس کے سامنے ملا ہوا بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ میں بیٹھ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس دوران آئینہ کی طرف نظر گئی تو دکھائی دیا کہ قلم میرے بائیں ہاتھ میں ہے، حالانکہ میں اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ اسی طرح گھڑی دائیں ہاتھ میں دکھائی دی، حالانکہ وہ میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔

ایسا اس لئے تھا کہ آئینہ میں آدمی کی تصویر الٹ جاتی ہے۔ یعنی دایاں رخ بائیں طرف اور بایاں رخ دائیں طرف ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو خارجی دنیا کو اپنے فٹ کئے ہوئے شیشہ میں دیکھیں۔ ان کے اپنے مشاہدہ میں ہر چیز الٹی ہوگی اور وہ ان کو الٹی صورت میں بیان کریں گے۔ بظاہر وہ اپنے بیان میں مخلص ہوں گے۔ مگر مخلص ہونے کا لازمی مطلب یہ نہیں

ہے کہ آدمی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ واقعہ کے اعتبار سے بھی صحیح ہے۔ ایک چیز باعتبار مشاہدہ کچھ اور ہوتی ہے اور باعتبار واقعہ کچھ اور۔

فجر کی اذان کی آواز آئی۔ گھڑی دیکھی تو ہندستانی وقت کے لحاظ سے گھڑی میں چھ بج رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ دہلی میں آجکل فجر کی اذان تقریباً پانچ بجے ہوتی ہے۔ افغانستان کا وقت، ہندستان کے مقابلہ میں ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندستان "آگے" ہے اور افغانستان اس سے "پیچھے" یہ صرف ایک جغرافی تقسیم کا معاملہ ہے نہ کہ سابق اور مسبوق کا معاملہ۔

نماز میں امام کو آگے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ امام کی شخصیت برتر ہے اور دوسرے نمازیوں کی کم تر۔ یہ قیام جماعت کے لئے ایک انتظامی تقسیم ہے۔ کبھی فرق باعتبار جوہر ہوتا ہے اور کبھی فرق باعتبار انتظام۔ جو لوگ جوہری تقسیم اور انتظامی تقسیم کے اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ ایک عظیم الشان غلطی کرتے ہیں۔ جس فرق کو اللہ تعالیٰ نے برائے انتظام رکھا تھا، اس کو افضلیت اور غیر افضلیت کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر دین میں زبردست خرابی پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔

۲۵ اکتوبر کو میں نے واپسی کا پروگرام بنایا تھا۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے پیغام ملا کہ ۲۵ اکتوبر کی شام کو ڈاکٹر نجیب اللہ (پریسیڈنٹ افغانستان) شرکاء کانفرنس سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کا نام لے کر خاص طور پر انھوں نے کہا کہ ان سے ملنا بھی ضروری ہے۔ یہ ملاقات یہاں کے صدارتی محل میں ہونے والی تھی۔ میں نے عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں ۲۵ اکتوبر کی فلائٹ چھوڑ دوں تو اس کے بعد اگلی فلائٹ مجھے ۲۷ اکتوبر کو ملے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ عذر پریسیڈنٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی فکر نہ کیجئے ۲۶ اکتوبر کو انھیں اسپیشل فلائٹ کے ذریعہ دہلی پہنچا دیا جائے گا۔ مگر اپنے ضروری پروگرام کے تحت میرے لئے مزید ٹھہرنے کا موقع نہ تھا، چنانچہ میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۸ کو دہلی واپس آگیا۔

۲۵ اکتوبر کو مجھے انڈین ایئر لائنز سے واپس آنا تھا۔ مگر اس روز کی فلائٹ سے ہماری سیٹ کنفرم نہ تھی۔ میں اور میرے ساتھی دونوں ویٹنگ لسٹ پر تھے۔ ایئر پورٹ پہنچے تو کاؤنٹر پر بتایا گیا کہ تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب اس جہاز سے سفر کی کوئی گنجائش نہیں۔

اتنے میں انڈین ایئر لائنز کے منیجر کسی وجہ سے وی آئی پی لاؤنج میں آگئے جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے

تھے۔ میں فوراً ان سے ملا اور کہا کہ کل مجھے روم جانا ہے، اس لئے آج میرا دہلی پہنچنا ضروری ہے۔ اگر آپ اس جہاز سے ہمیں بھیج دیں تو آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اچھا، میں تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے آفس میں چلے گئے۔ چند منٹ بعد ایک کلرک آیا۔ اس نے ہم دونوں آدمیوں کا ٹکٹ اور پاسپورٹ مانگا۔ تھوڑی دیر کے بعد مذکورہ کلرک دوبارہ آیا اور ٹکٹ اور پاسپورٹ کے ساتھ ہمارا بورڈنگ کارڈ بھی ہمارے حوالہ کردیا۔

انڈین ایئرلائنز کے منیجر جنھوں نے بالکل آخر وقت میں ہمارا یہ کام کیا ان کا نام مسٹر اودے کمار شرما تھا۔ اس کے بعد جب میں ہوائی جہاز میں داخل ہوکر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو میرا دل کہہ رہا تھا ــــــ اگر آدمی اپنے کیس کو جینوئن کیس ثابت کر سکے تو ہر شخص اس کا تعاون کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، خواہ اس کے نام اودے کمار شرما ہو یا محمد اسلام الدین۔

ایک سفر

صنعاء (یمن) جنوبی عرب کا ایک تاریخی شہر ہے جو دنیا کی قدیم ترین آبادیوں میں شمار ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں، وہ اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک قابل دید شہر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک عرب شاعر کا شعر ہے کہ صنعاء ضرور جانا چاہیے، خواہ اس کے لیے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے:

لابُدّ من صنعاء وان طال السفر

صنعاء میں ۲۹ اکتوبر — ۲ نومبر ۱۹۸۸ کو ایک بین اقوامی اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا اہتمام یمن کی وزارت اوقاف نے کیا تھا۔ کانفرنس کی دعوت پر اس میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ ذیل میں اس سفر کی روداد درج کی جاتی ہے۔

بیرونی سفر میں سب سے پہلا مرحلہ ویزا کا ہوتا ہے۔ میرے پاسپورٹ پر یمن کا ویزا لگ کر آیا تو معلوم ہوا کہ صفحات کے اعتبار سے یہ اس کا آخری ویزا تھا۔ اب اس پاسپورٹ میں مزید اندراج کی گنجائش نہیں۔ گویا باعتبار ضخامت وہ اکتوبر ۱۹۸۸ میں ختم ہو گیا، جب کہ باعتبار مدت اس کی تاریخ فروری ۱۹۸۹ تک باقی تھی۔ اسی طرح زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے حوصلے زیادہ ہوتے ہیں، مگر وسائل اس کی نسبت سے کم ہوتے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ وسائل کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے لیے زندگی کا راستہ نکالے۔ پاسپورٹ کی تاریخ زیادہ ہو تب بھی وہ اس وقت سفر کے لیے بیکار ہے جب کہ اس کے صفحات کی مقدار ختم ہو گئی ہو۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸ کی شام کو ۸ بجے گھر سے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک تجربہ گزرا۔ اس کے بعد آجکل کے معاشرہ کے بارہ میں سوچتے ہوئے میری زبان سے نکلا: آہ، کوئی آدمی آدمی نہیں، ہر آدمی غیر آدمی ہے۔ ایرپورٹ پہونچ کر اندر داخل ہوا تو ایرپورٹ کے عملہ کے دو آدمی اپنے افسر کے کسی حکم کے بارہ میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "پھر کیا پرابلم ہے" دوسرا شخص بولا: "پرابلم کیا ہے، جو افسر کہے گا وہی کرنا ہوگا"

میں نے سوچا کہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ اس کو افسر کے کہے پر چلنا ہے۔ مگر انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اس کو خدا کے کہے پر چلنا ہے۔ آج کا انسان خدا کی ماتحتی قبول کرنے کے

لیے تیار نہیں ۔ حتی کہ وہ لوگ بھی نہیں جو خدا کا جھنڈا اٹھانے ہی کو اپنا مشغلہ حیات بنائے ہوئے ہیں ۔ افسر کے معاملہ میں انسان کا حال یہ ہے کہ "پرابلم" ہو تب بھی وہ اس کی اطاعت کرتا ہے مگر خدا کے معاملہ میں صورت حال اس کے برعکس ہے ——— اگر پرابلم نہ ہو تو وہ خدا کے حکم کو مانے گا ۔ اور اگر پرابلم پیش آجائے تو وہ خدا کے حکم کو ماننے سے انکار کر دے گا ۔

دہلی سے کراچی تک کا سفر پی آئی اے کی فلائٹ ۲۷۲ کے ذریعہ ہوا ۔ جہاز کے کیپٹن ضیاء الاسلام تھے ۔ پی آئی اے کے جہاز کی صفائی اور اس کا انتظامی معیار انڈین ایرلائنز سے بہتر نظر آیا ۔ پی آئی اے کے میگزین (ہم سفر) کے سرورق پر عالمی معیار کے مطابق (Your personal copy) لکھا ہوا تھا ۔ جب کہ انڈین ایرلائنز کے میگزین نمسکار پر اس قسم کا اندراج نہیں ہوتا ۔ البتہ ایک چیز دونوں میں مشترک تھی ۔ نمسکار میں انگریزی کے ساتھ ہندی مضامین کا حصہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح ہم سفر میں انگریزی کے ساتھ اردو کا ۔ مگر دونوں میں انگریزی زبان کا حصہ زیادہ تھا اور اپنی قومی زبان کا حصہ اس کے مقابلہ میں کم ۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی برتری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ۔ مگر عین اسی وقت وہ بیرونی تہذیب کی برتری کو فخر کے ساتھ قبول کیے ہوئے ہیں ۔

جہاز اپنے ٹھیک وقت پر ۱۰ بج کر ۳۰ منٹ پر روانہ ہوا ۔ تاہم اس کی بیشتر سیٹیں خالی تھیں ۔ اس قسم کے مسافر جہازوں کو تجارتی پرواز (کمرشیل فلائٹ) کہا جاتا ہے ۔ مگر دنیا بھر میں اڑنے والے جہازوں کی بہت بڑی تعداد عملاً نان کمرشیل فلائٹ ہوتی ہے ۔ یہ دراصل ان پروازوں کا بالواسطہ فائدہ ہے جس کی وجہ سے انھیں جاری رکھا گیا ہے ۔ اس دنیا میں اکثر کسی کام کو اس کے بالواسطہ فائدے کی خاطر کرنا پڑتا ہے ، خواہ بظاہر اس سے کوئی براہ راست فائدہ حاصل نہ ہو رہا ہو ۔

کراچی سے صنعار کا سفر یمن ایرلائنز کی فلائٹ ۷۵۵ کے ذریعہ ہوا ۔ راستہ میں خلیج ٹائمز (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸) پڑھنے کا موقع ملا ۔ یہ انگریزی روزنامہ دوبئی سے نکلتا ہے ۔ اس میں ایک ہندستانی مسلمان (مقیم راس الخیمہ) کا مضمون تھا ۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہندستانی مسلمانوں کا مسئلہ قیادت کے فقدان (Lack of leadership) کا مسئلہ ہے ۔

مگر میرے نزدیک یہ ادھوری بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ مخصوص اسباب کی بنا پر ہندستان کے مسلمانوں کی نفسیات کچھ اس طرح کی ہوگئی ہے کہ لفظی جوشش دکھانے والے سطحی لیڈروں کی باتیں ہی ان کو اپیل کرتی ہیں جو مسلمانوں کو بربادی کے سوا کہیں اور نہ لے جاسکیں۔ اس کے مقابلہ میں جو رہنما سنجیدہ اور تعمیری بات کریں وہ مسلم عوام کے درمیان مقبولیت حاصل نہیں کرتے مسلمانوں کی یہی بے شعوری ان کا اصل مسئلہ ہے، ہندستان میں بھی اور دوسرے ملکوں میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ فقدانِ شعور ہے نہ کہ فقدانِ قیادت۔

کراچی سے یمن کے سفر میں جہاز کے اندر ایک عرب مسافر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ کویت کا عربی اخبار الانباء (۱۹ اکتوبر ۱۹۸۸) تھا۔ اس کے آخری صفحہ پر خالد قطمہ کے قلم سے ایک دلچسپ مضمون درج تھا جس کا عنوان تھا وَلَوْ (اور اگر)۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ عرب ممالک کے ہوائی اڈوں پر "مخدرات" سے بھی زیادہ جس چیز کی جانچ ہوتی ہے اور جس کو عرب امن اور مفاد امت کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہتھیار (اخطر سلاح) سمجھا جاتا ہے وہ "کتاب" ہے۔ اگر آپ کسی ہوائی اڈہ سے گزریں تو جانچ والا آدمی آپ کے حقیبہ کو کھولے گا اور اس کو ٹٹول کر دیکھے گا۔ اگر وہ اس میں کوئی کتاب پا گیا تو وہ اس کو اس طرح لے گا جیسے کہ اس نے کوئی ٹائم بم دیکھ لیا ہو (کأنّہ شاھد قنبلۃ موقوتۃ) اس کے بعد آپ نہایت بے چارگی کے ساتھ اس کے فیصلہ کا انتظار کریں گے کہ وہ آپ کی کتاب کو ممنوع الدخول قرار دیتا ہے یا آپ اور آپ کی کتاب دونوں کو۔

مضمون نگار نے اپنا بخار نظام (حکومت) پر اتارا تھا۔ مگر میرے نزدیک اس کی ساری ذمہ داری ان نام نہاد مسلم مفکرین پر ہے جنھوں نے اسلام کی سیاسی تفسیر کرکے اسلامی دعوت کو سیاسی انقلاب کے ہم معنی بنادیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں کے حکمراں اب "اسلامی دعوت" کا نام لینے والوں کو سیاسی اپوزیشن کے طور پر دیکھتے ہیں اور خطرہ سمجھ کر فوراً انھیں دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلم مفکرین کی اس خود ساختہ تشریح نے اب مسلم ملکوں میں اسلام کا کام کرنے کو بڑی حد تک ناممکن بنادیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اگر غیر سیاسی اسلام پیش کرتے جس کی ایک مثال تبلیغی جماعت کی صورت میں نظر آتی ہے تو مسلم داعی کو مسلم ملکوں میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا اور کام کے تمام

بہترین مواقع اسس کو حاصل رہتے ۔ مگران کے "سیاسی اسلام" نے خود اپنی ہی دنیا کو اسلام کے لیے ایک قسم کا قیدخانہ بنا دیا ہے ۔

صنعاء (یمن) کے ہوائی اڈہ پر اترا تو ۱۳ اکتوبر کا سورج نکل رہا تھا۔ یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ کاؤنٹر پر ضروری اندراجات کرانے کے بعد میں عام گیٹ سے باہر آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کانفرنس کا کوئی آدمی میری رہنمائی کرنے اور ساتھ لے جانے کے لیے موجود نہیں ہے ۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں پولیس (شُرطہ) کے دفتر میں گیا۔ صنعاء کے روزنامہ الشورة (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول پر مذکورہ کانفرنس کے افتتاح (۲۹ اکتوبر) کی روداد نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی۔ یہ افتتاح یہاں کے صدر (رئیس) علی عبداللہ الصالح نے کیا تھا۔ اس اخبار کو میں نے پولیس افسر کو دکھایا اور کہا کہ میں اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوں۔ مگر یہاں کوئی شخص مجھے ریسیو کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک صاحب مجھے تلاش کرتے ہوئے پولیس کے دفتر میں آ گیے ۔

یہ عبدالرحمٰن اسماعیل الشیبی (مدیر الحج والمؤتمرات) تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم گاڑی لے کر وی آئی پی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں ۔ چنانچہ ان کے ساتھ روانہ ہو کر مذکورہ مقام پر پہنچا۔ اور ان کے ساتھ ہوٹل تک آیا۔

اس واقعہ کے بعد دل بھر آیا۔ دنیا کے اس تجربہ سے میرا ذہن آخرت کی طرف مڑ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا : کیسا عجیب ہوگا اگر آخرت میں ایسا ہو کہ میں اپنے احساسِ عجز اور احساس تقصیر کے تحت عام دروازہ سے گردن جھکا کر نکل رہا ہوں۔ اس وقت فرشتے میرے پاس آئیں اور کہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ——— میرے بندے کو ادھر لے آؤ اور اس کو خاص دروازہ سے نکالو ، ہم نے یہاں اس کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا ہے ۔

صنعاء میں میرا قیام شیراٹن ہوٹل (کمرہ ۳۳۰) میں تھا۔ یہ ہوٹل پہاڑی سے متصل ہے۔ اس میں ایک نئی چیز یہ دیکھی کہ عام ہوٹلوں میں ریسپشن گراؤنڈ فلور پر ہوتا ہے ۔ مگر اس ہوٹل میں ریسپشن چھٹی منزل پر تھا۔ اس کی نیچے کی منزلیں ایک طرف پہاڑ سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ چھٹی منزل پر زمین کی سطح ملتی تھی، چنانچہ چھٹی منزل پر ریسپشن اور آمد و رفت کے راستے بنائے گیے تھے۔ ہوٹل کے اس نظام کو دیکھ کر دل نے کہا : اس دنیا میں کبھی نیچے سے راستہ نکالنا ہوتا ہے اور کبھی اوپر

سے۔ اس "فرق" کو جاننے ہی میں زندگی کی تمام بڑی بڑی کامیابیوں کا راز چھپا ہوا ہے۔

ہوٹل کے کمرہ میں ایک فولڈر تھا۔ اس کا عنوان تھا : ضیفنا الکریم (Dear guest) اس میں بہت سے سوالات تھے اور "مہمان" سے گذارش کی گئی تھی کہ جب وہ ہوٹل سے جانے لگے تو اس کو بھر کر استقبالیہ میں چھوڑ دے۔ ان سوالات کا خلاصہ یہ تھا کہ آپ نے اپنے تجربہ میں ہمارے ہوٹل کو کیسا پایا۔ ہمارے عملہ کی کارکردگی، ہمارے کمروں کا نظام، ہماری سروس وغیرہ کے بارہ میں جو تجربات آپ پر گزرے ہوں ان کو سوالات کے آگے تحریر کر دیں۔ اسی فولڈر کا ایک حصہ موظفونا وعمالنا (Our people) عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے پوچھا گیا تھا کہ ہمارے ہوٹل کے عملہ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا :

Gave you a friendly greeting upon arrival.
Were courteous and helpful at the front desk?
Smiled and greeted you each time they saw you.
Performed their jobs quickly and efficiently.
Were enthusiastic about their jobs?
Took personal responsibility to answer your questions.
Helped you without being asked.
Anticipated your needs.
Took personal responsibility to resolve your problems.
Were friendly and hospitable?
Showed that they wanted you to come back.
Overall, how well did our people perform?

اس کو پڑھ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ میں نے سوچا کہ دنیا کے فائدے کے لیے آدمی کتنا زیادہ اہتمام کرتا ہے، مگر آخرت کے فائدے کے لیے لوگ کسی اہتمام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دکاندار اور گاہک کا جو رشتہ ہے، وہی اخروی طور پر داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر آج کوئی داعی نہیں جو اپنے مدعو کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرے جو ہوٹل کا مالک اپنے گاہکوں کے ساتھ کر رہا ہے۔

دل نے کہا : لوگ اپنی دنیا کی خاطر لوگوں سے مسکرا رہے ہیں۔ مگر خدا کی خاطر لوگوں سے مسکرانے والا کوئی نہیں۔ دکاندار اپنے گاہک کا استقبال کرنے کے لیے بے قرار ہے مگر داعی کو اپنے مدعو کا استقبال کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ دنیا کی اقوام سے مسلمانوں کا یہی غیر داعیانہ سلوک ان کا سب سے بڑا جرم ہے۔ مسلمان جب تک اس معاملہ میں اپنی اصلاح نہ کریں، وہ خدا کی رحمتوں

کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ خدا اسی شخص کا مسکرا کر استقبال کرتا ہے جس نے خدا کی خاطر اس کے بندوں کا مسکرا کر استقبال کیا ہو۔

کئی منزلہ عمارتوں میں ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں اس میں رہنے والے لوگوں کو کس طرح بچایا جائے۔ اس مقصد کے لیے اونچی عمارتوں میں مختلف قسم کی ضروری ہدایات جگہ جگہ درج ہوتی ہیں۔ ہوٹل میں ایک جگہ یہ ہدایت لکھی ہوئی نظر آئی:

في حالة نشوب الحريق عليك استعمال السلّم وعدم استعمال المصعد

یعنی اگر عمارت میں آگ لگ جائے تو عمارت سے نکل کر باہر جانے کے لیے لفٹ (elevator) استعمال نہ کریں بلکہ سیڑھیوں کے ذریعہ اتریں۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے ہے کہ عمارت میں آگ لگنے کی صورت میں بجلی فیل ہوسکتی ہے۔ ایسی حالت میں آدمی اگر لفٹ کے اندر داخل ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو آگ کے قیدخانہ میں بند کرلے گا۔ اس کے بعد اس کے زندہ بچنے کی رہی سہی امید بھی ختم ہوجائے گی۔

لفٹ عام حالت میں تیزی کے ساتھ چڑھنے اترنے کا ذریعہ ہے۔ مگر عمارت میں آگ لگنے کی صورت میں معاملہ الٹا ہوجاتا ہے۔ اب آدمی کے لیے تیز رفتار ذریعہ کے مقابلہ میں سست رفتار ذریعہ زیادہ کارآمد بن جاتا ہے ——— تیز سفر بظاہر بہت اچھی چیز ہے۔ مگر بعض اوقات تیز سفر موت کا ذریعہ بن جاتا ہے اور سست سفر زندگی کا ذریعہ۔

یمن اس وقت دو حصوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی یمن اور شمالی یمن۔ جنوبی یمن پر مارکسی ذہن رکھنے والوں کا قبضہ ہے۔ مگر شمالی یمن میں اسلامی فکر کے لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ میرا سفر شمالی یمن میں ہوا۔ ایک صاحب نے میری عربی کتابوں کی فہرست مانگی۔ فہرست بناتے ہوئے میں نے کہا کہ "ایک کتاب کا نام سقوط الماركسية ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کتاب آپ کے یہاں پسند کی جائے گی یا نہیں"۔ انھوں نے فوراً کہا کہ مارکسی حکومت جنوبی یمن میں ہے۔ ہمارے یہاں (شمالی یمن میں) اسلامی شورائی نظام ہے (الحكم الماركسي في جنوب اليمن اما اليمن الشمالية فالحكم فيها شوروي اسلامي) شمالی یمن میں کافی ترقیاتی کام جاری ہیں۔ یہ سب زیادہ تر سعودی عرب، کویت اور عرب امارات وغیرہ کے تعاون سے ہو رہے ہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ یمن کا وفد مدینہ آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتاکم اھل الیمن۔ ھم ارق افئدۃ و الین قلوبا۔ الایمان یمان والفقہ یمان والحکمۃ یمانیۃ (بخاری ومسلم) یعنی تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں۔ وہ رقیق القلب ہیں اور نرم دل ہیں۔ ایمان تو یمن والوں کا ہے، سمجھ یمن والوں کی ہے، حکمت یمنی حکمت ہے۔

اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے، وہ مطلق معنوں میں نہیں ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایمان اور تفقہ اور حکمت ہمیشہ کے لیے یمن والوں کی خصوصیت ہے۔ اس کا مقصد دراصل ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا تھا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اسلام قبول کرنے کے لیے آئے۔ یہ ایک وقتی کلمہ ہے نہ کہ کوئی ابدی قانون۔ جو لوگ اس حقیقت کو نہ جانیں، وہ احادیث کو سمجھنے میں سخت غلطی کریں گے۔

قرآن کی سورۃ نمبر ۸۵ میں "اصحاب اخدود" کا ذکر ہے۔ یعنی قدیم زمانہ کے کچھ خدا پرست جن کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھے میں ڈال کر وحشیانہ طریقہ سے ہلاک کر دیا گیا تھا (البروج)

اصحاب اخدود کون لوگ تھے، ان کے بارہ میں قطعیت کے ساتھ کوئی چیز ثابت نہیں۔ تاہم ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح کے پیروؤں کے ساتھ یمن میں ہوا۔ یہ غالباً ۵۲۳ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت یمن میں ایک یہودی بادشاہ ذونواس کی حکومت تھی۔ اس نے یمن کے عیسائیوں کو یہودی بنانا چاہا۔ وہ لوگ اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔ یہودی بادشاہ ان پر سخت برہم ہوا اس نے کچھ عیسائیوں کو قتل کر دیا اور کچھ کو آگ میں ڈال کر جلا دیا۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد ۲۰ ہزار بتائی جاتی ہے۔

روایات بتاتی ہیں کہ ان یمنی عیسائیوں میں سے ایک شخص (ذوثعلبان) بھاگ کر باہر چلا گیا۔ اس نے روم کے عیسائی بادشاہ قیصر اور حبش کے عیسائی حکمراں نجاشی کو اس ظالمانہ واقعہ کی اطلاع دی۔ اس کے بعد حبش کی حکومت نے اپنے فوجی سردار ارياط کی رہنمائی میں ۷۰ ہزار حبشیوں کی فوج تیار کی۔ رومی سلطنت نے بحری بیڑہ دیا جس کے ذریعہ فوج یمن کے ساحل پر اتاری گئی۔ اس نے لڑ کر ذونواس کی فوج کو شکست دی اور ذونواس کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح یمن سے یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ۵۲۵ء میں پیش آیا۔ اس کے بعد یمن پر حبش کی عیسائی حکومت کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ظلم ہر شخص کے لیے ممکن ہے۔ مگر ظلم پر کھڑا ہونا کسی شخص کے لیے ممکن نہیں۔

ارباط کے بعد ابرہہ یمن کا حکمراں ہوا۔ یہی ابرہہ ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے کچھ پہلے ہاتھیوں کی فوج لے کر مکہ آیا تھا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے۔ اس نے یمن کے دارالسلطنت صنعاء میں ایک بہت بڑا کلیسا (Ekklesia) بنوایا جیسا اب تک کسی عیسائی نے نہیں بنوایا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ میں اس وقت تک رکنے والا نہیں ہوں جب تک عرب کے حج کو اس کی طرف پھیر نہ دوں (لستُ بمُنْتَہٍ حتی اصرف الیہا حجّ العرب، سیرۃ ابن ہشام، اول ۴۳)

روایات کے مطابق غالباً ۵۷۱ء میں وہ ۶۰ ہزار فوج کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی فوج میں ایک درجن بڑے بڑے ہاتھی بھی شامل تھے۔ اس لیے اس کو اصحاب فیل کہا گیا ہے مگر جیسا کہ سورہ الفیل میں بتایا گیا ہے، ابرہہ اور اس کا لشکر خدائی عذاب کے تحت تباہ ہوگیا اور مکہ کے اندر داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ابن سبا جس کے فتنوں نے اسلامی تاریخ کو شاید سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ وہ اسی صنعاء کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک یہودی تھا۔ اس کا پورا نام عبداللہ بن سبا المعروف بہ ابن السوداء تھا وہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کا ہم عصر تھا۔ اس نے یہ نظریہ نکالا کہ ہر پیغمبر کا ایک وصی ہوتا ہے جو اس کے بعد اس کا خلیفہ بنتا ہے۔ محمدؐ کے وصی علی ابن ابی طالب ہیں۔ جس طرح محمد خاتم الانبیاء ہیں، اسی طرح علیؓ خاتم الاوصیاء ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ محمدؐ کی وفات کے بعد لوگوں نے علیؓ کے سوا دوسروں کو خلیفہ بنا کر سخت غلطی کی ہے۔ اب سب کو چاہیے کہ موجودہ خلیفہ (عثمانؓ) کو قتل یا معزول کردیں اور ان کی جگہ علیؓ کو خلیفہ بنائیں۔

صنعاء میں اس فتنہ کو پھیلانے کے زیادہ مواقع نہیں تھے۔ چنانچہ وہ صنعاء کو چھوڑ کر مدینہ آگیا۔ یہاں کے حالات بھی اس کے موافق نہ تھے۔ اس کے بعد وہ بصرہ گیا۔ پھر کوفہ اور دمشق پہونچا۔ لیکن ہر جگہ کے حالات اس کو اپنے خلاف نظر آئے۔ آخر میں وہ مصر پہنچا۔ اس وقت عبداللہ بن سعد ابن ابی سرح مصر کے گورنر تھے۔ عبداللہ کی بعض باتوں سے یہاں کے لوگوں کو کچھ شکایات تھیں۔ انھیں شکایتوں نے ابن سبا کو مصر میں کام کرنے کا موقع دے دیا۔ اس نے لوگوں کے

جذبات کو ابھار کر مصر میں ایک عام شورش برپا کر دی جس کا آخری نتیجہ حضرت عثمانؓ کا قتل تھا۔
حکمراں کے خلاف ایجی ٹیشن کی مہم چلانا اور سیاسی شکایتوں کو بیان کرکے عوام کو بھڑکانا، یہ تمام تر ابن سبا کی سنّت ہے۔ یہ سنت آج بھی مسلمانوں میں پورے زور و شور کے ساتھ جاری ہے۔ حتی کہ موجودہ زمانہ میں جن مسلم رہنماؤں نے عمومی شہرت حاصل کی، وہ تقریباً سب کے سب وہی ہیں جو ابن سبا کے اس مجرب نسخہ کو استعمال کرکے شہرت اور مقبولیت کے مقام تک پہونچے ہیں۔

یمن میں ایک چھوٹا سا قصبہ مارب کے نام سے آباد ہے۔ کسی وقت یہاں عالی شان شہر قائم تھا۔ قرآن میں قوم سبا کا ذکر ہے۔ اس کا مرکز یمن کا قدیم شہر مارب تھا۔ اس کا زمانہ ۱۱۵ قبل مسیح کے بعد سے ایک ہزار سال تک پھیلا ہوا ہے۔ تجارت اور زراعت میں غیر معمولی ترقی کی وجہ سے اس وقت وہ دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر آج دنیا کے اقتصادی نقشہ پر یمن کو کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہیں۔

سبا کی قوم جنوبی عرب پر حکمراں تھی۔ تاریخ میں ان کو سبائی (Sabaean) کہا جاتا ہے۔ (1/1044) ساتویں صدی عیسوی میں یہ قوم اپنے آخری عروج پر تھی۔ اس نے سدّ مارب (Marib Dam) بنا کر اپنی زراعت کو زبردست ترقی دی جس کا ذکر قرآن میں سورۂ سبا میں آیا ہے۔ یہ علاقہ اس وقت اتنا سرسبز اور خوش حال ہو گیا کہ مورخین اس کو دورِ قدیم کا پیرس (Paris of ancient world) کہتے ہیں۔

سد مارب تقریباً چودہ میٹر اونچا اور ۶۰۰ میٹر لمبا تھا۔ وہ ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک یمن کی آبپاشی کا ذریعہ بنا رہا۔ (5/441) دورِ قدیم کے اعتبار سے وہ اتنا شاندار تھا کہ قوم سبا کے لوگ اس پر فخر کرتے تھے۔ حتی کہ اپنی ترقی اور خوش حالی کی وجہ سے ان میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اس وقت چھٹی صدی عیسوی میں بند کے اندر شگاف ظاہر ہوئے۔ یہ ابتدائی وارننگ تھی۔ مگر قوم سبا اس سے ہوش میں نہیں آئی۔ اس کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں سخت زلزلہ آیا اور بند سمیت پورا علاقہ ویران ہو گیا۔

صنعاء ایک تاریخی شہر ہے جو یمن کی راجدھانی ہے۔ صنعاء حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۶۳۲ء میں

اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ یہ پورا شہر پہاڑ کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ ۱۵۱۶ء سے وہ عثمانی ترکوں کے تحت تھا۔ یہ قبضہ ۱۹۱۳ء میں ختم ہوا۔ ۱۹۶۲ میں یہاں فوجی انقلاب آیا اور "امام" کی جگہ موجودہ حکومت قائم ہوئی۔ پہلے یہاں یہودی بھی آباد تھے۔ ۵۰-۱۹۴۹ میں تمام یہودی باشندے یمن کو چھوڑ کر اسرائیل چلے گئے۔ یہاں تمام ترقیاتی کام "انقلاب" کے بعد ہوئے ہیں۔ چنانچہ صنعار یونیورسٹی ۱۹۷۰ میں قائم ہوئی۔

یمن میں ایک چیز نظر آئی جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ہر آدمی اپنے پیٹ پر سینگ کی مانند یا انگریزی حرف جے (J) کی شکل کی ایک چیز باندھے ہوئے تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ خنجر ہے جس کو یہاں کی زبان میں الجنبیۃ کہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں ہر آدمی اپنے ساتھ ایک تلوار رکھتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں خنجر نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم وہ صرف علامت کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کو کبھی لڑائی بھڑائی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ حتی کہ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس کو سخت جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ یہاں جو شخص اس کو نہ لگائے وہ کمزور شخصیت کا آدمی سمجھا جائے گا۔ بنیادی طور پر وہ بطور زینت کے استعمال ہوتا ہے (من لا یحملها یعتبر ذو شخصیةٍ ضعیفةٍ وهی تلبسُ اساساً کالزینۃ)

تاہم اس رسمی خنجر کا بہت بڑا فائدہ ہے۔ یہ اگرچہ مارنے کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ مگر وہ یہاں کے بیشتر آپس کے جھگڑے ختم کر دیتا ہے۔ بہت کم جھگڑے ہیں جن کو عدالت میں لے جانے کی نوبت آتی ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ دو آدمیوں میں آپس کا جھگڑا ہو، خواہ وہ قتل کا ہو یا ایک ملین ڈالر کا ہو۔ دونوں اپنے قبیلہ کے سردار کے پاس جائیں گے، اور اپنے اپنے "خنجر" کو نکال کر سردار کے سامنے رکھ دیں گے۔ یہ اس بات کی ضمانت ہوگی کہ سردار جو بھی فیصلہ کر دے، وہ اس کو لازماً تسلیم کریں گے، خواہ وہ اپنے موافق ہو یا اپنے خلاف۔ یہاں کے ۸۰ فی صد جھگڑے اسی طرح عدالت میں جائے بغیر طے ہو جاتے ہیں۔

یہ روایات کی طاقت کا نتیجہ ہے۔ ہندستان میں آزادی کے بعد تمام روایات ٹوٹ گئیں، اور کوئی نئی روایت قائم نہیں ہوئی۔ یہی سب سے بڑی کمی ہے جو آج کے ہندستان میں پائی جاتی ہے۔

۳۱ اکتوبر کی دوپہر کو عبداللہ الصالح (رئیس جمہوریہ یمن) سے یہاں کے "قصر" میں ملاقات ہوئی۔ یہ اجتماعی ملاقات تھی۔ فرداً فرداً ملاقات کے بعد رئیس نے ایک مختصر خطاب کیا۔ اس میں انھوں نے اس تصور کو پسند کیا کہ اسلام کو ایک دعوتی قوت کی حیثیت سے اٹھایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت بہت سی اسلامی جماعتیں اسلام کے نام پر سیاسی جھگڑوں میں مشغول ہیں۔ اس کے بجائے اگر وہ دعوتی محاذ پر کام کریں تو یہ ان کی صلاحیتوں کا زیادہ بہتر استعمال ہوگا۔

۳۱ اکتوبر کی شام کو سبا ہوٹل (Taj Sheba Hotel) میں ایک خصوصی میٹنگ ہوئی۔ اس میں کانفرنس کے بیرونی شرکار اور یمن کے مقامی علمار جمع ہوئے۔ کارروائی کا آغاز تلاوتِ قرآن سے ہوا۔ اس کے بعد قاضی علی العثمان (وزیر الاوقاف) نے ابتدائی خطاب کیا۔ وہ خالص عالمانہ حلیہ میں تھے۔ اس موقع پر وزارت اوقاف کے اکثر ذمہ داران موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ وزیر، نائب وزیر اور دوسرے اکثر تعلیم یافتہ افراد میری کتابیں پڑھے ہوئے ہیں۔ لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں کانفرنس کے بعد مزید ٹھہروں تاکہ یہاں کی یونیورسٹی اور دوسرے اداروں میں میرے محاضرات رکھوائے جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ لوگوں کو جب معلوم ہوگا کہ آپ یہاں آئے تو ان کو سخت شکایت ہوگی کہ آپ سے ملاقات اور محاضرہ کا پروگرام کیوں نہیں رکھوایا گیا۔ مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے عذر کر دیا۔ سبا ہوٹل کے جس ہال میں اس ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا، وہاں دیوار پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا:

الدعوة الى الله : رسالة الانبياء وميراث العلماء ونهج الصالحين

اس نشست میں تقریباً ۵۰ آدمی شریک ہوئے۔ مگر لوگوں کی گفتگوؤں سے ایسا معلوم ہوا کہ کسی پر پوری طرح یہ واضح نہیں ہے کہ "دعوت الی اللہ" کیا ہے۔ اکثر لوگ دعوت سے آغاز کرکے مبشرین اور مستشرقین اور صہیونیین کے پیدا کردہ مسائل پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیتے۔ حالاں کہ یہ سب دفاعی مسائل ہیں نہ کہ دعوتی مسائل۔

ایک صاحب نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر شروع کی: هل لنا ان نتسائل ما هو دور العلماء اليوم فى ايقاظ الامة ودفعها لاقامة حضارة اسلامية جديدة (کیا ہم اپنے آپ سے یہ سوال کریں گے کہ امت کو بیدار کرنے میں اور اسلامی تہذیب کو قائم کرنے میں علمار کا رول کیا ہے) مگر چند جملوں کے بعد ہی ذہن کی گاڑی "حل مشاکل" اور مقابلۂ اعداء کے

رخ پر چل پڑی۔ موجودہ زمانہ میں ہر جگہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ کام کے نام سے صرف ایک چیز کو جانتے ہیں اور وہ مقابلہ اعدا رہے۔ دعوتِ اعداء کی اہمیت نہ ان کے اصاغر کو معلوم ہے اور نہ ان کے اکابر کو۔

کانفرنس میں زیادہ تر انھیں امور پر بحث ہوئی جن کو ہندستان میں "مسائل ملّت" کہا جاتا ہے۔ اس کے ایک اجلاس میں کسی موضوع پر مشاورتی بحث ہو رہی تھی۔ ہر آدمی نیا نیا نکتہ نکال کر بحث کو لمبا کر رہا تھا۔ صدر جلسہ نے اپنی طرف سے ایک آخری تجویز پیش کی اور رد عمل کا انتظار کیے بغیر فوراً کہا : اذلم یکن هنالك اعتراض فيعتبر انّ هنالك موافقة (اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر اتفاق ہے) یہ کہہ کر کارروائی آگے بڑھادی۔

مشاورتی مجالس میں یہی طریقہ درست ہے۔ ہر شخص جس نے اس طرح کی مجالس میں شرکت کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ لوگ اتنی زیادہ بحثیں نکالتے ہیں کہ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ یہ بات کسی خاتمہ پر پہونچنے والی نہیں۔ ایسی حالت میں بات کو ختم کرنے کی صورت وہی ہے جس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔

یہاں کے اجتماع میں اور دوسری اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میں اس رائے پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں پر "خطرات" کا ذہن سوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں "مواقع" دکھائی نہیں دیتے۔ اور بلاشبہ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بے شمار سرگرمیوں کے باوجود اب تک احیاء اسلام اور تعمیر ملّت کا عمل ان کے درمیان شروع نہ ہو سکا۔ اس کا منزل پر پہونچنا تو درکنار۔

- امریکہ میں ایک شخص نے پیغمبر ہونے کا دعوی کیا ہے۔
- غانا میں ایک شخص نے نیا مذہب نکالا ہے جس کا مقصد تمام مذہبی کتابوں (بشمول قرآن) کو جلانا ہے۔
- انگلینڈ میں ایک شخص نے مضمون شائع کیا ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔
- فلاں مسلم حکمراں مسلمان نہیں ہے، وہ یہودی ہے، وغیرہ

مسلمان ہر جگہ بس اسی قسم کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہ اب تک زندگی کے اس راز کو نہ جان سکے کہ اس قسم کے "مسائل" ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اور ہر زمانہ میں لازماً باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ ہمارا کام اس قسم کے "خطرات" کا انکشاف کرنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد ان مواقع کار کو تلاش کرنا ہے جو ہر حال اور ہر مقام پر موجود رہتے ہیں۔ ہمیں خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کرنا چاہیے۔ یہی زندگی کا راز ہے۔ اسی تدبیر کے ذریعہ دور اول میں اسلام کی تاریخ بنی تھی۔ آئندہ بھی جب اسلام کی تاریخ بنے گی، اسی تدبیر کے ذریعہ بنے گی۔ اگر مسلمان خطرات کے خلاف ردعمل میں مشغول رہے تو اسلام کی جدید تاریخ بننے والی نہیں، خواہ اس قسم کے ردعمل میں ایک کرور سال کیوں نہ صرف کر دیئے جائیں۔

میں نے کہا کہ مغرب نے تسخیر کائنات کے امکان کو استعمال کرکے موجودہ غلبہ حاصل کیا ہے۔ مگر تسخیر قلوب کے امکان کو استعمال کرنے کا میدان ابھی خالی ہے۔ جو قوم اس دوسرے امکان کو استعمال کرے گی وہ مغربی تاریخ سے بھی زیادہ بڑی تاریخ بنائے گی۔ تاہم اندازہ ہوا کہ اس طرح کی بات صرف ایک تقریر سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے لیے مسلسل ذہنی خوراک پہونچانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام موثر طور پر صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ الرسالہ کا عربی اڈیشن نکلنے لگے۔ معلوم ہوا کہ کچھ عرب حضرات بطور خود الرسالہ کا عربی اڈیشن نکالنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔

یمن قوم سبا کا وطن رہا ہے۔ سبا کا دارالسلطنت مارب تھا۔ اس کے نام پر سدّ مارب یہاں کا مشہور ترین تاریخی مقام ہے۔ ۲ نومبر ۱۹۸۸ کی صبح کو صنعاء سے مارب کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ مقام صنعاء سے تقریباً ۱۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شروع سے آخر تک نہایت عمدہ سڑک ہے جو کویت کے تعاون سے بنائی گئی ہے۔ تقریباً پورا راستہ پہاڑوں کے درمیان طے ہوا۔ ان پہاڑوں میں ہر قسم کے پتھر پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں یمن کا عقیق (قیمتی سرخ پتھر) بہت مشہور تھا۔ ایک شاعر نے دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا ہے:

اشک یخ بستۂ عبرت ہیں عدن کے موتی   خون افسردۂ حسرت ہے عقیقِ یمنی

تین ہزار سال پہلے یمن کے لوگوں نے جو سد مارب بنایا تھا۔ وہ آج بھی انسانی ذہانت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ خود اس علاقہ میں زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ بہت بڑے علاقہ کی بارانی بارش

کو بند کے ذریعہ مارب کے مقام پر جمع کیا جاتا تھا اور اس سے سینچائی کا کام لیا جاتا تھا۔ اس تدبیر نے اس خشک علاقہ کو سرسبز و شاداب بنا دیا تھا۔ قدیم سد مارب کے آثار اب بھی نمایاں طور پر موجود ہیں۔

قدیم بند ہی کے مقام پر اب یہاں دوبارہ جدید طرز کا ڈیم بنایا گیا ہے۔ ڈیم کے انچارج نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ شیخ زائد (عرب امارات) نے یہاں کا دورہ کیا تو ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس کو دوبارہ بنایا جائے۔ سب سے پہلے انھیں نے اس تصور کا آغاز کیا (وهو الذي بدأ هذه الفكرة)

ہم لوگوں کا قافلہ تقریباً دو گھنٹہ میں سد مارب کے مقام پر پہونچا۔ تعارف کے دوران بتایا گیا کہ اس ڈیم کو دوبارہ بنانے کے دو مقصد ہیں۔ ایک مقصد اقتصادی ہے۔ یعنی اس علاقہ کی آبپاشی کے لیے پانی حاصل کرنا۔ دوسرا مقصد اسلامی ہے۔ سدّ مارب کا ذکر خود قرآن میں آیا ہے۔ یہ ڈیم اس علاقہ کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھے گا (يُحيي ذكرى هذه المنطقة) یہ ڈیم گویا انسان کے لیے اس بات کا نشان ہے کہ خدا کے شکر گذار بنو تو تمہارے لیے سب کچھ ہے اور ناشکری کروگے تو اس کا نتیجہ دوبارہ وہی ہوگا جو قوم سبا کے ساتھ پیش آیا۔

موجودہ ڈیم ۷۰۰ میٹر لمبا اور ۴۰ میٹر اونچا ہے۔ قدیم سد مارب تقریباً ۱۸ میٹر اونچا تھا۔ جہاں یہ ڈیم بنایا گیا ہے اس کو عام طور پر وادی سبا کہا جاتا ہے۔ سابق سد مارب تین ہزار سال پہلے بنا تھا۔ یہ پورا کا پورا مضبوط پتھروں کا تھا۔ اس کے آثار اب بھی جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کثیر تعداد میں کتبے موجود ہیں۔ یہ کتبے حمیری زبان میں ہیں۔ یہ پورا ڈیم شیخ زائد (عرب امارات) کے تعاون سے بن رہا ہے۔ اس کی لاگت ایک سو ملین ڈالر ہے۔ تحقیق اور ریسرچ کا سارا کام جرمن ماہرین نے کیا ہے۔ وہ پچھلے دس سال سے اس کام میں مشغول ہیں۔

سد مارب دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس کھنڈر کو دیکھنے کے لیے گئے جو معبدِ شمس (Sun temple) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ملکہ بلقیس اور اس کی قوم سبا کا عبادت خانہ تھا۔ اب بھی اس کے کھنڈر صحرا میں موجود ہیں۔ اس کے کئی ستون اب بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا ایک ایک پتھر ۵۰ ٹن کا ہے۔ یہ معبد گول انداز میں بنا ہوا تھا۔ اس کی کھدائی میں کافی کتبات اور سامان نکلے جو اب لندن کے میوزیم میں موجود

ہیں۔ یہ معبد تقریباً تین ہزار سال پرانا ہے۔

ہم وہاں دوپہر کے وقت پہونچے۔ سورج پوری تابناکی کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اور اس کے نیچے معبد شمس آخری حد تک کھنڈر کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ اس ماحول میں ایسا معلوم ہوا جیسے سورج زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ میں تمہارا خدا نہیں۔ اگر میں خدا ہوتا ہو تو میں اپنے عبادت خانہ کو کھنڈر ہونے سے بچا لیتا۔

مزید آگے بڑھے تو وہ جگہ تھی جس کو "عرش بلقیس" کہا جاتا ہے۔ یہ ملکہ سبا (بلقیس) کا محل تھا جو معبد شمس کے قریب واقع تھا۔ اس کے پانچ بڑے بڑے ستون اب بھی سیدھے کھڑے ہوئے ہوئے ہیں۔ ہر ستون ۱۲ میٹر لمبا ہے۔ ان ستونوں کے اوپر یمنی لڑکے چڑھنے اور اترنے کا ایک عجیب وغریب تماشا دکھا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شہر کی اونچی عمارتوں میں اوپر چڑھنے کے لیے جو لفٹ لگی ہوئی ہے وہ اوٹس (OTIS) کی ہے جو ایک مغربی کمپنی ہے۔ روایتی صعود میں مسلمان خود استاد ہیں مگر مشینی صعود کے لیے انھیں مغرب کی شاگردی کرنی پڑتی ہے۔ مسلمان روایتی دور میں سب سے آگے تھے، مگر سائنسی دور میں وہ سب سے پیچھے ہو گئے۔

یہیں پر قدیم شہر مارب کے کھنڈرات ہیں جو دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک عمارت ہے جو "مسجد سلیمان" کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان نے یہاں نماز پڑھی اور پھر اسی جگہ مسجد تعمیر کی گئی۔ تاہم اس کا تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔ یہ مسجد ایک بہت بڑے ہال کی صورت میں ہے جو کہ تقریباً ۳۰ ستونوں پر قائم ہے۔ پورا مارب شہر ایک بلندی پر کھنڈرات کی صورت میں نظر آتا ہے اور عبرت کا عجیب نمونہ ہے۔

مارب شہر مشہور "قیرواں روڈ" پر واقع تھا۔ یہ شاہراہ بحر عرب کو بحر روم سے ملاتی تھی۔ اس پر ہزاروں کی تعداد میں اونٹوں کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ ان تاجروں سے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے اور وہ حکومت سبا کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا ـــــــ قدیم زمانہ کی تجارتی شاہراہ اب صرف سیاحوں کی شاہراہ بن کر رہ گئی ہے۔

قدیم مارب کے پاس ہی جدید مارب آباد ہے۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے وہ بھی قدیم انداز کا بنا ہوا ہے۔ یہاں ایک "ہوٹل بلقیس" ہے جو غالباً سیاحوں کی ضرورت کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ گویا

صحرا کے اندر ایک تہذیبی نخلستان ہے ۔ اس ہوٹل میں ظہر کی نماز پڑھی گئی اور یہیں دوپہر کا کھانا کھایا گیا۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد صنعاء کے لیے واپسی ہوئی۔

قدیم شہر مارب کے ٹوٹے ہوئے مکانات اور قدیم سد مارب ، معبد شمس ، عرش بلقیس وغیرہ کے کھنڈرات سب پاس پاس واقع ہیں۔ اس پورے علاقہ کو وادی سبا کہا جاتا ہے ۔ جب ہم کھنڈرات کی اس خشک وادی میں پہونچے تو یہ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا اور تیز روشنی بکھیر کر دیکھنے والوں کو دور سے دکھا رہا تھا۔

یہ تاریخی منظر جب میرے سامنے آیا تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کہ یہ سورج نہیں ہے بلکہ خدائی ٹارچ ہے جو اندھیرے میں اس لیے جلائی گئی ہے تاکہ لوگوں کو دکھائے کہ خدا کی طاقتیں کیا ہیں اور وہ قوموں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرتا ہے ۔

یہاں ایک کتاب دیکھی ۔ اس کا نام تھا ——— یمن کی از سر نو دریافت :

Yemen Rediscovered

کتاب کے مصنف مائیکل جینر (Michael Jenner) ہیں۔ وہ لندن میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور اب لندن ہی میں رہتے ہیں۔ وہ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کے مڈل ایسٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔ انھوں نے یمن کا سفر کیا اور علم الآثار کی جدید تحقیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کتاب مرتب کی ۔ اس میں یہاں کے آثار کے بہت واضح فوٹو دیے گیے ہیں اور قدیم یمن سے متعلق نہایت مفید معلومات درج ہیں۔ یہ کتاب لانگ مین کمپنی نے چھاپی ہے ۔

کتاب کے سرورق پر لکھا ہوا تھا کہ یمن عرصۂ دراز تک ان ملکوں میں شامل تھا جن کے بارہ میں دنیا کو بہت کم معلومات تھیں ۔ یمن نے اب اپنے دروازے بیرونی مشاہدین کے لیے کھول دیئے ہیں:

For many years one of the least-known countries in the world, Yemen has recently opened its doors to foreign visitors.

آج اس طرح کی کتابیں بڑی تعداد میں مختلف ملکوں کی قدیم تاریخ کے بارہ میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہ گویا ، ایک اعتبار سے ، قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین کی تفسیر ہے ۔ قدیم زمانہ میں قوموں پر ظاہر ہونے والے فیصلے دبے ہوئے کھنڈروں کی صورت میں زمین میں

دفن تھے یا تاریخ کے پردہ میں چھپ گیے تھے۔ حتی کہ اب لوگ آج کے "یمن" کو جانتے تھے، وہ قدیم "یمن" سے ناواقف ہو چکے تھے۔ علم الآثار کے ماہرین گویا موجودہ زمانہ میں خدائی کارندے بن کر ظاہر ہوئے اور بڑھتے ہوئے سیاحتی ذوق نے اس کی ضروری قیمت ادا کی۔ اس طرح ایسا ہوا کہ خدا کا فیصلہ جو تاریخ کے گرد وغبار میں چھپ گیا تھا۔ اس کو کھود کر اور تحقیق کرکے نکالا گیا اور عالمی مشاہدہ کے لیے اس کو دنیا کے سامنے رکھ دیا گیا۔ تاہم یہ پورا کام غیر مسلموں کے ذریعہ انجام پایا ہے۔ اس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔

یکم نومبر کی دوپہر کو یہاں کی یونیورسٹی دکھائی گئی۔ اجتماعی طور پر تمام شرکا روہاں لے جائے گیے۔ یہ ایک مکمل یونیورسٹی ہے جہاں تمام شعبے قائم ہیں۔ ذریعہ تعلیم عربی کے ساتھ انگریزی بھی ہے۔ اس کے مختلف حصوں کو دکھاتے ہوئے ایک ہال میں لے جایا گیا جہاں کلاس جاری تھی۔ استاد نے بتایا کہ یہ "ٹرافک انجینیرنگ" کی کلاس ہے۔ انھوں نے عربی میں اپنے مضمون کا تعارف شروع کیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہاں کچھ لوگ عربی نہیں جانتے اس لیے انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے۔ استاد نے اس کے فوراً بعد اپنی بات کو انگریزی میں کہنا شروع کیا۔ جس روانی کے ساتھ وہ عربی میں بول رہے تھے، اسی روانی کے ساتھ انگریزی میں بولنے لگے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں جو اساتذہ ہیں وہ لائق ہیں اور اپنے مضمون پر اچھی طرح تیار ہیں۔

یمن کے وسائل زیادہ نہیں ہیں۔ ایک بڑی زیر تعمیر عمارت دکھائی گئی۔ یہ میڈیکل کالج تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ پورا کالج کویت کے تعاون کے تحت بنایا جارہا ہے۔ یہی حال دوسرے ترقیاتی امور کا بھی ہے۔ تاہم تیل کی تلاش یہاں بڑے پیمانہ پر جاری ہے اگر تیل دریافت ہوگیا تو یمن بھی دوسرے خلیجی ممالک کی طرح خوش حال ملک بن جائے گا۔

صنعاء کے ماہنامہ الارشاد اور روزنامہ الثورہ نے انٹرویو لیا۔ الارشاد کا انٹرویو تفصیلی تھا۔ وقت کی کمی کے باعث الثورہ کو میں صرف مختصر انٹرویو دے سکا۔ ٹیلی وژن کے لوگ بھی اصرار کررہے تھے۔ مگر وقت کی کمی کے باعث میں ٹیلی وژن کو انٹرویو نہ دے سکا۔ الارشاد کا انٹرویو اس کے رئیس تحریر د۔ عبداللہ الواسطی نے لیا۔ انھوں نے گفتگو کا آغاز اس جملہ سے کیا:

الشیخ وحیدالدین، مرحب بکم فی هذا البلد الذی هو بلد کل مسلم

اس کے بعد انھوں نے جو سوالات کیے ان میں سے کچھ یہ تھے :

۱- هل تتفضل باعطائنا تعريفاً موجزاً عن حياتك

۲- كم هي المولفات التي صدرت لكم وهل تتفضلون كتاباً منها

۳- هل لكم من تعليق على الصحوة الاسلامية القائمة اليوم

۴- ماذا تتوقعون لمستقبل المسلمين في الهند

۵- بالنسبة لجارتكم الباكستان متى تتوقعون سيفوز في الانتخاب المقبلة

آخری سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میرے اندازہ کے مطابق پاکستان کے آنے والے الکشن میں بھٹو پارٹی کامیاب ہوگی اور وہی حکومت بنائے گی ۔ یہ بات میں نے یکم نومبر ۱۹۸۸ کو کہی تھی ، جب کہ پاکستان کا الکشن ۱۶ نومبر کو ہوا ۔

یمن کی وزارت اوقاف کی طرف سے ان کی مطبوعات بطور ہدیہ دی گئیں ۔ ان میں سے ایک کتاب القانون المدنی (المعاملات الشرعية) تھی جس کو علما کی ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے ۔ یہ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس میں معاملات سے متعلق شرعی قوانین کو دفعہ وار مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں تیرہ سو سے زیادہ دفعات ہیں ۔ کتاب اصولی قوانین (القواعد الاصولية) سے شروع ہوتی ہے ، اور اموال اور جائداد کے غصب سے متعلق شرعی احکام پر ختم ہوتی ہے ۔ مادہ ۱۲۸۶ میں کہا گیا ہے کہ شریعت کے مطابق ، غصب حرام ہے اور ظلم ہے (ان الغصب حرام وظلم) اس میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ جس شخص نے ایک بالشت کے برابر (زمین) غصب کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق اس کی گردن میں پہنائے گا (من غصب شبراً طوّقه يوم القيامة الى سبع اراضين)

عبدالکریم بن عبداللہ العرشی (نائب رئیس الجمہوریہ) نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قانون بلاشبہ بہترین چیز ہے جو عمومی طور پر ساری انسانیت کے لیے اور خصوصی طور اسلامی امت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے (ان هذا القانون لخير عمل يقدم للبشرية عامة وللامة الاسلامية خاصة) یہ کتاب شرعی احکام کی قانونی ترتیب (تقنين احكام الشريعة الاسلامية) کی ایک کوشش ہے جس کی موجودہ زمانہ میں سخت ضرورت ہے ۔

یہاں ایک عربی کتاب نظر سے گزری۔ اس کا نام تھا ـــــــ قرآن کی تلاوت پر اجرت لینے پر حجت اور برہان:

اقامة الحجة والبرهان على جواز أخذ الأجرة على تلاوة القرآن

اس کتاب کے مولف یمن کے ایک عالم محمد بن اسماعیل الامیر (۱۱۸۲ - ۱۱۰۱ھ) ہیں۔ بعد کے زمانہ میں اس طرح کی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل پر حجت و برہان قائم کیا گیا۔ مگر اقوام عالم پر حجت و برہان قائم کرنے کے لیے کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی بھی تو وہ مناظرہ کے انداز میں، اور مناظرہ اقامت حجت نہیں۔

لندن سے آنے والے ایک صاحب نے کہا کہ یورپ میں اسلام کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ مثلاً کئی تعلیمی اداروں سے یہ رپورٹ ملی ہے کہ ایک مسلمان طالب علم نے وہاں درخواست دی۔ انٹرویو کے وقت اس سے سوال کیا گیا کہ کیا تم بنیاد پرست (fundamentalist) ہو۔ اگر اس نے کہا کہ ہاں تو اس کی درخواست رد کر دی جاتی ہے۔

میرے نزدیک یہ اغیار کا تعصب نہیں بلکہ خود اپنی حماقت کا نتیجہ ہے۔ وہ مسلم نوجوان جن کو "بنیاد پرست" کہا جاتا ہے، انھوں نے اپنی یہ تصویر بنائی ہے کہ وہ جہاں موقع پاتے ہیں نظام کے خلاف جھنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ تخریب کاری کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو لوگ ڈسپلن کو اہمیت دیتے ہوں، وہ ان کے ساتھ وہی کریں گے جو یورپ کی بعض تعلیم گاہوں میں پیش آیا۔ جس شخص کے متعلق تخریب کاری کا تصور ہو، وہ خود ہمارے دینی اداروں میں قبول نہیں کیا جاتا، پھر ایسا آدمی یورپ کے غیر دینی اداروں میں کیوں قبول کیا جائے گا۔

عبد المنعم الخطاب ایک مصری عالم ہیں۔ وہ تقریباً ۲۴ سال سے امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ ٹولیڈو کے اسلامک سینٹر میں مدیر (ڈائرکٹر) ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ امریکہ میں اسلام کی تبلیغ کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک پہلی اہم ضرورت مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہے نہ کہ امریکیوں کو مسلمان بنانا (مهمة الاولى عندي هي اسلام المسلمين لا اسلام الامريكيين)

میں نے کہا کہ اسلام الامریکیین کے بغیر اسلام المسلمین ممکن نہیں۔ اصل یہ ہے کہ کردار محض وعظ و نصیحت سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اعلیٰ مقصد سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ مسلمان بے مقصد ہیں،

اسی لیے وہ بے کردار ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کو اخلاقی اعتبار سے اٹھانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے اندر مقصدی شعور پیدا کیا جائے۔ جب ان کے اندر مقصدی شعور آئے گا تو وہ مقصد کے لیے بھی متحرک ہوں گے اور یہی چیز ان کے اندر اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کا سبب بھی بن جائے گی۔ اور دعوت ہی بلاشبہ سب سے بڑا اسلامی مقصد ہے۔

سفر کے دوران ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ عربی یا انگریزی دونوں میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک ساتھ رہے مگر قریب ہونے کے باوجود ان سے "ربط" قائم نہ ہو سکا۔ گویا وہی کیفیت تھی کہ :

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس وقت خیال ہوا کہ نطق اور زبان خدا کی کیسی عجیب نعمتیں ہیں۔ اگر آدمی کے اندر بولنے کی صلاحیت نہ ہو، یا وہ دوسرے لوگوں کی زبان نہ جانتا ہو، تو انسانی ہجوم کے اندر بھی وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کریگا۔ انسان کی تمام سرگرمیاں اور اس کی تمام ترقیاں نہایت گہرے طور پر نطق کی صلاحیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے ربط قائم کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ مختلف لوگوں کی تحقیقات دوسروں تک پہنچتی ہیں اور انسانیت کی مجموعی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ انسان اپنے دل کی بات سے دوسروں کو باخبر کرتا ہے۔

اس عجیب و غریب نعمت کا احساس اس وقت نہیں ہوتا جب کہ آدمی اپنے ہم زبان لوگوں کے درمیان رہ رہا ہو۔ اس نعمت کا صحیح احساس اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے درمیان پائے جہاں نہ دوسرے لوگ اس کی زبان جانیں اور نہ وہ دوسرے لوگوں کی زبان جانتا ہو۔ ایسے ماحول ہی میں صحیح طور پر احساس ہوتا ہے کہ نطق اور زبان کیسی عجیب خدا کی نعمتیں ہیں۔

ایک صاحب اپنے ملک کے سیاسی حالات کی بنا پر اپنے وطن سے باہر یورپ کے ایک ملک میں رہتے ہیں۔ انھوں نے عالمی پناہ گزینوں کے مسئلہ پر تقریر کی اور کہا کہ ان پناہ گزینوں میں بہت بڑی تعداد مسلمانوں کی ہے۔ ان کے بارہ میں مسلم ملکوں کو ایک مستقل ادارہ قائم کرنا چاہیے جو ان کی مدد کر سکے۔ ان کی تقریر کی رپورٹ تیار ہو کر آئی تو عربی رپورٹ میں درج تھا : وقد

جری التاکید علی ضرورۃ الاھتمام باللاجئین اھتماماً یتکافأمع کون ثلث المسلمین هم لاجئون فی هذا العالم۔ اسی طرح انگریزی رپورٹ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

This matter was emphasized as one third of the Muslims are refugees in this world.

اس کا مطلب یہ تھا کہ دنیا بھر میں جو مسلمان ہیں ان کا ایک تہائی حصہ پناہ گزین کے طور پر زندگی گزار رہا ہے۔ یعنی دنیا کے ایک ارب مسلمانوں میں سے تقریباً ۳۳ کروڑ۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ مذکورہ مقرر نے دراصل یہ کہا تھا کہ عالمی پناہ گزینوں کی جو تعداد ہے ان میں تقریباً ایک تہائی مسلمان پناہ گزین ہیں۔ گویا کہنے والے نے پناہ گزینوں میں تہائی کی بات کہی تھی، مگر رپورٹ مرتب کرنے والوں نے اس کو مسلمانوں کی مجموعی تعداد کا تہائی کر دیا۔

یہ غلطی کی وہ قسم ہے جو موجودہ دنیا میں بہت زیادہ عام ہے۔ اس لیے کسی کے خلاف کوئی بات علم میں آئے تو تحقیق کے بغیر ہرگز اس کو ماننا نہیں چاہیے۔

یہاں جناب محمد شیر چودھری (پیدائش ۱۹۳۸) سے ملاقات ہوئی۔ وہ پاکستان سے ہجرت کر کے ساؤتھ افریقہ گیے اور اب وہ وہیں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک قصہ بتایا۔ ۱۹۸۶ میں ڈربن کے اورینٹ ہال میں ان کی تقریر ہوئی۔ تقریر کے بعد حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا : کیا آپ اس پر مطمئن ہیں کہ واقعی صدر ضیاء الحق پاکستان میں اسلام لانا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں محمد شیر چودھری نے کہا : " میں سمجھتا ہوں صدر ضیاء تو اسلام لانا چاہتے ہیں مگر علماء شاید اسلام نہیں لانا چاہتے "

میں نے کہا کہ ایک لفظی فرق کے ساتھ میں اس جواب سے متفق ہوں۔ آپ نے کہا کہ علماء اسلام کو لانا نہیں چاہتے، میں کہوں گا کہ علماء اسلام کو لانے نہیں دیتے۔

کسی معاشرہ میں اسلام کو لانا ایک تدریجی عمل ہے۔ اس کے لیے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جو چیز آج ممکن ہے اس سے آغاز کیا جاتا ہے، اور جو چیز آج ممکن نہیں ہے، اس سے اعراض کرنا پڑتا ہے۔ مگر علماء صبر اور اعراض اور تدریج کو نہیں جانتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فوراً اسلام کا غلبہ قائم ہو جائے۔ علماء کی یہی تعجیل پاکستان میں اسلام کی تاخیر کا سبب بن رہی

ہے۔ پاکستان کے علماء عملی طور پر صرف اس پوزیشن میں تھے کہ وہ پاکستان کے لوگوں میں اسلامی شعور کو بیدار کریں۔ مگر پاکستان کے بنتے ہی وہ اسلامی حکومت قائم کرو کا نعرہ لے کر کھڑے ہوگیے۔ وہ ہر حکمراں کو مخالف اسلام قرار دے کر اس کو اقتدار سے ہٹانے کی مہم چلاتے رہے۔ علماء کی یہی وہ نادانی ہے جس نے ۴۰ سال بیتنے کے باوجود پاکستان میں اسلام کو آنے نہیں دیا۔

اس پر جناب محمد چودھری نے اپنا ایک اور لطیفہ بیان کیا۔ انھوں نے ایک بار کسی سے کہا کہ وہ ہر شخص کا مقابلہ کر سکتے ہیں، مگر وہ مولوی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ سننے والے نے پوچھا کہ کیوں۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی فوراً ہی چھلانگ لگا کر اپنی گاڑی پانچویں گیر میں چلا دے گا:

He must at once jump into the 5th gear.

ایک صاحب جو یورپ سے آئے تھے، مگر اصلاً وہ افغانی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت ۱۵ ملین افغانی باشندے افغانستان میں ہیں۔ ۳ ملین افغانی پاکستان میں ہیں اور ۲ ملین ایران میں۔ پاکستان کے ایک صاحب نے بتایا کہ افغانستان سے جو لوگ پاکستان گیے، ان کی بڑی تعداد اب افغانستان جانے میں دل چسپی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ انھوں نے پاکستان میں کافی تجارتیں پھیلالی ہیں جن کی امید وہ موجودہ افغانستان میں نہیں رکھتے۔ اسی طرح بہت سے افغانی نوجوانوں نے اپنے ملک سے نکل کر تعلیم حاصل کی۔ اب وہ یورپ اور امریکہ میں اچھی ملازمتوں میں ہیں، وہ بھی اس میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے کہ افغانستان واپس جائیں جو مسلسل جنگوں کے نتیجہ میں برباد ہو چکا ہے۔

افریقہ کے ایک صاحب نے کانفرنس میں کہا کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اپنے سیاسی عقیدہ کی وجہ سے اپنے مذہبی حقوق سے روکے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایرانیوں کی مثال دی کہ سعودی عرب نے ان کو حج سے روک دیا ہے۔ چنانچہ اس سال ایرانی حاجی مکہ نہ جا سکے۔ کویت کے ایک بزرگ نے فوری طور پر اس کی تردید کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ بیان واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔ سعودی حکومت نے ہرگز ایسا نہیں کیا کہ وہ ایرانیوں کو حج سے روکے۔ ان کو بدستور اجازت حاصل تھی۔ یہ خود ایرانی تھے جنھوں نے احتجاج کے نام پر اس سال حج کا سفر نہیں کیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ صحیح ہونے کے باوجود اس کی توجیہہ حد درجہ غلط ہو سکتی ہے۔ مذکورہ مثال میں ایک واقعہ جس کے ذمہ دار حقیقتہً ایرانی تھے، اس کو ایک شخص نے غلط طور پر سعودی عرب کی طرف منسوب کر دیا۔ اسی لیے حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے خلاف کوئی بیان دینے سے پہلے اس کے بارہ میں مکمل تحقیق کرو۔

۴ نومبر کو مجھے فجر سے پہلے واپس روانہ ہونا تھا تاکہ میں وقت پر ہوائی اڈہ پہنچ کر ساڑھے پانچ بجے کے جہاز کو پکڑ سکوں۔ ہوٹل کے استقبالیہ میں شام کو میں نے لکھوا دیا کہ صبح ۳ بجے مجھے جگا دیا جائے۔ رات کو میں سو رہا تھا کہ ٹھیک وقت پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ہوٹل والوں کی طرف سے ویک اپ کال (Wake-up-call) تھی۔ گویا کہ آواز دینے والا کہہ رہا تھا کہ اٹھ جاؤ۔ اب سونے کا وقت ختم ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ صور اسرافیل بھی اسی قسم کا ایک ویک اپ کال ہوگا۔ آج تمام لوگ سو رہے ہیں۔ کسی کو آنے والے دن کا احساس نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ اسرافیل کا صور گونج اٹھے۔ کیسی عجیب ہوگی یہ خدائی پکار، اور کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اس خدائی پکار سے غافل ہو کر بے خبر سو رہے ہیں۔

میں سفر میں ہمیشہ مختصر سامان رکھتا ہوں۔ عام طور پر صرف ایک چھوٹا ہینڈ بیگ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ صنعار سے ۴ نومبر کی صبح کو ہوٹل سے نکلا تو ہمارے یمنی گائڈ نے پوچھا آپ کا سامان۔ میں نے اپنے ہاتھ کا بیگ دکھاتے ہوئے کہا کہ بس یہی میرا سامان ہے، اس کے سوا اور میرا کوئی لگیج نہیں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا: افلح من خف متاعه (وہ شخص کامیاب رہا جس کا سامان کم ہو)

یہ گویا اسلامی تہذیب کا کلمہ تھا جو ان کی زبان سے نکلا۔ جزیرہ عرب پر اسلام کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ عربوں کی زبان اور ان کے انداز میں ابھی تک اس کے نشانات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربوں کا باہمی اختلاف اگر کسی طرح ختم ہو جائے تو اس کے بعد ان کے پاس جو کچھ بچے گا وہ وہی اسلامی تہذیب ہوگی جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر عربی کے ذریعہ انھیں ملی تھی۔

صنعار سے کراچی کا سفر پاکستان ایرلائنز کی فلائٹ ۷۴۶ کے ذریعہ ہوا۔ راستہ میں

پاکستانی اخبارات پڑھنے کو ملے۔ روزنامہ حریت (۳ نومبر ۱۹۸۸) کی چند سرخیاں یہ تھیں:

کوئی جماعت بھی جیتے، حکومت انتخابی نتائج کو تسلیم کرے گی۔ مصطفےٰ صادق

۱۶ نومبر عوام دشمن قوتوں کی شکست کا دن ہے۔ بیگم نصرت بھٹو

پاکستانی عوام اسلام کے سوا کسی اور ازم کو تسلیم نہیں کرتے۔ مولانا نورانی

حکمرانوں کے لیے انتخابات کے بعد انتقال اقتدار کے سوا کوئی راہ نہیں۔ مارشل اصغر خاں

اسلامی جمہوری اتحاد برسر اقتدار آکر ظالموں کے ہاتھ کاٹ دے گا۔ نواز شریف

انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز (۳ نومبر ۱۹۸۸) کے صفحہ اول کی ایک سرخی یہ تھی:

Islamic forces will emerge triumphant (Fazle Haq.)

روزنامہ جنگ (۳ نومبر ۱۹۸۸) بھٹو پارٹی کے تذکرے سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں یا تو بھٹو پارٹی کے لیڈروں کی تقریریں تھیں۔ یا مخالف پارٹی کی طرف سے بھٹو پارٹی کی مذمت۔ ایسا محسوس ہوا جیسے تمام دوسری جماعتوں کے اوپر بھٹو پارٹی کا بوس بن کر سوار ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ اپنے کو دفاعی پوزیشن میں محسوس کر رہے ہیں۔ اخبار جنگ میں جماعتِ اسلامی کے پروفیسر عبدالغفور کا ایک احتجاجی خط تھا جس میں انھوں نے اخبار جنگ سے شکایت کی تھی کہ "پاکستان کی انتخابی مہم میں جنگ کے نمائندے متعصبانہ اور جانبدارانہ انداز میں رپورٹنگ کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی اتحاد کے اجتماعات گھٹا کر شائع کرتے ہیں یا بالکل شائع نہیں کرتے۔

صنعا سے کراچی تک بنگلہ دیش کے ایک صاحب کا ساتھ رہا۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں بنگلہ دیش کے کئی ہزار آدمی مختلف حیثیتوں سے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ۱۹۷۱ میں پاکستان کے خلاف "آزاد بنگلہ دیش" کا جھنڈا اٹھایا تھا، مگر آزادی کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ بنگلہ دیش میں کام کے مواقع نہیں ہیں تو وہ پاکستان آکر یہاں کام کرنے لگے۔ اسی طرح بہت سے بنگلہ دیشی مسلمان ہیں جو یورپ اور امریکہ جا کر اپنے لیے کام تلاش کر رہے ہیں ——— "سونار بنگلہ" جب نعرہ تھا تو ہر آدمی کو سونار بنگلہ سے دلچسپی تھی۔ مگر سونار بنگلہ جب واقعہ بن گیا تو اب کسی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔

میں نے سوچا کہ ۱۹۷۰-۷۱ میں اگر کوئی شخص یہ کہتا کہ بنگلہ دیش کو آزاد کرانے کی تحریک ختم کردو اور پاکستان کی "ماتحتی" میں رہ کر اپنی تعمیر و ترقی کا کام کرو تو سارے بنگلہ دیش میں کوئی ایسے شخص کا ساتھ نہ دیتا۔ اس کے برعکس شیخ مجیب الرحمٰن کی آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کا ساتھ دینے کے لیے تمام بنگالی مسلمان امنڈ پڑے۔ حالاں کہ بالآخر اس کا جو انجام ہونا تھا وہ صرف یہ کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو خود بنگالی مسلمان مار ڈالیں اور بنگلہ دیش دنیا کا سب سے زیادہ پست اور کمزور ملک بن کر رہ جائے۔

جذباتی رہنمائی اور حقیقت پسندانہ رہنمائی میں کتنا زیادہ فرق ہے۔ مگر مسلمان ہر ملک میں، ایک یا دوسری صورت میں جذباتی رہنماؤں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ بربادی اور ہلاکت کی صورت میں بار بار اس کے نتیجہ کا سامنے آنا بھی انھیں جذباتی رہنماؤں کے پیچھے دوڑنے سے روکنے والا نہ بن سکا۔

۴ نومبر کی دوپہر کو کراچی پہونچا۔ ظہر کی نماز یہاں ایرپورٹ کی مسجد میں پڑھی " ایرپورٹ" کے ساتھ "مسجد" گویا دنیا کے ساتھ دین کو جوڑنے کی کوشش ہے۔ اسلام کے مطابق دینداری یہ نہیں ہے کہ آدمی دنیا کو چھوڑ کر روحانی جزیرہ میں چلا جائے۔ صحیح دینداری یہ ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے وہ دیندار بنا رہے۔ اس کا جسم بظاہر دنیا میں دکھائی دے مگر اس کا دل خدا کی یاد میں مشغول ہو۔

کراچی سے دہلی کے لیے میرے علاوہ تقریباً ایک درجن مسافر اور تھے۔ ان کے عورتیں اور بچے بھی تھے۔ دہلی کے مسافروں کو انتظارگاہ کے ایک حصہ میں بٹھا دیا گیا تھا۔ یہاں ان ہندستانیوں کے بچے مستقل طور پر شور و غل کرنے میں مشغول تھے اور اسی کے ساتھ ان کی مائیں بھی۔ مغربی دنیا میں ہندستانیوں کو بہت حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اور مجھے اس سے پورا اتفاق ہے۔ ہندستانی انسان اخلاقی اعتبار سے اتنے پست ہو چکے ہیں کہ مقابلۃً اگر دیکھا جائے تو وہ مغربی انسان کے مقابلہ میں غیر انسان نظر آئیں گے۔ باہر کی دنیا میں چھوٹے چھوٹے ملک بھی ہندستان سے بہتر نظر آتے ہیں۔ ہندستان کا انسان میرے تجربہ میں، بااصول زندگی سے واقف نہیں۔ وہ صرف ایک چیز جانتا ہے، اور وہ اس کی اغراض اور خواہشیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستان انسانی آبادی سے زیادہ ایک جنگل کے مشابہ ہے۔

اور جنگل میں محفوظ طور پر زندہ رہنے کی صورت صبر و اعراض کے سوا اور کچھ نہیں ۔

۴ نومبر کو کراچی سے دہلی آتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے پاس کی سیٹ خالی تھی۔ دورانِ پرواز اچانک ایک صاحب آئے اور اس پر بیٹھ گیے ۔ دیکھا تو وہ جناب فطین اشرف صدیقی (پیدائش ۱۹۶۲) تھے ۔ وہ سیتامڑھی (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں اور آج کل مسقط (سلطنت عُمان) میں بہ سلسلۂ روزگار مقیم ہیں۔ گفتگو کے دوران پاکستان کے آئندہ ہونے والے الکشن (۱۶ نومبر ۱۹۸۸) کا ذکر ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے یہاں بڑی تعداد میں پاکستان کے لوگ آباد ہیں۔ ان کا عام خیال یہ ہے کہ اس الکشن میں "اسلامی اتحاد" کے لوگ جیتیں گے اور وہی آئندہ حکومت بنائیں گے۔ خاص طور پر "اسلامی جماعت" کے لوگ تو اس طرح بات کرتے ہیں گویا پاکستان کا سیاسی مستقبل انھیں کے ہاتھ میں ہے ۔

میں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے ۔ اگر کھلا الکشن ہوتا ہے تو یقینی ہے کہ بے نظیر بھٹو کی پارٹی جیتے گی اور وہی حکومت بنائے گی ۔ یہ بات الکشن سے دو ہفتہ پہلے ہو رہی تھی جب کہ دنیا بھر کے "اسلام پسند" پاکستان میں "اسلامی جماعت" کی کامیابی کا بالکل یقین کیے ہوئے تھے ۔ چنانچہ فطین اشرف صدیقی صاحب کو میرے اس بیان پر بہت تعجب ہوا۔

میں نے کہا کہ پاکستان کا یہ الکشن ایک کسوٹی ہے ۔ ایک رائے پاکستان کے اور دنیا بھر کے "اسلام پسندوں" کی ہے اور ایک رائے میری ہے ۔ اس معاملہ میں اگر "اسلام پسند" لوگوں کی رائے درست نکلی تو وہ لوگ بابصیرت ہیں اور میں بے بصیرت ۔ اس کے برعکس اگر میری رائے درست ثابت ہو تو آپ کو ماننا ہوگا کہ میں بابصیرت ہوں اور وہ لوگ بے بصیرت ۔ فطین اشرف صاحب یہ سن کر ناقابل فہم تعجب کے ساتھ خاموش ہو گیے ۔

آج ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۶ نومبر کے پاکستانی الکشن میں بھٹو پارٹی نے ، ووٹروں کے لیے شناختی کارڈ کی شرط جیسے بعض ناموافق حالات کے باوجود سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہاں تک کہ یکم دسمبر ۱۹۸۸ کو بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی کرسی پر بیٹھ چکی تھیں ۔ دوسری طرف پاکستان کی "اسلامی جماعت" کا یہ حال ہوا کہ اس کے تمام امیدوار ہار گیے ۔ پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں اس کو کوئی سیٹ نہ مل سکی ۔

موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنماؤں کا یہ حال ہے کہ وہ حقائق کے بجائے امانی میں جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاملات میں صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ پاکستان کے "اسلامی مفکرین" ۴۰ سال تک یہ کہتے رہے کہ پاکستان کے سارے مسلمان اسلامی نظام چاہتے ہیں۔ صرف چند سیاسی حکمراں ہیں جو اس کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کے عوام کو اگر آزادانہ اظہارِ رائے کا موقع ملے تو وہ یقینی طور پر اسلامی نظام کے حق میں رائے دیں گے۔ مگر پہلے ہی آزادانہ انتخاب نے اس مفروضہ کو غلط ثابت کر دیا۔

اسی بے بصیرتی کی بنا پر ایسا ہوا کہ پاکستان کے قیام (۱۹۴۷) کے بعد سے ۴۰ سال تک ان کی ساری کوشش حکمرانوں کو سیاسی اقتدار سے ہٹانے یا انھیں پھانسی دینے پر مرتکز رہی۔ مگر حکمرانوں کو ہٹانے کے بعد جب عوامی الکشن ہوا تو معلوم ہوا کہ اسلامی نظام کی راہ میں اصل رکاوٹ حکمران نہیں بلکہ خود پاکستانی عوام تھے۔ اگر یہ مسلم رہنما صحیح بصیرت کے حامل ہوتے تو ۱۹۴۷ کے بعد وہ اپنی ساری کوشش عوام کا ذہن بنانے میں لگا دیتے۔ مگر اپنی غلط تشخیص کی بنا پر انھوں نے اپنی ساری کوشش حکمراں افراد کو اقتدار سے بے دخل کرنے میں لگادی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقت اور طاقت کا بے شمار سرمایہ صرف کرنے کے باوجود کوئی مثبت فائدہ ان کے حصہ میں نہ آسکا۔

پاکستان ایرلائنز پر آج (۴ نومبر ۱۹۸۸) کے پاکستانی اخبارات تھے۔ ہر ایک میں صفحہ اول کی پہلی سرخی یہ تھی: "مالدیپ پر ہندستانی فوج کا حملہ" اس کے ساتھ ہر اخبار میں، ایک یا دوسرے لفظوں میں یہ بات تھی کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور پاکستان میں اسلام کا نظام ہی نافذ ہوگا۔

میں نے سوچا کہ یہ اخبارات اگر یہ لکھتے تو زیادہ صحیح ہوتا کہ پاکستان اسلام کے نام پر قومی دھوم کے لیے بنا ہے اور پاکستان میں اسلام کے نام پر قومی دھوم جاری رہے گی۔ اور اس کا ایک ثبوت مذکورہ بالا خبر ہے۔ اگر پاکستان کے صحافیوں میں اسلام کا مزاج ہوتا تو وہ اس خبر کو اس کی صحیح شکل میں چھاپتے۔ مگر اس کو انھوں نے اپنے مخصوص قومی سانچہ میں ڈھال کر شائع کیا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک مالدیپی تاجر (عبداللہ لطفی) نے کولمبو کے پاس ایک پولٹری فارم میں اپنا مرکز بنایا۔ وہاں اس نے لنکا کے دہشت گرد نوجوانوں کو بھرتی کر کے ایک دستہ تیار کیا۔ ان کو کشتیوں کے ذریعہ اس نے مالدیپ میں اتارا اور مالدیپ کے صدر مامون عبدالقیوم کی رہائش گاہ

پر حملہ کر دیا۔ اس وقت مامون عبدالقیوم نے پڑوسی ہندستان سے مدد کی درخواست کی۔ ہندستان سے بذریعہ ہوائی جہاز فوج بھیجی گئی جس نے بغاوت کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ واضح ہو کہ مالدیپ کے پاس اپنی کوئی فوج نہیں ہے۔

۴ نومبر کو میں پیشگی اطلاع کے بغیر دہلی پہونچا تھا۔ اس لیے یہ معلوم تھا کہ ہمارے دفتر کا کوئی آدمی ایرپورٹ پر موجود نہ ہوگا۔ میں چاہتا تھا کہ ٹیلی فون کے ذریعہ دفتر میں اپنی آمد کی اطلاع دیدوں۔ تاکہ وہاں سے کوئی شخص آجائے۔ مگر ہوائی جہاز سے اترنے کے بعد آدمی کو امیگریشن کی کھڑکی پر لائن لگانی پڑتی ہے اور یہاں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ پبلک ٹیلی فون باہر کے حصہ میں تھا۔ میں نے چاہا کہ امیگریشن کی لائن میں لگنے سے پہلے میں ٹیلی فون کردوں تاکہ جب میں یہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلوں، اس وقت تک دفتر سے کوئی شخص آچکا ہو۔

اندر صرف پولس کا ٹیلی فون تھا۔ میں پولس کے دفتر میں گیا اور اپنی ضرورت بیان کی۔ پولس کا آدمی یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ دفتر کا ٹیلی فون ہے۔ آپ پبلک بوتھ پر جاکر ٹیلی فون کریں۔ مگر اس نے میری ضرورت محسوس کی اور فوراً ٹیلی فون کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ کر لیجئے۔ پہلے زیرو گھمائیے، اس کے بعد اپنا نمبر ڈائل کیجئے، اس نے کہا۔ چنانچہ میں نے پولس کے دفتر سے ٹیلی فون کر دیا۔ جب میں اندر کی کارروائیوں سے فارغ ہو کر باہر نکلا، تو وہاں دفتر کا آدمی بھی آچکا تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اپنی ضرورت کو معقول طور پر پیش کر سکیں تو فریق ثانی خود اپنے ضمیر کے تحت اس کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے، خواہ وہ پولس کا آدمی ہو یا غیر پولس کا آدمی۔

ایک سفر

اگست ۱۹۸۸ کی ۲۷ تاریخ تھی۔ اور دن کے ڈیڑھ بجے کا وقت، میں اپنے دفتر میں مطالعہ میں مشغول تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کیلی فورنیا (امریکہ) سے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی بول رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۳-۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو وہ لوگ امریکہ میں ایک انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی اس میں شرکت کروں۔ انھوں نے کہا کہ آپ اتنا وقت نکال کر آئیں کہ کانفرنس میں شرکت کے بعد امریکہ کے دوسرے مقامات پر بھی آپ کے خطابات کا پروگرام رکھا جا سکے۔

اس گفتگو کے موقع پر میں دہلی میں تھا اور ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی) کیلی فورنیا میں۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان ۱۴ ہزار میل سے بھی زیادہ کا فاصلہ تھا۔ مگر ٹیلی فون پر دونوں کو ایک دوسرے کی آواز اس طرح صاف سنائی دے رہی تھی جیسے دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوں۔ ٹیلی فونی ربط کا یہ نظام شاید اس لیے بنایا گیا ہے کہ انسان اُس دوسرے عظیم تر ربط کے بارے میں سوچ سکے جو بندے اور خدا کے درمیان اعلیٰ ربانی سطح پر قائم ہوتا ہے۔

۱۳ ستمبر کو ان کا باضابطہ دعوت نامہ (۵ ستمبر ۱۹۸۸) بذریعہ ڈاک مل گیا۔ اس میں ٹیلی فونی دعوت نامہ کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کا عمومی موضوع حسب ذیل ہوگا:

The Sirah of Prophet Mohammed and its Message
for Contemporary Men and Women.

میرے پاسپورٹ کے صفحات ختم ہو گئے تھے، مگر اس کی قانونی مدت ابھی باقی تھی۔ صفحات کے اضافہ کی درخواست دی گئی۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی کارروائی تھی۔ مگر تقریباً ایک مہینہ کی دفتری دوڑ دھوپ کے بعد ۱۰ صفحہ کا اضافہ ہو کر پاسپورٹ دوبارہ مل سکا۔ یہ ہندستانی دفتر کا حال تھا۔ دوسری طرف امریکی سفارت خانہ میں ویزا کی درخواست

دی گئی تو انھوں نے درخواست کے اگلے ہی دن ایک سال (۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ تا ۱۱ دسمبر ۱۹۸۹) کا ملٹیل ویزا دے دیا۔ یعنی اس ویزا پر میں ایک سال تک امریکہ میں قیام کرسکتا تھا۔ یا ایک سال کے دوران جتنی بار چاہے وہاں جاسکتا تھا۔ جب کہ ہماری درخواست میں صرف دو ہفتہ کا ویزا مانگا گیا تھا ——— یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ ہندستان اور امریکہ کے نظام میں وہ کیا فرق ہے جس نے ایک کو پیچھے اور دوسرے کو آگے کر دیا ہے۔

اس فیاضانہ سلوک کا سبب غالباً یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ریکارڈ کے مطابق پایا کہ اس سے پہلے نومبر ۱۹۸۵ میں میں امریکہ گیا تو میں کانفرنس میں شرکت کے بعد فوراً واپس آگیا۔ وہاں میں نے نہ ان کی انتظامیہ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا کیا اور نہ ناجائز طور پر زیادہ ٹھہرنے کی کوشش کی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں صرف وہ شخص مشکلات سے دوچار ہوتا ہے جو وہاں کے نظام سے انحراف کرے۔ مگر ہندستان جیسے ملکوں میں ہر حال میں آدمی کو دفتری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، خواہ اس نے مقررہ نظام سے ادنیٰ انحراف بھی نہ کیا ہو۔

آخری دنوں میں ایک مسئلہ پیش آیا۔ میرے رفیق سفر کو نئی دہلی کے امریکی سفارت خانہ سے ویزا حاصل کرنے کے لیے ایک تحریر درکار تھی جس میں بتایا گیا ہو کہ امریکہ کے متعلقہ اسلامی ادارہ نے ان کو بھی میرے ساتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا ہے۔ مگر وقت اتنا کم تھا کہ ڈاک کے ذریعہ سے امریکہ کا خط ہندستان نہیں پہونچ سکتا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے امکانات کو استعمال کرکے جدید انسان نے اس مسئلہ کو حل کرلیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے دفتر کو بذریعہ ٹیلی فون ضرورت بتائی گئی اور ایک گھنٹہ کے اندر ان کا دستخط شدہ خط دہلی میں موجود تھا۔

یہ تیز رفتار ترسیل اس آلہ کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تصویری مشین (Facsimile machine) کہا جاتا ہے اور جس کا مختصر نام فیکس (Fax) ہے۔ آپ ایک تحریر یا ایک خط تیار کرکے مشین میں ڈالیں، اور ایک سکنڈ کے اندر وہ مطلوبہ مقام پر پہونچ کر ویسا ہی چھپا ہوا نکل آئے گا۔

ابتدائی انسانی دور میں صرف پیدل پیغام رسانی کا طریقہ رائج تھا۔ پھر گھوڑوں کا

استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد ٹیلی گرام، ٹیلی فون اور ٹیلکس کے طریقے دریافت ہوئے۔ اب فیکس کے طریقہ نے سب پر برتری حاصل کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی زیادہ نعمتیں انسان کو دے رکھی ہیں، مگر کتنے کم لوگ ہیں جو اس کا واقعی شکر ادا کرتے ہوں۔

دہلی کا انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے۔ انتظار گاہ میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی مسافر دروازہ کھلنے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ ہندستانیوں نے ہندستانی ہوائی اڈوں پر تبصرہ شروع کیا۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے فلاں فلاں ملکوں کے ہوائی اڈے دیکھے ہیں، ان کے مقابلہ میں ہندستانی ہوائی اڈے بالکل پسماندہ نظر آتے ہیں۔ قریب کی کرسی پر ایک جاپانی مسافر بیٹھا ہوا ان کی پرجوش باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں وہ نہایت آہستگی کے ساتھ بولا: دوستو، کسی ملک کا ہوائی اڈہ ویسا ہی ہوتا ہے جس کا وہ تحمل کر سکتا ہو اور جس کا وہ مستحق ہو، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم:

Friends, a country gets the airports it can afford — and deserves. No more, no less.

جاپانی کا یہ تبصرہ سن کر اکثر لوگ چپ ہو گیے۔ تاہم ایک شخص بولا: جناب عالی، اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی داداؤں (Political dadas) کی حکومت ہے۔ اور جب تک یہ صورت حال قائم ہے، ہمارے ملک میں کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

دہلی سے پین ایم (Pan Am) کی فلائٹ نمبر ۶۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو صبح چار بجے کا وقت تھا کہ جہاز اپنا پر پھیلائے ہوئے رن وے پر دوڑا، اور پھر اوپر اٹھ کر پرواز کرنے لگا۔ یہ عین وہی انداز تھا جو کسی بڑی چڑیا کا انداز پرواز کے وقت ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز بھی عین اسی اصول کے تحت اڑتا ہے جس طرح کوئی چڑیا اڑتی ہے۔

ہوائی جہاز کیا ہے۔ ہوائی جہاز دراصل چڑیا کی مشینی نقل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوائی جہاز کا پہلا کامیاب ماڈل وہ ہے جو نیچر (قدرت) نے تیار کیا۔ اب اگر ہوائی جہاز کی نقل تیار کرنے کے لیے ذہانت درکار ہے تو ہوائی جہاز کی اصل بنانے کا کام کیا ذہانت کے بغیر انجام پا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوائی جہاز، دوسری بے شمار

چیزوں کی طرح ، اس بات کا خاموش اعلان ہے کہ یہاں ایک زندہ ذہانت موجود ہے۔ کائنات کے پیچھے زندہ ذہانت کا اقرار کیے بغیر کائنات کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی ۔

ہوائی جہازوں میں سگرٹ پینے کی اجازت ہوتی ہے ۔ مگر ٹوائیلٹ (غسل خانہ) میں سگرٹ پینا سخت منع ہے ۔ حسب معمول ٹوائیلٹ کے باہر لکھا ہوا تھا کہ اس کے اندر اسموکنگ نہ کریں ۔ اس ممانعت کے نیچے یہ سطر درج تھی :

This lavatory is equipped with a smoke detector

میں نے اس فقرہ کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہا تو اس کا عمدہ لفظی ترجمہ سمجھ میں نہ آیا ۔ ایک لمحہ کے لیے خیال ہوا کہ اردو زبان جدید ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے ۔ مگر یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں ۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ انگریزی زبان کا ارتقاء جن حالات میں ہوا ، اس کی وجہ سے اس کے اندر مشینی خیالات کو ادا کرنے کی زیادہ بہتر صلاحیت پیدا ہوگئی ۔ مگر ایک اور میدان ایسا ہے جہاں اردو (اور عربی) کو مغربی زبانوں پر فوقیت حاصل ہے ۔ یہ ہے روحانی تجربات یا معرفتِ ربّانی والے خیالات کو ادا کرنا ۔

مسٹر خوشونت سنگھ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسٹر راجیو گاندھی جہاز چلا رہے تھے ۔ اتفاق سے خوشونت سنگھ بھی اسی جہاز سے سفر کر رہے تھے ۔ راجیو گاندھی نے خوشونت سنگھ کو پیش کش کی کہ وہ پائلٹ کے کیبن (Cookpit) میں آئیں اور دیکھیں کہ ہوائی جہاز کس طرح چلایا جاتا ہے ۔ ہوائی جہاز کا ایک عام مسافر صرف ہوائی جہاز کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے ۔ وہ اس کا مشاہدہ نہیں کرتا کہ ہوائی جہاز کس طرح اڑایا جاتا ہے ۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ میں چاہتا ہوں کہ کائناتی جہاز کے "انجن" کو دیکھوں ۔ میں اس عالم غیب کو دیکھوں جس کے تحت یہ عالم شہود چلایا جا رہا ہے ۔ موت کے بعد ہر آدمی اس کو دیکھے گا ۔ مگر اس لذت دیدار کی سعادت انھیں لوگوں کو ملے گی جنھوں نے دنیا میں اپنی "بینائی" کی حفاظت کی ہو ۔ جو لوگ دنیا میں اپنی "بینائی" کو کھودیں انھوں نے گویا اپنے آپ کو اس ربانی مشاہدہ کے لیے نااہل بنالیا ۔ وہ دنیا میں خدا کی بات کو دیکھنے سے محروم تھے ، آخرت میں وہ خدا کی ذات کو دیکھنے سے محروم رہیں گے ۔

دہلی اور فرینکفرٹ کے درمیان سفر کرتے ہوئے جہاز ہلنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک شدید جھٹکے لگتے رہے۔ خالص فنی اعتبار سے اس قسم کے جھٹکے خطرناک نہیں ہوتے۔ مگر ایک عام مسافر جو ۳۵ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑ رہا ہو اور اس کی سواری ہچکولے کھانے لگے تو اس کا غیر متاثر رہنا سخت مشکل ہے۔ بے اختیار میری زبان سے کلمہ کے الفاظ نکلنے لگے۔

اس وقت خیال آیا کہ آخر وقت میں کلمہ پڑھنے کی اہمیت کیوں ہے۔ اس کی روح یہ ہے کہ مومن پر آخری وقت آئے تو وہ چاہنے لگتا ہے کہ اپنے اعمال نامہ میں کوئی آخری نیکی ریکارڈ کرا سکے۔ اس وقت اس کو سب سے بہتر چیز صرف کلمہ نظر آتا ہے۔ کیوں کہ کلمہ دو سب سے بڑی حقیقت کا اعلان ہے۔ ایک یہ کہ اس دنیا کا معبود صرف ایک اللہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہاں کامل صداقت صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں پر ظاہر کی گئی۔ آخر وقت میں کلمہ پڑھ کر بندہ گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ خدایا، میں کوئی عمل نہ کر سکا، اب میں اعتراف کو تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میرے پاس اقرارِ عملی کا سرمایہ نہیں، تو اقرارِ لسانی کو میری طرف سے قبول کر لے۔

ساڑھے آٹھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز فرینکفرٹ کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ فرینکفرٹ کو مغربی جرمنی کا تجارتی مرکز (Business capital) کہا جاتا ہے۔ گویا مغربی جرمنی میں اس کی حیثیت وہی ہے جو ہندستان میں بمبئی کی اور امریکہ میں نیویارک کی۔ ۱۹۴۴ کے ہوائی حملہ میں فرینکفرٹ تباہ ہو گیا تھا۔ تاہم اب چند تاریخی عمارتوں کے سوا کہیں اور اس کا نشان موجود نہیں ——— اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تخریب کے بعد نئی تعمیر کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

فرینکفرٹ میں ایک دکان ہے جو ۲۲۵ سال سے مسلسل جاری ہے اس کا نام میسن (Meissen) ہے۔ یہ کٹلری کی دکان ہے۔ یہاں سے آپ ۷۰ قسم کی قینچیاں اور ایک سو قسم کی چھریاں خرید سکتے ہیں ——— تجارت کی کامیابی سب سے زیادہ استقلال پر منحصر ہے۔ مگر یہی صفت موجودہ مسلمانوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔

فرینکفرٹ سے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۷۶ کے ذریعہ سفر ہوا۔ ساڑھے نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز نیویارک پہونچا۔ نیویارک میں باہر کا موسم کافی ٹھنڈا تھا۔ تاہم ایرپورٹ کے اندر

کا آدمی اپنے آپ کو ایک جزیرہ میں محسوس کر رہا تھا۔ نیو یارک کو عالمی اقتصادی مرکز (World Financial Centre) کہا جاتا ہے۔ یہ جدید مواصلاتی ذرائع کا کرشمہ ہے، اس کے بغیر کسی شہر کو عالمی اقتصادی مرکز کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد تقریباً ۴۰ سال تک امریکہ کو یہ حیثیت حاصل رہی۔ مگر اب امریکہ پر زوال کے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کا اعتراف حال میں خود رونالڈ ریگن نے کیا۔

پین ایم کی میگزین (دسمبر ۱۹۸۸) میں ایک مضمون سفر کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ سفر میں اگرچہ بہت سے فائدے ہیں، لیکن سفر ایک تھکا دینے والا عمل (Tiring task) ہے۔ کم از کم یہ بات میرے لیے صد فی صد سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ اس سفر کے لیے جب میں دہلی سے روانہ ہوا تو گھر سے رخصت ہوتے ہوئے میری زبان سے نکلا: مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں مذبح کی طرف جا رہا ہوں۔ سفر میں خواہ بظاہر کتنی ہی چمک دمک ہو، مگر میرے لیے وہ ہلاکت خیز حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہر بار یہ سوچتا ہوں کہ اب کبھی کسی سفر میں نہ جاؤں گا۔ مگر مشن کا تقاضا مجبور کرتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔

انسان کا ذہن قدرت کا ایک خاموش کارخانہ ہے۔ وہ ہر آن اپنی "پیداوار" دیتا رہتا ہے۔ البتہ عام کارخانوں کی طرح، ذہن کا معاملہ بھی یہ ہے کہ جیسا "خام مال" اس کے اندر ڈالا جائے اسی کے مطابق وہ اپنی پیداوار دے گا۔ مثلاً ایک شخص حسد، بغض، گھمنڈ اور ناجائز نفع اندوزی جیسی چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے تو اس کے ذہن سے جو چیزیں بن کر نکلیں گی، وہ انھیں برائیوں کا مرکب ہوں گی۔ اس کے برعکس جو شخص صالح چیزیں اپنے ذہن میں ڈالے اس کا ذہن صالح پیداوار کا کارخانہ بن جائے گا۔

میرے اندر خدا کے فضل سے توحید، آخرت اور تعمیر پسندی کا مزاج ہے۔ اس لیے میرے ذہن سے جو فکری پیداوار برآمد ہوتی ہے وہ ہمیشہ انھیں چیزوں کا مرکب ہوتی ہے۔ نیو یارک سے لاس اینجلس جاتے ہوئے راستہ میں بن جانسن کا واقعہ ذہن میں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ لوگوں نے مجھ سے میرا میڈل چھینا ہے نہ کہ میری رفتار (الرسالہ فروری ۱۹۸۹، صفحہ ۵)

میرے ذہن میں آیا کہ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہیں تو وہ یہ ہوگا کہ: لوگوں نے مجھ

سے اپنی دی ہوئی چیز چھینی ہے نہ کہ خدا کی دی ہوئی چیز۔ انسان کی دی ہوئی چیز ہمیشہ کم ہوتی ہے اور خدا کی دی ہوئی چیز ہمیشہ زیادہ ۔ ہر آدمی جب بھی کوئی چیز کھوتا ہے تو وہ "کم" کو کھوتا ہے "زیادہ" پھر بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے ۔ آدمی کو چاہیے کہ کم کو بھول کر زیادہ پر اپنی ساری توجہ لگا دے ۔

ایک اور موقع پر ایک تجربہ گذرا ۔ اس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ آ گئے : آج کا انسان تمنا کے درجہ میں بھی جنت کا طالب نہیں، عمل کے درجہ میں اس کا طالب ہونا تو درکنار ۔ ایسی حالت میں لوگوں پر جنت کے دروازے کھلیں تو کیسے کھلیں ۔

ہندستان سے امریکہ جانے کے لیے پان امریکن کی دو روٹ ہیں ۔ ایک لندن کے راستہ سے ۔ دوسرا، فرینکفرٹ کے راستہ سے ۔ پچھلی بار نومبر ۱۹۸۵ میں جب میں امریکہ گیا تھا تو لندن کے راستہ سے گیا تھا ۔ امریکہ کے لیے میرا موجودہ سفر ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہوا ۔ کانفرنس کے منتظمین نے اس بار جو ٹکٹ بھیجا وہ فرینکفرٹ کے راستہ سے تھا ۔ جس دن میں نے فرینکفرٹ سے نیویارک کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۶۷ سے سفر کیا ۔ عین اسی دن پین ایم کا دوسرا جہاز فلائٹ نمبر ۱۰۳ لندن سے نیویارک کے لیے روانہ ہوا تھا ۔ اگر میری روٹ لندن



کے راستہ سے ہوتی تو میں عین اسی جہاز میں ہوتا۔

لندن سے نیویارک جانے والے اس جہاز (فلائٹ ۱۰۳) کے ساتھ عجیب حادثہ پیش آیا۔ لندن سے روانہ ہو کر وہ فضا میں بلند ہوا اور ۳۱ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہونچ کر ۸۰۰ کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑنے لگا۔ جب وہ اسکاٹ لینڈ میں داخل ہوا تو اچانک اس میں دھماکہ ہوا۔ وہ وہاں کے ایک گاؤں لاکربی (Lockerbie) کے اوپر گر پڑا۔ جہاز مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اس کے اوپر اس وقت ۲۵۸ مسافر تھے جو سب کے سب فوراً ہی ہلاک ہو گئے۔

امریکہ کی سرزمین پر اترنے کے بعد مجھے جو پہلی خبر ملی وہ یہی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری روٹ کو بدل دیا۔ اگر میرا سفر لندن کے راستہ سے ہوتا تو الرسالہ کے قارئین کو "سفرنامہ" کے بجائے شاید میری موت کی خبر پڑھنے کو ملتی۔

امریکہ کی سرزمین پر پہلی بار میں اپریل ۱۹۸۳ میں آیا تھا۔ اس کی مختصر روداد الرسالہ جون ۱۹۸۳ میں چھپ چکی ہے۔ اس وقت میں ٹرانزٹ پیسنجر کے طور پر نیویارک ایرپورٹ پر اترا تھا۔ اس موقع پر ایک عجیب ناقابل فہم واقعہ پیش آیا۔ ہوائی جہاز سے اتر کر میں بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ کاؤنٹر پر کھڑا ہو گیا۔ میری باری آئی تو کلرک نے میرے پاسپورٹ پر مہر لگانے کے بجائے اس کو اپنے پاس رکھ کر مجھے ایک طرف کھڑا کر دیا۔

میں انتظار میں کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ تمام مسافر ایک کے بعد ایک چلے گئے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام سپاہی آیا۔ کلرک نے فوراً میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا جیسے کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا ہو۔ اب میں اس سپاہی کی تحویل میں تھا، اور میرا پاسپورٹ اس کے قبضہ میں تھا۔ وہ مجھ کو لے کر لاؤنج میں کھڑا ہو گیا۔ اب دوبارہ ایک اور شخص کے انتظار کا مرحلہ شروع ہوا۔ کافی دیر کے بعد ایک سفید فام پولیس افسر آیا۔ سیاہ فام سپاہی نے اب میرا پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔

سفید فام پولس افسر نے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلا۔ یہاں تک کہ ہم لوگ ایرپورٹ کے باہر پہونچ گئے۔ یہاں پولس کی ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کار پر بیٹھ گئے۔ کار روانہ ہوئی اور مختلف سڑکوں سے ہوتی بالآخر ایک بڑی بلڈنگ کے سامنے

رکی۔ پولس افسر مجھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ یہ اس کا دفتر تھا۔ یہاں اس نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔ اور مشین پر میرے پاسپورٹ کے ہر صفحہ کا فوٹو لینے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر میں نے پولس افسر سے کہا :

Am I under arrest?

اس نے مسکرا کر کہا کہ نہیں۔ اب تک ہم دونوں خاموش تھے۔ اب باتیں ہونے لگیں۔ میں نے اسلامی مرکز کا تعارف کرایا تو وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔ اس نے اپنا نام مسٹر لوئی (My Louis) بتایا۔ اس پولس افسر کی کار پر بیٹھے بیٹھے میں نے پہلی بار نیویارک شہر کی ایک جھلک دیکھی۔ تاہم کسی نامعلوم ہدایت کی بنا پر اس نے میرا پاسپورٹ مجھے نہیں دیا۔ وہ مجھ کو لے کر دوبارہ ایرپورٹ آیا اور خود ہی ایر انڈیا کی پہلی فلائٹ سے میری سیٹ کنفرم کرائی اور مجھ کو ہوائی جہاز کے اندر داخل کر کے بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ آپ کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات آپ کو پائیلٹ کے ذریعہ مل جائیں گے۔ چنانچہ دوران پرواز مجھے ایک لفافہ دیا گیا جس میں پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔

امریکہ کے لیے میرا دوسرا سفر نومبر ۱۹۸۵ میں ہوا۔ اس سفر کی مفصل روداد الرسالہ مارچ۔ اپریل ۱۹۸۶ میں شائع ہو چکی ہے۔ امریکہ کا تیسرا سفر موجودہ سفر تھا جو دسمبر ۱۹۸۸ میں ہوا۔

ہوائی سفر کے اعتبار سے ہماری آخری منزل لاس اینجلیز تھی۔ نیویارک سے لاس اینجلیز تک کا فاصلہ ساڑھے پانچ گھنٹہ میں طے ہوا۔ ایرپورٹ سے جائے قیام (انا ہائم) تک ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کا ساتھ رہا۔ راستہ کی گفتگو میں انھوں نے بتایا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد بالکل صحیح طور پر معلوم نہیں۔ عام اندازہ کے مطابق ۸ ملین سے ۱۰ ملین تک مسلمان امریکہ میں آباد ہیں۔ ان مسلمانوں میں عام طور پر دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو ایسے ملکوں سے آئے ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ دوسرے، وہ لوگ جو ایسے ملکوں میں تھے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور اب وہ وہاں سے آکر امریکہ میں آباد ہوئے ہیں۔

اکثریتی ملکوں کے مسلمانوں میں دینداری نسبتاً بہت کم پائی جاتی ہے۔ ان کے ملکوں میں دینی کام (مثلاً مسجد، مدرسہ وغیرہ) سب حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ نفسیاتی

طور پر یہ سمجھنے لگے کہ یہ سب حکومت کے کرنے کے کام ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں انھوں نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس اقلیتی ملکوں کے لوگ اپنے ملک میں خود ہی یہ سب کام کر رہے تھے۔ چنانچہ جب وہ امریکہ (یا دوسرے مغربی ملکوں) میں آئے تو اپنی سابقہ نفسیات کے تحت انھوں نے اس کو خود اپنی ذمہ داری سمجھا کہ وہ اپنے دین کا تحفظ کریں اور مسجد اور مدرسے اور دینی ادارے قائم کریں۔ اس وقت امریکہ میں کثرت سے مدرسے اور اسلامی مراکز قائم ہیں۔ اور یہ زیادہ تر اقلیتی ملکوں کے لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صدیقی نے بتایا کہ تاہم یہاں کا تہذیبی دباؤ بہت سخت ہے۔ بمشکل دس فی صد مسلمان ایسے ہوں گے جو اپنے دین کے لیے واقعۃً فکرمند ہوں۔ ڈاکٹر صدیقی کی گفتگو ایک یہودی سے ہوئی۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ مغربی ملکوں میں بھی ہم اسلامی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں (we can survive) یہودی نے ان کی بات کو سنا اور پھر بولا کہ تیسری نسل کے بعد آکر مجھے بتانا :

Come and tell me after third generation

جس ادارہ کی دعوت پر میرا یہ سفر ہوا، اس کے دفاتر گارڈن گروو (Garden Grove) میں واقع ہیں۔ تاہم سیرت کانفرنس کا اہتمام قریب کے شہر اناہائم (Anaheim) میں کیا گیا تھا۔ یہ امریکہ کا ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں میرا قیام ہلٹن ہوٹل (Hilton and Towers) کے کمرہ نمبر ۱۴۸-۵ میں تھا۔ مذکورہ "انٹرنیشنل سیرت کانفرنس" کی کارروائیاں اسی ہوٹل کے ایک بڑے ہال میں انجام پائیں۔

اناہائم، کیلی فورنیا میں واقع ہے۔ کیلی فورنیا کے بعض حصے نہایت گرم ہیں۔ مشہور وادیٔ موت (Death Valley) کا تعلق اسی علاقہ سے ہے جو تقریباً ۲۲۵ کیلومیٹر لمبی ہے۔ پروفیسر ارونگ (T.V. Irving) کی تحقیق ہے کہ کیلی فورنیا کا لفظ اسپین سے آیا ہے۔ عرب جب اسپین آئے تو وہاں کے کسی گرم مقام کو انھوں نے قلعۃ الفرن (تنور کا قلعہ) کہا۔ یہ لفظ اسپینی لہجہ میں بگڑ کر کیلی فورنیا ہو گیا۔ اس کے بعد جب اسپین کے لوگ امریکہ آئے اور چلتے ہوئے اس مقام پر پہونچے تو یہ مقام انھیں بہت گرم محسوس ہوا۔ چنانچہ اس کا نام

انھوں نے کیلی فورنیا رکھ دیا۔ گویا کیلی فورنیا ایک عربی لفظ قلعۃ الفرن کی اسپینی صورت ہے۔

ہندستان ایک زیر ترقی ملک ہے۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ ایک ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں ہر چیز کا معیار ہندستان سے ممتاز طور پر مختلف ہے۔ مثلاً ہندستان کا ایک آدمی اپنے ٹی وی سٹ کو چلانے کے لیے اس کے پاس جاتا ہے اور اس کا بٹن دبا کر اس کو آن کرتا ہے۔ مگر یہاں آپ کو ٹی وی سیٹ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ فاصلہ پر لیٹے یا بیٹھے ہوئے دیا سلائی کے برابر ایک آلہ کا بٹن دبائیں گے اور آپ کا ٹی وی فوراً چلنے لگے گا۔ ریموٹ کنٹرول کا یہ طریقہ اب امریکہ میں بہت زیادہ عام ہو چکا ہے۔

ہوٹل کے کمرہ کا دروازہ کھولنے کے لیے ہمیں چابی استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے پاس تاش کے پتہ کی مانند ایک چھوٹا سا سوراخ دار کارڈ تھا۔ اس کو ایک خانہ میں ڈالا جاتا تو وہاں ہری بتی جل جاتی۔ اس کے بعد ایک ہینڈل دبانے سے دروازہ اپنے آپ کھل جاتا تھا۔ یہ کمپوٹر کا کرشمہ تھا۔ وغیرہ، وغیرہ۔

ہوٹل کے کمرہ کی پشت پر دیواری شیشہ کے باہر میں نے دیکھا تو کمرہ سے ملا ہوا وسیع پارک نظر آرہا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے خیال آیا کہ میں تو ہوٹل کی پانچویں منزل پر ہوں، پھر یہاں پارک کیسا۔ مگر یہ چھت کا پارک تھا۔ ہوٹل کے درمیان میں وسیع چھت پر درخت اور پھول اگا کر یہ پارک قائم کیا گیا تھا۔ تاہم اس کی زمین مصنوعی تھی۔ بظاہر زمین پر گھاس کا ہرا لان دکھائی دیتا تھا۔ مگر وہ درحقیقت کیمیائی قالین تھا جو کٹی ہوئی گھاس کی مانند بنا کر زمین پر بچھا دیا گیا تھا۔

ہلٹن ہوٹل کے جس وسیع ہال میں سیرت کانفرنس ہو رہی تھی، ایک بار مجھے اس کے ٹوائیلٹ میں جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کے اندر میں نے دیکھا کہ ایک ٹونٹی دار لوٹا (Watering can) رکھا ہوا ہے۔ پلاسٹک کا بنا ہوا یہ امریکی لوٹا اس ہندستانی لوٹے سے بالکل مختلف تھا جس کے متعلق یہ استہزائی فقرہ مشہور ہے: "کیا آپ کے شامل بندھنا بھی ہے"۔ یہ اتنا خوبصورت اور اتنا موزوں بنا ہوا تھا کہ وہ آرٹ کا ایک نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اگر اتنا خوبصورت لوٹا بنایا ہوتا تو ناممکن تھا کہ کسی جواہر لال نہرو

کو یہ جرأت ہو کہ وہ ٹونٹی دار لوٹے کو مسلم تہذیب کا نشان بتا کر اس کا مذاق اڑائے۔ اس کے بعد لوٹے کا مذاق اڑانا خود اپنی بد ذوقی کا اشتہار دینے کے ہم معنی بن جاتا، اور کون ہے جو اپنی بدذوقی کا اشتہار دینا پسند کرے۔

کانفرنس کے دوران عربوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ ۲۴ دسمبر کو فجر کی نماز کے لیے مقررہ ہال میں پہونچا تو وہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ ڈاکٹر جمال بدوی موجود تھے۔ وہ مصری ہیں اور آج کل کناڈا میں رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے اصرار کیا۔ میں نے یہ کہہ کر ان کو آگے بڑھادیا: الائمة من العرب، وانا احبّ ان اسمع قرأة العرب۔

فنی قاریوں کی قرأت مجھے پسند نہیں۔ مگر عربوں کی سادہ قرأت مجھے بے حد پسند ہے۔ ایک عرب عالم جب قرآن کی قرأت کرتا ہے تو اس کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ صوتی لہروں پر میرا رشتہ ماضی سے قائم ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر ایک ارتعاش (thrill) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام بھی اسی طرح قرآن کو پڑھتے ہوں گے۔

یہ اسلام کی ایک نادر خصوصیت ہے جو آج کسی بھی دوسرے مذہب کو حاصل نہیں۔ دوسرے مذاہب کی کتابیں جن زبانوں میں تھیں وہ آج مردہ زبانیں بن چکی ہیں۔ یہ زبانیں جس لہجہ میں اپنے ابتدائی زمانے میں بولی جاتی تھیں، ان کا تسلسل بعد کی تاریخ میں قائم نہ رہ سکا۔ اس لیے آج یہ جاننا ناممکن ہے کہ قدیم مذاہب کی مقدس کتابوں کو ان کے ابتدائی حاملین کس طرح پڑھتے تھے۔ مگر قرآن کی زبان پوری طرح ایک زندہ زبان ہے۔ اس کا لہجہ تواتر کے ساتھ تاریخ میں سفر کرتا ہوا ہم تک پہونچ رہا ہے۔ آج کا ایک فصیح عرب عالم جب قرآن کو پڑھتا ہے تو وہ عین وہی لہجہ ہوتا ہے جس میں اصحاب رسول قرآن کو پڑھتے تھے۔ اس طرح ہر فصیح عرب عالم گویا صحابہ کرام کی قرأتِ قرآن کا زندہ ٹیپ ہے ـــــ اللہ تعالیٰ کا کیسا عجیب احسان ہے جو "قرآنِ محفوظ" کی صورت میں انسانیت کے حصہ میں آیا ہے۔

قومی آواز (۱۳ جنوری ۱۹۸۹) میں ایک عالم کی تقریر نقل ہوئی ہے۔ موصوف نے ایک عربی مدرسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس کی زبان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے جس کی وجہ سے ڈیڑھ ہزار سال سے یہ کلام اور زبان آج تک ایک حرف کی تبدیلی کے

بغیر محفوظ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں تغیرات رونما ہوئے اور ان کی اصلی حالت زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہی۔ لیکن عربی زبان انقلاباتِ زمانہ کے باوجود اپنی اصل حالت پر برقرار ہے۔ کیوں کہ یہ کلامِ الٰہی ہے اور اس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ مسلمان بجا طور پر اس پر فخر کر سکتے ہیں (صفحہ ٦)

قرآن کا اور عربی زبان کا محفوظ ہونا اہل اسلام کے لیے فخر کی بات نہیں بلکہ شکر کی بات ہے۔ کوئی شخص کہے کہ سورج کروروں سال سے برابر روشن ہے اور اس پر ہمیں فخر کرنا چاہیے تو یہ ایک لغو بات ہوگی۔ کیوں کہ سورج کو دیکھ کر ہمارے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فخر کا جذبہ۔ اسی طرح قرآن اور عربی کا محفوظ ہونا بھی شکر کا موضوع ہے نہ کہ فخر کا موضوع۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل غلطی یہی ہے کہ انھوں نے قرآن اور اسلام کو اپنا قومی فخر بنالیا ہے۔ یہی وہ برائی ہے جس میں اس سے پہلے یہود مبتلا ہوئے، اور اب مسلمان بہت بڑے پیمانہ پر اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کے پروگرام میں شیخ جاد الحق (شیخ الازہر، قاہرہ) ڈاکٹر عبدالمحسن الترکی (ریاض) اور ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف (مکہ) کا نام بھی تھا۔ وہ لوگ اس کے اجلاس کو خطاب کرنے والے تھے مگر آخر وقت میں کچھ اسباب پیش آنے کی وجہ سے وہ شرکت نہ کر سکے۔ ان لوگوں کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس میں ایک عرب شیخ نے بہت دلچسپ تقریر کی۔ انھوں نے عربی میں خطاب کرتے ہوئے کہا: ھل قرأتم فی القرآن: ادُع الی سبیل ربك بالسیف او بالارھاب (کیا آپ نے قرآن میں پڑھا ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف تلوار اور دہشت گردی کے ذریعہ بلاؤ) اس کے برعکس قرآن میں ہے کہ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلاؤ (النحل ١٢٥) اس کے بعد انھوں نے بہت اچھے انداز میں اس کی تفصیل کی کہ دعوت دل کو جیتنے کا نام ہے نہ کہ جسم کو قتل کرنے کا۔

میں نے کہا کہ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گا کہ دوسرے لوگ اگر "سیف" کو استعمال کریں تب بھی ہمیں حکمت اور موعظت حسنہ ہی کے طریقہ پر قائم رہنا ہوگا۔ اس کے

بغیر حکیمانہ دعوت کا عمل جاری رہنا ممکن نہیں ۔

ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی (ملک عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ) نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ لوگوں کی نظر میں ان کی منفی تصویر (Negative image) بن گئی ہے ۔ اس صورت حال کو بدلنا اور لوگوں کی نظر میں مسلمانوں کی مثبت تصویر (Positive image) بنانا وقت کا سب سے بڑا کام ہے ۔ یہ عین وہی بات ہے جس کی الرسالہ مشن کے ذریعہ کوشش کی جارہی ہے ۔ ڈاکٹر مدثر حسین صدیقی ہمارے اس مشن سے پوری طرح واقف ہیں ۔

میں نے کہا کہ یہ بات صحیح ہے ، مگر وہ اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اس میں یہ دوسری بات شامل نہ کی جائے کہ تصویر کو بدلنے کا یہ کام خود مسلمانوں کو کرنا ہوگا ۔ اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ مسلمان دوسروں کی ایذا رسانی پر یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کریں ۔

۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ کو شام کے اجلاس میں میں نے اپنا مقالہ (انگریزی) پڑھ کر سنایا ۔ سننے کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کی کاپی حاصل کرنا چاہا ۔ کانفرنس کے منتظمین کی طرف سے بتایا گیا کہ یہ مقالہ (دوسرے مقالوں کے ساتھ) کتابی مجموعہ میں شائع کیا جائے گا ۔ نیز اس کا مکمل ویڈیو ٹیپ بھی کانفرنس کے منتظمین کے پاس موجود ہے ۔ مقالہ کا عنوان یہ تھا :

Dawah Activism: The Prophetic Method

۲۴ دسمبر کی شام کو " ورک شاپ " تھی ۔ اس میں کافی لوگ شریک ہوئے ۔ اس نشست کے ماڈریٹر ڈاکٹر عبدالرحیم الطالب (سوڈانی) تھے ۔ ایک اعتبار سے یہ " سوال وجواب " کی مجلس تھی ۔ سب کے سب پڑھے لکھے لوگ تھے ۔ پوری گفتگو نہایت سنجیدہ علمی انداز میں ہوئی ۔

ابتداءً میں نے دعوت کے بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی کچھ مزید وضاحت کی ۔ اس کے بعد تحریری انداز میں سوالات آنا شروع ہوئے ۔ تقریباً دو درجن سوال آئے ۔ میں نے مختصر اور مثبت انداز میں سوالات کا جواب دیا ۔ یہ سوالات کس قسم کے تھے ، اس کا اندازہ کرنے کے لیے تین سوالات یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

1. Please tell us which are the books in English that can enlighten the non-Muslims who are interested in accepting Islam.

2. We are having difficulty in doing Dawah work because of bad and wrong practices of Muslims. The religion of Islam teaches one thing and the Muslims do just against it. What is your answer to this problem.

3. Could you explain how does one manage to awaken his or her spiritual consciousness.

۲۳ دسمبر کی شام کو کانفرنس ہال میں ایک اثر انگیز واقعہ پیش آیا۔ اسی روز میں نے اپنا ۴۵ منٹ کا مقالہ پڑھا تھا۔ جیسے ہی میں نے اپنا مقالہ ختم کیا۔ سامنے کی نشستوں پر ایک امریکی نوجوان کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس نوجوان کو اسٹیج پر لایا گیا اور مائک کے پاس کھڑا کرکے اس سے کلمہ پڑھایا گیا۔ اس کے بعد انگریزی میں کلمۂ شہادت کی تشریح بتائی گئی۔

بعد کو اس نوجوان سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنا نام میریو سرانو (Mario Serrano) بتایا۔ اس کی عمر ۲۳ سال تھی۔ اس نے بطور خود کچھ اسلام کا مطالعہ کیا تھا، مگر اسلام قبول کرنے کی بابت آخری فیصلہ اس نے کانفرنس میں میرا مقالہ سننے کے بعد کیا۔ اسی طرح امریکہ میں اور پوری دنیا میں ہر روز کچھ نہ کچھ افراد اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ اسلام کی اپنی طاقت کے ذریعہ ہو رہا ہے، مسلمانوں کے کسی باقاعدہ تبلیغی عمل کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

۲۴ دسمبر کی شام کو آخری پروگرام تھا۔ اس موقع پر امریکن مسلم کمیونٹی کے قائد امام ویلیس (وارث) محمد نے خطاب کیا۔ وہ باقاعدہ باڈی گارڈ کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ وہ شکاگو سے خاص اسی شرکت کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اسلامی عبادت کے موضوع پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اسلام کا مقصد مکمل لبریشن ہے۔ یعنی انسان کو ہر عملی یا فکری بندھن سے آزاد کرکے ایک خدا کا عابد بنانا۔

آخری تقریر سعودی عرب کے پرنس محمد الفیصل کی تھی۔ وہ سعودی ایمبیسی (واشنگٹن) میں اسلامک افیرس شعبہ کے چیرمین ہیں۔ مسلم ملکوں میں غالباً سعودی سفارت خانہ پہلا سفارت خانہ ہے جس نے اس قسم کا اسلامی شعبہ بڑے پیمانہ پر قائم کیا ہے۔ پرنس محمد الفیصل نے نہایت

سادہ اور سنجیدہ انداز میں انگریزی میں تقریر کی جس میں لقد جاءکم رسول من انفسکم (التوبہ ۱۲۸) کی تشریح بیان کی۔ انھوں نے اپنی تقریر اس جملہ پر ختم کی کہ یہاں آنے سے میرا مقصد آپ کے ساتھ شریک ہونا تھا نہ کہ آپ سے کچھ کہنا:

I came here to share something with you,
rather than to say something to you.

کانفرنس ۲۳۔۲۴ دسمبر ۱۹۸۸ کو تھی۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ یہاں مزید قیام کیا جائے اور مختلف مقامات (نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو وغیرہ) میں پروگرام رکھا جائے اور وہاں خطابات کیے جائیں۔ اگر میں ان لوگوں کی تجویز مان لیتا تو مجھے کئی مہینے تک یہاں ٹھہرنا پڑتا۔ مگر یہ میرے لیے ممکن نہ تھا، اس لیے کانفرنس کے بعد میں صرف چند دن ٹھہر سکا اور بعض اجتماعات کو خطاب کیا۔

۲۳ دسمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی ۔ یہ مسجد پہلے چرچ تھی۔ مسیحی حضرات نے اس کو فروخت کر دیا۔ چرچ کی یہ عمارت اب مسجد کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد میں قرآن کا مختصر درس دیا۔ ۲۵ دسمبر کو نماز ظہر کے بعد دوبارہ اس مسجد میں درس حدیث کا پروگرام تھا۔

جمعہ کے دن جب میں مسجد میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نمازی لوگ اس کے اندر متفرق طور پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر جب پہلی اذان ہوئی تو اس کے فوراً بعد تمام لوگ مل مل کر صف کی صورت میں کھڑے ہو گئے۔ جماعت سے پہلے کی سنّتیں انھوں نے صف بندی کرکے پڑھیں۔ سنّتوں سے فارغ ہو کر وہ صف بہ صف بیٹھ گئے۔ خطبہ کے بعد جب جماعت کی نماز شروع ہوئی تو ان کے اٹھتے ہی صفیں قائم ہو گئیں، "آگے آجائیے، آگے آجائیے" کی پکار بلند کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہی طریقہ ہندستانی مسجدوں میں بھی رائج ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔

پروفیسر ایوانے یازبیک حداد کے حوالہ سے معارف (جنوری ۱۹۸۹) میں ایک رپورٹ (امریکہ میں مسلمان) شائع ہوئی ہے۔ اس میں درج ہے کہ:

" امریکہ میں مسلمان عورتیں جمعہ کی نماز باجماعت ادا کرتی ہیں۔ مگر مرد اپنی ملازمت اور کاروباری مشغولیتوں کی وجہ سے جمعہ کی نماز کے لیے

مسجدوں میں نہیں جاسکتے۔ چنانچہ وہ اتوار کو اجتماعی طور پر ظہر کی نماز ادا کرتے ہیں " صفحہ ۶۰

امریکہ کے مسلمان مردوں کے بارہ میں اس رپورٹ میں جنرلائزیشن سے کام لیا گیا ہے۔ امریکہ کے مسلمان مرد تین قسموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو سرے سے نماز ہی نہیں پڑھتا۔ ایک گروہ اتوار کے دن ظہر کی باجماعت نماز کو جمعہ کے بدل کے طور پر ادا کرتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو حسب قاعدہ جمعہ کے دن جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے، ۲۳ دسمبر کو میں خود جمعہ کی ایک جماعت میں شریک ہوا۔

جناب صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر ۲۵ دسمبر کو عورتوں اور مردوں کی ایک تعداد جمع ہوئی۔ یہ زیادہ تر تاجر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ اس موقع پر آیات اور احادیث کی روشنی میں مفصل خطاب ہوا۔ ۲۷ دسمبر کو نماز عشاء کے بعد اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں تیسرا خطاب ہوا۔ اس کا موضوع حقیقتِ دین تھا۔ پھر ۲۸ دسمبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کی رہائش گاہ پر دوبارہ اجتماع ہوا۔ اس موقع پر میں نے اسلام میں آخرت کا تصور اور اس کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ ان سب تقریروں کا ٹیپ وہاں کے لوگوں کے پاس موجود ہے۔

۲۹ دسمبر کے اجتماع میں ایک انجینیر، صفی الرحمٰن قریشی (پیدائش ۱۹۵۱) بھی موجود تھے۔ میں نے دیکھا پورے مجمع میں وہ سب سے کم بولنے والے ہیں۔ اجتماع کے دوران وہ مکمل طور پر خاموش رہے۔ بعد کو ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک حدیث سنائی جس میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص چپ رہا، اس نے نجات پائی (من سکت نجا) میں نے کہا کہ آپ اس حدیث کی تشریح کن الفاظ میں کریں گے۔ انھوں نے کہا: "جب میں بول رہا ہوں تو میں سیکھ نہیں رہا ہوں" ان کی یہ مختصر تشریح مجھے بہت پسند آئی۔

ایک مجلس میں دعوتی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ہفت روزہ الدعوۃ (ریاض) کے شمارہ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا کہ کیا ہم مغرب کی مسلم نسلوں کو ضائع ہونے کے لیے چھوڑ دیں:

اجيالنا المسلمة في الغرب هل نتركها نهباً للضياع

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت مغربی دنیا میں جو مسلمان آباد ہیں، ان کی تعداد دس ملین

سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ گویا مغرب میں ہمارے سفیر ہیں (ھم سفراءنا فی الغرب)

یہ بلاشبہ صحیح ترین لقب ہے جو مغرب میں مقیم مسلمانوں کو دیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر امریکہ میں جو مسلمان آباد ہیں، انھیں اگر اپنی اس حیثیت کا شعور ہو جائے تو وہ اسلام کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

میں نے انھیں ایک حدیث سنائی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، مگر وہ مدینہ ہے (اُمِرتُ بقریۃ تأکل القری یقولون یثرب وھی المدینۃ) اس حدیث سے اسلام کا طریق کار معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ "مکہ" میں اگر اسلامی دعوت کے لیے حالات نامساعد ہوں تو "مدینہ" کو دعوتی مرکز بنا کر دوسرے علاقوں کو مسخر کرو۔ یہ طریق کار دور اول میں نہایت کامیابی کے ساتھ زیر عمل لایا جا چکا ہے، اور موجودہ زمانہ میں بھی اس کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔

میں نے کہا کہ امریکہ کو آج اسی قسم کے ایک "قریہ" کا مقام حاصل ہے۔ امریکہ میں وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو قدیم زمانہ میں "یثرب" میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں کے لوگوں میں مختلف اسباب سے دین حق کی پیاس پیدا ہو چکی ہے۔ یہاں دعوت و تبلیغ کے آزادانہ مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں وہ تمام جدید ترین اسباب و وسائل مہیا ہیں جو اشاعت فکر کے کام کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے درکار ہیں۔

مزید یہ کہ امریکہ کو، ایک اعتبار سے، عالمی قیادت کا مقام حاصل ہے۔ اگر امریکہ میں موثر انداز میں دعوتی کام کر کے یہاں کی اکثریت کو اسلام کے دائرہ میں داخل کر لیا جائے تو وہ دوسری قوموں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث کے الفاظ میں، امریکہ کا "قریہ" دوسرے تمام قریوں کو نگل جائے گا۔

مک کلوسکی (Pete McCloskey) امریکہ کے ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ وہ پندرہ سال تک کانگرس (پارلیمنٹ) کے ممبر رہے ہیں۔ وہ مسلم نواز مشہور ہیں، خاص طور پر فلسطین کے معاملہ میں وہ کھلے طور پر اسرائیل کے مخالف اور عربوں کے حامی ہیں۔ چنانچہ یہاں کے یہودی ان کے سخت مخالف ہیں۔ پچھلے الکشن (کیلی فورنیا) میں یہودیوں نے ان کے خلاف متحدہ ووٹ دے کر انھیں ہرا دیا۔

اس حلقہ انتخاب میں یہودی ووٹروں کی تعداد ۸۰۰۰ ہے۔

دسمبر ۱۹۸۸ میں نیویارک میں پانچواں "مسلم ورلڈ ڈے" منایا گیا۔ اس موقع پر روز ویلٹ ہوٹل کے ہال (Grand Ballroom) میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر مک کلوسکی نے کہا کہ امریکہ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد یہودیوں سے زیادہ ہے۔ اس کے باوجود یہودی یہاں کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کا یہاں کی پالیسیوں پر کوئی اثر نہیں۔ اس کی وجہ خود مسلمان ہیں نہ کہ امریکی نظام۔ امریکی مسلمان اگر اپنے ووٹوں کا بھرپور استعمال کریں تو وہ یہاں کے نظام کو بدل سکتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ یہود نوازی امریکہ کی روایتی پالیسی نہیں۔ موجودہ یہود نواز پالیسی کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کا یہودی گروپ نہایت گہرے طور پر یہاں کے سیاسی عمل میں شریک ہے اور ہر سطح پر اس میں حصہ لیتا ہے۔ امریکہ میں ایک اور طاقتور گروپ ہے جو تعداد میں زیادہ بڑا ہے۔ یہ عرب ہمدردوں (مسلمانوں) کا گروپ ہے۔ مگر وہ ہمارے سیاسی عمل میں شرکت نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کی پامالی کے بارہ میں آپ کے احساسات امریکی نظام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک آپ اس مقصد کے لیے منظم نہ ہو جائیں:

> The reason for the pro-Israeli policy of the United States is because one group of people in this country is deeply involved in political process and participates in it at all levels. The United States has another strong group which is greater in size and that group is Arab sympathisers, (yourselves), which has not participated in our political process. Your feelings about human rights violations will not be translated into American system unless you are not organized.
>
> (*The Minaret,* New York, December 16, 1988)

آپ کو امریکہ میں اور امریکہ کے باہر بے شمار مسلمان ملیں گے جو امریکہ کی مسلم دشمنی پر الفاظ کا دریا بہائیں گے۔ مگر ایسا مسلمان شاید ایک بھی نہ ملے جو سنجیدہ طور پر یہ رائے رکھتا ہو کہ یہ خود اپنی عملی کوتاہی کا مسئلہ ہے نہ کہ امریکہ کی اسلام دشمنی کا۔ امریکہ کو "مسلم دشمنی" کے مقام سے ہٹا کر مسلم نوازی اور اسلام دوستی کے مقام پر لانے کے دو یقینی راستے ہیں۔ ایک دعوتی عمل کا راستہ، جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ دوسرا سیاسی عمل کا راستہ، جس کی نشاندہی مسٹر مک کلوسکی نے کی۔

مگر مسلمانوں کے اندر نہ پہلے عمل کے لیے کوئی حقیقی جذبہ ہے اور نہ دوسرے عمل کے لیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ خود تو اپنی ساری طاقت اپنا ذاتی مستقبل بنانے میں لگائے رہیں، اور دوسرے لوگ آکر ان کا ملی مستقبل بنا دیں، مگر اس دنیا میں ایسا واقعہ کبھی ظاہر ہونے والا نہیں۔

مسلمانوں کی ایک مجلس میں امریکہ میں رہنے والے ہندوؤں کا ذکر آیا۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ وہ لوگ تو رات دن بس ڈالر کمانے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بھی تو یہاں یہی کر رہے ہیں۔ دونوں میں صرف نام کا فرق ہے۔ ہندو کے نزدیک "ڈالر" اگر مذہبی دیوتا ہے تو آپ کے یہاں ڈالر زندگی کا مقصد۔

ڈاکٹر رالف سسن (Dr Ralph R. Sisson) اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک میں کمیونی کیشن کے پروفیسر ہیں۔ پیدائشی طور پر وہ عیسائی ہیں اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے میں نے ایک ملاقات میں پوچھا کہ امریکہ میں یہودی صرف ۳ فی صد ہیں، اس کے باوجود وہ یہاں چھائے ہوئے ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ہارڈ ورک (سخت محنت) اس کے برعکس یہی سوال کسی مسلمان سے کیجئے تو بلا تامل اس کا جواب ہوگا کانسپریسی (سازش)

موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسری قوموں کے بارہ میں نفرت میں مبتلا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کے بارہ میں صحیح رائے قائم نہیں کر پاتے۔ مذکورہ امریکی پروفیسر اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھا۔ اس نے محبت اور نفرت سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحیح رائے قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان لکھنے والوں نے امریکی یہودیوں کے بارہ میں بے شمار کتابیں اور مضامین شائع کیے ہیں جن میں جوش و خروش کے ساتھ یہودی سازشوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام تحریریں بالکل سطحی ہیں۔ وہ اپنے قاری کو اصل حقیقت سے باخبر نہیں کرتیں۔

امریکہ کے موجودہ سفر میں میں نے جو نئی باتیں دریافت کیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کی طاقت کا اصل راز ان کی تنظیم ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے امریکہ میں یہودیوں کی تعداد ۵۸ لاکھ بتائی ہے۔ اس قلت تعداد کے باوجود، انھوں نے اپنے تمام

قابل ووٹ افراد کو ووٹر لسٹ میں درج کرا رکھا ہے۔ ہر الکشن میں ان کے بیشتر افراد ووٹ دیتے ہیں اور ہمیشہ متحدہ طور پر اپنے ووٹوں کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے تمام ادارے شیرازہ کی طرح باہم مربوط ہیں۔ اپنے قومی مقاصد کے لیے وہ بے دریغ دولت خرچ کرتے ہیں۔ ان میں انفرادی سطح پر اختلافات ہیں، مگر قومی نوعیت کے معاملہ میں وہ ہمیشہ متحد رہتے ہیں۔ وہ اربابِ کار سے مسلسل ربط رکھتے ہیں اور ان کی رائے کو اپنے حق میں متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر کام منظم انداز میں کرتے ہیں نہ کہ اس طرح منفرد انداز میں جس کا ہمارے یہاں عام رواج ہے۔

امریکی مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۸ سے ۱۰ ملین تک ہے۔ جب کہ یہودیوں کی موجودہ تعداد زیادہ سے زیادہ ۶ ملین قرار دی جاسکتی ہے۔ مگر مسلمان ہر معاملہ میں یہودیوں کے بالکل برعکس ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ملک گیر تنظیم نہیں۔ ان کے بے شمار ادارے ہیں، مگر سب کے سب آزاد ادارہ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ان کے ووٹ یہودیوں سے زیادہ ہیں مگر سیاسی بے شعوری کی بنا پر اب تک وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو استعمال نہ کر سکے۔ امریکی مسلمانوں کا نقطۂ نظر ایک لفظ میں یہ ہے کہ —— زیادہ سے زیادہ ڈالر کماؤ، اور بقیہ ہر چیز سے غیر متعلق رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کا متحد اور منظم ہونا ان کی اصل طاقت ہے، اور امریکی مسلمانوں کا غیر متحد اور غیر منظم ہونا ان کی اصل کمزوری۔ جو لوگ اس راز کو نہ جانیں وہ امریکی زندگی کی الف ب بھی نہیں جانتے۔

آخری اجتماع (۲۴ دسمبر) میں اسلامک سوسائٹی (گارڈن گروو) کے لیے تعاون کی اپیل کی گئی۔ لوگوں نے ڈالر کی صورت میں اپنے عطیات دینے شروع کیے۔ اسٹیج کے پاس ایک بلیک بورڈ رکھا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں مسلسل رقم کی مقدار لکھی جارہی تھی —— ایک ہزار ڈالر، ۲۰ ہزار ڈالر، ۳۵ ہزار ڈالر، اس طرح گنتی بڑھتے بڑھتے تقریباً ۹۰ ہزار ڈالر تک پہونچ گئی۔ پورا مجمع بیک وقت بلیک بورڈ پر عطیات کی مقدار دیکھ رہا تھا۔ یہ گویا چندہ کے قدیم طریقہ کو ماڈرنائز کرنا ہے۔ مجھے یہ طریقہ پسند آیا۔

گارڈن گروو (Garden Grove) امریکہ کا ایک شہر ہے جو لاس انجلیز کے قریب

پیسفک سمندر کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اسلامک سوسائٹی یہیں پر ۱۹۶۲ میں قائم ہوئی۔ اپنے دستور کے مطابق یہ ایک غیر سیاسی (Non-political) ادارہ ہے۔ اس میں برابر ترقی ہوتی رہی۔ اب وہ پانچ ایکڑ سے زیادہ بڑے رقبہ میں قائم ہے۔ اس کے اندر مسجد، کانفرنس روم، لائبریری، اسکول، وغیرہ واقع ہیں۔ اس سوسائٹی کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی ہیں۔

سوسائٹی کی ہر چیز امریکی معیار کے مطابق ہے۔ اس کے اسکول کو دیکھتے ہوئے ہم ایک بند دروازہ پر پہونچے۔ معلوم ہوا کہ اس کے اندر لفٹ لگی ہوئی ہے۔ اس لفٹ پر سوسائٹی کو ۴۵ ہزار ڈالر خرچ کرنا پڑا۔ یہاں کا قانون یہ ہے کہ ہر اسکول جو گراؤنڈ سے اوپر ہو، خواہ وہ صرف ایک منزل ہو، اس میں لفٹ (Elevator) لگانا ضروری ہے، تاکہ معذور طالب علموں کو اوپر چڑھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

امریکہ میں معذوروں (Handicapped) کا ہر سطح پر بے حد خیال کیا جاتا ہے۔ ہر جگہ انھیں خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ یہ صرف لفظی قانون نہیں ہے، بلکہ اس پر باقاعدہ عمل ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا اسکول اس وقت تک منظور نہیں کیا گیا جب تک اس نے لفٹ نہ لگالی۔ اب بھی اس کا جدید ترین طرز کا "کیچن" غیر منظور شدہ ہے، کیوں کہ اس کے طعام خانہ کے دروازہ پر چوکھٹ لگی ہوئی ہے جو معذوروں کی پہیہ دار گاڑی کے بآسانی گزرنے میں رکاوٹ ہے۔ واضح ہو کہ فی الحال سوسائٹی کے اسکول میں کوئی معذور طالب علم موجود نہیں۔

اسلامک سوسائٹی میں مسلم بچوں کے لیے ایک اسکول قائم ہے۔ یہ اسکول بھی جدید معیار کے مطابق ہے۔ ایک اجلاس میں بچوں نے عربی اور انگریزی میں تقریریں کیں۔ اس طرح کے پروگرام ہندستان میں بھی مکاتب و مدارس میں کیے جاتے ہیں۔ مگر یہاں بچوں نے جس طرح تقریریں کیں، ان کا معیار ہندستانی طلبہ سے بہتر نظر آیا۔ حسان صدیقی (۱۱ سال) نے عربی میں تقریر کی۔ یہ تقریر بالکل عرب لہجہ میں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عرب بچہ بول رہا ہے۔ اسلامک سوسائٹی کی طرف سے ایک ماہانہ میگزین بھی نکلتا ہے جس کا نام آرنج کریسنٹ (The Orange Crescent) ہے۔

امریکہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہاں ہر چیز کا ایک اسٹینڈرڈ قائم ہو گیا ہے۔ ملک کے ایک

حصہ میں چیزوں کا جو معیار ہے، وہی آپ کو پورے ملک میں نظر آئے گا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ نے امریکہ کے ایک شہر کو دیکھا ہو تو آپ نے تمام شہروں کو دیکھ لیا:

If you have seen one city, you have seen them all.

اس ماحول کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں جو اسلامی کام ہو رہے ہیں، وہ بھی، کم از کم ظاہر کے اعتبار سے، جدید معیار کے مطابق ہیں۔ ہندستان میں ہمارے بزرگوں نے دعوت کا کام زیادہ تر پست طبقات میں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اسلام کا معیار بھی پست ہو گیا۔ امریکہ میں عمومی طور پر پست و بلند کا یہ فرق نہیں ہے، اس لیے یہاں اسلام کا کام کرنے والوں کو بھی اپنا معیار بلند رکھنا پڑتا ہے، ورنہ یہاں کے ماحول میں وہ بے قیمت ہو کر رہ جائیں۔

امریکہ میں بڑی تعداد میں ایسے مراکز قائم ہیں جن کو یہاں کی اصطلاح میں "اسلامک سنٹر" کہا جاتا ہے۔ ہندستانی اصطلاح میں ان کو وسیع تر مسجد کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں مرکزی طور پر ایک مسجد ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے تعلیمی اور ثقافتی شعبے بھی۔ یہ مراکز یہاں کے مسلمانوں کے لیے نقطۂ اتحاد یا اجتماعی شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس قسم کے ایک مرکز کے بارہ میں معلوم ہوا کہ وہاں کے وابستہ مسلمانوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں میں نے لوگوں کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ اتحاد کی واحد قیمت اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔ اس سلسلہ میں صحابہ کرام کی بہت سی مثالیں دیں (اس تقریر کا ٹیپ مرکز میں موجود ہے)

تقریر کے بعد بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ "اختلاف کے باوجود اتحاد" کا یہ نظریہ ابھی تک ہم کو بتایا ہی نہیں گیا۔ حالاں کہ اس معاملہ میں اہم ترین بات یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ مشرق کے مسلمان ہوں یا مغرب کے مسلمان، سب کی واحد کمی یہ ہے کہ ان میں حقیقی شعور موجود نہیں۔ ہمارے علماء اور قائدین خود ہی بے شعوری کا شکار ہیں، پھر وہ دوسروں کو کس طرح شعور دے سکتے ہیں۔

اسلامک سوسائٹی (آرنج کاونٹی) کے علاقہ میں تقریباً ۴۰ ہزار مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم ان میں بمشکل دس فیصد ایسے مسلمان ہوں گے جو اسلامک سوسائٹی سے وابستہ ہوں۔ میں نے سوسائٹی

کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ علامہ اقبال کے پاس ایک بار کسی دور کے شہر سے ایک تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ اقبال نے معذرت کرتے ہوئے لکھا ——— اقبال خانہ نشین ہے۔ اور موجودہ طوفان کے زمانہ میں اپنے گھر کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے۔

میں نے کہا کہ امریکہ (اور دوسرے مغربی ملکوں) میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اور ان کی نسلیں ایک کلچرل طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ مغربی تہذیب کے طوفانی سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں "اسلامک سوسائٹی" جیسا مرکز ان کے لیے کشتیٔ نوح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر جگہ ایسے اسلامی مراکز قائم کریں، اور جہاں وہ قائم ہیں وہاں انھیں مضبوط کریں اور ان سے وابستہ رہتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ جو لوگ ان مرکزوں سے علاحدہ رہیں گے ان کے لیے اندیشہ ہے کہ وہ فکان من المغرقین (ہود ۴۳) کا مصداق ثابت ہوں۔

امریکی براعظم کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کو ساؤتھ امریکہ اور دوسرے کو نارتھ امریکہ کہا جاتا ہے۔ نارتھ امریکہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اگر صرف لفظ "امریکہ" بولا جائے تو اس سے یہی نارتھ امریکہ مراد لیا جاتا ہے۔ میرا موجودہ سفر نارتھ امریکہ میں ہوا جس کو زیادہ صحیح طور پر یو ایس یا یو ایس اے کہا جاتا ہے۔ امریکہ (یونائیٹڈ اسٹیٹس) کا رقبہ ۹۳۶۳۴۰۵ مربع کیلومیٹر ہے۔ یہ رقبہ انڈیا کے مقابلہ میں تین گنا زیادہ ہے۔

"امریکہ ایک خوش قسمت ملک ہے" ایک صاحب نے کہا "امریکہ میں ہر قسم کے قدرتی ذرائع وافر مقدار میں موجود ہیں، اور یہی اس کی غیر معمولی ترقی کا راز ہے۔" میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ امریکہ نے اگر ذرائع کی فراوانی کے بل پر ترقی کی ہے تو جاپان کی ترقی کے بارہ میں آپ کیا کہیں گے جہاں قدرتی ذرائع نایابی کی حد تک کم ہیں۔ سیاسی حالات کا غیر موافق ہونا اس پر مزید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جاپان کا ظاہرہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کی محنت اور دانش مندی ہر چیز پر فوقیت رکھتی ہے۔ وہ ہر دوسری چیز پر بالا ثابت ہوتی ہے۔

اینڈریو کلگور (Andrew Killgore) یہاں کی ایک مشہور شخصیت ہیں۔ انھوں نے امریکہ کی مہاجر کمیونٹی کے ایک اجتماع میں تقریر کی۔ اس میں انھوں نے کہا کہ کسی بھی سماج میں سب سے زیادہ محنت سے کام کرنے والے لوگ مہاجر ہیں:

The hardest working people in
any society are the immigrants.

امریکہ جیسے ملک میں جو حیثیت مہاجر کی ہے ، وہی ہندستان جیسے ملک میں اقلیتی فرقہ کی ہے ۔ ایک اعتبار سے ، دونوں ہی اقلیت کا کیس ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ امریکہ کی " اقلیت " زیادہ محنت کے ذریعہ اپنے کامیاب مستقبل کی تعمیر کر رہی ہے ، اور ہندستان کی " اقلیت " محنت کے راستہ کو چھوڑ کر احتجاج اور مطالبہ کا ناکام راستہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

اس فرق پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ امریکہ جیسے ملکوں کی " اقلیتیں " اپنی فطرت پر ہیں ۔ یہ فطرت کا سکھایا ہوا سبق ہے کہ جہاں کم مواقع ہوں ، وہاں زیادہ محنت کرو ۔ چنانچہ یہ لوگ فطرت کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں کہ محنت کی زیادتی سے مواقع کی کمی کی تلافی کرنے میں لگ جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس ہندستان جیسے ملکوں میں فطرت اور انسان کے درمیان ایک مصنوعی پردہ حائل ہو گیا ہے ۔ یہ نام نہاد لیڈروں کا پردہ ہے ۔ لیڈروں نے مسلسل جھوٹا سبق پڑھا کر یہاں کے انسان کو فطرت کے راستہ سے ہٹا دیا ہے ۔ ہندستان کی اقلیت کو اگر اس کے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو وہ بھی اپنی فطرت کے زور پر وہی طریقہ اختیار کر لیتی جو امریکہ کی اقلیت نے اختیار کیا ۔

امریکی اقلیت کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کی رہنما خدائی فطرت ہے ، ہندستانی اقلیت کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے رہنما جھوٹے انسانی لیڈر ہیں ۔ انھیں دو لفظوں میں دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے فرق کا راز چھپا ہوا ہے ۔

امریکہ کی آبادی ڈھائی سو ملین (۲۵ کروڑ) ہے ۔ اس میں چھ ملین یہودی ہیں ۔ کل آبادی کا تین فی صد ۔ اس اعتبار سے وہ یہاں کی ایک بہت چھوٹی اقلیت ہیں ۔ مگر امریکی یہودی اپنے کو اقلیت نہیں سمجھتے ۔ امریکی نظریہ کے مطابق ، وہ مختلف مگر برابر (Different but equal) کے اصول کو مانتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ اقلیت محض کوئی عددی معاملہ نہیں ۔ وہ دراصل ایک ذہنی حالت کا نام ہے :

Minority is a state of mind.

ہندستان میں بھی آپ کو ایسے مسلمان ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ ہم اس ملک میں اقلیت نہیں ہیں، ہم یہاں کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں۔ مگر ہندستانی مسلمان کی یہ بات محض ایک لفظی فخر ہے۔ جب کہ امریکی یہودی کی مذکورہ بات مواقع کار کو بتانے کے لیے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستانی مسلمان ہندستان میں اقلیت والے حقوق بھی حاصل نہ کر سکے۔ اس کے برعکس امریکی یہودی امریکہ کے ان مناصب پر قبضہ کیے ہوئے ہیں جو عام حالات میں صرف اکثریت کا حصہ ہوتے ہیں۔

لی آیا کوکا (Lee Iacoca) امریکہ کی تجارتی دنیا میں افسانوی شخصیت (Legend) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ کو امریکہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تجارت کے میدان میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور نیویارک سے چھپی ہے۔ یہاں میں نے یہ آپ بیتی دیکھی۔ اس کا نام ہے:

IACOCA: An Autobiography, 1984

انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ آدمی چلتا رہے حتی کہ برے وقتوں میں بھی۔ آدمی مایوس نہ ہو، حتی کہ اس وقت بھی جب کی اس کی دنیا منہدم ہو رہی ہو۔ میں نے سخت محنت کی اہمیت کو جانا۔ آخر کار آپ کو مفید بننا چاہیے:

I learned to keep going, even in bad times. I learned not to despair, even when my world was falling apart. And I learned about the value of hard work. In the end, you've got to be productive.

اپنی زندگی کی کہانی بیان کرنے کے بعد آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ کیسے یہاں تک پہونچے۔ میں وہی جواب دیتا ہوں جو میرے والدین نے مجھے بتایا تھا ـــــ اپنے آپ کو استعمال کرو:

People say to me: "You're a roaring success. How did you do it?" I go back to what my parents taught me. Apply yourself (p. 340).

امریکہ کے معمار اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا راز یہ بتاتے ہیں کہ اپنے آپ کو استعمال کرو

اس کے برعکس ہندستان کے مسلم لیڈر اپنے ہم قوم لوگوں کو یہ جھوٹا سبق سکھا رہے ہیں کہ دوسرے کے خلاف حقوق طلبی کی مہم چلاؤ۔

ہندستان میں تجارت کا مطلب لوٹ ہوتا ہے۔ یہاں میں کسی کے پاس ملکی صنعت کی بنی ہوئی کوئی چیز دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہو: ایک مرتبہ تو میں پھنس گیا، مگر دوبارہ میں پھنسنے والا نہیں۔ ہندستان میں آدمی قیمت دے کر بھی اپنی مطلوب چیز کو نہیں پاتا۔

امریکہ میں صورت حال اس سے بالکل مختلف نظر آئی۔ یہاں ہر چیز سائنس کے جدید معیار پر بنائی جاتی ہے۔ ہینڈ بیگ سے لیکر کار تک، اور ٹیلی فون سے لیکر دستی گاڑی تک ہر چیز عین وہی ہے جیسا کہ معیار کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔ یہاں کا گاہک ضروری قیمت دینے کے بعد ہمیشہ اپنی مطلوب چیز کو پالیتا ہے۔

یہ فرق دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہندستان میں بھری ہوئی سیٹوں کے درمیان ایک عظیم الشان سیٹ ابھی خالی ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کوئی آکر وہاں بیٹھے۔ یہاں تجارتی لوٹ کی جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ مگر تجارتی تبادلہ کی جگہ ابھی تک خالی ہے۔ یہاں کے مسلمان اگر کوآپریٹو سوسائٹیاں بنائیں اور مشترکہ سرمایہ کے ذریعہ مختلف صنعتیں کھولیں جہاں سستے سامان بنانے کے بجائے حقیقی مطلوبہ معیار کے مطابق چیزیں بنائی جائیں تو وہ زبردست کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندستان کے وسیع جغرافیہ میں وہ اپنا ایک "امریکہ" بنا سکتے ہیں۔

امریکی ایک بہت خرچ کرنے والی قوم ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت جاپانی اپنی آمدنی کا ۱۸ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ جب کہ امریکی اپنی آمدنی کا صرف ۳ فی صد حصہ سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرتے ہیں۔ چنانچہ بچت (Individual savings) کے اعتبار سے اس وقت جاپانی سب سے زیادہ بچانے والی قوم ہیں۔ ۱۹۸۸ میں جاپانیوں کے سیونگ اکاونٹ میں مجموعی طور پر جو رقم تھی۔ اس کی مقدار ۵۰۰۰ بلین ڈالر ہے۔

امریکیوں کی اسی خصوصیت کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں ہر قسم کی سرگرمیاں شباب پر نظر آتی ہیں۔ کوئی بھی غلط یا صحیح کام کیجیے، وہاں آپ کو مالی تعاون کرنے والے مل جائیں گے۔ خیراتی کاموں

ہیں رقم دینے والے امریکہ میں سب سے زیادہ ہیں۔ دنیا بھر کی عیسائی مشنریوں کو سب سے زیادہ امداد امریکہ سے ملتی ہے۔ ہندو گروؤں کو سب سے زیادہ تعاون امریکہ سے ملا ہے۔ انگریزی اسلامی لٹریچر کا سب سے بڑا مارکیٹ امریکہ ہے، وغیرہ۔ بعض لوگ اس کی شکایت کرنے والے ملیں گے کہ امریکہ کے لوگ بے فائدہ کاموں میں بہت زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کے اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ امریکہ میں فائدہ والے کاموں کے لیے بھی بہت زیادہ تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔

مغربی دنیا میں امریکی لوگ سب سے زیادہ مذہبی سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً فرانس میں صرف ۵ فی صد لوگ چرچ جاتے ہیں۔ انگلینڈ میں ۱۰ فی صد۔ مگر امریکہ میں چرچ جانے والوں کی تعداد ۵۰ فی صد ہے۔ امریکہ غالباً واحد ملک ہے جس کی کرنسی (ڈالر) پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہوتا ہے:

In God we trust

ایک طرف امریکہ میں اگر جنسی آزادی اور اس قسم کی دوسری برائیاں عروج پر ہیں تو دوسری طرف ان کے یہاں مذہبی مزاج بھی پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔ اگر امریکی سماج کے "تاریک پہلوؤں" کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو یہاں اسلامی دعوت کے مواقع نہایت روشن نظر آئیں گے۔

یہاں اگر آپ صبح کے وقت کسی سڑک پر نکلیں تو ہر گھر کے سامنے آپ کو پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلے رکھے ہوئے نظر آئیں گے۔ ان تھیلوں کے اندر گھر کا کوڑا بھرا ہوتا ہے۔ سرکاری گاڑیاں ان کو اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پھر خاص قسم کی مشینوں میں رکھ کر انھیں دبایا جاتا ہے تو ان کا حجم بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان کو ٹھکانے لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں یہ کام ایک مستقل فن بن چکا ہے جس کو گاربالوجی (Garbology) یا ویسٹ مینجمنٹ (Waste management) کہا جاتا ہے۔

اس فن میں تازہ ریسرچ اس بات پر ہو رہی ہے کہ کوڑے کو دوبارہ قابل استعمال بنانے کے لیے کیا کیا جائے۔ یہ ریسرچ اب کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ آئندہ یہ ممکن ہو سکے گا کہ سیور گیس (Sever gas) سے ڈائمنڈ بنایا جا سکے۔ امریکی بحریہ کے سائنس دالوں نے حال میں اس کا دعویٰ کیا ہے۔ ایک شخص نے اس کو بتاتے ہوئے کہا:

That's the most recent claim of US naval scientists.

امریکہ کے حالیہ الکشن (۱۹۸۸) میں جو لوگ صدارت کے امیدوار تھے، ان میں مسٹر گیری ہارٹ (Gary Hart) کا نام ابتداءً سرفہرست تھا۔ عوام میں ان کی مقبولیت کی بنا پر پیشین گوئی کی جارہی تھی کہ اگلی میعاد کے لیے وہی صدر منتخب ہوں گے۔ مگر الکشن سے پہلے یہاں کے بعض اخباروں نے مسٹر ہارٹ کی ایک تصویر چھاپ دی جس میں وہ امریکہ کی ایک فلم ایکٹرس ڈونا رائس (Donna Rice) کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ اخباروں نے انکشاف کیا کہ مسٹر ہارٹ نے ڈونا رائس کے مکان میں رات گزاری ہے۔ اس کے بعد مسٹر ہارٹ کی مقبولیت اچانک ختم ہوگئی۔ حتی کہ انھیں صدارت کی امیدواری سے اپنا نام واپس لینا پڑا۔

اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ نومبر ۱۹۸۸ کے الکشن کے موقع پر بھٹو پارٹی کے اسلامی مخالفین نے ایک تصویر چھاپی جس میں مسز نصرت بھٹو کو امریکہ کے سابق صدر مسٹر فورڈ کے ساتھ ناچتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پاکستان بھر میں پھیلا دیا گیا۔ مگر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پاکستانی عوام نے بھٹو پارٹی کے حق میں ووٹ دے کر بے نظیر بھٹو کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا ——— اسلامی ملک اور غیر اسلامی ملک کا یہ فرق بھی کیسا عجیب ہے۔

ایک خبر پڑھی۔ اس میں بیل گاڑی کے بارہ میں ایک "نئی دریافت" کا ذکر تھا۔ ترقی پذیر ملکوں میں جانوروں کے ذریعہ کھینچی جانے والی گاڑیوں میں ٹائر لگانے سے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ یہ گاڑیاں ہلکی چلتی ہیں اور ان میں زیادہ سامان ڈھویا جاسکتا ہے۔ مگر دیہاتی علاقوں میں کچی سڑکوں کی وجہ سے ان کے ٹائر اکثر اوقات پنکچر ہوجاتے ہیں اور پھر ان میں دوبارہ ہوا بھرنا اور قابل استعمال بنانا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

خبر میں بتایا گیا تھا کہ ان ٹائروں میں ہوا کی جگہ لکڑی کا بھوسہ بھرنے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان ٹائروں کے پنکچر ہونے کا خطرہ ختم ہوجاتا ہے۔ یہ گاڑیاں تقریباً دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتی ہیں اور ان میں ۵۰۰ کلو گرام سامان لادا جاسکتا ہے۔ یہ "دریافت"

اقوام متحدہ کے ادارۂ زراعت کے تحت کی گئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں کار اور ہوائی جہاز سے لیکر جدید قسم کی بیل گاڑی تک اکثر چیزیں وہ ہیں جو امریکہ سے دنیا کو ملی ہیں۔ امریکہ کا یہی تخلیقی عمل ہے جس نے اسے جدید دنیا میں برتر مقام دیدیا۔ اس کا سبب وہ " سازشیں" نہیں ہیں جو ہم نے اس لیے دریافت کر رکھی ہیں تاکہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنی پسماندگی کو خود اپنی نااہلی کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے دوسروں کی نالائقی کے خانہ میں ڈال سکیں۔

مولانا عبد الماجد دریا بادی نے جولائی ۱۹۶۵ کا ایک تجربہ ان الفاظ میں لکھا تھا ــــ" ایک دن دوپہر کی گاڑی سے کلیفورنیا یونی ورسٹی کے ایک استاد بے شان و گمان دریا باد پہنچے۔ اور دو ڈھائی گھنٹے کے سوال وجواب کے بعد واپسی کی ٹرین سے واپس ہو گئے امریکہ کے صاف وشفاف بلوری سڑکوں کا عادی ہمارے قصبات کی ادھ کچی ادھ پکی کھائیوں اور گڑھوں سے بھری ہوئی سڑکوں کا تصور بھی نہ کرسکتا ہوگا۔ اور پھر موٹرنشیں امریکی کے ذہن میں کھڑکھڑے چرخ چوں ایکوں کی تصویریں بھی کیوں آنے لگیں تھیں۔ اور یہ تجربہ بالکل انوکھا نہیں۔ ایک اور امریکی پروفیسر خاک پھانکتے آج سے چند سال قبل بھی آچکے تھے۔ ایسے اعجوبہ سفر سے بڑھ کر اعجوبہ سفر بھی غرض وغایت نکلا۔ موضوع مطالعہ وتحقیق ہندستان میں تحریک خلافت کی تاریخ (تقریباً ۱۹۱۹ - ۱۹۲۹) اسی ایک کام کے لئے امریکہ سے ہندستان، پاکستان کا سفر۔ اور مدراس، بنگلور، دہلی، حیدرآباد، کلکتہ، لکھنؤ، لاہور، کراچی وغیرہ کے علاوہ دریاباد تک کی پرمشقت مسافت۔ اور عین اسی زمانہ میں ایک دوسرے امریکی ریسرچ اسکالر اپنا موضوع لئے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکات (۱۹۰۰ سے لیکر ۱۹۲۰ تک) ہندستان کی خاک چھان رہے ہیں۔ اور دریاباد آنے پر ہر وقت آمادہ۔ لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے ہیں کے حقیر ذخیرۂ معلومات (کامریڈ وغیرہ کی جلدوں) سے کام لے رہے ہیں (صدق جدید ۱۲ اگست ۱۹۶۵)

یہ اس قسم کی بے شمار مثالوں میں سے ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی قومیں کس طرح ہر قسم کے احوال سے اپنے کو باخبر رکھتی ہیں تاکہ ان کی پلاننگ صحیح ہو۔ قدیم زمانہ میں صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد سارے یورپ میں نئے قسم کے اہل علم جاگ اٹھے جن کو مستشرق کہا جاتا ہے۔ انھوں نے مشرقی اقوام (بشمول مسلمان) کی اتنی کامل تحقیق کی کہ ان کے بارے میں خود مشرقی اقوام سے زیادہ واقف اور باخبر ہو گئے۔ اس واقفیت سے انھوں نے زبردست فائدہ اٹھایا جس

کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

صلیبی جنگوں جیسا واقعہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ برعکس صورت میں پیش آیا۔ مگر موجودہ پورے دور میں مسلمانوں میں کوئی بھی مثال نہیں ملتی جب کہ مسلم اہل علم نے مغربی اقوام کی برتری کا راز سمجھنے کے لئے حقیقی معنوں میں کوئی سنجیدہ کوشش کی ہو۔

سیٹل (Seattle) میں امریکہ کی مشہور جہاز ساز کمپنی بوئنگ (Boeing) کا پلانٹ ہے جس کی ورک فورس (Workforce) ۹۶ ہزار ہے۔ یہ اپنی وسعت کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے جو امریکی معیار کے ۷۵ فوٹ بال فیلڈ کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اگر آپ وہاں جائیں تو وہاں ایک شاندار بورڈ پر آپ کو یہ الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے کہ جس طرح ہیرا تراشنے والا ہیرے کو تراشتا ہے، اسی طرح ہمارے ماہر کاریگر ہر جہاز کو درست کرتے ہیں اور حد درجہ صحت اور تفصیل کے ساتھ اس کو تیار کرتے ہیں:

Just as the diamond cutter strikes the stone, so our skilled workers assemble and carefully inspect each airplane with precision and detail.

ابتداءً بوئنگ کمپنی میں کام کا معیار ایسا ہی تھا۔ مگر اب اس کا سابقہ معیار باقی نہیں رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں بوئنگ کے ایک درجن سے زیادہ جہازوں کے ساتھ چھوٹے یا بڑے حادثات پیش آئے۔ چنانچہ اب بوئنگ کمپنی کی ساکھ (Reputation) بہت گر گئی ہے۔ آبزرور (The Observer) کی ایک تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان ہوائی حادثات کا سبب زیادہ تر بناوٹ کی خامیاں (Manufacturing errors) تھیں ــــــ الفاظ میں اعلیٰ معیار مقرر کرنا بے حد آسان ہے، مگر عمل میں اس کو مسلسل طور پر برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہے۔

امریکہ نے ایک شٹل خلا میں بھیجی جس کا نام چیلنجر (Challenger) تھا۔ یہ شٹل دو ملین میل کا سفر طے کر کے ۹ اپریل ۱۹۸۳ کو زمین پر واپس آ گیا۔ اس میں دو خلائی کاریگر (Orbital repairman) اوپر بھیجے گئے تھے۔ ان دونوں کے جسم پر ۲۵۰ پونڈ وزن کا خلائی سوٹ تھا۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت دو ملین ڈالر سے زیادہ تھی۔ وہ زمین سے ۱۷۶ میل کی دوری پر اپنے جہاز سے باہر نکلے اور چار گھنٹہ تک خلا میں رہے اور ایک مواصلاتی سٹلائٹ کی مرمت کا کام کر کے دوبارہ اپنے کیبن میں

واپس آ گئے۔

امریکی خلاباز جس وقت زمین سے پونے دوسو میل کی بلندی پر "تاریخ کا پہلا خلائی کارنامہ" انجام دے رہے تھے، اس وقت سابق امریکی صدر رونالڈ ریگن نے اپنے زمینی دفتر میں بیٹھے ہوئے ان سے بات کی۔ صدر نے ان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ یہ خلائی شٹل ہمارے اس عہد کی ایک علامت ہے کہ ہم خلا میں امریکی بالاتری کو باقی رکھیں گے:

The space shuttle is a symbol of our commitment to maintain America's leadership in space. *Harald Tribune,* London, April 10, 1983.

اب پانچ سال بعد امریکہ کی خلائی بالاتری کا افسانہ ختم ہو رہا ہے۔ خلائی بالاتری کا منصوبہ امریکہ کے لیے اتنا مہنگا پڑا کہ وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ انسان اپنی محدودیت کو نہیں جانتا۔ اگر وہ اپنی محدودیت کو جانے تو ہرگز وہ بڑی بڑی باتیں نہ کرے۔

ایک خبر اخبار میں نظر سے گذری ——— امریکہ اور فلپائن کی حکومت کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا ہے جس کے تحت واشنگٹن نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ فلپائن میں اپنے چھ فوجی اڈوں (Military bases) کے استعمال کے لیے پانچ کروڑ ڈالر سالانہ معاوضہ ادا کرے گا۔ یہ معاہدہ **۱۹۹۱ تک** نافذ رہے گا۔ ان میں ایک فضائی اڈہ، ایک بحری اڈہ، اور چار نسبتاً چھوٹی تنصیبات شامل ہیں۔ امریکہ یہ سالانہ معاوضہ معاشی امداد، فوجی تعاون اور اشیار کی فراہمی کی صورت میں ادا کرے گا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی خارجہ پالیسی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ رہا ہے کہ وہ عالمی قیادت حاصل کرے۔ وہ اس کی بے حد مہنگی قیمت مسلسل دیتا رہا ہے۔ مذکورہ خبر اس کی محض ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ مگر امریکہ کے مدبرین اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ یہ پالیسی قابل عمل نہیں۔ ایک امریکی لیڈر نے کہا کہ ایک خاندان کی طرح ایک سماج بھی اپنے ذرائع سے باہر جا کر غیر محدود طور پر زندہ نہیں رہ سکتا:

A society, like an individual family,
cannot live beyond its means indefinitely.

اسی کا نام حقیقت پسندی ہے۔ غیر اسلام احساس حقیقت کی زمین پر کھڑا ہوتا ہے اور اسلام احساس خداوندی کی زمین پر۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے پاس آج دونوں میں سے کوئی زمین موجود نہیں۔ اور بلاشبہ یہی ان کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

نومبر ۱۹۸۸ میں امریکہ میں جو صدارتی الکشن ہوا ہے، اس میں جارج بش (George Bush) کو امریکہ کے صدر کی حیثیت سے چنا گیا ہے۔ ایک خبر پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ مسٹر جارج بش کا ایڈمنسٹریشن امریکہ کی اقتصادی پالیسی میں اہم تبدیلیاں لا رہا ہے۔ مثلاً امریکہ اب تک یورپ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا رہا ہے۔ مگر نئے فیصلہ کے تحت ایشیا کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اس کا سبب ایشیا سے ہمدردی نہیں، بلکہ امریکہ کے اپنے مفاد کا تحفظ ہے۔

نئے ایڈمنسٹریشن کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۷ میں امریکہ کی تجارت یورپ سے تقریباً ۱۷۰ بلین ڈالر کے بقدر تھی جب کہ اسی مدت میں ایشیا سے امریکہ کی تجارت ۲۴۱ بلین ڈالر رہی۔ ۱۹۸۸ میں بھی یہی تناسب مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔

باشعور لوگ ہمیشہ اپنے عمل کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرکے اپنے عمل کا رخ بدل لیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ بے شعور ہوں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک بار وہ جس ڈگر پر چل پڑیں، بس اسی ڈگر پر وہ بے سوچے سمجھے چلتے رہتے ہیں، ان کی آنکھ صرف اس وقت کھلتی ہے جب کہ وہ بربادی کے گڑھے میں گر کر اصلاح حال کا آخری موقع کھو چکے ہوں۔

امریکہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی بے قید آزادی ہے۔ اس بے قید آزادی کا سب سے زیادہ اظہار جنسی معاملات میں ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کی کم سن لڑکیوں میں، دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلہ میں، اسقاط کی شرح سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ یورپی قوموں کے مقابلہ میں تقریباً دگنا زیادہ۔ ۱۵ سے ۱۹ سال کی عمر کی امریکی عورتیں تقریباً دس فی صد کی تعداد میں ہر سال حاملہ ہو جاتی ہیں:

American teenage girls have the highest rate of abortion in the developed world, more than double that of most European nations. About 9.8 per cent of American women aged 15 to 19 become pregnant annually, the highest rate among the nations studied.

بیسویں صدی میں ایک طرف امریکہ میں آزاد زندگی کا تجربہ کیا گیا، اور دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کا۔ امریکہ میں آزاد نظام کے تجربہ نے اس کو برباد کن اباحیت تک پہونچا دیا۔ یہاں تک کہ خود امریکہ میں بی ایف اسکنر (B.F. Skinner) جیسے لوگ پیدا ہوئے جو کہہ رہے ہیں کہ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے :

We can't afford freedom

دوسری طرف سوویت روس میں پابند زندگی کو قائم کرنے کی کوشش کا یہ بھیانک انجام ہوا کہ سابق روسی وزیر اعظم جوزف اسٹالن نے ۱۲ ملین آدمیوں کو مار ڈالا، مجموعی طور پر ۳۸ ملین آدمی اس کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ یہ اعداد و شمار خود روسی مورخ میڈ ویڈیو (Roy Medvedev) نے "ماسکو نیوز" میں شائع کیے ہیں (کلیرٹی ۴ دسمبر ۱۹۸۸) چنانچہ موجودہ روسی وزیر اعظم میخائیل گورباچوف کو اعلان کرنا پڑا کہ "ہم پابند زندگی کا تحمل نہیں کر سکتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ خدائی رہنمائی کے بغیر جب بھی انسانی زندگی کا نقشہ بنایا جائے گا، وہ یا تو ایک انتہا کی طرف جائے گا یا دوسری انتہا کی طرف۔ وہ کبھی معتدل اور متوازن نقشہ نہیں ہو سکتا۔

امریکہ کے سابق صدر مسٹر رونالڈ ریگن نے اپنے آٹھ سالہ دور حکومت میں امریکہ کو کوئی ترقی نہیں دی، البتہ اس کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا کر دیا۔ ریگن نے، بظاہر اپنی ذاتی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے ستارہ کی جنگ (Star wars) کا نعرہ لگایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایسی جنگی ٹکنالوجی تیار کی جائے کہ دشمن کے حملہ کا مقابلہ زمین سے اوپر ہو سکے اور اس کو خلا کے اندر ہی برباد کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں ریسرچ اور تجربات کا خرچ اتنا بڑھ گیا کہ امریکہ جو دنیا کو قرض دیتا تھا، وہ خود سب سے بڑا مقروض ملک بن گیا۔ اس وقت (۱۹۸۸ کے آخر تک) امریکی قرضہ دو کھرب ساٹھ ارب ڈالر تک پہونچ چکا ہے۔ صرف جاپان کا قرضہ اس کے اوپر ۱۵ ارب بیس کرور ڈالر ہے۔ اس وقت امریکی انتظامیہ کے اخراجات اس کی آمدنی سے بہت زیادہ ہیں۔ مختلف ملکوں کا سرمایہ جو اس وقت امریکہ کے بینکوں میں ہے، اگر وہ اس کو نکال لیں تو امریکہ اچانک دیوالیہ ہو جائے گا۔ دنیا کے دس بڑے بینکوں میں صرف ایک امریکی بینک ہے، باقی سب جاپانی بینک ہیں۔ پہلے یہ حال تھا کہ دنیا بھر میں جتنی کاریں تیار ہوتی تھیں، ان کا ۷۵ فیصد امریکہ تیار کرتا تھا۔ اب صرف ۲۵ فی صد کاریں یہاں

تیار ہورہی ہیں۔ ۱۹۷۲ میں دنیا کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کا ۷۰ فی صد امریکہ میں تیار ہوتا تھا۔ اب اس کی مقدار صرف ۳۰ فی صد رہ گئی ہے۔

کوئی شخص یا قوم خواہ وہ کتنا ہی زیادہ طاقتور ہو، اس کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ طاقت کے اندر اقدام کرنا کامیابی کی طرف لے جاتا ہے اور طاقت کے باہر اقدام کرنا بربادی کی طرف۔

ایک لطیفہ پڑھنے کو ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت کیوں کم ہوگئی ہے۔ اگر سب نہیں تو کم از کم ایک وجہ یقیناً یہی ہے جو اس لطیفہ میں بتائی گئی ہے۔

۸۶ سال کی ایک بوڑھی عورت پہلی بار ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اس نے دوران پرواز جہاز کے عملہ کی طرف سے ایک اعلان سنا: آپ کا کیپٹن آپ سے ہم کلام ہے۔ بعض مشینی خرابی کی وجہ سے ہمارے چوتھے انجن نے کام چھوڑ دیا ہے۔ تاہم اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تین انجن کے ذریعہ اپنی پرواز جاری رکھیں گے اور وقت پر اپنی منزل پر اتر جائیں گے۔ مزید میرے پاس آپ کے لیے کچھ قابل اطمینان خبر بھی ہے۔ ہم اپنے ساتھ جہاز میں چار پادری رکھتے ہیں۔ بوڑھی خاتون جو اعلان کو بغور سن رہی تھی، اس نے جہاز کے عملہ کے ایک شخص کو بلا کر کہا: براہ کرم کیپٹن سے یہ کہہ دیں کہ میں اس کو زیادہ پسند کروں گی کہ ہمارے پاس چار انجن ہوں اور تین پادری:

An 86-year-old woman who was flying for the first time heard the following announcement come over the plane's intercommunication system. "This is your captain speaking. Our number four engine has just been shut off because of mechanical trouble. However, there is nothing to worry about. We will continue our flight with three engines and will land on schedule. Also, I have some really reassuring news for you. We have four priests on board."
The elderly passenger, who had been listening apprehensively, called the flight attendant. "Would you please tell the captain," she said, "that I would rather have four engines and three priests."

یہ لطیفہ دور جدید کے ایک اہم پہلو کو بتاتا ہے۔ موجودہ زمانہ مشینی زمانہ ہے۔ آج ہر چیز کا تعلق مشین سے ہوگیا ہے، خواہ سفر کرنا ہو یا گھر کے اندر کھانا پکانا یا اشیاء صرف کو تیار کرنا ہو۔ قدیم روایتی دور میں ان چیزوں کے لیے مشینی ماہرین کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آج ہر چیز کا تعلق مشینی ماہرین سے ہوگیا ہے۔ یہی صورت حال ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مذہبی طبقہ کی اہمیت گھٹا دی

اور مشینی طبقہ کی اہمیت کو لوگوں کی نظر میں بڑھا دیا۔ کیوں کہ دورِ جدید کی مشینیں مشینی ماہرین سنبھالتے ہیں نہ کہ مذہبی ماہرین ۔

ایک صاحب نے کہا کہ اسلام ، امریکہ میں مغلوب ہوگیا ۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ جو مسلمان امریکہ آئے ، وہ ابتداءً اپنے ساتھ اسلامی تہذیب لے کر آئے تھے ۔ اس طرح یہاں اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کا مقابلہ پیش آیا ۔ اس مقابلہ میں مغربی تہذیب برتر ثابت ہوئی ۔ کیوں کہ ان مسلمانوں کی اکثریت نے اب اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اختیار کر لیا ہے ۔

میں نے کہا کہ اس معاملہ کو بتانے کے لیے زیادہ صحیح لفظ یہ ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ یہاں جو مقابلہ پیش آیا وہ اصول پسندی اور خواہش پرستی کے درمیان تھا ۔ اسلام اصول پسند زندگی کا نمائندہ تھا ، اور مغربی تہذیب خواہش پرست زندگی کی نمائندگی کر رہی تھی ۔ اور ساری تاریخ کا یہ تجربہ ہے کہ انسان اس معاملہ میں ہمیشہ کمزور واقع ہوا ہے ، وہ اصول پسندی کو چھوڑ کر خواہش پرستی کی طرف جھک جاتا ہے ۔

یہ تصادم امریکہ میں نہیں بلکہ ہر جگہ جاری ہے ۔ جہاں بھی آدمی کو موقع مل رہا ہے ۔ وہ اصول کو چھوڑ کر خواہش کو اختیار کر لیتا ہے ۔ امریکہ میں یہ واقعہ تہذیب کے انداز میں ہو رہا ہے اور دوسرے مقامات پر عمومی انداز میں ۔

ایک صاحب نے اپنی گفتگو میں مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی بیان کی ۔ انھوں نے کہا کہ کبھی مسلمان دنیا میں غالب اور فاتح حیثیت رکھتے تھے ، آج مسلمانوں کی تعداد ساری دنیا میں ایک بلین سے بھی زیادہ ہے ، مگر آج ہمارا حال یہ ہے کہ دنیا پر اثر انداز ہونا تو درکنار دوسرے لوگ ہمارے قومی فیصلے کرتے ہیں ، آج ہم اپنی قسمت کے مالک نہیں :

We are not the master of our destiny

موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر جگہ مسلمان اسی انداز میں سوچتے ہیں ۔ وہ اپنی موجودہ حالت کا تقابل ماضی کی فاتحانہ حیثیت سے کرتے ہیں ، وہ اپنا تقابل داعیانہ حیثیت سے نہیں کرتے ۔ مسلمان اگر اپنی موجودہ حیثیت کا تقابل ماضی کی داعیانہ تاریخ سے کریں تو ان کے اندر دعوتی عمل کا جذبہ بیدار ہوگا ۔ مگر ماضی کی فاتحانہ تاریخ سے تقابل ان میں کسی صحت مند جذبہ کو بیدار کرنے کا سبب نہیں بنتا ۔

۲۷ دسمبر کو صبح ساڑھے دس بجے کا وقت ہے۔ صاف آسمان پر سورج چمک رہا ہے۔ موسم نہایت خوش گوار ہے۔ میں کوسٹامیسا (Costa Mesa) کے پارک (Wakeham Park) میں ایک بنچ پر بیٹھا ہوں۔ پارک کے اندر کے مناظر، باہر کا ماحول اور اطراف کی سڑکیں اور مکانات، ہر چیز اتنی باقاعدہ اور اتنی منظم دکھائی دیتی ہے کہ دیر تک سوچنے کے باوجود مجھے وہ الفاظ نہیں ملے جن سے میں اس کی تصویر کشی کرسکوں۔

مجھے ایک بزرگ کا واقعہ یاد آیا۔ انھوں نے ایک بے نمازی نوجوان کو دیکھ کر کہا تھا کہ میرے بیٹے نماز پڑھا کرو تاکہ آخرت میں تمہارا خوبصورت چہرہ آگ میں نہ جلایا جائے۔ امریکہ کی خوبصورت زندگی اور یہاں کے بارونق تمدن کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میں نے سوچا کہ کاش اللہ کے کچھ بندے اٹھیں اور یہاں کے انسانوں کو اللہ کے دین پر لانے کی کوشش کریں تاکہ ان کی نسلیں اگلی دنیا میں دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں۔ اس دعا کے سوا مجھے کوئی اور لفظ نہیں ملا جس کو میں یہاں درج کروں۔

امریکہ میں بہت سے "قابل دید" مقامات ہیں۔ لوگوں نے کئی جگہوں پر لے جانے کی پیش کش کی مگر میں کہیں نہ جاسکا۔ البتہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۸ کو یہاں کا مشہور ڈزنی لینڈ (Disnyland) دیکھا۔ یہ ایک تفریح گاہ یا تماشائی پارک (Amusement park) ہے۔ اس کو ابتداءً والٹ ڈزنی نے بنایا تھا اور ۱۹۵۵ میں اس کا افتتاح ہوا۔ بہت بڑے رقبہ میں طرح طرح کی عجیب چیزیں ہیں جن کو دیکھ کر لوگ حیرت اور مسرت میں پڑجاتے ہیں۔ اس کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش کن مقام (Happiest place on earth) کہا جاتا ہے۔ اس کا ٹکٹ فی کس ۲۵ ڈالر ہے۔ دنیا بھر کے بے شمار لوگ اس کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ یہاں ہر روز میلے جیسی بھیڑ ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس قسم کے دو پارک بنائے گیے ہیں۔

ڈزنی لینڈ میں ایک طرف حال اور مستقبل کی دنیا کے پُرعجوبہ مناظر ہیں۔ دوسری طرف اس میں سفر کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی ایک ٹرین بنائی گئی ہے جو پانی اور کوئلے سے چلتی ہے، اور سیٹی کے بجائے اس میں قدیم طرز کا گھنٹہ ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ تاہم مجھے ڈزنی لینڈ سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہوسکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈزنی لینڈ کی واقعی اہمیت اس سے بہت کم ہے جتنی اس کی

پبلسٹی کی گئی ہے۔ اس دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی اہمیت کی چیز کو شہرت نہیں ملتی۔ البتہ غیر حقیقی اہمیت والی چیزیں بہت زیادہ شہرت حاصل کر لیتی ہیں۔

ایک صاحب نے پُرفخر طور پر کہا کہ امریکہ دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے فلک بوس عمارتیں (Skyscrapers) میں شہرت حاصل کی، میجر ولیم لی بیرن جینی نے ۱۸۸۵ میں پہلی دس منزلہ بلڈنگ شکاگو میں بنائی۔ اس کے بعد یہ ذوق بڑھتا رہا۔ نیویارک میں ۱۹۳۰ میں کرسلر بلڈنگ بنائی گئی جس کی ۷۷ منزلیں تھیں۔ ۱۹۳۱ میں نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بنی جس میں ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ ۱۹۷۳ میں شکاگو میں سیرس ٹاور بنایا گیا جس کی ۱۱۰ منزلیں ہیں۔ موجودہ سیرس (Sears) میں ۱۳ ہزار کارکن کام کرتے ہیں۔ یہ ایک عظیم الشان ریٹیل شاپ ہے، چنانچہ اس کو ہر چیز کی دکان (Everything stores) کہا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ واقعہ انسانی کارنامہ سے زیادہ خدائی کارنامہ کو یاد دلاتا ہے۔ یہ غیر معمولی اونچی عمارتیں تمام تر لوہا (اسٹیل) کا کرشمہ ہیں۔ قرآن میں ہے کہ لوہے کے اندر خدا نے بأس شدید (الحدید ۲۵) پیدا کیا ہے۔ لوہے کی اسی قدرتی صفت نے اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ زمین کے اوپر اتنی اونچی عمارتیں کھڑی کی جاسکیں۔

"اسکائی اسکریپر" کو دیکھ کر آپ کے اوپر استعجاب کی حالت طاری ہو رہی ہے۔ مگر یہ استعجاب حقیقۃً انسانی انجینئرنگ پر نہیں بلکہ خدائی تخلیق پر ہونا چاہیے۔ کیوں کہ انجینئرنگ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی تخلیق کا انسانی استعمال ہے۔ "لوہا" تخلیق ہے اور "اسکائی اسکریپر" صرف اس کا ایک استعمال۔

ایک امریکی سے ملاقات ہوئی جو واشنگٹن کا رہنے والا تھا۔ واشنگٹن امریکہ کی راجدھانی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ واشنگٹن کے بارہ میں کچھ بتائیے۔ اس نے مسکرا کر کہا:

People only leave Washington by way of the box — ballot or coffin.

یعنی لوگ واشنگٹن کو صرف بکس کی راہ سے چھوڑتے ہیں۔ ووٹ کا بکس یا تابوت کا بکس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجدھانی ہونے کی وجہ سے واشنگٹن میں ہر قسم کی اعلیٰ ترین سہولتیں مہیا ہیں۔

اس کے علاوہ تمام اہم ترین سیاسی فیصلے یہیں ہوتے ہیں۔ جس شخص کو واشنگٹن میں کوئی جگہ مل جائے، وہ اس کو آخری سمجھ کر اس سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ جس "واشنگٹن" کا حال یہ ہو کہ ایک "بکس" آدمی کو اس سے جدا کر دے، اس واشنگٹن کی کیا حقیقت۔ "واشنگٹن" تو وہ ہے جس میں ہمیشگی کی صفت پائی جائے۔ اور ایسا واشنگٹن آدمی کو جنت کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۸۸ کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے گھر پر تھا۔ صبح فجر کے وقت اچانک خطرہ کا الارم بجنے لگا۔ چند سکنڈ کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ صغیر احمد صاحب نے رسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے فوراً آواز آئی کیا آپ ٹھیک ہیں (Are you O.K., Sir?)۔

یہاں پر گھروں میں ایک سسٹم لگا ہوا ہوتا ہے جس کو سیکورٹی الارم سسٹم کہتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی شخص دروازہ کھول کر باہر نکلے یا اندر داخل ہو تو الارم فوراً بجنے لگتا ہے۔ اور عین اسی وقت پولس کے کنٹرول روم میں لال بتی جل جاتی ہے۔ پولس ایک منٹ کے اندر صاحب مکان کو ٹیلی فون کر کے خیریت معلوم کرتی ہے۔ یہ ٹیلی فون اسی کے مطابق، پولس کے دفتر سے آیا تھا۔ مذکورہ الارم کا قصہ اس لیے پیش آیا کہ ہمارے ایک ساتھی نے فجر کے وقت باہر جانے کے لیے گھر کا دروازہ کھول دیا تھا۔

اتنے زبردست انتظام کے باوجود امریکہ میں مسلسل قتل اور ڈاکہ کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پرامن سماج کے قیام کے لیے مشینی انتظام کے سوا بھی ایک چیز درکار ہے۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔ صرف مشینی انتظام کبھی پُرامن سماج کے قیام کی ضمانت نہیں بن سکتا۔

صغیر احمد اسلم (پیدائش ۱۹۳۶) کمالیہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ اب وہ امریکی شہری ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا ۱۹۵۱ کا ایک واقعہ بتایا۔ رمضان کا زمانہ تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر وہ بائیسکل کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے بازار سے آلو بخارا اور مالٹا خریدا۔ اس کو بائیسکل کے پیچھے رکھ کر جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک شخص ملا۔ اس نے ان کو روکا اور کچھ آلو بخارا زبردستی نکال کر لے لیا۔ صغیر احمد اسلم صاحب نہ غصہ ہوئے اور نہ اس سے دوبارہ اپنا آلو بخارا چھیننے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے انھوں نے کہا: دیکھو، یہ مالٹا ہے، اس میں سے بھی لے لو۔

آدمی نے مزید کوئی چیز نہ لی، وہ شرمندہ ہوکر چلا گیا۔

مذکورہ واقعہ میں ایک صورت یہ تھی کہ صغیر اسلم صاحب یہ سوچتے کہ ابھی تو اس نے صرف آلو بخارا لیا ہے، اگر میں کمزوری دکھاؤں تو وہ مالٹا بھی لے لے گا۔ اور اگر میں نے مزید کمزوری دکھائی تو وہ میری بائیسکل بھی چھیننے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس قسم کے خیالات صرف شیطانی وسوسہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر خود عمل نہ کرنا فطرتِ خداوندی کو عمل کرنے کا موقع دینا ہے۔ چنانچہ صغیر اسلم صاحب نے جب کوئی مخالفانہ ردعمل ظاہر نہیں کیا تو مذکورہ آدمی کا ضمیر جاگ اٹھا۔ فطرتِ خداوندی نے وہ کام زیادہ بہتر طور پر کر دیا جس کو انسان صرف ناقص طور پر انجام دیتا۔

جناب صغیر اسلم صاحب یہاں کپڑے وغیرہ کی تجارت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۷۵ میں ایک بار ایک اخبار میں اشتہار نکلا کہ فلاں ہوٹل میں ہمارا لکچر ہوگا جس میں بتایا جائے گا کہ آپ مفید طور پر کوئی جائداد (Real estate) کس طرح حاصل کریں۔ اشتہار میں بتایا گیا تھا کہ اس کی کوئی فیس نہیں ہے۔ میں گیا تو میں نے دیکھا کہ ہال بالکل بھرا ہوا تھا۔ بلکہ سیٹ پر جگہ نہ ملنے کی وجہ سے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمی سامعین میں موجود تھے۔

اس اجتماع میں انھوں نے محض اپنا تعارف کرایا اور کچھ ابتدائی باتیں بتا کر کہا کہ کل ہمارا آٹھ گھنٹہ کا کورس ہوگا، اس میں تمام تفصیل بتائی جائے گی اور اس کی فیس ۵۰۰ ڈالر ہوگی۔ صغیر اسلم صاحب نے ۵۰۰ ڈالر دے کر ٹکٹ خرید لیا۔ اگلے دن وہ ہال میں پہونچے تو وہاں بمشکل ایک درجن آدمی موجود تھے۔ انھوں نے آٹھ گھنٹہ کے کورس میں شرکت کی۔ اس میں انھیں جائداد کی خریداری کے بارہ میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کو استعمال کرتے ہوئے انھوں نے اگلے چند مہینوں میں ۱۰ مکانات کی خریداری مکمل کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کام میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا کیوں کہ صرف تین سال میں ان مکانات کی قیمت دگنا ہو گئی۔ انھوں نے پانچ سو ڈالر خرچ کر کے پانچ لاکھ ڈالر کمائے۔

اس دنیا میں کامیابی کے لیے حوصلہ درکار ہے۔ جو شخص حوصلہ مند نہ ہو، وہ اس دنیا میں کبھی اعلیٰ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

صغیر احمد اسلم صاحب نے بتایا کہ ۱۹۶۹ میں وہ لاس اینجلیس کی ایک بڑی فرم میں ۳۵ اسٹور کے منیجر تھے۔ ان کو اپنے امریکی افسر کے ساتھ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ جنرل منیجر تقریباً ۳۵ سال کا تھا۔ اور ہوٹل کے زمانہ قیام میں شراب اور عیاشی کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ صغیر اسلم صاحب ایک بااصول آدمی تھے۔ ان کو اس قسم کی باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر ایک سفر میں وہ جنرل منیجر کے کمرہ میں گیے اور دروازہ بند کرکے اس سے نہایت سخت گفت گو کی ــــــ تم عیاش ہو، تم بالکل نکمے ہو، تم بزنس کرنا نہیں جانتے، وغیرہ۔

صغیر اسلم صاحب جنرل منیجر کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد جب باہر جانے لگے تو جنرل منیجر نے ان کو پکڑ کر واپس بلایا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ ہاں، تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ اس نے کہا کہ پھر تمہارے اندر یہ جرأت (Courage) کہاں سے آئی کہ تم مجھ کو اس طرح خطاب کرو۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ تم یہی تو کر سکتے ہو کہ مجھ کو فائر (برخاست) کردو، تو میں اس سے پہلے کمپنی سے اپنا استعفا تیار کر چکا ہوں۔ اس نے کہا کہ فائر کرنا تو درکنار، میں تم کو چھوڑوں گا بھی نہیں، تم ہماری کمپنی کے لیے بہت قیمتی ہو۔

اس شخص کا نام جب اسٹوارٹ میگروڈر (Jeb Stuart Magruder) تھا۔ میں نے صغیر اسلم صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس کے ساتھ اتنی سخت گفتگو کی، پھر بھی وہ آپ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا، اس کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میں کمپنی کے لیے ایک مفید شخص ہوں۔ اپنے ذاتی جذبات پر اس نے کمپنی کے مفاد کو غالب رکھا۔

مذکورہ امریکی نے ذاتی رنجش کے باوجود صغیر اسلم صاحب کی قدر دانی کی۔ یہ اعتراف اور یہ بلند حوصلگی جو امریکہ کے ایک شرابی میں پائی جاتی ہے، وہ آج ہماری بڑی بڑی دینی شخصیتوں میں بھی موجود نہیں۔ ذاتی رنجش کے بعد کسی کی صلاحیت کا اعتراف بلاشبہ اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے، مگر ہمارے تمام اکابر اس اخلاقی قدر سے مکمل طور پر خالی ہیں۔

ایک امریکی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ اس کا ایک پاؤں کسی حادثہ میں ضائع ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اس نے مصنوعی پاؤں لگا رکھا تھا۔ یہ نوجوان ایک پرکشش شخصیت کا مالک تھا، مگر پاؤں کا کھونا اس کے لیے ایک ناقابل تلافی محرومی بنا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ میں نے کہا کہ

انسان کا جسم ایک بے حد قیمتی مشین ہے۔ مگر اس مشین کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دنیا میں ایسا کوئی کارخانہ نہیں جہاں اس زندہ مشین کے اسپیر پارٹ (Spare Parts) تیار ہوتے ہوں۔ انسان کے لیے اپنی کمیوں کی تلافی کی صورت صرف ایک ہے ــــــ وہ اپنے خالق کو راضی کرے تاکہ بعد کو آنے والی دنیا میں وہ اس کو ایک ابدی اور بے نقص جسم عطا کردے۔

ایک تعلیم یافتہ عیسائی نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مگر بعض سوالات میرے ذہن کو الجھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون سے سوالات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں غلامی کا مسئلہ، پیغمبر کا کئی شادیاں کرنا، حجر اسود کو چومنا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اسلام یا کسی بھی نظام کا مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں۔ ہر مذہب یا ہر نظام میں کچھ بنیادی چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ فروعی چیزیں۔ ایک سنجیدہ متلاشی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ پہلے زیر مطالعہ مذہب یا نظام کی بنیادی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے جب ان کے بارہ میں پوری واقفیت حاصل ہو جائے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ فروعی یا ضمنی باتوں کو سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ امریکہ کے نظام تہذیب کو سمجھنا چاہیں تو اس کا آغاز آپ یہاں سے نہیں کریں گے کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن اپنی جیب میں ہمیشہ سونے کی نعل کیوں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ درست نہ ہوگا۔ اس کے برعکس آپ یہ کریں گے کہ پہلے امریکہ کی تاریخ، اس کے علوم، اس کے قانون اور اس کے صنعتی اور تجارتی طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہی طریقہ علمی طریقہ ہے اور یہی طریقہ آپ کو اسلام کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔

یہاں بہت سے نومسلم امریکیوں سے ملاقات ہوئی۔ مثلاً ۳۹ سالہ پال یوسف جیول (Paul Yusuf Jewell) جو سفید فام نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور سراج وھاج جو سیاہ فام نسل میں پیدا ہوئے اور پھر اسلام قبول کیا۔ کانفرنس میں بھی بڑی تعداد میں نومسلم امریکی آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض نے وہاں تقریریں بھی کیں۔

ایک خاص بات یہ محسوس ہوئی کہ نومسلم امریکیوں میں، دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں، زیادہ ایمانی جوش اور زیادہ جذبۂ عمل پایا جاتا ہے۔ لوگوں کے ذریعہ یہاں کے جو حالات معلوم

ہوئے، ان سے اندازہ ہوا کہ یہاں کی سیاہ فام نسل میں اسلام کی اشاعت کے زبردست امکانات پائے جاتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمانوں میں دعوتی جذبہ پوری طرح بیدار ہو جائے اور وہ سیاہ فام نسل میں اسلام کی تبلیغ بڑے پیمانہ پر شروع کر دیں تو عین ممکن ہے کہ ان کی پوری قوم اسلام میں داخل ہو جائے۔

امریکہ میں اظہار خیال اور اشاعت افکار کی مکمل آزادی ہے۔ یہاں وہ منافقت بھی نہیں کہ کاغذ پر کچھ لکھا ہو اور عمل کسی اور چیز پر کیا جاتا ہو۔ مسلمان اگر اس امکان کو استعمال کریں اور یہاں کی سیاہ فام نسل کو اسلام کے حلقہ میں داخل کرلیں تو اس کے بعد امریکہ میں ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو جائے گا۔

امریکہ میں اس وقت یہودی غلبہ قائم ہے۔ اگر مذکورہ واقعہ رونما ہو سکے تو یہ منحوس غلبہ ختم ہو کر یہاں ایک نیا صحت مند غلبہ شروع ہو جائے گا۔ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ امریکیوں کے خیالات سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ یہاں کے سنجیدہ لوگ یہودی غلبہ کو بالکل پسند نہیں کرتے مگر اسلام کے سوا کوئی چیز نہیں جو امریکہ سے اس منحوس غلبہ کو ختم کر سکے۔ یہاں آکر اسلام خود امریکہ کی اپنی ایک ضرورت بن جاتا ہے۔

پاکستان میں راقم الحروف کی تمام کتابیں چھپ گئی ہیں اور وہاں عام طور پر ملتی ہیں۔ یہاں کے ایک پاکستانی مسلمان نے کراچی سے "ظہور اسلام" حاصل کی تھی اور اس کو پڑھ چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ نے اس کتاب کے ایک باب (حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار) میں نواسۂ رسول کے خلاف قلم اٹھایا ہے، یہ کہاں تک درست ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا ہے کہ حسین کے عمل کے مقابلہ میں حسن کے عمل کو ترجیح دی ہے، اور وہ بھی بہر حال نواسۂ رسول تھے۔

پھر میں نے کہا کہ حسین اور حسن کا معاملہ امت کے لیے ایک آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں دو رول ماڈل (Role Models) رکھ دیئے تھے۔ ایک رول ماڈل (نمونۂ عمل) حسین کا، جس سے امت کو باہمی خوں ریزی کے سوا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ دوسرا رول ماڈل حسن کا، جس سے اسلام اور امت اسلام کو زبردست فائدے

حاصل ہوئے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ظہور اسلام)

اب اللہ آپ کا امتحان لے رہا ہے کہ آپ دونوں میں سے کس رول ماڈل کو اپنے لیے اختیار کرتے ہیں۔ حسین کے رول ماڈل میں چونکہ جاہ طلب اور سیاست پسند لوگوں کے لیے گنجائش نکلتی ہے، اس لیے لوگ اس کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس رول ماڈل کو اپنایا، انھوں نے دوبارہ اسلام کی تاریخ میں بربادی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ جب کہ حسن کا رول ماڈل اپنانے والوں نے ہمیشہ تاریخ میں مثبت اضافے کیے ہیں۔

ایک مجلس میں میں نے دیکھا کہ ایک صاحب روس کو برا کہہ رہے ہیں اور دوسرے صاحب امریکہ کو۔ میں نے کہا کہ روس اور امریکہ میں داخلی حالات کے اعتبار سے ضرور فرق ہے، مگر جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، دونوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں میں سے کسی کی بھی خارجہ پالیسی اصول کی بنیاد پر قائم نہیں۔ وہ تمام تر استحصال کی بنیاد پر چلائی جا رہی ہے۔

مثلاً افغانستان اور فلسطین کے معاملہ کو تقابلی طور پر دیکھیے۔ افغانستان میں روس مقامی کمیونسٹ عناصر کا حامی ہے، اور امریکہ مقامی مسلم مجاہدین کا۔ اس کے برعکس فلسطین میں امریکہ اسرائیل کا حامی اور سرپرست بنا ہوا ہے، اور روس فلسطینی مسلمانوں کی تنظیم کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ گویا افغانستان میں روس امریکی کردار ادا کر رہا ہے اور فلسطین میں امریکہ روسی کردار ادا کرنے میں مشغول ہے۔

اس اعتبار سے جنرل ضیاء الحق اور ڈاکٹر نجیب اللہ دونوں کا کیس، باعتبار نوعیت تقریباً یکساں ہے۔ ضیاء الحق امریکہ نواز پالیسی پر کاربند تھے، اس لیے وہ امریکہ کے مطلوب شخص بن گیے۔ اس کے برعکس نجیب اللہ روس نواز پالیسی پر عامل ہیں، اس لیے وہ روس کے مطلوب شخص بنے ہوئے ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ امریکہ ظالم اسرائیل کی حمایت کر کے مسلم دنیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پیدا کیے ہوئے ہے۔ ضیاء الحق اسی امریکہ کے حامی بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ضیاء الحق کو یہ خوش قسمتی حاصل ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے اکابر ان

کو مجاہد اسلام کا ٹائیٹل عطا کریں۔ دوسری طرف نجیب اللہ اشتراکی روس کے حامی بنتے ہیں تو ان کے حصہ میں یہ بدقسمتی آتی ہے کہ اکابر ملت ان کو غدار کے لقب سے نوازتے ہیں۔

ایک دیندار مسلمان سے پاکستان کے الکشن (نومبر ۱۹۸۸) کے بارہ میں گفتگو ہوئی جس میں اسلامی اتحاد کو شکست دے کر بے نظیر بھٹو نے کامیابی حاصل کی ہے، اور اب وہ کسی مسلم ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم کی حیثیت حاصل کیے ہوئے ہیں۔ مذکورہ مسلمان نے اس پر اپنے درد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ " سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا حادثہ ہے "۔ میں نے کہا کہ ایک لفظی ترمیم کے ساتھ مجھے آپ کے تبصرہ سے اتفاق ہے۔ وہ یہ کہ ـــــــ سقوط خلافت کے بعد یہ مسلم دنیا کے لیے دوسرا سب سے بڑا سبق ہے۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد ترک خلافت کی حمایت میں جو ہنگامہ خیز تحریک چلائی گئی، وہ گویا دیمک زدہ لکڑی پر " ملٹی اسٹوری بلڈنگ " کھڑا کرنے کی کوشش تھی۔ چنانچہ عین فطری قانون کے مطابق وہ ناکام ہوگئی۔ اسی طرح پاکستان میں اسلامائزیشن کا ساڑھے گیارہ سالہ فوجی عمل کیا گیا۔ وہ بھی گویا بیج ڈالے بغیر پھاوڑے کے ذریعہ فصل کاٹنے کی کوشش تھی جو دوبارہ خود فطری قانون کے تحت بے فائدہ ثابت ہوئی۔

پیغمبرانہ طریقہ تزکیہ اور تدریج کا طریقہ ہے۔ یعنی پہلے ذہن بنایا جائے، اس کے بعد دھیرے دھیرے عملی احکام کا نفاذ کیا جائے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر حالات پیدا کیے بغیر نہ بین اقوامی اسلامی خلافت قائم ہوسکتی اور نہ قومی اسلامی حکومت۔ مگر مسلم رہنماؤں نے یہ اصلی اسلامی سبق نہ پہلے لیا اور نہ اب وہ ایسا سبق لے رہے ہیں۔ جس واقعہ سے سبق کی غذا حاصل کرنا تھا، اس کو وہ ماتم سرائی کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔

امریکہ کے لیے روانہ ہونے سے پہلے دہلی میں میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں پر مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کی دنیا میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ بے قیمت ہے تو وہ ہندستانی مسلمان ہے، مگر امریکہ کے سفر میں مجھ کو جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے بعد اندازہ ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان آج سونے اور چاندی سے بھی زیادہ قیمتی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں مجھے معلوم ہوا کہ جو مسلم قائدین ہندستان میں "مسلمان خطرہ میں" والی سیاست کے چیمپین بنے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل ہندستانی مسلمانوں کی لاشوں کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ یہ لوگ امریکہ میں (اور اسی طرح دوسرے دولت مند ملکوں میں) جاتے ہیں اور وہاں مسلمانوں کے اوپر ظلم کی داستانیں بتا کر بہت بڑی بڑی رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ ہندستان کے اور دوسرے ملکوں کے مسلمان جو یہاں کافی دولت کما رہے ہیں، ظلم اور تعصب کی داستانیں سن کر ان کے اندر قومی ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے، اور وہ مختلف طریقوں سے بڑی مقدار میں رقمیں جمع کرکے ان نام نہاد قائدین کو دیدیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ قائدین لاشوں کے تاجر ہیں، اگرچہ نادان لوگ ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔

امریکی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تقریباً ہر آدمی مقروض ہوتا ہے۔ کار، مکان اور اس طرح کی دوسری قیمتی چیزیں عام بینکوں سے سودی قرض لے کر حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ قرض محدود آمدنی والے بھی لیتے ہیں اور زیادہ آمدنی والے بھی۔ محدود آمدنی والوں کے لیے وہ ایک ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ اپنا خرچ بڑھائے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ رقم پس انداز نہیں کرپاتے اور قیمتی چیزیں حاصل کرنے کے لیے انھیں بینکوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ تاہم بزنس والے لوگ جن کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے، وہ بھی تقریباً صد فی صد مکانات قرض پر حاصل کرتے ہیں۔

دکتور کمال کامل عبدالحمید نمر (پیدائش ۱۹۳۷) ایک فلسطینی عرب ہیں۔ وہ تقریباً دس سال سے امریکہ میں ہیں۔ آج کل وہ سعودی اکیڈمی (واشنگٹن) میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے امریکی مسلمانوں کے بارہ میں کئی سال تک ریسرچ کی ہے اور اس موضوع پر وسیع معلومات رکھتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ کولمبس سے بہت پہلے دسویں صدی عیسوی میں اسپین کے آٹھ مسلمان امریکہ کے جنوبی ساحل پر اتر چکے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ آج تو یہاں بسنے والے عرب خاندان اپنی عربی زبان بھول چکے ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد نے عیسائی عورتوں سے شادیاں کرلی ہیں۔ مگر ان کو ایک بوڑھی عرب خاتون نے بتایا کہ میرے والد ۱۸۸۵ میں امریکہ آنے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا امریکہ میں مسجد ہے۔ کشتی والوں نے بتایا کہ نہیں۔ وہ ایسے کافر ملک میں جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور فوراً کشتی سے اتر آئے (خشی ان یھاجر الی بلاد الکفر تلك واسرع بمغادرة القارب علی الفور)

اسی طرح انھوں نے اور بہت سی معلوماتی باتیں بتائیں۔ ۱۸۹۲ میں امریکہ کا پہلا عربی رسالہ جاری ہوا جس کا نام "کوکب امریکا" تھا۔ نارتھ ڈاکوٹا کے شہر روس (Russ) میں یہاں کا پہلا جمعہ ۱۹۰۰ میں قائم ہوا۔ مشی گان کے شہر ہالینڈ پارک میں ۱۹۱۹ میں پہلی باقاعدہ مسجد تعمیر کی گئی۔ مگر افسوس کہ اب وہ چرچ ہے (وھو الآن مع الاسف کنیسة) اس وقت امریکہ میں ۴۰۰ سے زیادہ باقاعدہ مسجدیں ہیں۔ گھروں کی سیکڑوں مسجدیں اس کے علاوہ ہیں۔

انھوں نے ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ ۱۸۵۶ میں امریکہ نے عرب سے ۳۲ اونٹ خریدے تھے جو کشتی کے ذریعہ امریکہ لائے گئے تاکہ یہاں کے جنوبی علاقہ میں ان سے باربرداری کا کام لیا جاسکے۔ مگر آج یہ حال ہے کہ خود عرب ممالک امریکہ سے کار اور ہوائی جہاز خرید رہے ہیں۔

ان کے بیان کے مطابق، عربوں کے مقابلہ میں دوسری قوموں کے لوگ اپنی زبان اور اپنے کلچر کی حفاظت کے معاملہ میں زیادہ سخت ہیں۔ ایک عرب ایک بار ایک یہودی کے گھر گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا لڑکا ایک کونے میں دونوں ہاتھ اوپر کیے ہوئے ایک پاؤں پر کھڑا ہے اور رو رہا ہے۔ دریافت کرنے پر یہودی نے بتایا کہ میں اس سے کہتا ہوں کہ گھر کے اندر عبرانی زبان بولو مگر وہ نہیں بولتا۔ اسی کی یہ سزا ہے۔ ایک بوڑھے عرب نے انھیں بتایا کہ میرے لڑکے عرب اخلاق اور عرب زبان کو بھول چکے ہیں۔ اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرا اپنا گناہ ہے۔ میں نے اپنے بچوں کو امریکہ میں لاکر جرم کیا ہے (إنه ذنبي انا۔ لقد اجرمت باحضار ابنائي الى امريكا)

نئی نسل اگرچہ امریکی سماج میں گھل مل گئی ہے۔ مگر قدیم نسل سخت غیر مطمئن ہے۔ ایک بوڑھا عرب جو امریکہ کا شہری بن چکا ہے اور یہاں خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ اس نے دکتور عمر سے کہا کہ میری بدقسمتی ہے کہ میں امریکہ کے موٹرساز کارخانہ میں محنت کرکے ڈالر کماتا رہا۔ یہی محنت اگر میں خود اپنے ملک میں کرتا تو وہاں بھی میں اپنے لیے ایک اچھی زندگی بنا سکتا تھا (ولسوء الحظ فقد بذلت من الجهد في مصانع السيارات ما ان لو بذلته في بلدي لعشتُ افضل حياة)

امریکہ کے مسلمان مجھے ایک بڑے تضاد میں مبتلا نظر آئے۔ یہاں آپ جس مسلمان سے بھی ملیں

وہ آپ کو اس غم میں مبتلا نظر آئے گا کہ اس کے بچے " اسلامی تہذیب " سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف ان مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص (اِلّا ماشاء اللہ) سودی قرض پر زندگی گزار رہا ہے۔ بچوں کی تہذیبی شناخت کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ ہے، مگر اپنے آپ کو سودی قرض سے بچانے کے معاملہ میں ان کا اسلامی احساس زندہ نہیں۔

یہاں عام طور پر لوگ دو سبب سے سودی قرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک شخص ہے جس نے نیا نیا روزگار حاصل کیا ہے۔ اس کے پاس اپنے روزمرہ کے خرچ کے لیے تو معقول رقم ہوگی۔ مگر اس کے پاس اتنی رقم نہ ہوگی کہ وہ فوراً کار اور مکان بھی حاصل کر لے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ وہ دس سال تک کما کر رقم بچائے اور دس سال کے بعد کار اور مکان حاصل کرے۔ مگر ماحول کے زیر اثر وہ اس انتظار پر راضی نہیں ہوتا اور فوراً ہی کار اور مکان کا مالک بن جانا چاہتا ہے۔ یہاں بینک اس کی مدد کرتا ہے اور کار اور مکان اور دوسری قیمتی چیزوں کے لیے اس کو سودی قرض فراہم کر دیتا ہے۔ اس طرح آدمی سودی قرض میں پھنس جاتا ہے اور پھر تمام عمر اس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس رقم موجود ہوتی ہے (مثلاً تاجر حضرات) مگر وہ بھی مکان جیسی زیادہ قیمتی چیزوں کو نقد خریدنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بینک سے قرض لے کر مکان خریدتے ہیں۔ اور خود اپنی رقم کو کاروبار میں لگا دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ بینک کو جتنا سود ادا کریں گے، اس سے زیادہ وہ کاروبار میں نفع کما کر حاصل کر لیں گے۔

امریکی مسلمانوں کا یہ تضاد بتاتا ہے کہ اپنے بچوں کی تہذیبی پہچان کے لیے ان کا غم اسلامی غم نہیں ہے۔ اگر وہ اسلامی غم ہوتا تو اس کا اثر دونوں معاملات میں ظاہر ہوتا۔ یہ قومی جذبہ کے تحت ہے نہ کہ حقیقۃً اسلامی جذبہ کے تحت۔ اور یہ قومی جذبہ جس طرح مسلمانوں میں ہے اسی طرح وہ پوری شدت کے ساتھ دوسری قوموں میں بھی پایا جاتا ہے (ملاحظہ ہو مسٹر رام بکسانی کا بیان، مطبوعہ قومی آواز، ۴ جنوری ۱۹۸۸، صفحہ ۲)

اس معاملہ کا اس سے بھی زیادہ عجیب پہلو یہ ہے کہ یہاں کے تمام مسلمان اس بات کی شکایت کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ امریکہ کی اقتصادیات پر یہودیوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ یہاں

کی بینکنگ پوری طرح ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ یہاں کی دولت پر قبضہ کر کے اس کو بھرپور طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ مگر یہ بات صرف زبانی مذمت تک محدود ہے۔ عملی طور پر یہاں کا تقریباً ہر مسلمان یہودی اقتصادی اداروں سے سودی قرض لے کر ان کو تاعمر اپنی کمائی کا ایک حصہ ادا کرتا ہے تاکہ وہ خود اس کے اپنے اقرار کے مطابق، اس کو اسلام اور مسلمانوں کی جڑ اکھاڑنے میں لگائیں۔

لاس اینجلیس کی ایک خاتون بلی روتھ (Billie Ruth) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ قبول اسلام کا سبب پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں ۱۸ سال پہلے کی عمر میں چرچ جاتی تھی۔ وہاں مجھے مسیحیت کے بارہ میں عجیب تجربہ ہوا۔ میں نے پایا کہ جو کچھ میں بائبل میں پڑھتی ہوں اور جو کچھ میں چرچ کے اندر سنتی ہوں، دونوں ایک نہیں ہیں۔ میں نے سوال کرنا شروع کیا اور چرچ سوسائٹی کو چھوڑ دیا:

I found that what I read in the Bible and what I heard in the Church was not the same. I started questioning and I dropped out of church society.

بعد کے مرحلہ میں انھوں نے قرآن کو پڑھا اور اسلام قبول کر کے ایک انڈونیشی مسلمان (سلیمان) سے شادی کر لی، مطالعہ کے بعد انھوں نے پایا کہ اسلام واحد مذہب ہے جس میں جو کچھ لکھا ہے وہی بتایا بھی جاتا ہے:

Islam is the only religion that reads and teaches the same.

بعض لوگ اس واقعہ کو اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگیاں اسلام کے مطابق نہیں ہیں۔ مگر یہ صورت حال کسی بھی درجہ میں اسلامی دعوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں۔ عیسائیت ایک منظم مذہب ہے، اس بنا پر اس میں مذہب کے دو معیار بن گئے ہیں۔ ایک ان کا چرچ، دوسرے ان کی کتاب مقدس۔ ان دونوں میں اگر فرق یا تضاد ہو تو وہ خود مسیحی مذہب کو مشتبہ قرار دینے کا سبب بن جائے گا۔ اس کے برعکس اسلام میں اصل معیار صرف ایک ہے۔

اور وہ اس کی کتاب مقدس ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا خلاف اسلام عمل، خالص نظریاتی اعتبار سے، اسلامی دعوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ مسیحیت میں ریڈنگ اور ٹیچنگ کا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے برعکس، اسلام میں صرف ریڈنگ اور پریکٹس کا۔

امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ ان نومسلموں کے ذریعہ وہی دعوتی عمل دوبارہ زندہ ہونا چاہیے تھا جو دوراول کے نومسلموں کے ذریعہ ساری دنیا میں زندہ ہوا تھا۔ مگر عملاً ایسا نہ ہوسکا۔ محمد علی کلے (پیدائش ۱۹۴۲) ایک امریکی نومسلم ہیں۔ ان کے اندر ابتداءً دعوت کا جذبہ تھا۔ مگر شاید میں عظیم ہوں (I am the greatest) کے شوق سے وہ چھٹکارا حاصل نہ کرسکے۔ اپنے کو سب سے بڑا ثابت کرنے کے لیے وہ بار بار باکسنگ کا خوفناک کھیل کھیلتے رہے۔ آخری کھیل (۱۹۸۱) ان کے لیے سخت مہلک ثابت ہوا۔ ان کے سر میں ایسی چوٹیں آئیں جس سے ان کا دماغی توازن بگڑ گیا۔

محمد علی کے پاس شکاگو میں ۱۶ ایکڑوں کا نہایت وسیع مکان ہے۔ وہ دو فارم کے مالک ہیں۔ جدید ترین گاڑیوں کا ایک پورا دستہ موجود ہے۔ بہت بڑا بینک بیلنس اس کے علاوہ ہے۔ مگر محمد علی اب خود کچھ بھی نہیں۔ وہ آج ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) بن چکے ہیں۔ اب وہ عام انسان کی حیثیت سے بھی زندگی گزارنے کے قابل نہیں، اسلامی داعی کی ذمہ داریوں کو ادا کرنا تو درکنار۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب مثال بلی روتھ سلیمان (Billie Ruth Suleiman) کی ہے۔ اس امریکی نومسلمہ سے پوچھا گیا کہ زندگی میں آپ کی خواہش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے مدینہ سے گہری محبت ہے۔ اگر مجھے رہنے کے لیے کوئی ایک جگہ دی جائے تو میں پیغمبر کی مسجد کے قریب ترین رہنا پسند کروں گی:

O, I have deep love for Madina. If I were given one place to live, I would choose to be as close as possible to the Prophet's Mosque.

میرا خیال ہے کہ اس قسم کے احساسات موجودہ مسلم سماج کا نتیجہ ہیں نہ کہ اسلامی تعلیمات کا۔ موجودہ مسلمان نہ صرف یہ کہ خود اسلامی دعوت کا کام نہیں کررہے ہیں۔ مزید یہ کہ کوئی شخص اگر قرآن کو پڑھ کر

اسلام قبول کرتا ہے تو اس کے لیے بھی وہ "ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد" کا مصداق ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اسلام قبول کرکے وہ جس سماج میں داخل ہوتا ہے وہ اس قسم کے نغموں سے گونج رہا ہے:

میرے مولا بلالے مدینے ہمیں

ماہنامہ برہان (نومبر ۱۹۸۸) میں ایک واقعہ پڑھا۔ مطبوعہ الفاظ کے مطابق وہ یہ تھا: "امریکہ میں مقیم تحریک اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ ڈاکٹر عرفان احمد صاحب نے ۲-۵ جولائی ۱۹۸۸ کو علی گڑھ میں انٹرنیشنل اسلامک فیڈریشن آف اسٹوڈنٹ آرگنائزیشن IFSO کے تحت منعقدہ ٹریننگ کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک بات نقل کی۔ ایک بار دوران گفتگو مولانا نے امریکہ کی آزادی اور سیکولرزم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سوویت سیکولرزم اور ہندستانی سیکولرزم کے مقابلہ میں امریکی سیکولرزم کم خطرناک ہے۔ اس پر میں نے مولانا کی سادہ لوحی پر تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ مولانا، امریکہ میں بسنے والے مسلمان عالمی دشمنِ اسلام نمبر ایک امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں، اور وہ اس مسئلہ میں اتنے حساس ہیں کہ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ دنیا کا سب سے بڑا دشمن کون ہے تو چھوٹتے ہی وہ امریکہ کا نام لیتے ہیں" (صفحہ ۳۱-۳۲)

یہ نہایت عجیب بات ہے کہ امریکہ میں بسنے والے مسلمان شدید حساسیت کی حد تک یہ رائے رکھتے ہیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اس کے باوجود ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ملکوں کو چھوڑ کر اطمینان کے ساتھ امریکہ میں رہ رہے ہیں تاکہ اس سب سے بڑے دشمنِ اسلام کی مشین کا ایک پرزہ بن سکیں۔ حتیٰ کہ پہلا موقع ملتے ہی وہ امریکہ کی شہریت حاصل کر لیتے ہیں تاکہ اپنی آنے والی نسلوں تک کو اس عظیم دشمنِ اسلام کی خدمت گزاری کے لیے وقف کر سکیں۔ واضح ہو کہ امریکی شہریت کسی کو صرف اس وقت ملتی ہے جب کہ وہ امریکی نظام سے مکمل وفاداری کا فارم بھرے۔

تاہم اس سے قطع نظر، ذاتی طور پر مجھے دونوں میں سے کسی رائے سے بھی اتفاق نہیں۔ میرے نزدیک یہ بات بالکل اضافی ہے کہ کون دشمن نمبر ا ہے اور کون دشمن نمبر ۲۔ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ ظاہری ناموافق حالات کے باوجود امکانی طور پر مواقع کار کہاں پائے جاتے ہیں۔ موانع کو

دیکھنا اور مواقع کو نہ دیکھنا ہی بے بصیرتی ہے، اور موجودہ زمانہ میں ساری دنیا کے مسلمان اسی بے بصیرتی میں مبتلا ہیں، ان کے اصاغر بھی اور ان کے تمام اکابر بھی۔

محمود السائس ایک مصری انجینیر ہیں۔ انھوں نے مصر کے بعد امریکہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ آج کل وہ امریکہ کے ایک بڑے انجینیرنگ ادارہ (Database System Services) میں منیجر ہیں۔ یہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی کا ادارہ ہے جو ہوائی جہاز بنانے کا کام کرتی ہے۔

محمود السائس کا کہنا ہے کہ میں (اور اسی طرح دوسرے بہت سے لوگ، جو یہاں ہیں، وہ شناخت کے بحران (Identity crisis) میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے امریکی شہریت حاصل کرنے کے لیے ۲۲ فروری ۱۹۷۸ کو ایک مخصوص فارم بھرا۔ اس کے تحت انھوں نے اس بات کا حلف لیا کہ میں ہر بیرونی وفاداری کو مکمل طور پر ترک کر کے پوری طرح صرف امریکہ کا وفادار رہوں گا۔ "مگر دس سال گزرنے کے بعد بھی میں دہرا جذبات کا شکار ہوں" انھوں نے کہا۔

ایک طرف، محمود السائس کے الفاظ میں، ان کے معاہداتی فرائض (Contractual obligations) ہیں جن کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دوسری طرف ان کے جذباتی احساسات (Sentimental feelings) ہیں جو ان کے سابق وطن مصر سے وابستہ ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے جذباتی انداز میں کہا کہ ان دونوں چیزوں کے درمیان میں اپنی شخصیت کو متعین نہیں کر پاتا۔ کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ میری اصل قومیت کیا ہے:

Can you tell me what my true nationality is?

میرا اندازہ ہے کہ یہی ان تمام لوگوں کا حال ہے جنھوں نے یہاں کی شہریت حاصل کرلی ہے۔ ہر ایک دہرا شخصیت کا انسان بنا ہوا ہے۔ کچھ لوگ کش مکش میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ چھوڑ کر دوبارہ اپنے سابق وطن چلے گیے۔ اور کچھ لوگوں نے اس جھنجھٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس حد تک امریکی بنالیا کہ اب وہ غیر ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اور "عید" کے بجائے "کرسمس" کو اپنے تیوہار کے طور پر مناتے ہیں۔

مسلمان اگر مغربی ملکوں میں داعی بن کر آتے تو وہ وہی تاریخی کارنامہ انجام دیتے جو صحابہ کرام نے عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں جاکر انجام دیا۔ مگر وہ داعی بن کر نہیں آئے نتیجہ یہ

ہوا کہ وہ صرف دوسری قوموں کے مدعو بن کر رہ گیے۔

امریکی مسلمانوں کے بارہ میں ایک رپورٹ پڑھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ میں چار ملین کی تعداد میں وہ مسلمان ہیں جو حال میں ہجرت کرکے یہاں آئے ہیں۔ اور چار ملین سے کچھ زیادہ وہ لوگ ہیں جن کو پہلے بلیک مسلم کہا جاتا تھا، مگر اب وہ بقیہ مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو چکے ہیں اور صرف مسلم کہے جاتے ہیں۔ یہ مسلمان چار ہزار سے زیادہ مسجدوں اور کلچرل مراکز میں اپنے مذہبی اعمال ادا کرتے ہیں :

In the U.S. it is estimated that there are 4 million Muslims of recent immigrants, and more than of what was referred to, and is no more, of the black Muslims, because now the black Muslims have joined ranks with the rest and are all called Muslims. These Muslims practice their religion in over 400 smaller or larger mosques or cultural centres.

امریکہ کے کالے باشندوں (نیگرو) کو پہلے غلام سمجھا جاتا تھا۔ تاہم اب انھیں قانونی طور پر یکساں شہری حقوق حاصل ہیں۔ اگرچہ اپنی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر وہ اس قانونی امکان سے ابھی پورا فائدہ اٹھانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔

امریکہ کے بعض نئے مفکرین نے سفید فام باشندوں اور سیاہ فام باشندوں کے درمیان یکساں حقوق کی وکالت کرتے ہوئے کہا ہے کہ امریکہ کے سیاہ فام باشندے مختلف مگر یکساں (Different by equal) ہیں۔ یہ نہایت صحیح تعبیر ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ عورت اور مرد کے فرق کا بھی ہے۔ عورت مرد سے مختلف ہے، مگر حقوق اور انسانی احترام میں وہ یکساں ہے۔ لیکن امریکی مفکرین نے جس حقیقت کو سیاہ فام اور سفید فام باشندوں کے معاملہ میں سمجھ لیا ہے، وہ اس حقیقت کو ابھی تک عورت اور مرد کے معاملہ میں سمجھ نہ سکے۔

اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ سفید فام اور سیاہ فام کے مسئلہ پر انھوں نے کھلے ذہن کے تحت سوچا، اس لیے وہ اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھ گیے۔ مگر عورت اور مرد کے معاملہ میں سوچتے ہوئے ان کی خواہش رکاوٹ بن گئی۔ اس نفسیاتی پیچیدگی کی بنا پر وہ اس دوسرے معاملہ میں اس کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

امریکہ کے سیاہ فام باشندوں کو نیگرو کہا جاتا تھا۔ ان کی حیثیت وہاں بالکل غلام کی سی تھی۔ اس کے ردعمل میں ان کے درمیان مختلف تحریکیں اٹھیں۔ ایک تحریک کے قائد ایلیجا محمد تھے۔ انھوں نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنا مذہب اسلام بتایا۔ ان کے پیرو بلیک مسلم کہے جاتے تھے۔

۱۹۷۵ میں ایلیجا محمد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کے لڑکے وارث دین محمد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ وارث محمد نے جلد ہی پورے نظام کو بدل دیا۔ انھوں نے اپنے فرقہ کے لیے "بلیک مسلم" کے بجائے "امریکن مسلم" کی اصطلاح استعمال کی۔ انھوں نے اس سے انکار کیا کہ ان کے والد پیغمبر تھے۔ انھوں نے خالص اسلام (Pure Islam) کو اختیار کرنے کا اعلان کیا، یعنی وہی اسلام جو دوسرے تمام مسلمانوں کا ہے۔ انھوں نے امریکی حکومت سے وہ رقابت بھی ختم کر دی جو ان کے والد غیر ضروری طور پر قائم کیے ہوئے تھے۔ فرقہ کے کچھ افراد نے ان کی مخالفت کی، مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ۱۹۶۰ میں ان لوگوں کی تعداد ۱۰ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مگر ۱۹۸۵ میں اس فرقہ کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اب ان کی تعداد چار ملین ہے۔ اس فرقہ کے بارہ میں امریکہ میں بہت سی معلوماتی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Charles E. Lincoln, The Black Muslims in America, 1982

ایلیجا محمد نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا۔ تاہم ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ امریکہ میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ ہندستان یا پاکستان جیسے ملک میں پیدا ہوتے تو ان کا مستقبل بالکل دوسرا ہوتا۔ اب تک وہ اور ان کے متبعین کافر قرار دے کر امت مسلمہ سے الگ کر دیے گئے ہوتے۔ مگر آج ایلیجا محمد کے جانشین وارث محمد اپنے چار ملین پیرؤوں کے ساتھ امت مسلمہ کا حصہ بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر میاں محمد سعید (پروفیسر جارج میسن یونیورسٹی، ورجینیا) نے بتایا کہ ۱۹۷۲ میں وہ وینزویلا کے شہر کارکس (Carcas) گیے۔ وہ ہوائی اڈہ پر اترے تو وہاں آدمیوں کا بہت بڑا ہجوم اکٹھا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ لوگ اتنی بڑی تعداد میں ہوائی اڈہ پر کیوں جمع ہیں۔ مجمع میں سے ایک شخص نے کہا کہ آپ نہیں جانتے۔ آج محمد علی آنے والے ہیں۔ یہ سارے لوگ ان کے استقبال کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بتاتے ہوئے ڈاکٹر

میاں محمد سعید نے کہا کہ محمد علی بلیک مسلم ہونے کی حیثیت سے الیجا محمد کا پیرو تھا۔ مگر ساری دنیا میں اس کا استقبال ایک مسلم ہیرو کی حیثیت سے کیا گیا :

He was welcomed all over the world as a Muslims hero

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی کلے اپنے آپ کو مسلم ملت کا ایک فرد سمجھنے لگے۔ امریکہ کے کالے مسلمان عمومی طور پر مسلمانوں کے قریب آگئے۔ یہ قربت بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کالے مسلمانوں کے موجودہ لیڈر وارث محمد نے حج کے لیے جانا چاہا تو ان کو بھی بلا روک ٹوک حج کی اجازت مل گئی۔ وہاں ان کی ملاقات تمام دنیا کے مسلمانوں سے ہوئی۔ اس سے ان کو اپنے خیالات کی تصحیح میں مدد ملی۔

نیو آرک (Newark) میں رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں وارث محمد کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ جب وہ وہاں پہونچے تو ان کا خصوصی استقبال کیا گیا۔ یہاں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کھلے طور پر اعلان کیا کہ ان کے باپ الیجا محمد عام انسان تھے، وہ پیغمبر نہیں تھے۔ محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر نبوت آخری طور پر ختم ہو چکی ہے۔ ہم دوسرے مسلمانوں کے عقیدہ کو مانتے ہوئے ان کے ساتھ یکساں طور پر شامل ہوتے ہیں۔ ان کے والد کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانہ میں صرف ان کی جماعت کو امت اسلام کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اپنی جماعت کا نام انھوں نے (Lost-Found Nation of Islam) رکھا تھا۔ وارث محمد نے اس کو بدل کر اپنی جماعت کا نام "امریکن مسلم" رکھ دیا۔ وغیرہ

قادیانی لیڈروں اور قادیانی فرقہ کا معاملہ بھی عین یہی تھا۔ مگر یہاں ان کے ساتھ بالکل مختلف سلوک کیا گیا۔ صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان کے معاملہ میں دعوت اور نصیحت کے اصول پر اصلاحی عمل کا آغاز کیا جاتا۔ مگر مسلم علماء نے یہاں نفرت اور مناظرہ بازی اور تکفیر اور بائیکاٹ سے اپنے عمل کا آغاز کیا۔ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ان کے دشمن بن کر کھڑے ہوگیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قادیانیوں میں مزید شدت بڑھتی گئی، وہ قریب ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوگیے۔

مسلمانوں نے محمد علی کلے کو اپنا ہیرو بنایا۔ مگر انھوں نے ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنا ہیرو نہیں بنایا۔ حالانکہ محمد علی نے جو کارنامہ باکسنگ کے میدان میں انجام دیا تھا، وہی کارنامہ ڈاکٹر عبدالسلام نے سائنس کے میدان میں انجام دیا تھا۔ اگر مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کرتے تو

عین ممکن تھا کہ جس طرح " امریکی قادیانی " تائب ہو کر امت مسلمہ کا جزء بن گیا ، اسی طرح " پاکستانی قادیانی " بھی اپنی اعتقادی اصلاح کرکے امت مسلمہ میں شامل ہو جاتا۔

واشنگٹن سے ایک عربی اخبار نکلتا ہے جس کا نام " الامۃ " ہے۔ اس کے چند شمارے دیکھنے کو ملے۔ یہاں کے انگریزی اخباروں کے مقابلہ میں اس کا معیار صحافت بہت کم تھا۔ اس کے شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۸۸ میں صفحہ اول پر خلیل جبران کے چند اقوال درج تھے۔ ایک قول یہ تھا :

وَیلٌ لامّۃٍ مقسّمۃٍ إلی أجزاءٍ وکلّ جزءٍ یَحْسَبُ نفسَہُ فیھا أُمّۃ — اس قوم کے لیے خرابی ہے جو بہت سے حصوں میں بٹ جائے اور ہر جزء یہ سمجھے کہ وہی قوم ہے۔

مغربی ملکوں میں بڑی تعداد میں ہندستان اور پاکستان کے لوگ آباد ہیں۔ یہ لوگ مختلف اسلامی شخصیتوں سے متاثر ہیں اور اس کے مطابق اپنے اجتماعات کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے مختلف ناموں سے الگ الگ تنظیمیں بھی قائم کر رکھی ہیں۔

اسی قسم کی ایک تنظیم کا اجتماع امریکہ میں جولائی ۱۹۸۸ میں ہوا۔ اس کی روداد میں نے پڑھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ ہماری تنظیم نے مختلف مقامات پر " دعوتی اجتماعات " کیے۔ اسی کے ساتھ درج تھا کہ " افغانستان ، فلسطین اور ہندستانی مسلمانوں کے حق میں مختلف شہروں میں مظاہرے اور جہاد کانفرنسیں منعقد کی گئیں "۔ میں اس انداز کار کو عملاً بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ قومی احتجاج اور دعوت حق کا کام ، دونوں ساتھ ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

رپورٹ کے مطابق ، تنظیم کے جولائی ۱۹۸۸ کے اجتماع میں اس کے صدر نے جو تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارا نصب العین اسلامی نظام حکومت کا قیام ہے۔ اسی میں دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔ انھوں نے گرجدار آواز میں کہا کہ مسلم نوجوان خالد و طارق کو اپنا آئیڈیل بنائیں اور انسان کو انسان کی غلامی سے نکالنے کے لیے مجاہد بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی جذباتی تقریر کے دوران بار بار اللہ اکبر کے نعرے لگتے رہے۔

اس اجتماع میں مشہور انگریز نومسلم یوسف اسلام ، سابق کیٹ اسٹیونس (Cat Stevens) کو بھی بلایا گیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ، یوسف اسلام کی تقریر کے دوران آڈیٹوریم پر مکمل سناٹا چھایا رہا۔ سامعین مبہوت ہو کر ان کی گفتگو سنتے رہے۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا۔ " روشنی کی طرف سفر "

انھوں نے اپنے قبول اسلام کا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ دولت، شہرت، عزت سب کچھ میرے پاس موجود تھی، مگر دل کا سکون نہ تھا۔ ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ شراب اور منشیات کے ذریعہ سکون حاصل کرو۔ اسی دوران مجھے قرآن کا انگریزی ترجمہ مل گیا۔ اس کو پڑھ کر میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ سکون کا اصل ماخذ کیا ہے، قرآن نے میرے دل کے آخری گوشہ تک اپنی جگہ بنا لی۔

ہندستان اور پاکستان کے "اسلام پسند" جو اپنے ملکوں کو چھوڑ کر امریکہ گیے ہیں۔ وہ وہاں بھی سیاست اور جہاد کی تقریریں کرتے رہتے ہیں، مگر اس قسم کی تقریروں میں وہاں کے باشندوں کے لیے کوئی کشش نہیں۔ البتہ یوسف اسلام جیسے لوگوں کی آواز میں ان کے لیے بے پناہ کشش ہے۔ مغرب کے سامنے سیاسی انداز میں اسلام کو پیش کرنا مغرب کو اسلام سے دور کرنا ہے۔ البتہ اگر مغرب کے سامنے فطرت کے انداز میں اسلام کو پیش کیا جائے تو وہاں کا انسان اس کے اندر اپنے لیے بے پناہ کشش پائے گا۔

امریکہ میں اب خدا کے فضل سے بہت سے لوگ پیدا ہو گیے ہیں جو الرسالہ کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابراہیم مامون صاحب نیویارک میں مقیم ہیں۔ وہ عرصہ سے الرسالہ کے قاری ہیں۔ اب انھوں نے پانچ کی تعداد سے الرسالہ کی ایجنسی شروع کر دی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ امریکی پروفیسر ٹامس (Prof. Thomas) ان کے ملاقاتیوں میں تھے، ان کو انھوں نے الرسالہ انگریزی دیا اور مرکز کی چھپی ہوئی انگریزی کتابیں پڑھائیں۔ پروفیسر ٹامس کو یہ کتابیں بہت پسند آئیں۔ اب وہ اسلام سے مانوس نظر آرہے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کے مختلف مقامات پر لوگ الرسالہ (اردو یا انگریزی) منگاتے ہیں۔ وہ ان کو خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھاتے ہیں۔

ہلٹن ہوٹل کے ایک بہت بڑے ہال کے باہر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا۔ جس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا: بازار۔ اس کے اندر مختلف "اسلامی" چیزوں کی دکانیں تھیں۔ اس کے زیادہ بڑے حصہ میں کتابوں کے اسٹال تھے۔ دو بڑی میزوں پر اسلامی مرکز (دہلی) کا بھی اسٹال تھا جس پر تمام کتابیں اور الرسالہ (اردو، انگریزی) رکھے گئے تھے۔ بڑی تعداد میں

لوگوں نے اسے آکر دیکھا اور کتابیں حاصل کیں۔ کئی لوگوں نے پورے پورے سٹ حاصل کیے۔

صغیر احمد اسلم صاحب یہاں کے ایک بڑے تاجر ہیں۔ ان کو تذکیر القرآن بہت زیادہ پسند آئی۔ انھوں نے بار بار اصرار کیا کہ پوری تفسیر کو آڈیو کیسٹ پر لے آئیے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں امریکہ میں لوگوں کے پاس پڑھنے کا وقت نہیں، البتہ سننے کا وقت انھیں مل جاتا ہے۔ اور یہ وقت وہ ہے جب کہ وہ کار پر سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ یہاں کے آدمی کے پاس اگر کوئی "خالی وقت" ہے تو وہی ہے جب کہ وہ کار سے سفر کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ وقت روزانہ اس کو کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اگر تذکیر القرآن کو کیسٹ پر منتقل کر دیا جائے تو ہر آدمی اس کو اپنی کار میں رکھے گا اور سفر کے وقت روزانہ اس کو سنتا رہے گا۔

۳۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو واپسی ہوئی۔ پین ایم کی فلائٹ نمبر ۱۲۰ کے ذریعہ لاس اینجلیس سے روانہ ہوا۔ دن کے بارہ بجے جہاز کے اندر داخل ہوا تو بڑے جہاز کی بیشتر سیٹیں خالی تھیں۔ یہ غالباً اس حادثہ کا اثر تھا جو ۲۱ دسمبر کو پین ایم کے جہاز کے ساتھ پیش آیا۔ انسان زندگی کے بعد پیش آنے والی موت سے ڈرتا ہے۔ مگر موت کے بعد پیش آنے والی موت سے کسی کو اندیشہ نہیں۔

اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتا ہوا لندن کی طرف جا رہا ہے۔ سطح زمین پر بادل چھائے ہوئے تھے، مگر ۳۳ ہزار فٹ اوپر پہونچ کر ماحول بدل چکا تھا۔ اب جہاز نیلے رنگ کے کھلے آسمان میں اڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ زندگی کے تمام جھگڑے نچلی سطح پر پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کو اٹھا کر بلندی پر لے جاسکیں تو تمام جھگڑے اور فساد اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

فرینکفرٹ سے دہلی کے لیے پین ایم کی فلائٹ نمبر ۶۲ کے ذریعہ سفر ہوا۔ یہ یکم جنوری ۱۹۸۹ کی تاریخ تھی۔ جہاز میں بیشتر ہندستانی مسافر تھے۔ چنانچہ اناؤنسر کی زبان بدل گئی۔ اس سے پہلے انگلش اور جرمن میں اعلانات کیے جارہے تھے۔ اب جہاز کے اناؤنسر نے انگلش کے ساتھ ہندی میں اعلان شروع کر دیا:

> ہمیں آشا ہے کہ ہمارے ساتھ آپ کی یاترا سکھت رہے گی۔ یدی آپ کسی قسم کی سہائتا چاہیں تو ہم آپ کی سیوا میں اُپسِتت ہیں۔ ہم اپنے سب یاتریوں کو

نئے سال کی شبھ کامنائیں دیئے ہیں۔
ایک تاجر کو معلوم ہے کہ اسے اپنے گاہک سے وہی زبان بولنا ہے جو گاہک کی اپنی زبان ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے داعی اس راز کو نہیں جانتے کہ وہ اپنے مدعو سے خود مدعو کی زبان میں کلام کریں۔ اگر کوئی شخص بظاہر مدعو کی زبان میں بولنے والا ہو تو وہ بھی صرف حروف تہجی کے اعتبار سے ہوگا۔ اسلوب کلام اور انداز بیان کے اعتبار سے دیکھئے تو مدعو کے آشنا اسلوب اور اس کے مانوس انداز میں بولنے والے داعی سرے سے دنیا میں موجود ہی نہیں۔
فرینکفرٹ سے دہلی کا سفر مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ یعنی سورج کے الٹی طرف۔ چنانچہ دن بہت تیزی سے ختم ہوا۔ فرینکفرٹ سے روانگی ہوئی تو دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ آٹھ گھنٹہ کا سفر طے کر کے جب دہلی پہونچے تو یہاں رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ یعنی "آٹھ گھنٹہ" میں "تیرہ گھنٹہ" کا سفر طے ہوا۔
۲ جنوری ۱۹۸۹ کو رات کے ڈیڑھ بجے جہاز دہلی پہونچا۔ آٹھ گھنٹہ کی لمبی اڑان کے بعد جب جہاز حفاظت کے ساتھ زمین پر اترا تو مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ لیکن اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ ہم جس زمین پر اترے وہ خود بھی ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے خلا میں دوڑ رہی ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہم ایک جہاز سے اتر کر دوسرے جہاز پر سوار ہوئے۔ ہم انسانی سواری سے نکل کر خدائی سواری میں بیٹھ گیے۔
انسانی سفر مسلسل جاری ہے۔ انسانی سفر کی منزل موت ہے نہ کہ کوئی ایرپورٹ۔ یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو (کن فی الدنیا کانك عابر سبیل)
۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ کو ہندستان سے امریکہ کے لیے روانگی ہوئی تھی۔ یکم جنوری اور ۲ جنوری ۱۹۸۹ کی درمیانی رات کو دوبارہ میں نے ہندستان کی زمین پر قدم رکھا۔ یہ سفر اگرچہ بہت محدود مدت کے لیے تھا، مگر اس مدت میں پورا کیلنڈر تبدیل ہوگیا۔ تاریخ کے صفحہ پر ۱۹۸۸ کے بجائے ۱۹۸۹ لکھا جا چکا تھا۔ میں "حال" سے نکل کر "مستقبل" میں داخل ہوگیا۔
دہلی سے کیلی فورنیا کے سفر میں میں نے کرۂ ارض کے آدھے سے زیادہ حصہ کا سفر کیا۔

جانے اور آنے کو ملا کر مجموعی طور پر تقریباً ۳۰ ہزار میل کا فاصلہ طے ہوا۔ دس دن کے بعد جب میں اس لمبے سفر سے واپس ہو کر اپنے ٹھکانے پر پہونچا تو میں نے سوچا کہ دنیا کے سفر میں آدمی بہر حال ایک روز اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتا ہے۔ مگر ایک اور سفر ہے جس کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔

یہ موت کا سفر ہے جو ہر ایک کو لازمی طور پر کرنا ہے۔ موت کے سفر کے بعد نہ واپسی کا کوئی امکان ہے اور نہ تلافی مافات کی کوئی صورت۔ ہر آدمی کو لازماً ایک ایسی سواری پر بیٹھنا ہے جو کبھی اس کو واپس لے کر نہیں آئے گی کہ وہ اپنی کوتاہی اور اپنی سرکشی کی تلافی کر سکے۔ آہ، کیسا سخت معاملہ انسان کے ساتھ پیش آنے والا ہے اور وہ کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔ دنیا کی تمام عجیب باتوں میں سب سے زیادہ عجیب بات بلاشبہ یہی ہے۔

اردو

- تذکیر القرآن جلد اول
- تذکیر القرآن جلد دوم
- اللہ اکبر
- پیغمبر انقلاب
- مذہب اور جدید چیلنج
- عظمت قرآن
- عظمت اسلام
- عظمت صحابہ
- دین کامل
- الاسلام
- ظہور اسلام
- اسلامی زندگی
- احیاء اسلام
- راز حیات
- صراط مستقیم
- خاتون اسلام
- سوشلزم اور اسلام
- اسلام اور عصر حاضر
- الربانیہ
- کاروان ملت
- حقیقت حج
- اسلامی تعلیمات
- اسلام دور جدید کا خالق
- حدیث رسولؐ
- ڈائری جلد اول
- ڈائری جلد دوم
- سفرنامہ (ملکی اسفار)
- سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
- میوات کا سفر
- قیادت نامہ
- راہ عمل
- تعبیر کی غلطی
- دین کی سیاسی تعبیر
- اقوال حکمت
- انوار حکمت
- تعبیر کی طرف
- تبلیغی تحریک
- تجدید دین
- عقلیات اسلام
- مذہب اور سائنس
- قرآن کا مطلوب انسان
- دین کیا ہے
- اسلام دین فطرت
- تعمیر ملت
- تاریخ کا سبق
- فسادات کا مسئلہ
- انسان اپنے آپ کو پہچان
- تعارف اسلام
- اسلام پندرھویں صدی میں
- راہیں بند نہیں
- ایمانی طاقت
- اتحاد ملت
- سبق آموز واقعات
- زلزلۂ قیامت
- حقیقت کی تلاش
- پیغمبر اسلام
- آخری سفر
- اسلامی دعوت
- خدا اور انسان
- حل یہاں ہے
- سچا راستہ
- دینی تعلیم
- حیات طیبہ
- باغ جنت
- نار جہنم
- خلیج ڈائری
- رہنمائے حیات
- شخصیات اسلام
- تعدد ازدواج
- روشن مستقبل
- صوم رمضان
- علم کلام
- صداقت اسلام
- علماء اور دور جدید
- ہندستانی مسلمان
- سیرت رسولؐ

عربی

- الاسلام یتحدی
- سقوط الماركسية
- حقيقة الحج

آڈیو کیسٹ

- A-1 حقیقت ایمان
- A-2 حقیقت نماز
- A-3 حقیقت روزہ
- A-4 حقیقت زکوٰۃ
- A-5 حقیقت حج
- A-6 سنت رسولؐ
- A-7 میدان عمل
- A-8 پیغمبرانہ رہنمائی
- A-9 اسلامی دعوت کے جدید امکانات
- A-10 اسلامی اخلاق
- A-11 اتحاد ملت
- A-12 تعمیر ملت
- A-13 نصیحت لقمان

ویڈیو کیسٹ

- V-1 پیغمبر انقلاب
- V-2 اسلام داعی امن
- V-3 اسلام دور جدید کا خالق
- V-4 امت مسلمہ کے لیے نئے چیلنج
- V-5 اسلام اور سماجی انصاف
- V-6 اسلام اور دور حاضر

- God Arises
- Muhammad The Prophet of Revolution
- Islam As It Is
- God Oriented Life
- Words of the Prophet
- Introducing Islam
- Religion and Science
- Tabligh Movement
- Islam the Voice of Human Nature
- Islam the Creator of Modern Age
- The Way to Find God
- The Teachings of Islam
- The Good Life
- The Garden of Paradise
- The Fire of Hell
- Man Know Thyself!
- Muhammad The Ideal Character
- Social Justice in Islam
- Polygamy in Islam
- Words of Wisdom

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

سال

- 1976-77
- 1978
- 1979
- 1980
- 1981
- 1982
- 1983
- 1984
- 1985
- 1986
- 1987
- 1988
- 1989
- 1990
- 1991

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

- 1984
- 1985
- 1986
- 1987
- 1988
- 1989
- 1990
- 1991

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

- 1990-91